مکالمہ

کراچی

اکادمی بازیافت

مکالمہ

کراچی

کتابی سلسلہ : ۱۵

ترتیب : مُبین مرزا

یکے از مطبوعات : اکادمی بازیافت

مکالمہ ۱۵

جولائی ۲۰۰۵ء — جون ۲۰۰۶ء

کمپوزنگ : لیزر پلس، اردو بازار، کراچی

سرورق : فیصل خان

طباعت : ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

قیمت فی شمارہ:

۱۵۰/ روپے (پاکستان میں)

۱۸/ امریکی ڈالر یا ۱۲/ پاؤنڈ (بیرونِ ملک)

ڈرافٹ/ پے آرڈر/ چیک بنام "مکالمہ" ارسال کریں۔

رابطہ: آفس #۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر۳، اردو بازار، کراچی

فون: ۲۷۵۱۴۲۸ ای میل: a.bazyaft@yahoo.com

ترتیب

افسانے

خصوصی مطالعہ

نظمیں

سوانح / یادیں

مشفق خواجہ

حرفِ آغاز

(ادب اور حالتِ جنگ)

اس وقت انسانی دنیا کی صورتِ حال واشگاف الفاظ میں بتا رہی ہے کہ ہم — ہم سب حالتِ جنگ میں ہیں۔ صرف وہی نہیں جن کی طرف سے جارحانہ پیش رفت ہو رہی ہے یا جو دفاعی حالت میں ہیں، بلکہ وہ بھی جو جنگ اور جارحیت کے عزائم و اقدامات کی توثیق کر رہے ہیں اور کمک فراہم کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ بھی جو اختیاری یا جبری خاموشی کے ساتھ جنگ ہوتے دیکھ رہے ہیں، یہاں تک کہ وہ بھی جو اس جنگ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں — سب کے سب حالتِ جنگ میں ہیں۔

اصل میں یہ آج کی یک قطبی دنیا کا مسئلہ ہے کہ جس میں فیصلے جنگل کے قانون کے تحت کیے جاتے ہیں۔ جنگل پر حکومت شیر کی ہو یا بندر کی اقتدار ہمیشہ جبر و استحصال کی راہ چلتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس — گزشتہ برسوں میں جہاں جہاں اور جس جس شکل میں جارحانہ اقدامات کیے گئے ہیں، ان کے خلاف آواز اٹھی ہے، انھیں مسترد کیا گیا ہے اور ان کی کھلے بندوں مذمت کی گئی ہے۔ اور ایسا صرف ان کی طرف سے نہیں ہوا جو جارحیت کا شکار ہوئے یا جن پر جنگ مسلط کی گئی بلکہ ہر اُس جگہ جہاں انسانی ضمیر بیدار ہے وہاں بربریت اور بہیمیت کے خلاف آواز بلند ہوا ہے۔ جارحانہ اقدامات کرنے والے حکمرانوں کے خلاف خود اُن کے عوام نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ یہ الگ بات کہ ان مظاہروں نے انسانی ضمیر کی بیداری اور انسان کے اجتماعی باطن میں خیر کے عنصر کا اظہار تو ضرور کیا ہے لیکن اور کوئی فرق نہیں پڑا۔ استحصالی قوت نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے سفاکی، بربریت اور ننگی جارحیت کے کسی اقدام سے دریغ نہیں کیا۔ اس بہیمانی تسلسل کا تازہ ترین مظاہرہ فلسطین، افغانستان اور عراق کے بعد اب لبنان میں دیکھا جا سکتا ہے، جہاں مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کے مسلسل قتل کے باوجود جارحیت کے وحشیانہ رقص میں لمحے بھر کا توقف نہیں آیا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ کس کی طرف سے اور کس کس کے ایما پر ہو رہا ہے؟ وہ جو آزادی اور مساوات کے داعی ہیں، حقوقِ انسانی کے علم بردار اور انصاف، جمہوریت اور امنِ عامہ کے سب سے بڑے ضمین ہیں، قتل و غارت گری کا یہ بازار انھی کا گرم کیا ہوا ہے۔ یہ حیرت کا مقام تو ضرور ہے لیکن تعجب کا یقیناً نہیں ہے۔ اس لیے کہ طاقت کا کوئی مذہب، کوئی عقیدہ اور کوئی اخلاقیات نہیں ہوتی۔ وہ کسی رنگ، نسل اور زبان کو نہیں جانتی۔ اسے کسی تہذیب یا نظریے سے سروکار نہیں ہوتا۔ اسے صرف اپنی خواہشات کی تکمیل سے غرض ہوتی ہے خواہ اس کے لیے انسانی تہذیب و تمدن کا ملیا میٹ ہو یا پوری انسانیت ہی کیوں نہ داؤ پر لگی ہو۔

جب یہ صورتِ حال ہو تو وہ لوگ جو سوچتے ہیں اور لکھتے ہیں اور انسانی تہذیب اور اس کی اقدار میں یقین رکھتے ہیں، وہ کیا کرتے ہیں، انھیں کیا کرنا چاہیے؟

ہم لکھنے لکھانے والے کہتے ہیں کہ قلم میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ تاریخ سے قوموں اور تہذیبوں کے

ایسے حوالے بھی مل جاتے ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بعض کتابوں نے معاشروں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی ادیب نے اپنے قلم کے زور سے تباہی اور جنگ کے پہیے کو الٹا کبھی نہیں پھیرا۔ انسانی دنیا میں کیسی کیسی جنگیں نہیں لڑی گئیں اور جب یہ جنگیں لڑی جارہی تھیں، عین انھی لمحات میں انسانیت کا ضمیر بن کر اہلِ فکر اور اہلِ قلم نے کب کب آواز نہیں اٹھائی۔ ایذرا پاؤنڈ، ژاں پال سارتر، برٹرینڈ رسل، سیمون دبوار، ایڈورڈ سعید، گنٹر گراس، نوم چومسکی، اروندھتی رائے اور امیتاو گھوش جیسے لوگ ظلم و بربریت کے اقدامات کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھاتے آئے ہیں لیکن طاقت نے بدمستی کے عالم میں ایسی کسی آواز کو کبھی نہیں سنا۔

یہ حقیقت ہے کہ ادیب کسی تخریبی طاقت کے آگے کوئی بند نہیں باندھ سکتا۔ تو پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟ عملاً میدانِ جنگ میں جا اترے، خاموشی اختیار کرے یا پھر ادب ترک کر کے کسی دوسرے مفید کام میں مصروف ہو جائے؟ ہر شخص تو ایذرا پاؤنڈ، سارتر یا برٹرینڈ رسل نہیں ہو سکتا۔ عامۃ الناس کی طرح لکھنے والوں کی اکثریت بھی ٹی ایس ایلیٹ، جیمز جوئس اور ڈی ایچ لارنس پر مشتمل ہوتی ہے جو بے شک جنگ سے نفرت کرتی ہے اور اس کے خلاف لکھتی بھی ہے لیکن وہ کسی مقتدرہ سے ٹکرانے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اس کے خلاف عملاً نعرہ زن ہونے کو تیار نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ ادیب کہہ سکتا ہے کہ وہ صحافی نہیں ہے اس لیے روز مرہ انسانی صورتِ حال پر ردِعمل کا اظہار اور اس کا تجزیہ اس کی ذمہ داری نہیں۔ وہ کسی سیاسی جماعت کا کارکن بھی نہیں ہے کہ اپنی جماعت کی پکار پر احتجاجی مظاہرے کے لیے فوری نکل کھڑا ہو۔ وہ کسی فلاحی ادارے سے بھی وابستہ نہیں کہ امدادی سامان کی ترسیل کے لیے چل پڑے۔ یا یہ کہ وہ کسی غیر سرکاری تنظیم (این جی او) کا اہل کار بھی نہیں کہ اور کچھ نہیں تو فنڈ ریزنگ ہی کے لیے کاغذات تیار کرے یا کسی فورم پر بیٹھ کر بات کرے۔ یہ بات ماننی چاہیے کہ یہ سب ادیب کے کام نہیں ہیں اور یہ بھی کہ وہ کسی مسئلے پر فوری رائے یا ردِعمل کے اظہار کا پابند نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آج ادب اور ادیب کا کردار معاشرے میں وہ نہیں ہے جو اگلے وقتوں میں ہوا کرتا تھا۔ زمانے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں اور ادیب کو اپنی باشعور حیثیت کے پیشِ نظر بدلتے تقاضوں اور زمانے کے حقائق کو جاننا چاہیے۔ آج کا ادب ہم عصر دنیا اور اس کی متغیر انسانی صورتِ حال سے بے گانہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ادب دائمی اقدار سے سروکار رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آج وہ اپنے عہد کی سچائیوں کو فراموش بھی نہیں کر سکتا۔ آج کا ادیب اگر معاشرے سے مربوط ہے اور وہ اس کے ساتھ مجہول رشتہ نہیں رکھنا چاہتا بلکہ زندہ تعلق کا خواہاں ہے تو اسے بہ ہر طور عصری حقائق سے باخبر رہنا اور ان کی طرف فعال رویہ بھی اختیار کرنا ہوگا۔ اہلِ فکر و نظر اور اہلِ قلم کی حیثیت معاشرے میں وہی ہوتی ہے جو انسانی وجود میں دماغ کی۔ چناں چہ نئی زندگی اور نئے زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ بات صاف طور سے سمجھی جانی چاہیے کہ اب ادیب معاشرے میں پیدا ہونے والے عارضی نوعیت کے مسائل سے بھی بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ عصری زندگی میں "عارضیت" کا چلن بہت بڑھ گیا ہے۔ چناں چہ اب اس کی بابت ادیب کی خاموشی یا تامل اس کی خوابیدگی کے مترادف ہوگا اور یوں اس کی حیثیت معاشرے میں عضوِ معطل کی سی ہو کر رہ جائے گی، جس کا ہونا نہ ہونا دونوں کوئی معنی نہیں رکھتے۔

ادب انسانی تجربے کے جمالیاتی اظہار سے عبارت ہے۔ اور عصرِ حاضر کی انسانی زندگی اور اس کا تجربہ سیاسی عوامل و عناصر کے بغیر نہ تو مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ آج کا ادیب اپنے عہد کی سیاسی صورتِ حال اور اس کے انسانیت پر اثرات کو جانے بغیر عصری شعور کا ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ اسے ان حقائق کو اپنی حسیت کے سانچے

میں ڈھالنا ہوگا کہ اس کے بغیر آج کے انسان کی روح تک رسائی ممکن نہیں۔ انسانی جذبہ واحساس پر اور انسان کی روح پر عہدِ جدید نے جو اثرات مرتب کیے ہیں انھیں جاننے کے لیے آج کے پورے انسانی تجربے کو سمجھنا ضروری ہے۔ مغائرت، بے حسی، خوف اور بے یقینی کا تجربہ پہلے بھی مختلف ادوار میں انسانوں کو ہوتا رہا ہے لیکن آج یہ تجربہ پوری انسانی زندگی کا ماحصل بن چکا ہے۔ یہ صورت تو شاید پہلے کبھی انسانی فکر واحساس پر نہ گزری ہوگی۔ آج کے انسان کی بپتا، اس کی روح کا المیہ اور اس کی افتادِ طبع کی کیفیت کو تہ در تہ سمجھنا بے حد ضروری ہے۔

اس گفتگو کا مقصد یہ نہیں ہے کہ نئے ادب اور نئے ادیب کے سامنے ہم اس کے سماجی کردار کا کوئی مطالبہ رکھ رہے ہیں یا اسے ادب تخلیق کرنے کا کوئی فارمولا بتانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ نہیں، بلکہ بہت سیدھی سادی اور چھوٹی سی بات ہے کہ اسے معاصر سچائیوں سے منھ نہیں موڑنا چاہیے۔ ہمیں انتظار حسین کی اس بات سے اختلاف نہیں کہ ادیب کو رائے کے اظہار ہی کی نہیں بلکہ اس کی بھی آزادی ہونی چاہیے کہ اسے کب اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔ لیکن اگر یہ تامل یا سکوت طول کھینچتا ہے تو ادیب اور معاشرے کا زندہ باہمی تعلق کیونکر برقرار رہے گا۔ ٹھیک ہے ضروری نہیں کہ ہر سماجی مسئلے کو ادیب تخلیقی تجربہ بنا کر سمجھنے کی کوشش کرے۔ وہ اس کے بغیر بھی معاشرے سے اپنے ربط کا اظہار کر سکتا ہے، اپنی گفتگو سے، مکالمے سے، تقریر سے یا کالم سے یا کسی بھی شکل میں۔ البیئر کامیو نے الجزائر کی تحریکِ آزادی کی مخالفت کی تھی۔ گو بعد میں وہ ان نظریات کا قائل نہ رہا ہو لیکن زندگی نے پھر اسے تلافی کی مہلت نہ دی۔ اپنے آخری ناول "پہلا آدمی" میں وہ ہیرو کو باپ کی قبر پر کھڑا ہوا دکھاتا ہے جو عالمِ شباب میں جنگِ عظیم میں کام آ گیا تھا۔ ادھیڑ عمر کا ہیرو کتبہ پڑھ کر چکراتا ہے کہ یہ جواں سال لڑکا جو چوبیس برس کی عمر میں مارا گیا، اس کا باپ تھا۔ ہیرو کے احساسات جنگ کی ہولناکی پر تبصرہ ہیں۔ لیکن یہ تبصرہ بڑی معنویت سے ہم کنار ہوئے بغیر ختم ہو جاتا ہے اس لیے کہ کامیو کی اپنی زندگی بھی یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے وہ اور جیتا تو الجزائر کی آزادی کی بابت اپنی رائے سے رجوع کرتا۔ بہر حال اس کی عظیم انسان دوستی بھی اس کے دامن کا یہ داغ نہیں دھو سکتی۔ کہنے والی بات یہ ہے کہ ادیب کے حقائق کو مؤخر کرنے یا ان سے لاتعلق یا تارک الدنیا صوفی ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ اب ایک گوشے میں بیٹھ کر اور اندر کی دنیا میں مست ہو کر رہنا کافی نہیں ہے۔ اسے اپنے خارج کی دنیا سے ایک باقاعدہ رشتہ رکھنا ہوگا اور اس پر توجہ دینی ہوگی۔ ادیب پہلے بھی صرف اپنے زمانے میں نہیں جیتا تھا بلکہ وہ اس کے ساتھ ہی ساتھ پچھلے اور اگلے زمانوں میں بھی سانس لیتا تھا لیکن اب یہ کام اسے شعوراً اور التزاماً کرنا ہے کہ اس کے بغیر عصری آگہی اور اپنے عہد سے زندہ تعلق دونوں ہی ممکن نہیں۔

حالتِ جنگ میں عام حالات کی زندگی کے اصولوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ آج کی زندگی ماقبل کی انسانی صورتِ حال سے یکسر مختلف نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس کی طرف ادیب کا رویہ بھی الگ ہونا چاہیے۔ آج کی مقتدر وحشیانہ طریق نے جمہوریت، انصاف، امن، ترقی پسندی، روشن خیالی اور انسان دوستی ایسے نظریات کی مکمل نفی کردی ہے۔ آج یہ سب دل کش دعوے بالکل کھوکھلے ثابت ہو چکے ہیں۔ آج دنیا پر طاقت اور ہوس کا راج ہے۔ طاقت کسی غیر مرئی شے کو نہیں مانتی۔ وہ صرف اس شے کو تسلیم کرتی ہے جسے چھو کر دیکھا جا سکے، جسے زیر کیا جا سکے یا حاصل کیا جا سکے، یا پھر نیست و نابود کیا جا سکے۔ آج انسانوں کے درمیان مغائرت کے احساس اور بے حسی کے رویے کو دانستہ فروغ دیا جارہا ہے۔ انسانی دنیا کو ایک ایسا وسیع و عریض سردخانہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جہاں انسانی اجسام موجود تو اپنے اصل خدوخال میں ہوں گے لیکن ان کے بیچ تعلق کی گرمی نہ ہوگی، وہ وحدت نہ ہوگی جو جذبے کے اشتراک سے ہوتی ہے۔ تو یہ زمانہ ہمارے ادب اور ہمارے ادیبوں کے سامنے جو سب سے بڑا سوال پیش کرتا ہے وہ انسانی جذبہ واحساس اور

انسانیت کی بقا سے ادب اور ادیب کی وابستگی کا سوال ہے۔ اگر آج کے ادیب کو انسانیت مجرّد شکل اور انسان حنوط شدہ لاشوں کی صورت میں قبول نہیں ہیں تو پھر اسے اس سوال کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔

☆☆

اس عرصے میں ہمارے ادبی منظر نامے سے بہت سے بڑے لوگ رخصت ہوگئے۔ پرچہ پریس جا رہا تھا کہ نامور ادیب و شاعر احمد ندیم قاسمی صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر آئی۔ قاسمی صاحب عصری ادب کے بزرگ ترین افراد میں تھے۔ انھوں نے عمرِ عزیز کا طویل عرصہ شعر و ادب کی تخلیق اور آبیاری میں صرف کیا۔ گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے میں ادب کی کم و بیش تین نسلوں نے ان سے فیض پایا۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کی ذات مرجعِ خلائق تھی۔ علم و ادب کی ترویج میں آپ کا گراں قدر حصہ ہے۔ آپ کا تنقیدی کام عصری نقدِ ادب کو اعتبار بخشتا ہے۔

شان الحق حقی صاحب بھی چلے گئے۔ حقی صاحب عمدہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ شعر و ادب کے تراجم میں بھی آپ کا کام قابلِ قدر ہے۔ انگریزی اور اردو لغت نویسی میں آپ نے مثالی خدمات انجام دیں اور تادمِ حیات اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔

جمال پانی پتی صاحب بھی رخصت ہوئے۔ جمال صاحب محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے مکتبِ فکر کے آخری بڑے آدمی تھے۔ ہماری روایت، مذہب اور تہذیب کا جیسا شعور جمال صاحب رکھتے تھے اور جس کا اظہار نہایت بلاغت کے ساتھ ان کے تنقیدی مقالات میں ہوا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جمال صاحب ان لوگوں میں تھے جنھیں عصری علم و ادب کی آبرو کہنا چاہیے۔

مشفق خواجہ صاحب بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ تحقیق کے شعبے میں تو خواجہ صاحب کی خدمات لائقِ تحسین ہیں ہی لیکن ادب کے فروغ اور ادبی اقدار کے تسلسل و استحکام میں بھی جو کردار انھوں نے ہمارے زمانے میں نبھایا اس کی مثال بایدوشاید۔ ایک گوشہ نشین شخص کس طرح شہر کی رونق ہوتا ہے اور اس کا جانا کیسی ویرانی پیدا کرتا ہے، خواجہ صاحب کے انتقال کے بعد یہ احساس بہت شدت سے ہوتا ہے۔

حسن عابدی صاحب بھی انتقال کر گئے۔ کیسے بھلے، دھیمے اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ بے غرضی اور بے نفسی کی اعلیٰ مثال۔ آسمان سے شکوہ نہ شکایتِ زمانہ۔ اپنے کام میں مگن۔ آخری برسوں میں جو نظمیں انھوں نے لکھیں وہ جدید نظم کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہے۔ نہایت بامعنی زندگی بسر کی۔ آخری دن تک اپنے کام پوری ذمہ داری سے کیے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر آفتاب احمد، امرتا پریتم، نرمل ورما، معین احسن جذبی، جگدیش بمل، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، حنیف اسعدی، ارشد ملتانی، امید فاضلی، ساقی امروہوی، شمیم نوید، عبدالکریم عابد، صلاح الدین، محمد انور میر، حکیم افتخار فخر، حبیب اللہ اوج، ایم ایچ عسکری، سعد اللہ کلیم، شمس نعمان، منظور حسین ندیم، پروفیسر محمد سلیم، مقبول جلیس اور فن کاروں میں سنیل دت، رنگیلا، زرینہ بلوچ، جمیل بسمل، جمشید انصاری بھی رخصت ہوگئے۔ ادارہ ان سب اہلِ ادب و فن کی رخصت پر افسوس کا اظہار کرتا ہے اور ان کے لواحقین کے غم میں شریک ہے۔

☆☆☆

افسانے

انتظار حسین

رشی اور چڑیا

مند پال رشی بہت جانے مانے رشی تھے۔ سب ہی رشی منی ان کا بہت آدر کرتے تھے۔ کورو پانڈو دونوں ہی انھیں آنکھوں پہ بٹھاتے تھے۔ انھیں کسی کے لڑائی جھگڑے سے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ بس اپنی سمادھی پر بیٹھے رام نام کا جاپ کرتے رہتے تھے۔ تپسیا اتنی کی تھی اور برت اتنے رکھے تھے کہ گھٹ گھٹا کر بس اب ہڈیوں کی مالا رہ گئے تھے۔ مگر ایک روز کیا ہوا کہ بیچ تپ میں ان کا دھیان بٹ گیا۔ دھیان آیا کہ عمر بہت ہوگئی ہے کسی روز بھی یم دوت آن دھمکے گا۔ وہ تو خیر ہونا ہی ہے۔ وہ دن سب پہ آنا ہے مگر مکتی کیسے ہوگی۔ میں تو بے اولاد ہوں۔ آدمی لاکھ رام نام جپے، لاکھ تپ کرے، مکتی تو پھر بھی اسی صورت ہوتی ہے کہ آدمی اولاد والا ہو۔

یہ سوچ کر مند پال جی بہت پریشان ہوئے۔ اب کیا کیا جائے۔ آخر طے کیا کہ بہت برہم چریہ پالن کرلیا۔ اب جلدی سے استری کو گھر میں لاؤ اور جھٹ پٹ اولاد پیدا کرو۔ مگر استری اب انھیں کہاں ملتی تھی۔ بوڑھے پھونس ہوچکے تھے۔ ناریاں یوں ان کے چرن چھوتی تھیں مگر بیاہ کے نام پر بھڑک کر دور بھاگتی تھیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد ایک نرالی ترکیب انھیں سوجھی۔ سوچا کہ میں تو جون بدل سکتا ہوں، پھر مجھے کس بات کی چنتا۔ سنا ہے کہ چڑیاں جلدی انڈے بچے دیتی ہیں۔ سو چڑا بن جاتا ہوں۔ نئی جون میں آ کر نئی عمر مجھے مل جائے گی۔ کسی چڑیا سے جوڑا مل ہی جائے گا۔ بس پھر جلد ہی اولاد والا ہوجاؤں گا۔

بس پھر مند پال رشی نے دیر نہیں کی۔ شبھ مہورت دیکھ کر جون بدلی اور چڑے کا روپ لے لیا اور اڑ کر سیدھے کھانڈو بن میں پہنچے جہاں رنگ رنگ کے پنچھی بسیرا کیے ہوئے تھے۔ وہاں ان کی مڈھ بھیڑ ایک چڑیا سے ہوگئی جس کا نام سارنگی تھا۔ وہ کب سے اکیلی ماری ماری پھر رہی تھی۔ اس کے چڑے کو ایک شکرے نے شکار کرلیا تھا۔ مند پال سے اس کا جی ایسا ملا کہ ایک دوسرے پر واری ہونے لگے۔ جلدی ہی جوڑا مل گیا اور سارنگی نے ایک اونچے پیڑ کی ایک شاخ میں جلدی جلدی گھونسلا بنایا اور چار

انڈے دے ڈالے۔ مند پال کا دل باغ باغ ہوگیا۔

پھر کیا ہوا کہ سارنگی تو گھونسلے میں بیٹھی انڈے سیتی رہتی تھی اور مند پال چڑے کے روپ میں اُڑے اُڑے پھرتے تھے۔ اصل میں مند پال کو تو چڑا بن کر پر لگ گئے تھے۔ اتنی عمر انھوں نے برہم چاری بن کر بتا دی۔ ناری سواد کیا ہوتا ہے، انھیں پتا ہی نہیں تھا۔ یہ پتا انھیں اب چلا۔ بس پھر تو ان کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا۔ جس چڑیا کو چہچہاتا دیکھتے اس پہ ریجھ جاتے۔ ایک چڑیا تھی لپتیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی چہکتی بولتی تھی۔ مند پال جی کا اس پہ جی آ گیا۔ اپنے پریم پیار سے اسے ایسا پرچایا کہ وہ تو ان پر لٹو ہوگئی۔ بس پھر مند پال جی اپنے بیوی بچوں کو بھولے اور لپتیا کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگے۔

اسی جنگل میں ایک شاما چڑیا رہتی تھی۔ وہ ایسی بلا تھی کہ اُڑتی چڑیا کے پر گنتی تھی۔ اس نے بھانپ لیا کہ یہ رشی جو چڑا بنا ہوا ہے، لپتیا پہ ڈورے ڈال رہا ہے اور لپتیا اپنا کھیل کھیل رہی ہے۔ اس نے سارنگی کے کان بھرے کہ اری کل چڑی تجھے کچھ بسنت کی بھی خبر ہے، تیرا رشی پیا تو بلا کا چڑی مار ہے۔ بن کی کتنی چڑیوں کو اس نے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ ان دنوں وہ اس دم کٹی لپتیا کے ساتھ لگا پھر رہا ہے۔

غریب سارنگی نے یہ سنا اور دل مسوس کر رہ گئی۔ کر بھی کیا سکتی تھی۔ بچے اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئے تھے۔ ابھی ابھی انڈوں سے نکلے تھے۔ ابھی کہاں اُڑنے جوگے تھے۔ ماں چگا دیتی تھی تو کھاتے تھے۔

شاما چڑیا آفت کی پُڑیا۔ اس نے تو یہ خبر بن کی ساری چڑیوں کے کانوں میں پرو دی۔ چڑیوں میں اس پر خوب کانا پ۔۔ ہوئی۔ لپتیا اور مند پال پہ انگلیاں اُٹھنے لگیں۔ جتنے منھ اتنی باتیں۔ ایک بولی، ''اس نگوڑے رشی کو تو نئی جون بہت راس آئی ہے۔ اپنے بڑھاپے کو بھولا، جوانی دیوانی کی مثل بنا ہوا ہے۔'' دوسری بولی، ''بڈھے پہ کچھ زیادہ ہی جوانی آن چڑھی ہے۔'' تیسری بولی، ''اے بی چڑیو، اس حرافہ لپتیا کو کچھ نہیں کہتیں، سب چڑوں کو چھوڑ کر کہاں جا کر منھ کالا کیا ہے۔'' ''ارے وہ تو ہے ہی سدا کی حرافہ۔ اسے تو یہی کرنا تھا۔ مگر رشی کو کیا ہوگیا۔ اس کی تو ساری تپ جنگ ہوگئی۔''

ادھر رشی جی کو کچھ پتا نہیں کہ چڑیوں میں کتنی تھڑی تھڑی ہو رہی ہے۔ لپتیا کے عشق نے ان کی آنکھوں پہ پردے ڈال دیے تھے۔ انھیں نہ اپنا ہوش تھا نہ یہ خبر کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ پہلے وہ رام نام جاپ میں ایسے گم تھے کہ دنیا کی خبر نہیں تھی۔ اب عشق نے ایسا دیوانہ بنایا تھا کہ انھیں کچھ پتا نہیں تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کھانڈو بن میں کیا قیامت اُٹھی ہوئی ہے۔ وہ تو یہ کہو کہ اگنی دیوتا سے ان کی کہیں مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ یہ لپتیا کے ساتھ اُڑے چلے جا رہے تھے۔ اُدھر سے اگنی دیوتا شعلے بھڑکاتے چلے آ رہے تھے۔ انھوں نے حیران ہو کر پوچھا، ''ہے اگنی دیوتا یہ کیا کر رہے ہو؟''

اگنی نے جواب دیا، ''کھانڈو بن میں آگ لگا رہا ہوں۔''

''کارن؟'' انھوں نے تعجب سے پوچھا۔

اگنی نے جواب دیا، ''رشی جی، کیا تمھیں پتا نہیں ہے کہ بھارت ورش کا بٹوارہ ہوگیا ہے۔ کھانڈو بن پانڈوؤں کے حصے میں آیا ہے۔ یہاں اب ان کی راج دھانی بنے گی۔ پریاں، ناگ بہت ہیں۔ پہلے انھیں جلا کر بھسم کرنا ہے، پھر یہاں نگر آباد ہوگا۔''

تب مند پال کی آنکھیں کھلیں۔ انھوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ بولے، ''زمین کا جب بٹوارہ ہوتا ہے تو پھر یہی ہوتا ہے۔ جانیں جاتی ہیں، گھر اجڑتے ہیں، جنتا گھر سے بے گھر ہوتی ہے۔'' پھر پوچھا، ''ہے اگنی، باقی جیو جنتو کیا کریں گے، کہاں جائیں گے؟''

اگنی نے کہا، ''یہ سوچنا میرا کام نہیں ہے۔ میرا کام تو آگ لگانا ہے سو میں نے لگا دی ہے۔ کھانڈو بن آگ کی لپیٹ میں ہے۔ کوئی جیو جنتو جیتا نہیں بچے گا۔''

اس گھڑی مند پال کو اپنے بیوی بچوں کا دھیان آیا۔ بہت پریشان ہوئے۔ بولے، ''ہے اگنی! اس بن میں تو میرے بیوی بچوں کا بھی بسیرا ہے اور بچے تو اڑ بھی نہیں سکتے۔ ابھی تو وہ انڈوں سے نکلے ہیں۔ کیا تو ان بچوں پر بھی دیا نہیں کرے گا؟''

اگنی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا، ''اچھا رشی جی مجھے اپنے ٹھکانے کا پتا بتاؤ۔ میں آگ سے کہوں گا کہ اس ایک گھونسلے کو مت جلائیو۔''

مند پال نے اس پیڑ کا پتا بتایا اور اس شاخ کا جہاں یہ گھونسلا بنا ہوا تھا اور جہاں ان کے بیوی بچوں نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ اگنی نے اتا پتا لیا اور آگے چل پڑا۔

مند پال نے مڑ کر نظر ڈالی تو پورا کھانڈو بن شعلوں میں لپٹا نظر آیا۔

لپتیا نے گھبرا کر کہا، ''شعلوں کی لپٹ تو یہاں تک آرہی ہے۔ جلدی سے یہاں سے نکلو۔''

اور دونوں تیزی سے اڑے اور کھانڈو بن سے دور نکل گئے۔

اب اُدھر کی سنو۔ کھانڈو بن میں جب شعلے بھڑکے تو بن کے سارے پشوؤں پنچھیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اُدھر سارنگی سخت پریشان کہ بچوں کا ساتھ ہے، گھر کا والی گھر میں نہیں ہے۔ میں عورت ذات بچوں کو کیسے سنبھالوں گی، کیسے ان کی جانیں بچاؤں گی۔ آس پاس نظر دوڑائی کہ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں آگ سے پناہ مل جائے۔ آخر اس نے ایک چوہے کے بل کو تاڑا۔ کتنے دنوں سے یہ ویران پڑا تھا۔ چوہا جو اس میں رہتا تھا، اسے ایک شکرے نے شکار کر لیا تھا۔ اس نے بچوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ پاس ہی ایک چوہے کا بل ہے۔ چوہے کو تو ایک شکرا چونچ میں دبا کر لے گیا۔ میں تمھیں اس بل میں چھپائے دیتی ہوں۔ آگ بل کے اندر تو نہیں جائے گی۔ جب آگ بجھ جائے گی تو میں آکر تمھیں وہاں سے نکال لوں گی۔

بچوں نے اس تجویز کو بالکل پسند نہیں کیا۔ بولے، ''ہے ماں! وہ چوہا نہیں ہے تو کیا ہوا،

آس پاس اور چوہے ہوں گے۔ وہ ہمیں کتر کے کھالیں گے۔ چوہوں کا کھاجا بننے سے یہ کہیں اچھا ہے کہ ہم آگ میں جل مریں۔''

سارنگی بہت پریشان ہوئی، ''ارے میرے بچو! پھر میں کیا کروں۔ تمھارے باپ کو تو رنگ رلیوں سے فرصت ہی نہیں ہے۔ اس چھنال لپتیا نے اس بڈھے کو ایسا باؤلا بنایا ہے کہ اسے گھر بار سے نہ کوئی غرض ہے، نہ بیوی بچوں کی کوئی پروا ہے۔ اس مصیبت کی گھڑی میں بھی اسے خیال نہیں آیا کہ اس کے بچوں پر کیا بیتے گی؟''

بچوں نے ماں کو سمجھایا، ''ماں تو اپنی فکر کر، ہماری چنتا مت کر۔ ہمارے بھاگ میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اگر بچنا بھاگ میں ہے تو یہ آگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اگر جل مرنا ہی بھاگ میں لکھا ہے تو پھر کوئی کیا کرسکتا ہے۔ ہم تو اُڑ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ مگر تو تو جاسکتی ہے۔ بے ماں تو دیر مت کر۔ جلدی سے یہاں سے نکل جا۔''

سارنگی بچوں کو سینے سے لگا کر بہت روئی۔ مگر کیا کرتی۔ جب آگ سر پر آگئی تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ کر وہاں سے اُڑ گئی۔

جب سارنگی بھی چلی گئی تو بے چارے بچوں کا رکھوالا کوئی بھی نہ رہا۔ ادھر آگ نے بن میں قیامت مچا رکھی تھی۔ اگنی نے جیسے طے کر رکھا تھا کہ سارے بن کو جلا کر بھسم کر دے گا۔ اپنے شعلوں کے لشکر کے ساتھ مارا مار کرتا آخر وہ اس پیڑ کے پاس آن پہنچا جہاں یہ بچے بے آسرا بیٹھے چوں چوں کر رہے تھے۔ اگنی دیوتا نے فوراً پہچان لیا کہ یہ تو مند پال کے بچے ہیں۔ اس نے اپنے شعلوں سے کہا کہ ہے شعلو! اس برکش کو چھوڑ دو، باقی اردگرد جو کچھ ہے سب کو جلا ڈالو۔ شعلوں نے یہی کیا۔ اگنی نے اپنا کام پورا کیا اور آگے بڑھ لیا۔

اگنی کے چلے جانے کے بعد سارنگی بے قراری کے عالم میں یہاں آئی۔ بچوں کو صحیح سلامت دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ انھیں چھاتی سے لگا کر بہت روئی۔ پھر اس نے مندپال کو یاد کیا اور جتنا بُرا بھلا کہہ سکتی تھی اتنا کہا۔ کہنے لگی کہ دنیا کے پردے میں کوئی ایسا باپ بھی ہوگا کہ گھر میں قیامت مچی ہو اور وہ مُڑ کر خبر ہی نہ لے کہ اس کے بیوی بچے کس حال میں ہیں۔ ادھر بچوں کو بھی دُکھ تھا کہ یہ ہمارا کیسا باپ ہے۔ ہماری جان جوکھوں میں تھی، مگر اس نے ہماری خبر ہی نہیں لی۔

لیکن مند پال ایسے نہیں تھے جیسا سارنگی نے بچوں پر جتایا تھا۔ انھوں نے اگنی سے سفارش تو کر دی تھی، مگر دل کو پھر بھی اطمینان نہیں تھا۔ آگ جتنی بھڑکی اتنی ہی مندپال کی بے چینی بڑھتی گئی۔ آخر انھوں نے لپتیا کو چھوڑا اور چلے اپنے بال بچوں کی اور۔ یہاں آ کر انھوں نے بربادی کا جو منظر دیکھا اس نے انھیں اندر سے ہلا دیا۔ اردگرد سب کچھ جل گیا تھا مگر ایک جلی شاخ پر وہ گھونسلا موجود تھا جہاں سارنگی اپنے بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے گھونسلے میں گئے مگر سارنگی نے گالی کوسنوں سے ان کا

سواگت کیا اور بچوں نے تو بات کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے لاکھ سمجھایا کہ اگنی سے انھوں نے سفارش کی تھی جس کے کارن اس نے ہمارے بسیرے کو سلامت چھوڑ دیا۔ مگر بیوی بچوں نے ان کی ایک نہ سنی۔

گھر میں مند پال کی یہ درگت بنی۔ باہر والے کیا سوچتے ہیں، یہ بھی اب انھیں پتا چل گیا۔ چڑیوں میں ان کی کتنی تھڑی تھڑی ہو رہی ہے اور بن کے پنچھی ان کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ آدمی کی جون میں میری اتنی عزت تھی کہ لوگ میرے پاؤں دھو دھو کر پیتے تھے۔ اب بھی میں اس جون میں کہیں جا کر پدھاروں تو لوگ آنکھیں بچھائیں گے۔ لیکن چڑے کی جون میں آ کر میری یہ درگت بنی ہے کہ نہ میری گھر میں کوئی عزت ہے نہ باہر کے لوگ مجھے اچھا سمجھتے ہیں، تو کیوں نہ میں اپنی آدمی والی جون میں واپس چلا جاؤں۔ مگر پھر انھیں خیال آیا کہ انھوں نے اولاد کے لیے یہ کشٹ کھینچا تھا اور اولاد کے لیے اس کارن کہ اولاد والے ہونے کی صورت ہی میں انھیں مکتی ملنی تھی۔ اگر وہ آدمی کی جون میں واپس چلے گئے تو پھر وہ بے اولادے ہو جائیں گے۔

تو بے چارے مند پال رشی عجب دبدا میں تھے، کس جون کو چھوڑیں کس جون میں رہیں۔ بس اسی میں وہ آدھے تیتر آدھے بٹیر بن گئے۔ نجات کی صورت یہی نظر آتی تھی کہ جلدی سے ان کا انت ہو اور انھیں مکتی مل جائے۔ مگر ان کی عمر کھنچتی چلی جا رہی تھی اور جیون لمبا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور مند پال آدھے تیتر آدھے بٹیر۔ آدمی کے روپ میں رشی تھے ساری جنتا ان کے چرن چھوتی تھی۔ چڑے کے روپ میں باہر نکلیں تو انگلیاں اٹھیں، ڈیوڑھی میں قدم رکھیں تو گالی کوسنوں سے سواگت کیا جائے۔

جب بہت خراب ہوئے تو مند پال نے سوچا کہ جو اپنی جون ہے وہی بھلی۔ جو بھی اپنا انجام ہو، اپنی جون میں واپس چلنا چاہیے۔ یہ طے کر کے بس وہ آدمی کی جون میں جانے کو تھے کہ ایک شوخ چلبلی چڑیا کہیں سے اُڑتی ہوئی آئی اور ان کے قریب ہی ایک شاخ پر بیٹھ کر چہچہانے لگی۔ مند پال کا جی مچل گیا۔ رہا نہ گیا۔ سوچا کہ جہاں چڑے کی جون میں اتنے دن گزارے ہیں دو ڈھائی دن اور سہی۔ بس فوراً ہی پھدک کر اس چڑیا کے پاس پہنچے اور گردن پھلا کر پر پھیلا کر اس سے عشق جتانے لگے۔ وہ چڑیا بھی آفت کی پرکالہ تھی۔ ایسی آسانی سے تو قابو میں آنے والی نہیں تھی۔ اس نے بھانپ لیا کہ یہ چڑا تو بالکل ان میں سے ہے جو چڑی کے غلام بن جاتے ہیں۔ چڑے سے منھ پھیر کر وہ دم بھر کے لیے چہچہائی اور پھر سے اُڑ گئی۔ مند پال تو اُس کی اس ادا پہ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ انھوں نے بھی پھریری لی اور اس کے پیچھے پیچھے اُڑتے چلے گئے۔

☆☆☆

اسد محمد خاں

عون محمد وکیل، بے بے اور کاکا

میں وکیل عون محمد ہوں۔ اس وقت وکالت نامے پہ پندرہ سالہ موکل کے دستخط لے کر اپنے دفتر جا رہا ہوں۔ ملزم، مسمّی کاکے کی والدہ بھی بچوں کی جیل تک میرے ساتھ میری گاڑی میں آئی تھی۔ وہ اسے بے بے کہہ کے پکارتا ہے اور اسے بہت پیار کرتا ہے۔

کاغذات کی تکمیل کے بعد بے بے گلشن کی بس پکڑنے چل دی۔ اسے عبداللہ شاہ غازی کی درگاہ پہ پہنچنا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ بے بے، بیٹھی رہ بیٹھی رہ (لوگوں کو میرا اسے بے بے کہہ کے پکارنا عجیب لگتا ہوگا کیوں کہ وہ ابھی صرف بتیس سال کی ہے، جب کہ میرا اپنا چھوٹا بیٹا سینتیسویں سال میں ہے) خیر، میں نے کہا بیٹھی رہ بیٹھی رہ بے بے! میں تجھے درگاہ چھوڑتا ہوا نکل جاؤں گا، مگر وہ نہیں مانی۔ کہنے لگی، ''میں چلی جاؤں گی۔ آپ میری وجہ سے ٹائم خراب مت کرو، کاکے کے کیس پہ کام شروع کر دو۔ بہت وقت نکل گیا ہے۔ اودھر جیل میں میرے کاکے کو پانچواں دن لگا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

اصل میں پولیس نے کاکے کے خلاف blasphemy کا کیس درج کیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ لوگ اسے جان سے نہ مار دیں۔

(بے بے کو ابھی یہ بات میں نے نہیں بتائی ہے۔)

ہوا یہ تھا کہ کاکے نے محلّے کے پیش امام کی جلتی ہوئی لالٹین پہ غلیل میں پتھر رکھ کے مار دیا تھا تو حجرے میں آگ پھیل گئی تھی جس سے پیش امام کی نئی واسکٹ، ایک پیلا سفید رومال اور کچھ برکتوں والے کاغذ ضائع ہو گئے تھے جن پر رحمتوں والا پاک کلام چھپا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بے حرمتی کا پرچہ کٹوانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آخر کو سچ سامنے آئے گا اور کاکا بری ہو جائے گا۔

عین ممکن ہے خود پیش امام پر (جس کا نام سراج دین ہے) بے حرمتی کا جرم ثابت ہو جائے۔

کوشش میری یہی ہے کہ سچ سامنے آئے... خالص اور پورا سچ۔

بے بے اور کاکے نے اپنے بارے میں اور پیش امام کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، دیکھیے، وہ میں

شروع سے سناتا ہوں:

بے بے، بہت دنوں کی بیوہ ہے۔ وہ زیادہ نہیں بولتی اور نماز کی پابندی کرتی ہے۔

اپنے کاکے کے ساتھ کسی گاؤں سے آکے وہ یہاں شہر میں غیر مسلموں کے کسی گرلز اسکول میں چپڑاسن لگ گئی اور محنت اور ایمان داری سے کام کرنے لگی۔ وہیں اسکول والوں نے اسے اپنی کینٹین کا ٹھیکا بھی دے دیا۔ لو جی، اس کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ اسکول والوں نے چار پانچ برس میں اس کی درخواست منظور کر لی اور اسے یہ اجازت دے دی کہ وہ اسکول اسٹاف کے علاوہ بھی گنتی کے لوگوں کے لیے اپنے گھر سے صاف ستھرا کھانا بنا کر لا سکتی ہے، جسے وہ لوگ لنچ کے وقفے میں کینٹین کے باہری گیٹ پر آکر لے جا سکتے ہیں۔

پھر اسے کہا گیا کہ وہ گیٹ کی اوٹ میں خالی جگہ میں اپنے لیے عارضی اسٹور جیسا بنا لے، جس کا ایک ہی دروازہ ہونا چاہیے، باہر کی طرف۔

یہاں وہ اپنے بیٹے اور کینٹین کے ملازم لڑکے کو بٹھا کے دوپہر میں کھانا کھلا سکتی ہے۔ پھر تو بے بے خود بھی یہیں کھانا کھانے لگی۔

اب جو اس کی آمدنی اور بڑھی تو اس نے کچی آبادی میں ۸۰ مربع گز کا ایک پلاٹ خرید لیا اور دو کمروں کا مکان بنا لیا۔ پھر بجلی لگوالی اور ایک کنواں کھدوا لیا۔ کنویں میں اس کے نصیب سے میٹھا پانی نکل آیا تو اس نے پمپ لگوا لیا اور گھر کی دیوار سے ملا کے ایک چھوٹی ٹنکی بنوا دی جس میں وہ محلّے والوں کے لیے پانی اسٹور کرنے لگی۔ صبح جب بے بے کے گھر کا پمپ چل رہا ہوتا تو دو چار محلّے والے سویرے کے تازہ پانی سے اپنی بالٹیاں بھر بھر کے لے جانے لگے۔ باقی پڑوسیوں کی دن بھر کی ضرورت کے لیے چھوٹی ٹنکی شام تک بھری رہتی۔

اس عرصے میں بے بے کے گھر کے سامنے ایک مسجد بن گئی تھی اور ایک جوان پیش امام کہیں سے آکے حجرہ بنا کے رہنے لگا تھا۔

پیش امام نے محلّے والوں کی ٹنکی دیکھی تو خوش ہو کے اس نے الحمدللہ کہا اور ایک دن ٹھیلے والے نانا کو ساتھ لے کر، اسے ٹیکسی میں بٹھا کے وہ کینٹین کے باہری دروازے تک پہنچ گیا۔

ٹھیلے والے نانا ایک نرم مزاج بڑے میاں تھے جو سستے پھلوں اور سبزیوں کا ٹھیلا لگاتے تھے۔ نانا کا کچا پکا گھروندا بے بے کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ بے بے پیار سے بڑے میاں کو بابا کہتی تھی اور کاکے نے انھیں نانا کہنا سیکھا تھا، اس لیے بڑے میاں سب کے نانا کہلانے لگے۔

تو نانا نے کینٹین پر آکے بتایا کہ پیش امام انھیں سفارش کے لیے لایا ہے۔ اگر بے بے باہر کی چھوٹی ٹنکی سے، گلی پار کرا کے، ایک نل مسجد کے وضو خانے تک پہنچا دے گی تو نمازیوں کے لیے طہارت اور وضو کا اچھا انتظام ہو جائے گا اور بے بے کو ثواب ملے گا۔

بے بے نے کہا، آپ دونوں نے اتنی دور آنے کی تکلیف کیوں کی۔ وہیں صبح گھر پہ کہہ دیا ہوتا۔ نانا نے بتایا کہ پیش امام وہاں سب لوگوں کے سامنے تم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بے بے نے پوچھا کیوں بھلا؟

پھر خود ہی بولی، چلو، بسم اللہ کرو۔ نیک کام میں اتنے سوال جواب کس لیے۔ آج میں دکان سے پائپ اور دوسری چیزیں لیتی آؤں گی۔ پلمبر سے کہہ دوں گی۔ وہ سویرے آجائے گا، مسجد تک پائپ پہنچا دے گا۔

نانا نے ٹیکسی میں بیٹھے پیش امام کو یہ سب بتلایا تو وہ کہنے لگا، جزاک اللہ! پائپ ہم ابھی ٹیکسی میں لیتے چلے جائیں گے... پلمبر سے بھی کہہ دیں گے۔ بی بی کو بولو پیسے کا بندوبست کر دے۔

بے بے نے ادھر مہمانوں کے لیے تازہ چائے بنالی تھی اور اندر اسکول میں کہہ دیا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے کے لیے سامان خریدنے نانا کے ساتھ جارہی ہے۔

کاکے نے نانا اور پیش امام کو چائے کے لیے کینٹین کے اسٹور میں آنے کو کہا تو پیش امام کہنے لگا، ''برخوردار! اگر چائے پلانی ہو تو یہیں گاڑی میں لے آؤ۔ میرا ہوٹل وغیرہ میں بیٹھ کر چائے پینا مناسب نہیں ہوگا۔'' کاکے کو حیرت ہوئی، ان کا اسٹور ہوٹل تو نہیں ہے، اگر ہوتا تو بھی کیا برائی تھی... خیر، اس نے دونوں کو اور ٹیکسی والے کو گاڑی میں ہی چائے پلادی۔

ادھر چھینٹا مار، تولیے سے ہاتھ منھ پونچھ، کنگھے کے دو ہاتھ چلا، بے بے سامان خریدنے کو تیار ہو کر باہر نکل آئی تو پیش امام سوچ میں پڑ گیا۔

نانا نے پوچھا کیا بات ہے، کس سوچ میں ہو؟ پیش امام بولا، ''بے پردہ مستورات بیٹھ رہی ہیں، میرے لیے موٹر میں ان کے ساتھ بیٹھنا مناسب نہیں ہوگا۔'' نانا نے پوچھا، کیوں مناسب نہیں ہوگا؟۔ پیش امام کہنے لگا، ''جب آپ نہیں سمجھ رہے تو میرا بیان کرنا بھی نامناسب ہے۔''

بے بے کو اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کس کینڈے کا آدمی ہے۔ مگر کیوں کہ وہ اچھا کام کرنے نکل رہی تھی اس لیے خود نانا کے ساتھ گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی اور پیش امام ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پہ جا بیٹھا۔

بے بے نے پلمبری کا سامان خرید دیا اور وہ دونوں واپس چلے گئے۔

پلمبر نے دل لگا کے کام کیا اور اگلے دن عشا کے بعد مسجد کے وضو خانے تک پائپ پہنچا دیا۔

اس دن کی نمازیں پڑھی جا چکی تھیں تو پلمبر نے مشورہ دیا کہ کل فجر کے وقت بسم اللہ کر کے پمپ چلا دینا۔ یہ مشورہ یوں بھی صحیح تھا کہ پائپ کو لگانے کے لیے اس نے کہیں کہیں سیمنٹ لگائی تھی، وہ بھی رات بھر میں سیٹ ہو جاتی۔

بے بے نے نانا کو پکا کر لیا کہ وہ فجر کے وقت بسم اللہ پڑھ کے اپنے مبارک ہاتھوں سے پمپ چلا دیں گے۔ نانا سیدھے سادے آدمی تھے۔ وہ فجر کی اذان کے بعد بے بے کے صحن میں، جہاں میٹر اور سوچ لگے تھے، پیش امام کو لے کر آ گئے۔ اس نے پمپ کے لیے لمبی دعا پڑھی اور بسم اللہ کہہ کے سوچ کھول دیا۔ پھر کافی دیر تک وہ دیدے گھما گھما کے جائزہ لیتا رہا اور بے بے اور کاکے کے لیے دعائے خیر کرتا رہا۔

دن خوب نکل آیا تو گلی میں موٹر رکشا کی آواز اور بچوں کے نعرے سنائی دیے۔ لوگوں نے نکل کے دیکھا کہ پلمبر پر مٹھائی کا ٹوکرا لدوائے پیش امام کھڑا بے بے کے مکان کی کنڈی بجاتا ہے۔ کاکے نے

دروازہ کھولا تو کلکاریاں مارتے ہجوم کو چیر کر بے بے کو پکارتا ہوا پیش امام گھر کے صحن میں آ گیا۔ بہت سے ہمت والے بچے بھی اس کی ٹانگوں سے لپٹے، اس کے کپڑے کھینچتے ہوئے صحن میں آ گئے تھے۔ پیش امام نے بہت استغفار پڑھی اور خطبے والا عصا (جو وہ فاتحہ پڑھنے کو ساتھ لیتا آیا تھا) گھمایا، مگر صحن میں آ جانے والے بچوں نے باہر جانے سے انکار کر دیا۔ نانا بھی آ گئے۔ پیش امام کو گلی میں نکل کر بچوں میں مٹھائی تقسیم کرنی پڑی۔

بے بے اور کاکے کو بہت سی مٹھائی دینے پیش امام جب دوبارہ گھر میں آ گیا تو بے بے نے نانا سے اور پلمبر اور پیش امام سے کہہ دیا کہ آج اتوار کا دن ہے، اس کی چھٹی ہے۔ وہ سب لوگ دوپہر کو آ جائیں اور کھانا کھا لیں، مہربانی ہوگی۔

بے بے نے دس آدمیوں کا کھانا تیار کیا۔ میٹھا اس نے ایک روز پہلے ایرانی ہوٹل والے کے فریج میں رکھوایا ہوا تھا۔ کیوں کہ اسکول کی وجہ سے بے بے اور کاکے کی ہوٹل والے سے جان پہچان ہو گئی تھی تو کینٹین کی ایک دن کی بچی ہوئی چیز وہ فریج میں سنبھال لیا کرتا تھا۔ کھانے کا وقت ہونے لگا تو کاکا فریج میں رکھوایا ہوا میٹھا لینے گیا۔ اس نے ہوٹل کے کاؤنٹر پہ کسی آدمی کے ساتھ پیش امام کو کھڑے دیکھا۔

وہ دونوں آدمی پیسے ادا کرنے کے لیے ایک دوسرے سے تکلف کا جھنجھٹ کر رہے تھے۔ ہوٹل کا مالک میز پر اپنے ہاتھ رکھے بڑی بیزاری سے دونوں کو یہ سب کرتے دیکھ رہا تھا۔ کاکے نے اسے سلام کیا اور دور سے فریج کی طرف اشارہ کیا تو اس نے سر ہلا دیا کہ نکال لو۔

لمحے بھر کو پیش امام کا دھیان بٹ گیا، اس نے کاکے کو فریج سے میٹھے کا پیکٹ نکالتے دیکھا۔ اسی وقت مہمان نے کاؤنٹر پر پیسے رکھ دیے اور وہ جیت گیا۔ پیش امام کھسیا گیا۔ اس نے دو روز پہلے ہی تو کاکے سے کہا تھا کہ اس کا ہوٹل میں چائے وغیرہ پینا مناسب نہیں ہے۔

دوپہر کے کھانے پر جب سب لوگ کھانے پر بیٹھنے لگے تو پیش امام نے شانوں پر سے کڑھا ہوا سفید رومال اتار کر اپنے برابر کی جگہ کو اس طرح جھاڑا جیسے گرد جھاڑتا ہو پھر کہنے لگا، ''آؤ برخوردار! یہاں میرے پاس بیٹھو۔'' ظاہر ہے کاکا اندر سے کھانا لا لا کر مہمانوں کے آگے رکھ رہا تھا، بیٹھ کیسے سکتا تھا۔ بے بے نے کھانے کے بعد چائے پلائی پھر وہ اندر بیٹھی عورتوں سے معذرت کر کے دروازے تک مردوں کو رخصت کرنے آئی۔ پیش امام نے اپنے پہلے سفید رومال کو گھونگھٹ کی طرح سر پہ ڈال رکھا تھا۔ تو اس نے گھر کی دہلیز پار کرنے سے پہلے پھر دعا پڑھی اور دیر تک رقت کے ساتھ مناجات کرتا رہا۔ اس نے بے بے کی خدا ترسی، نیک نفسی اور پرہیز گاری کا بیان کرتے ہوئے اس کے لیے اجر عظیم کی سفارش کی، کس لیے کہ بے بے نے اپنے ٹیوب ویل، موٹر اور پمپ سے نمازیوں کے اور خلق خدا کے لیے پانی فراہم کر دیا تھا۔ آمین کہہ کر اور مرد تو رخصت ہوئے مگر پیش امام رہ گیا جو باہر کی ٹنکی کے ہر پہلو کی جانچ پڑتال کرتا جاتا تھا اور ٹونٹیوں کو گھما گھما کے خدا کی بزرگی بیان کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے بے بے سے جانے کی اجازت چاہی، جو فوراً ہی مل گئی۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بے بے کو مشورہ دیا کہ اب جب کہ اس کی اور اس

گھرانے کی جان پہچان ہوگئی ہے تو یہ بہتر ہوگا کہ کا کا، پیش امام سے سپارہ پڑھنا شروع کردے۔ بے بے نے کہا، سبحان اللہ! اس سے اچھی بات کیا ہوگی، وہ کاکے کو بھیج دیا کرے گی۔ پیش امام کہنے لگا، وہ خود آجایا کرے گا اس لیے کہ کہا گیا ہے کہ نیک کام سرانجام دینے کے لیے ایک قدم بھی اٹھایا جائے تو اس پر اتنا اتنا ثواب ہوتا ہے۔ بے بے نے کہا کہ آپ کیوں زحمت کریں، کا کا ہی آجایا کرے گا اور وہ سلام کرکے اندر چلی آئی۔

دوسرے دن سے کاکے نے پیش امام سے سپارہ پڑھنا شروع کردیا۔ مگر ابھی پڑھنے کا وقت ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ کا کا کبھی تو فجر کی نماز کے بعد آدھے گھنٹے کے لیے مسجد ہی میں بیٹھ کر سبق لیتا اور سنا دیتا تھا، کبھی مغرب کے بعد۔ لیکن یہ دونوں وقت بہت تنگ تھے کیوں کہ صبح دونوں ماں بیٹے کو کینٹین کھولنے کی جلدی ہوتی تھی اور شام میں کا کا بہت تھکا ہوا ہوتا تھا تو مغرب کے بعد اسے نیند کے جھونکے آتے تھے۔ کچھ دن سپارے کی پڑھائی صبح اور شام، وقت بدل بدل کے ہوئی پھر یہ گنڈے دار ہونے لگی۔ پیش امام نے تجویز پیش کی کہ کاکے کو دن میں ضرور وقت ملتا ہوگا تو کیوں نہ پیش امام کینٹین پر آجایا کرے۔ سنا ہے اسٹور میں کچھ جگہ ہے، بس وہاں ایک طرف بیٹھ کے کا کا سبق لے لیا کرے گا۔ اس وقت بھی اس نے نیک کام سرانجام دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ دور جانے کی فضیلت بیان کی اور فاصلے کو ثواب کے لحاظ سے مفید بتایا۔ تجویز اچھی تھی، مگر بے بے نے سوچا ہماری وجہ سے بے چارہ چل کر یا بس سے اتنی دور آئے گا اس لیے اس نے جواب میں پیشکش کی کہ دوپہر کا کھانا پیش امام کینٹین ہی میں کھا لیا کرے، اس لیے کہ وقت کھانے کا ہوگا اور کا کا اس وقت فارغ بھی ہوتا ہے۔ پیش امام نے پہلے تو تجویز کی مخالفت کی مگر یہ مخالفت ایسی تھی جیسی ایرانی ہوٹل کے کاؤنٹر پر چائے کے پیسے ادا کرنے کے لیے اس کا اور اس کے مہمان کا تکلف بھرا جھنجھٹ۔

پیش امام دوپہر میں کینٹین پر آنے لگا۔ پہلے بے بے، کا کا اور کینٹین والا لڑکا فرصت پاتے ہی اسٹور کی میز پر کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ اب جو پیش امام آنے لگا تو کا کا وہیں ایک طرف بیٹھ کے سبق پڑھ لیتا پھر کاکے اور پیش امام اور لڑکے کے لیے بے بے کھانا لگا دیتی۔ انھیں کھلا کر پیش امام کے جانے کے بعد، وہ خود کھانا کھا لیتی۔

بہ ظاہر سب ٹھیک ٹھاک تھا لیکن پیش امام، باتوں باتوں میں مسلمانوں کے آپس کے انتشار کے وجوہ بیان کرنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مسلمان لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا کریں تو یگانگت بڑھے گی اور اسلامیانِ عالم کو دنیا میں سربلندی نصیب ہوگی۔ بے بے اس کے خیال سے پورا پورا اتفاق کرتی تھی لیکن کھانا وہ پیش امام کے جانے کے بعد ہی کھاتی رہی۔

پیش امام عام طور پر کھانے کے بعد ایک لمبی دعا کرتا اور چائے ضرور پیتا تھا۔ دعا میں خاص طور پر بے بے کی صحت اور اس کی سلامتی طلب کی جاتی۔ مگر پیش امام کا بے بے اور کاکے کی زندگیوں میں اس طور دخل ہونا آخرکار ان کے ذہنی سکون کو درہم برہم کر گیا۔

ایک روز سبق لینے، کھانا کھانے، چائے پینے کے بعد کا کا، پیش امام کو کینٹین کے دروازے تک

رخصت کر کے جو اندر اسٹور میں آنے لگا تو پیش امام بھی پیچھے پیچھے چلا آیا۔ بے بے نے ابھی کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ کاکے اور پیش امام کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔ پیش امام ایک کرسی کھینچ کر میز سے ذرا دور بیٹھ گیا اور کاکے سے کہنے لگا کہ دیکھو برخوردار! مجھے تمھارے مستقبل کے بارے میں تمھاری والدہ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ تم مجھے سکون سے باتیں کرنے دو۔ اس لڑکے کو بھی ادھر نہ آنے دینا۔ جاؤ شاباش۔ پھر وہ بے بے سے مخاطب ہوا، بولا، ''خاتون آپ کچھ دیر بعد کھانا کھا لیجیے۔ کچھ غور طلب معاملات ہیں جن پر بات کر کے میں فوری طور پر جانا چاہتا ہوں۔ جلدی میں ہوں۔''

بیٹے نے ماں کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا۔ ماں نے اشارے سے اسے باہر جانے کو کہہ دیا۔ وہ باہر آ بیٹھا اور سوچنے لگا کہ پیش امام ایسی کون سی بات کہنا چاہتا ہے؟ ہوسکتا ہے میری شکایت کرتا ہو۔ پر میں ٹھیک ٹھاک پڑھ رہا ہوں، روز کا کام روز کرتا ہوں۔ اور کیا چاہیے؟ خیر، وہ اسی سوچ میں تھا کہ اندر سے بے بے نے اسے آواز دے لی۔ وہ پہنچا تو بے بے منہ پر ہاتھ رکھے شاید رو رہی تھی۔ مگر وہ بولی تو اندازہ ہوا کہ رو نہیں رہی تھی، وہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کاکے کے پہنچتے ہی پیش امام پُر زور انداز میں بے بے سے کہنے لگا، ''خاتون! میں پھر تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ برخوردار کا فی الوقت اس معاملے سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ فوری طور پر اس سے یہ بات کہہ دی جائے۔''

بے بے نے مشکل سے ضبط کر کے کہا کہ حضرت مولانا! آپ کا خیال درست نہیں ہے۔ جو تجویز آپ پیش کر رہے ہیں، اگر میں اس سے اتفاق کرلوں تو آپ اس کاکے کے باپ بن جائیں گے، اس لیے پہلے اس برخوردار سے پوچھ لیا جائے کہ کیا یہ آپ کو اس حیثیت سے قبول بھی کرے گا؟—— کیوں بیٹے؟

پیش امام نے کسی کو بولنے کا موقع نہ دیا، تقریباً خفا ہو کے کہنے لگا، ''خاتون! یہ بچہ قبول نہیں کرے گا۔ قبول آپ کریں گی۔ ایجاب وقبول زوجین کے مابین ہوتے ہیں۔''

بچے کی سمجھ میں اب بھی زیادہ کچھ نہیں آیا تھا۔

بے بے کو پیش امام کی بات پر طرارہ آ گیا۔ کہنے لگی، ایجاب وقبول طرفین کے مابین ہوتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ میرا بیٹا ہی میرا محرم اور میرے گھر کا واحد مرد ہے تو میں پہلے اس کی رائے معلوم کروں گی۔ آپ چپ رہیے۔ کیوں بیٹے؟ یہ پیش امام صاحب جنھیں تم اس وقت کرسی پہ بیٹھے دیکھ رہے ہو، اگر یہ مستقل، یہاں اس کرسی پر..... مطلب، اگر یہ پورے کے پورے ہماری زندگی کا حصہ بن جائیں..... تو تمھیں کیسا لگے گا؟ بے بے نے بیٹے سے کچھ مسکراتے کچھ سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی جو اب کاکے کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے الجھ کے سوال کیا، کیوں؟ بے بے نے مسکرا کے پوچھا، کیوں کیا مطلب؟ جبھی یہی کہہ رہے ہیں۔ کاکے نے اب کے تیز ہو کے پوچھا، ''مگر یہ ہماری زندگی میں کیوں حصہ بنائیں گے؟''

کاکے کے حصہ بنائیں گے، کہنے پر بے بے نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی، پھر ہنسی روک کے

بولی، اس لیے کہ یہ صاحب مجھے گناہوں سے بچانا چاہتے ہیں — مجھو جنتی بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں جو اکیلی رہ کے تمھاری پرورش کر رہی ہوں تو یہ کفرانِ نعمت ہے، جو گناہ ہوتا ہے۔

کاکے نے پیش امام سے کہا، پرورش کرنا گناہ نہیں ہوتا۔

لاحول پڑھتے ہوئے پیش امام بھنا کے بولا، ''خاتون! ایک بہت اہم مسئلہ آپ نے بچے کو کھیلنے کو دے دیا ہے۔ آخر یہ کس قماش کی گفتگو ہے؟''

بے بے نے اب کے پوری طرح سنجیدہ ہو کے کہا، ''یہ ماں بیٹے کی گفتگو ہے۔ آپ کو پسند نہیں ہے تو چلے جایئے۔''

پیش امام کو بہت بُرا لگا۔ وہ اٹھا مگر پھر سنبھل کے بیٹھ گیا اور کاکے سے کہنے لگا، ''جاؤ برخوردار، تم باہر جاؤ۔'' کاکے نے الٹ کے کہا، ''کیوں؟''

پیش امام نے اونچے سُر میں کہا، ''میں کہہ رہا ہوں باہر جاؤ۔ بچوں کے سامنے بہت سے مسئلوں پر بات نہیں ہو سکتی۔''

بے بے اب روکھے پن سے بولی، ''سنیے جی مولوی صاحب! میں نے آپ سے جانے کو کہا ہے۔ اب آپ تشریف لے جایئے اور ادھر آنے کی پھر زحمت نہ فرمایئے۔ بس ہو گئی پڑھائی۔ بچہ کہیں اور پڑھ لے گا۔''

پیش امام نے آنکھیں دکھائیں، کہنے لگا، ''پھر زحمت نہ فرمایئے، کیا مطلب؟ میں اس بچے کو کلام اللہ پڑھا رہا ہوں۔''

بے بے کو اس انداز پہ حیرت ہوئی، کہنے لگی، ''نہیں اب نہیں پڑھا رہے آپ۔ اس نے پھر آنکھیں دکھائیں، خاتون! اس کا فیصلہ میں کروں گا!''

بے بے اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ کاکا اس کے برابر جا کھڑا ہوا۔ کہنے لگی، ''تم اپنے حواسوں میں تو ہو؟ میں آخری بار کہہ رہی ہوں کہ اب چلے جاؤ اور یہاں اب نہ آنا۔ سمجھے؟''

پیش امام نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے گہری سانس لی، جیسے خود کو کسی آزمائش کے لیے تیار کر رہا ہو۔ پھر پھنسی ہوئی آواز میں بولا، ''عورت تجھے نہیں معلوم کہ تو کن شیطانی اثرات کے تحت ایک دین دار آدمی سے منہ ماری کر رہی ہے۔ اے بدنصیب! میں نے تو تیری اصلاح کے لیے یہ تحریک کی تھی۔ خدا جانتا ہے کہ اس میں نفسی خواہش کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس وقت میں جا رہا ہوں مگر میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔ اے ناقص العقل! میں تو......''

بے بے نے اسے آگے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جس کرسی پر اب تک بیٹھی تھی اس نے اس کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑا اور دانت پیس کر بولی، ''جاتا ہے یا دوں ایک!''

''تجھے یہ کرسی اٹھانا مہنگا پڑے گا۔ جہنمی! ملعون!'' کہتا ہوا پیش امام اسٹور سے نکل گیا۔

بے بے بہت دیر تک سناٹے میں رہی پھر کاکے سے آہستہ سے کہنے لگی، "یہ مجھے پاگل لگتا ہے۔ بلاوجہ جھک جھک کر کے گیا ہے۔ یہ تجھے کہیں باہر ملے تو بات مت کرنا اور اس جھگڑے کا کسی سے ذکر مت کرنا۔" کاکے نے سر ہلا کے بے بے سے وعدہ کر لیا۔

دو دن کچھ نہیں ہوا۔ پیش امام ایک بار کاکے کو بستی میں نظر آیا۔ اس نے خود ہی نظریں چرا لیں۔ کاکے نے بھی سلام نہیں کیا۔ تیسرے دن ایک جوان آدمی بے بے کو کینٹین کے دروازے میں کھڑا دیکھ کے آگے آیا، سلام کر کے کہنے لگا، "بی بی! پرسوں جو ہوا تھا، بے شک برا ہوا تھا۔ آپ کچھ خیال نہیں کرنا۔ بھائی سراج دین نے پچھوایا ہے کہ اب تو آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا؟"

کاکا اسے پہچان گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو پیسے دینے کے لیے اس دن پیش امام کے ساتھ جھنجھٹ کر رہا تھا اور بالآخر پیسے دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بے بے اسے بولتے سن رہی تھی اور بس گھورے جا رہی تھی۔ اس نے جو 'بھائی سراج دین' کہا تو یہ پیش امام کا نام ہوگا۔

لمحے بھر رک کے وہ کہنے لگا، "اصل میں جی وہ بڑا نیک طبیعت آدمی ہے۔ کبھی دنگا فساد نہیں کرتا۔ دین دار بندہ ہے۔ ادھر ملک میں اس کے گھر والوں کا تھوڑا بہت کاروبار ہے، زرعی زمین بھی ہے، نہری...... ایک بھائی ہے، چھوٹا۔ والدہ صاحبہ ہے۔ والد صاحب پولیس کا ریٹائرڈ حوالدار ہے۔ اس کی بات کا بُرا مت منانا۔ گرما گرمی میں کچھ کہہ دیا ہوگا۔ اب اگر آپ فرماؤ تو ادھر سے والدہ صاحبہ کو بلوا بھیجتے ہیں۔ ویسے وہ بہت ضعیف ہو گئی ہے۔ ادھر ہی آپ لوگ بات کر کرا کے طے کر لو۔"

بے بے نے اس کی یہ لمبی بکھری بکھری تقریر بڑے حوصلے سے سنی۔ وہ سانس لینے کو رکا تو اس نے رسان سے پوچھا، "اے بھائی! تمھارا نام کیا ہے؟"

وہ جھینپ کے بولا، "میرا نام بھی سراج دین ہے۔ سب چھوٹا سراج دین کہتے ہیں۔ وہ بڑا ہے، ملاں۔" روانی میں وہ پیش امام کا بے تکلفی کا نام بتا گیا تھا اور اب اس بات پر اور خجل ہو رہا تھا۔

بے بے نے اسی دھیمے انداز میں کہا، "بھائی چھوٹے سراج دین! آپ یقیناً ملاں سراج دین کے قریبی دوست ہوں گے۔" وہ بات کاٹ کے جلدی سے بول پڑا، "ملاں تو جی ہم پیار سے کہتے ہیں۔ بڑا عالم فاضل آدمی ہے.... ہاں جی، میں اس کا بچپن کا دوست ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تو بھائی چھوٹے سراج دین! آپ اپنے دوست بڑے سراج دین کو سمجھائیں۔ اللہ نے انھیں دین کی سمجھ اور علم دیا ہے۔ وہ اللہ کا کلام پڑھاتے ہیں تو پھر اسی کے مطابق عادات و اطوار بھی رکھیں۔" چھوٹا سراج فوراً بولا، "بی بی! وہ بڑے سوہنے عادات و اطوار کا بندہ ہے۔ آپ یقین کرو۔"

"سنو جی! مجھے بات کرنے دو!" بے بے نے ڈپٹ کے کہا۔ چھوٹا سراج مرعوب ہوا تھا۔ وہ بولی، "سوہنے عادات و اطوار والا بندہ کبھی عورتوں کو دھمکیاں نہیں دیتا، نہ بدکلامی کرتا ہے۔" چھوٹا کہنے لگا، "دیکھیں نا جی، آدمی سے کبھی کبھار کوئی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بندہ بشر جو ہوا۔ کچھ خیال نہ کریں آپ، معاف

کر دیں اسے۔"

بے بے بولی، "اچھا تم اس کی طرف سے معافی مانگنے آئے ہو؟" وہ ہاں میں سر ہلا کے کہنے لگا کہ یہی سمجھ لیں آپ۔

"تو ٹھیک ہے۔" بے بے نے کہا، "معاف کیا میں نے۔ مگر ایک بات اپنے ملاں سراج دین کو بتا دینا کہ اس طرف کبھی رخ نہ کریں۔ میں نے بات اپنے تک ہی رکھی ہے۔ آدمی بنے رہے تو آئندہ بھی کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔ ٹھیک ہے، تم جاؤ۔"

چھوٹا سراج منہ کھولے بے بے کو تکے جا رہا تھا، دھیرے سے کہنے لگا، "وہ تو ٹھیک ہے جی، پر میں اس کو جواب کیا دوں؟" اس پر بے بے نے جیسے پھر ڈانٹ پلائی کہ کیسا جواب؟ وہ بولا، "یہی جی رشتے کی بات۔"

بے بے نے اس کی طرف دیکھ کر جیسے مایوسی میں سر ہلایا۔ افسوس کے ساتھ بولی، "تم کیسے آدمی ہو؟ میں کہہ رہی ہوں کہ میں تمھارے سراج دین کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی اور تم رشتے کی بات پوچھ رہے ہو۔ ارے بندے خدا کے، کہہ دینا مجھے نہیں کرنا اس سے نکاح۔ اب تو خوش ہو؟ اب جاؤ! مجھے کام کرنے دو۔"

چھوٹے سراج دین کے چہرے پر لال رنگ کی تیکھی لہر دوڑ گئی۔ اسے بے بے کے غصے کی سہار تھی پر وہ اس کی حقارت نہ برداشت کر سکا۔ نتھنے پھلا کے بولا، "بی بی او بی بی! زیادہ اونچا اڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہم شریف ہیں تو شریف ہیں۔ ہم سے ٹیڑھی بات نہیں کر۔ ہاں!"

اور یہ سب بک بکا کے چھوٹا سراج چلا گیا۔ بے بے سمجھی بات ختم ہو گئی۔ مگر بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

دوسرے دن مسجد کو جانے والا پائپ اکھاڑ دیا گیا۔ باہر کی ٹنکی سے پانی لینے والے ایک دم کم ہو گئے۔ جہاں صبح شام مردوں عورتوں کی بھیڑ لگا کرتی تھی وہاں یہ ہو گیا کہ کبھی بہت ضرورت میں کوئی آ کے بالٹی بھر لیا کرتا۔ بے بے کے گھر محلے والوں کا آنا جانا جیسے بالکل بند ہو گیا۔ ایک دن نانا نے صبح ٹھیلا نکالنے سے پہلے گلی میں آ کے بے بے کو آواز دی۔ وہ دروازے پہ پہنچی تو نانا نے ہکلا ہکلا کے کہا کہ اب وہ اس کا سودا نہیں لا سکیں گے۔ اسے اب اور کوئی انتظام کر لینا چاہیے۔ بے بے نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے بس...... اب مشکل ہے۔ بے بے نے کہا، بابا! کوئی بات نہیں، آپ نے بہت خیال رکھا، اللہ خوش رکھے۔ وہ منھ ہی منھ میں کچھ کہہ کر چلے گئے۔ اس کے بعد نانا نے ان سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ نہ وہ ان دونوں کو صبح جگاتے، نہ ٹنکی سے پانی لیتے اور نہ ہی بات کرتے۔ کا کا سلام کرتا تو سر جھکائے جھکائے جواب دے دیتے۔ بے بے ایک روز مغرب کے بعد کا کے کو لے کے ان کے دروازے پہ گئی۔ کواڑ تھپتھپایا تو پوچھنے لگے کون ہے؟ بے بے بولی، میں اور کا کا آئے ہیں تو ذرا ٹھہر کر بولے کہ بھئی اس وقت جاؤ تم لوگ، میں وظیفہ پڑھ رہا ہوں۔ بے بے اندر ہی اندر روتی ہوئی واپس آ گئی۔

ایک دن محلے کی ایک بہت بولنے والی عورت کو روک کے بے بے نے پوچھا کہ آخر بات کیا ہے

تو اس نے بے دھڑک بتادیا کہ تم جو دیکھتے ہی دیکھتے جھونپڑی سے پکے مکان میں آئی ہو یہ جادو جنتر ایسے ہی نہیں ہوگیا۔ ہمیں سب پتا ہے۔ اور لوگ پانی اس لیے نہیں لیتے کہ تمھاری غلط کمائی کی وجہ سے پانی ناپاک ہوگیا ہے۔ بے بے نے اپنی 'غلط کمائی' کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس طرح غلط ہے تو عورت بھنا کے بولی، "بی بی! بس رہنے دو منھ مت کھلواؤ...... پیش امام کے ایک جاننے والے نے ایک بندے کو رات میں چوروں کی طرح تمھارے گھر سے نکلتے ہوئے پکڑا تھا، دوسرا باہر کھڑا تھا، وہ شور سن کے ڈپٹ لیا، نہیں اتنے گواہوں کی گواہی مل جاتی کہ سنگ ساری میں کوئی دیر نہیں لگتی۔"

بے بے تو خالی کرسی اٹھا کر رہ گئی تھی۔ ملاں سراج دین نے اس پر پوری قوت سے وار کیا تھا۔

بعد میں کسی دوسری نے یہ تصدیق بھی کی کہ جو آدمی پکڑا گیا تھا اس نے نانا اور پیش امام کے سامنے اقبالِ جرم کیا ہے۔ اور پیش امام کل کہہ رہا تھا کہ وہ مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر حلف اٹھانے کو تیار ہے کہ بڑی سڑک کے ایرانی ہوٹل کا مالک تجھے پیسے لیے بنا خوب مٹھائیاں بھیجتا ہے۔ عورت نے یہ بھی کہا کہ اس میں ذرا بھی جو غیرت ہو تو ڈوب مرے۔

بے بے اس روز دیوار پکڑے پکڑے گھر میں آئی اور لیٹ گئی۔ وہ صبح تک بخار میں بڑی بڑی ہذیان بکتی رہی۔ کاکا اس کی موئی سے لگا بیٹھا سب سنتا اور کافی کچھ سمجھتا رہا۔

اور ابھی فجر میں دیر تھی جو کاکا گلی میں آیا۔ اس نے پیش امام کو اپنے حجرے میں لالٹین جلاتے دیکھا۔ وہ غلیل اور ایک چھوٹا پتھر لینے گھر میں گھسا اور... اسے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا... مگر باہر آ کر اس نے پیش امام پر پتھر کھینچ مارا۔ حجرے میں آگ پھیل گئی اور وہ ہوا جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔

اور اب میں، عون محمد وکیل اپنی سی کوشش کر رہا ہوں کہ سچ سامنے آئے اور کاکا بے حرمتی کے الزام سے بری ہو جائے۔

مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں، کسی دن جیل کے باہر، چار سو یا اس سے کچھ کم (یا زیادہ) خوب غصہ دلائے ہوئے مسلح (اور غیر مسلح) لوگ نہ آ کھڑے ہوں جنھیں سوہنے نبی ﷺ جی کی لائی ہوئی رحمتوں والی شریعت کی (اور Circumstantial Evidence کی) یا تو سمجھ ہو یا نہ ہو... تو سوال یہ ہے کہ ایسے میں ... کاکے کی جان کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔

خیر — اللہ مالک ہے۔

☆☆☆

اسد محمد خاں

ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی

قسط ۷

''ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی'' کا ڈھب کچھ اس طور کا بنتا جا رہا ہے کہ میں، راوی، یہ کہانی کہیں سے بھی سنانا شروع کر دیتا ہوں۔

تین آدمیوں کی ہماری ٹولی نے اسپین کی یاترا میں (دارالحکومت) مادرد، (پریوں کی کہانی والے castle) سگوویا اور (یونی ورسٹی ٹاؤن) سلامانکا دیکھے تھے اور اندلس کے چار شہروں مالقہ (لوگ اسے Malaga کہتے ہیں، میں اپنا دل خوش کرنے کو عربی تلفظ پر اصرار کروں گا) غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ کی 'زیارت' کی تھی اور ایک بار سڑک کے راستے اپنے مہربان دوست Bash Bojari (بشارت بخاری جن سے آپ مل چکے ہیں) کی کار میں بیٹھ کر ہم چوبیس گھنٹے کے لیے پرتگال کے صدر مقام لزبن جا پہنچے تھے۔

اس وقت میں پرتگال کے لزبن کو اور ہسپانیہ کے مادرد، سگوویا، سلامانکا وغیرہ کو کچھ عرصے کے لیے بھلاتے ہوئے بس اپنے چار اندلسی شہروں کو یاد کروں گا... بلکہ پانچ کو... پانچواں تورے مالینوس ہے۔

مالقہ سے چند کلومیٹر دور، یہ ساحلی قصبہ، تورے مالینوس (جس کے نام کا انگریزی ترجمہ Tower of the Mill ہے) مجھے بار بار یاد آ رہا ہے، یعنی یہ کہ اپنے بیان کیے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔

مالقہ کو ویسے تو مورز (Moors) کا شہر کہا جاتا ہے مگر وہاں صرف ایک اَلکا زبا (القصبہ) کے آثار محفوظ ہیں، جہاں، کہا جاتا ہے کہ طارق بن زیاد کی آمد سے پہلے کچھ عرب کشتیاں آن رکی تھیں اور اُن کی ایک چھوٹی سی جماعت نے ایک محلّہ (یہ اَلکا زبا) بسا لیا تھا۔ اسے اب محکمۂ سیاحت نے سنبھال لیا ہے۔ خیر ہم نے پہلے مالقہ کے اس القصبہ کا چکر لگایا... کوئی زیادہ متاثر نہ ہوئے تو پروڈیوسر دوست کے مشورے پر ایک مضافاتی بس میں سوار ہو، ہم تورے مالینوس آ گئے۔

بس سے اُترے، جگہ کے نام کا ترجمہ پڑھا۔ ارے واہ! یہ 'ٹاور اوف دا مِل' ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں اُس پون چکی کا ٹاور ہوا کرتا ہو جس پر سروانتے کے شہرۂ آفاق کردار، ڈون کیخوتے نے ہلّہ بول دیا تھا اور نتیجے میں ہوا چکّی کے بھاری پنکھوں (یعنی دیو کے بھیانک بازوؤں) کی چپیٹ میں

آ کر موصوف زخمی ہو گئے تھے؟

میں نے دوستوں کو اپنے گمان سے آگاہ کیا اور سارا دن انھیں اسی بدگمانی میں رکھا۔

رات پڑے بس میں بیٹھنے لگے تو میں نے ایمان داری سے قبول دیا کہ نہیں یہ وہ جگہ نہیں ہو سکتی۔ سرواتنے کی کہانی کا venue یہ نہیں تھا۔ پروڈیوسر کہنے لگے، ''ہم نے کون سا یقین کر لیا تھا، ہم تو تمھیں خوش کرنے کو ہاں میں سر ہلا رہے تھے۔ ہا ہا ہا!'' (مجھے بھی اخلاقاً ہنسنا پڑا) یہ بستی Costa Del Sol یعنی ''ساحلِ شمس'' پر ہے۔ گویا بحیرۂ روم کا سامنا کرتے، ہسپانیہ کے دھوپ بھرے جنوبی ساحل پر بسی ہے، جہاں تقریباً سارے سال (بیش تر) شمالی یورپ کے دھوپ سے محروم ٹورسٹ جمگھٹا کیے رہتے ہیں۔

مالقہ میں اور یہاں پہنچتے ہی چہرے گھما کر دیکھو تو ایک ہی سا منظر دکھائی دیتا ہے۔ بلند و بالا تعمیرات جن پر شوخ رنگوں میں پینٹ کیے گئے بل بورڈز اور جلتے بجھتے نیون سائنز جن پر ہوٹلوں کی آسائشوں اور نائٹ کلبوں کے sizzling مناظر کے اشتہاروں پہ اشتہار۔ مجال ہے ساحلِ شمس کی ذرا بھی جھلک دکھائی دے جائے۔

میں نے کہا، ''کسی سے پوچھ کے آتا ہوں، یہ 'ساحلِ شمس' آخر گیا کہاں؟''

پروڈیوسر، جو نیویارک اور لاس ویگاس میں بالترتیب رہائش رکھتے اور کاروبار کرتے ہیں، پہلے ہنسے، پھر انکار میں سر ہلا کے بولے کہ بڑے بھائی! کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی چیزیں اور رہائش اور sizzling night life اور گائیڈڈ اور unguided tours کا اہتمام کرنے والے لوگ قیامت ہوتے ہیں۔ یہ اچھے اچھے ساحلوں اور جلوے والی جگہوں سے متعلق ہوائی جہازوں، ریلوں اور بسوں کے تمام اڈوں کے گرداگرد کانکریٹ، شیشے اور اسٹیل اور گوشت و پوست کے حصار بنا دیتے ہیں اور اس طرح ساحلوں اور جلوے والی جگہوں کو اُس وقت تک 'حجاب' میں رکھتے ہیں جب تک کہ خود اُن چھچھوروں کی 'بوہنی' نہ ہو جائے۔

ڈائریکٹر نے جماہی لے کر کہا، ''بھائی جان، دنیا روز بہ روز مادّیت پرست اور خود کو ضرر پہنچانے والی ہوتی جا رہی ہے۔'' پھر وہ نیند سے لڑتے ہوئے سر جھٹک کے بولے، ''خیر، پہلے سگریٹ ماچس پکڑ لیں.... پھر دیکھتے ہیں کیا کچھ کرنا ہے۔''

ہم دو ہنسنے لگے تو وہ بھی ہنسے پھر ہم tobacconists کے گلیارے میں گھسے پھر برابر کی sex equipments(?) اور نیلی فلموں کے کیسٹس کی کشادہ دکان کو تجسس (اور برہمی) سے گھورتے ہوئے ساحلِ شمس کی طرف اُترنے والی سیڑھیوں پر ہو لیے۔

دس منٹ تک اِدھر اُدھر بھٹکتی سیڑھیوں کے پیچیدہ نظام سے الجھتے ہوئے ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ تو گویا یہ Costa Del Sol ہے؟ ہاں جناب؟... اور یہ اپنا بحیرۂ روم ہے؟ اے سبحان اللہ!

مجھے یاد آیا ایک اندلسی جغرافیہ داں الادریسی نے کوئی ہزار نو سو برس پہلے Mediterranean کا

نقشہ بنایا تھا۔ حکیم محمد سعید صاحب مرحوم نے کسی کتابچے میں اُسے بہت اہتمام سے چھپوایا تھا۔ کتنے ہی دن میں اسے اٹلس کے ساتھ رکھ کے دیکھتا رہا۔ ۸۰/۸۵ فی صد درست تھا۔

کچھ دیر اپنی محویت میں ہم تینوں خوش گوار دھوپ میں لہرتے Mediterranean کو دیکھتے رہے پھر بیک وقت تینوں کو خیال آیا کہ کہیں بیٹھ جائیں اور ذرا جم کے دیکھیں۔ اب جو مڑ کے اپنے عقب میں دیکھتے ہیں تو سمجھو تینوں پتھر کے ہوگئے۔

جہاں تک نظر کام کرتی تھی ریستورانوں، ہوٹلوں، کرسیوں پڑے چبوتروں، ہاتھ گاڑیوں اور کھوکھوں کا ایک جیش عظیم بحیرۂ روم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، آپس میں کندھے سے کندھا بھڑائے، جیسے یلغار کرنے پر تُلا کھڑا تھا۔ ہم تینوں منھ ہی منھ میں کچھ بک جھک کے، ہڑبڑا کے رہ گئے۔ ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ پروڈیوسر دوست کے بیان کیے ہوئے بھیانک تجارتی حصار کا آوٹر پیری میٹر تھا اور یہ چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا کہ بھیا جی! دریا پہاڑ گھاٹیاں اور سایہ دار شجر اور گم صم گپھائیں اور جھیلیں اور جھیل میں ہنستے نیل کمل اور اپنی چھبی دیکھتے چندر ماں کسی کے باپ کے نہیں ہیں۔ جس کا جی چاہے ٹیکس دے کے یا بنا ٹیکس دیے بھی یہاں اپنا 'کھوانچا' لگا سکتا ہے۔ جاؤ تمھاری ایسی کی تیسی!

سو پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ ایک کشادہ دل سا ریستوران چن لیا، کچھ دیر کو وہاں ٹیکی لی، تازہ سوفلے منگائے، چائے پی، خوش کام ہوئے اور چل نکلے۔ ساحل پر لمبی ٹہل لگانے کا وقت ہو گیا تھا۔

ساحل پہ وہی سب تھا جو یورپ کے ساحلوں پر ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں نہاتے، غسلِ آفتابی کرتے یا دھڑتے کے ساتھ رازونیاز میں مصروف جوڑوں سے بس اتنا ہی 'شغف' تھا کہ ہم پاکستانی سنسر کی حدیں پہچان کر بعض مجوزہ مناظر کو اپنے مجوزہ سیریل کے لیے approve یا dis-approve کرتے چلے جا رہے تھے۔ پروڈیوسر کا خیال تھا کہ یہ سارا footage ڈالنا خوب رہے گا۔

ڈائریکٹر دوست کا موقف تھا کہ یہ سب جو یہاں سے وہاں تک ہو رہا ہے اس سے اپنے average ناظر کو شمہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔ یا شمہ بھر ہوئی بھی تو مجھے بہ حیثیت ہدایت کار اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے... کیوں اسد بھائی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟ جس پاکستانی کردار کو ہم یہاں لائیں گے اُس کی پہلی ترجیح... sorry....

میں ہدایت کار دوست کی پوری بات نہ سن سکا، کیوں کہ بالکل سامنے ساحل کی ریت پر مجھے یسوعؑ دکھائی دیے تھے۔

اپنی ان گنت شبیہوں کی طرح وہ صلیب پر تھے اور ہمیشہ کی طرح اُن کا سجھاؤ abandon کا... یعنی مکمل سپردگی کا سجھاؤ تھا کہ الوہی!...

''میں تیری رضا میں راضی ہوں۔''

''او مائی گاڈ! یہ کیا ہے؟ بھئی... سب حاآن... اللہ!''

''کم.. ما آل ہے یار!''

کسی نے ساحل کی ریت میں انسانی قد کے چوگنے اسکیل پر جی زز کی bas-relief ...اُبھرواں شبیہہ... بنائی تھی۔ صلیب پر کیلوں سے ٹھکی ہوئی اُن کی ہتھیلیاں اور اُن کے پیر، ریاضت سے دُبلایا ہوا اُن کا زخمی torso... اور وہ چہرا! بہت بڑے دُکھ میں اور مکمل سپردگی کے ساتھ (اور جیسا کہ میں نے کہا) راضی بہ رضا۔

ہم نے ایک تحیّر میں شبیہہ کے پاس جا کر دیکھا کہ ریت کو تھوڑا کچھ 'ثبات' دینے کے لیے بنانے والے نے، اُسے کسی طرح کے 'نظر نہ آنے والے' گوند میں گوندھ لیا تھا کیوں کہ سمندر سے خشکی کی جانب آنے والی ہوا اُبھرواں شبیہہ کو چھیڑ ضرور رہی تھی۔ اُسے مٹا نہیں پاتی تھی۔ ہوا اپنے ساتھ ریت لا رہی تھی جس نے bas-relief کے آغاز پر (یعنی جی زز کے 'کانٹوں کے تاج پر') بادل سے بنا دیے تھے۔ مَیں نے دل میں کہا، ''اسد خانا! ہوا تو اسے ری ٹچ اور improve کر رہی ہے۔''

Mediterranean کی ہوا صورت گری جانتی ہے... صورت گروں کی محرم ہے۔ اطالیہ اور یونان اور کہاں اور کہاں کس کس سے اس کی شناسائیاں رہی ہیں۔

پھر ہمیں یسوعؑ کے قدموں میں، کچھ دور، ریت میں، ریت کا ایک پیالہ سا نظر آیا۔ پیالے میں ہسپانوی peseta اور یورو اور ین اور فرانک اور طرح طرح کے سکّے پڑے تھے۔ پروڈیوسر نے، جو یہ سب دیکھ کر (شاید) آبدیدہ ہو گئے تھے... جھک کر، احترام کے ساتھ ڈالر کے دو سکّے پیالے کی ریت میں کھونس دیے (دوسرے دن بتانے لگے کہ سکّے ''شگن'' کے تھے۔ شبیہہ ساز کے دن پھر جائیں گے)۔

خیر، بھوک لگ رہی تھی تو ہم نے طے کیا کہ بحیرۂ روم کا براہِ راست سامنا کرتے کسی ریستوراں، ہوٹل، نانبائی، مطبخ یا 'کھوانچے والے' کی طرف جانے کی بجائے سیڑھیاں چڑھ کے اصل حصار میں پہنچا جائے۔ وہاں ہمیں کچھ افریقی، ایشیائی صورتیں دکھائی دی تھیں۔ ہو سکتا ہے کچھ اچھی اور kosher غذا بھی مل جائے۔

کسی بھی سیڑھی کے پیچیدہ نظام سے اوپر پہنچتے ہوئے ایک مسکین فوٹو شاپ سے مناسب داموں میں فلم رول خریدتے اوپر آئے تو دیکھا یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے جس سے یہاں آتے سامنا ہوا تھا... شہر بے شک تو رے مالینوس تھا۔ مگر ہم بھٹک گئے تھے۔ ویسے ہم نے سن رکھا تھا کہ مسافرت میں بھٹکنا کبھی کبھی اچھا ہوتا ہے۔

اس وقت بھی اچھا ہی ہوا، سوگرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے ہدایت کار دوست بولے، ''سبحان اللہ!''

ہم نے دیکھا کہ شوخ و شنگ لڑکے لڑکیوں کا ہنستا کھلکھلاتا ہجوم ایک کیوریو شاپ سے انباروں عجائب و غرائب خرید کے نکل رہا ہے۔ بعض چیزیں، جنھیں وہ شرارتاً کندھوں یا سروں پر اُٹھائے ہوئے نمائش کرتے نکلے تھے، دیکھنے میں اچھی لگیں تو ہم تینوں اس دکان میں جا گھسے۔

وہاں ہر براعظم کی نمائندگی ہو رہی تھی۔ ایشیا کی بہت سی چیزیں تھیں۔ اپنے پاکستان کی شیشم کی inset والی چھوٹی بڑی صندوقچیاں بھی نظر آئیں، لمحے بھر کو nostalgic ہوئے، انھیں خوش ہو کے ہاتھ لگایا اور آگے بڑھ گئے۔ ہندوستان سے منگائی ہوئی راجستھانی گڑیوں کو دیکھتے، پسندیدگی میں سر ہلاتے ہم نے پوری دکان کا چکّر لگایا۔ پروڈیوسر نے کسی افریقی علاقے سے آئی بالشت بھر کی ایک بھدّی مورتی خریدی جو سیاہ لکڑی میں تراشی گئی تھی۔ مجھے تو یہ ایک موٹے، ننگ دھڑنگ witchdoctor (یا شامان) کا caricature لگتا تھا۔ دکان دار کہنے لگا کہ زولولینڈ کے لوگ ارواحِ خبیثہ کو دوڑا دینے کے مقصد سے اسے گھروں میں رکھتے ہیں۔ یہ جہاں بھی 'استھاپت' کی جائے گی اس سے مشرق، مغرب، جنوب اور شمال کے چار چار گھر بھی ارواحِ خبیثہ کے اثرات سے محفوظ رہیں گے۔" اے سبحان اللہ!"

پروڈیوسر دوست بتانے لگے کہ انھوں نے یہ مورتی میرے لیے خریدی ہے تاکہ میں 'گندی جیسی' روحوں سے محفوظ رہتے ہوئے سکون سے اُن کا سیریل لکھ سکوں۔ میں نے کہا ناں دوست، میں یہ نہیں لے سکتا۔ میں ڈراموں، سیریلوں کے اسکرپٹس ارواحِ خبیثہ کے درمیان بیٹھ کے لکھتا ہوں۔ یہ 'شامان' اگر میرے گھر میں رہا تو آپ کے سیریل کا کام کبھی مکمل نہیں ہونے کا۔

پروڈیوسر نے ہدایت کار کو آمادہ کرنے کو کہا کہ برادر! تم لے جاؤ۔ باقی عمر آرام سے رہوگے۔ وہ بولے، یہ تو اچھا ہے کہ میرا گھر بلیّات سے بچا رہے گا۔ لیکن میں اپنے بالکل شمال اور ایک دم مشرق میں بسے ہوئے دو منحوس ہمسایوں کو کسی بھی صورت میں... ہرگز ہرگز... ارواحِ خبیثہ سے بچانا نہیں چاہتا۔ کوئی ایسا جادو منتر ہوتا تو میں شکریے کے ساتھ قبول کر لیتا کہ جو مجھے تو منحوس اثرات سے محفوظ رکھے مگر میرے اٹی جی ایٹ شمال اور مشرق کے پڑوسیوں، سالوں کا ٹیپا کردے۔ وہ واقعی سنجیدہ تھے۔ اس لیے مجبوری تھی۔ کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم خاموشی سے آگے چل پڑے اور ایک تنگ و تاریک hovel میں، جو کیفے لگتا تھا، داخل ہو گئے۔ وہاں سناٹا تھا۔ ایک طرف ایک اکیلا آدمی بیٹھا کوئی مشروب sip کر رہا تھا۔

مشروب سپ کرنے والا ہمیں اور ہم اُسے 'آدھی بے تعلقی' سے دیکھتے رہے۔ ہمارا دیکھنا کچھ بیزاری کا بھی تھا، ہم جلدی میں تھے کس لیے کہ ہمیں کیفے کے مالک، ویٹر کک.. یعنی کسی کا بھی انتظار تھا۔ اُس آدمی کو بالکل جلدی نہیں تھی، کیوں کہ اُس کا پسندیدہ مشروب اور بہت سا وقت اُس کے پاس تھا۔

بالآخر اس نے اپنا مشروب ختم کیا، ہمیں ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا، اُٹھا... پھر عجب کام کیا... اس نے گلاس اُٹھایا اور پینٹری میں چلا گیا... لمحے بھر میں واپس آیا تو وہ ایپرن باندھے تھا اور menu کی پلاسٹک چڑھی رنگا رنگ شیٹس اُس کے ہاتھ میں تھیں، بازو پر پڑا سفید نیپکن چمک مار رہا تھا۔

وہ خبیث یہاں ملازم تھا — اور اب ہماری طرف آ رہا تھا۔

پروڈیوسر، جو ڈھیر ہوئے پڑے تھے ایک دم تن کے بیٹھ گئے۔ اُن کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

وہ کسی بھی وقت اشتعال میں آسکتے تھے۔ ہدایت کار نے اُن کے چہرے پر ایک بار نظر ڈالی اور بے سوچے سمجھے بل بل کے ہنسنا شروع کردیا۔ پھر ویٹر کی طرف دیکھ کر، کہ جو ہمارے بہت قریب پہنچ گیا تھا، وہ دِلّی آگرے کے محاورے میں کہنے لگے،''ابے جھوتنی کے! یہاں بھوک کے مارے آنتیں قُل ھواللہ پڑھ رہی ہیں اور تم گھنٹے بھر سے ہماری صورت کے سامنے بیٹھے شرابیں پی رہے ہو! That's great, really great!.... ہاہاہا۔ سالے!''

ویٹر نے پہلے بہت کوشش کر کے اُن کی بات سمجھنا چاہی، اور پریشان ہوا۔ پھر جیسے ہی انگریزی کی مانوس آوازیں سُنائی دیں، اس نے دانت نکال دیے اور جاپانیوں کی طرح بہت گھبرا جھکتے ہوئے اس نے بار بار''تھینک یو، تھینک یو، یس سر! ریالی گرریٹ'' کہا، اور ... ہدایت کار دوست کی طرح، زیادہ کچھ سوچے سمجھے بغیر، ہنسنا شروع کردیا۔

پروڈیوسر نے یہ سب دیکھا، اچانک غصہ تھوک دیا اور سب کی آواز میں آواز ملا کر،''ریالی ریالی گرریٹ'' کہتے ہنسی میں شامل ہوگئے۔

معلوم ہوا اس کی شفٹ بارہ بجے شروع ہوتی تھی۔ بارہ بج کر ٹھیک ایک منٹ ہوا تھا۔ وہ اسی کیفے سے خریدے مشروب سے لطف اُٹھاتے ہوئے اپنی شفٹ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا، ''سوری مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تم پاکستانی ہو تو میں بارہ بجے کے انتظار میں نہ بیٹھا رہتا۔ تمھیں اٹینڈ کرتا۔''

پروڈیوسر نے پوچھا کہ پاکستانیوں میں ایسی کیا بات ہوتی ہے؟ رازداری سے جھک کر کہنے لگا،''تم لوگوں نے پروا نہیں کی، بم بنالیا۔''

''مگر یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے بھائی!'' میں نے جیسے ذمہ داری کے بوجھ سے لرزتے ہوئے کہا،''تمھیں ہیروشیما، ناگاساکی یاد ہے؟''

''ہاں یاد ہے، جبھی کہہ رہا ہوں کہ اچھا کیا، بنالیا۔ کچھ لوگوں کی طرح تم فضول لوگ نہیں ہو۔ آدمی کی جان کی قیمت بھی سمجھتے ہو۔ اچھا کیا۔''

میں نے کہا کہ یہ اتنی آسان اور سرسری بات نہیں ہے، اس پر پھر گفتگو ہوگی۔ گھڑی دیکھ کر کہنے لگا،''رات آٹھ بجے تک یہیں ملوں گا۔ آجانا۔''

ہم آٹھ سے پہلے اُدھر سے گزرے تو جاننے والے مراکشی نے ہاتھ ہلا کے بلالیا۔ وہ اپنے کیفے کے یہودی مالک سے ہمیں ملوانا چاہتا تھا۔ ہم تینوں نے کوئی اہمیت نہیں دی تو اس نے اصرار سے کہا مل لو، میں نے تمھارے بم کی خبر پڑھ کے اخبار سب سے پہلے اسی کو دکھایا تھا۔ انھیں بھی تو پتا چلے۔ پروڈیوسر نے کہا،''سو؟..... وحاٹ؟..... تم ابھی تک بم سے چپٹے ہوئے ہو؟'' ہدایت کار نے بات آگے بڑھائی،''..... نہ صرف چپٹے ہوئے ہو بلکہ اُس ..... (وہ کسی طرح کا نسلی حوالہ دُہرانا نہیں چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اور ہی ناگفتہ بہ لفظ کہا) اُس فلانے کو بھی چمٹائے ہوئے ہو۔''

میں بولا: "بتاؤ اُسے! کیا بات کرتے ہو؟ Classified چیزوں کے اتنے قریب امیروں غیروں کو نہیں لاتے۔"

وہ کچھ نہیں سمجھا تو پروڈیوسر نے انگریزی میں "منی پاؤ" جیسی کوئی بات کہہ دی، پھر اُسے سمجھایا کہ وہ جہاں سے آرہے ہیں وہاں انھوں نے بہت یہودی دیکھے ہیں۔ Enough is enough ۔ اور پھر اس موضوع پر ہمارا مکالمہ ختم ہوگیا۔ اور باتیں شروع ہوگئیں۔ ویسے یہ مراقشی نوجوان ہمیں اچھا لگا تھا۔ پھر کبھی تورے مالینوس جانا ہوا تو اُسے تلاش کریں گے۔

مرزا جی! اب خطوں اور ای میلوں کا ایک کولاج (Collage) بناتا ہوں۔ ادیبوں کو لکھے گئے تین خط ہیں سال ۷۶ء، ۸۵ء اور ۹۱ء کے اور اگست ستمبر ۲۰۰۴ء کی تین ای میلز ہیں جو اپنی ایک مجوزہ کہانی "مہامائی کا ہریا" کی صورت گری کے مراحل بیان کرتی ہیں اور یہ دکھاتی ہیں کہ کس طرح اُس کہانی، نے آخر کار ایک مجوزہ ناول، کا چولا پہننا شروع کیا ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔

28-6-76.

اسد محمد خاں 936/8 عزیز آباد، کراچی 38- پاکستان۔

سیّد محمود خان ہاشمی (in fact Mahmood Hashmi) سلامت باش!

تم نے ساقی فاروقی کے ہاتھ رسالہ دمان بھیج دیا، نوازش۔ اور تم پھر غائب ہوگئے۔ کیا مصروف ہو؟ میں نے دِلّی سے آکر دو کہانیاں اور لکھی ہیں۔ ایک پرسوں حلقے میں پڑھ رہا ہوں۔ شاعری کا کام بدستور رُکا ہوا ہے، نثر لکھنے میں لطف آرہا ہے۔ شاعری کے نام کا قرض دوسری زبانوں سے ترجمہ کرکے اُتار رہا ہوں، فی الحال۔ خیال ہے کہ اس سال اپنا پہلا اور آخری شعری مجموعہ لے آؤں گا۔ پندرہ برس میں جو کچھ کیا ہے ایک جگہ لکھ کر خود دیکھوں گا تو اندازہ ہوگا کہ کیا ہے اور آگے کے امکانات کیا ہیں (تمھیں معلوم ہے میں بے اُجرت کی حمالی کا قائل نہیں ہوں)۔

اب یہ اس وجہ سے ہے کہ میں خود شعر نہیں کہہ رہا اور نثر کی طرف راغب ہوں یا حقیقت میں صورت حال بدل رہی ہے۔ ویسے تم نے خود اندازہ لگایا ہوگا کہ شعر کی سلطنت اُکھڑتی نظر آتی ہے۔ یہاں اور تمھارے ملک میں، دونوں جگہ، بڑی کس مپرسی کا سا عالم ہے۔ سیّد سلیم احمد کا بھی خیال یہی ہے کہ شعر کی سلطنت تاراج ہونے کو ہے اور اب جو یہ صدی آنے کو تیار بیٹھی ہے، نثر کی صدی ہے۔ واللہ اعلم! ویسے ہمارے یہاں تو ادب ہی کا ملک تاراج ہوتا نظر آتا ہے۔ ٹیلی وژن اور ڈائجسٹ نے ادب سے قاری چھین لیے۔ مطالعے کا اور غور کرنے کا وقت کسی کے پاس نہیں رہا۔ ادب اور علم کے ready reckoner اُس کاوش کی جگہ لے رہے ہیں جو رُبع صدی پہلے لکھنے پڑھنے والوں کی زندگی تھی۔ یا شاید ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔ یا پیمبری سال لگ گئے ہیں سب کو۔ by the way تم دِلّی والے ہو، کبھی بتاؤ ٹکسالی زبان میں پیمبری سال کے کیا implications ہیں؟

اب ظاہر ہے مڈل ایجڈ لوگ تازہ دم نسل کی طرح چلت پھرت تو نہیں لا سکتے۔ مگر برادرم! تازہ دم نسل کہاں ہے؟ وہ لوگ کون ہیں جو لکھنے پڑھنے کے کام کو جاری رکھیں گے؟ ہمارے یہاں کے تازہ دم لڑکے تو بنکوں میں افسری، خلیج کی ریاستوں میں ملازمت یا فلم ٹیلی وژن میں ایک چانس کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اور جو لکھنے پڑھنے کے کیڑے سے کاٹے جا چکے وہ لیکچرر شپ سے آگے سوچنے سے انکار کرتے ہیں۔ ماشا اللہ ہمارے یہاں لیکچرر فرسٹ کلاس گزیٹڈ پوسٹ ہے۔ سات سو روپے basic pay گروپ سترہ کا اسکیل اور الاؤنسز وغیرہ ملا کر بارہ ساڑھے بارہ سو روپے اور پھر increment اور re-grouping اور لیکچررز یونین اور ٹی وی میں پروگرام کو ہیئرنگ کا چانس اوف اوف۔ یار محمود ہاشمی! کیا ہم ہی۔ تیا تھے کہ انکریمنٹ اور ری گروپنگ اور فلموں میں چانس اور اوف اوف نہ کر پائے؟

تمھارے یہاں میں نے لکھنے پڑھنے والوں کی اکثریت کو سلیم، جاوید صاحبان کی طرف حسرت سے دیکھتے اور 'کاش کاش' کرتے سنا ہے اور یہاں کا لوئر مڈل کلاس کا لڑکا سیدھا بینک کی کرسی کی طرف لپکتا ہے۔ یا پھر اُسے لیکچرر شپ یا خلیج کی ریاستیں بُلا لیتی ہیں۔ ذہین لڑکیاں microbiology اور medicine جیسے شعبوں میں جان کھپانے اور تقریباً مڈل ایجڈ ہونے کے بعد شادی کر لیتی ہیں اور شادی کے بعد بڑی یک سوئی سے اچاروں، چٹنیوں اور سوئیٹر کے چار سیدھے دو الٹے پھندوں کا لٹریچر جمع کرتی ہیں اور قسم ہے جو اپنے مضمون یا انسانی تاریخ یا ادب یا زندگی سے ایک سطر پڑھنے کا موقع آنے دیں۔ پھر اُن کی ٹھوڑیاں دُہری اور تہری ہو جاتی ہیں اور وہ درود تاج پڑھتے پڑھتے اللہ کو پیاری ہو جاتی ہیں... چلیے چھٹی ہوئی۔

راقم کو ہرگز درود تاج پر کوئی اعتراض نہیں۔ پڑھیے، آپ میں سے خدا جسے توفیق دے، ضرور پڑھیے۔ مجھے کہنا شاید یہ تھا کہ یہ بھی پڑھو اور کولرج کی قبلائی خان بھی اور ابن رشد بھی، وما توفیقی الا باللہ۔

ان پندرہ برسوں میں کہ میں لکھنے پڑھنے کے ایریا میں مسخرہ پن دکھا رہا ہوں، میں نے بڑے بڑے نابغوں کو بگل بجا کر ادب اور شاعری کے میدان میں آتے دیکھا اور پھر وہ اچھے بچوں کی طرح کہیں اور کیریئر بنا کر چلے گئے۔ یا ۳۷، ۳۸ سال کی عمر میں جب ذرا کنفرمبل حالات ہوئے تو بعض نے قلم دوات دھو کر کاغذ پھیلائے اور اسلامی سوشل نظمیں اور اسلامی سوشل کہانیاں یا سیکولر (تقریباً سرخ) سوشل ادب اور قومی یک جہتی لکھنے کا جتن کیا (جو زندگی کے پورے پھیلاوے کا minimal ہو تو ہو، پوری زندگی ہرگز نہیں۔ یا میں اس طرح سوچتے ہوئے غلطی پر ہوں؟ میں نے USSR کی حیات مستعار میں رشین لٹریچر کی committed کہانیاں اور نظمیں خوب پڑھی ہیں۔ مختصر یہ کہ سخ!)۔

تو اب اپنے narration کو وہیں سے پکڑتا ہوں جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا... کہ قومی یک جہتی لکھنے کا جتن کیا اور مدیروں کو ذرا دھمکا کر اپنے سرکاری/ فوجی رعب میں لے کر یا اشتہاروں کی رشوت دے کر ممتاز جگہ چھپنے کا بندوبست کر لیا اور بعض نے تو یہ کمال بھی کیا کہ ایک یا دوسرا یا تیسرا ادبی انعام بھی ہتھیا لیا۔

خود پر مضمون لکھوا لیے اور امیرِ شہر کی مسند کے قریب جا بیٹھے اور ادب ودب پر فیصلے صادر کرنے لگے۔

فراق گورکھپوری کو کس خدا کا حکم ہے جو وہ ہم ایسے اور تم ایسے مڈل ایجڈ لوگوں کو ستا رہے ہیں۔ ارے بھئی سلیم احمد ہمیں پینگ کی آڑھت کیوں نہیں کرنے دیتے اور رگھوپتی سہائے فراق صاحب قبلہ آپ نے تو اپنی عمر گزار لی، اپنے بگل بجوا لیے اب اس سیّد زادے، ہاشمیوں کے چشم و چراغ محمود میاں غریب کو اور اس الف میم نغے کو retarded بچوں کی طرح منھ کھولے زانوئے ادب تہ کیے اپنے سامنے کیوں بیٹھنے دیا ہے؟ ارے اُٹھا دیجیے انھیں، چھٹی کیجیے ان کی۔ کھانے کمانے موج اُڑانے دیجیے سُسُروں کو۔

یہ نہیں ہے محمود! میری جان! کہ ہم یا تم یا ہمارے تمھارے بچے، خدانخواستہ روزے پر روزہ رکھ رہے ہیں۔ مالی تکلیف میں ہیں۔ ناں بھئی ناں، بہت مزے میں ہیں۔ پیٹ بھر کھاتے ہیں، من پسند پہنتے ہیں۔ سو سو دو دو سو کی کتابیں بھی خرید لاتے ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ ہیرلڈ روبنز کی طرح ذاتی طیارہ نہیں ہے۔ مگر سوال وہی پرانا دُہراؤں گا کہ وہ نئے لڑکے کہاں ہیں جنھیں ہمارے سانحۂ ارتحال کے بعد لکھنے پڑھنے کا یہ کام کرنا ہے؟ کیا ہماری سماجی صورتِ حال اور مالی حیثیت اتنی عبرت ناک سمجھی جاتی ہے کہ لوگ lepers کی طرح ہمارے گلوں میں گھنٹیاں ڈال کر دور دور بھاگ گئے ہیں؟ یا اس رُخصت ہوتی ہوئی بیس ویں صدی کے معیارات پلک جھپکتے میں بدل گئے؟ کل تک تو لکھنے والے محترم سمجھے جاتے تھے۔

مجھے معلوم ہے میں بڑی میڈیوکر باتیں کر رہا ہوں۔ مگر تکلیف میں ہوں اور اپنے ساتھ کے لوگوں کو تکلیف میں دیکھ رہا ہوں اس لیے یہ باتیں کر کے اپنا system صاف کر لینا چاہتا ہوں۔ گاہے گاہے ضروری ہوتی ہیں یہ باتیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے بہت اچھے دوست جو بہت اچھا لکھ رہے تھے... بقول کے بہت اچھے جا رہے تھے status کی rat race میں کام آ گئے۔ بڑے بڑے ہونہار جو اچھی اچھی نظمیں کہانیاں غزلیں لے کر آتے تھے اب یہ خبرِ وحشت اثر سناتے آ رہے ہیں کہ بھائی! 700-50-150 EB-2500 کے گریڈ میں آ گئے ہیں ہم۔ ڈپٹی کمشنر کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ گوشت سبزی اور دودھ اسٹوڈنٹس کے وہاں سے مفت آ جاتا ہے۔ فرسٹ کلاس گزیٹڈ پوسٹ ہے۔ ہم اب کیریکٹر سرٹیفکیٹ پر دستخط کر سکتے ہیں...

...اور پاسپورٹ بنوالیا آپ نے؟ ہم پوچھتے ہیں بچہ جمورا! کوئی غزل کہانی نظم لکھی؟ کچھ نیا پڑھا؟ ارشاد ہوتا ہے کہ پرنسپل یا ڈی سی مہربان بہت ہے، بڑی ذمہ داریاں ڈال دی ہیں میرے سر (یعنی اب یہ ادب لکھنے پڑھنے کا غیر ذمہ دارانہ کام نہیں کر سکے گا)۔ انّا للہ وانا الیہ راجعون۔ تو بھائی ہاشمی! اندھوں کے آگے رو میاں! اور بین بجا بھینس کے آگے۔ یا بدھیا بھینسا بیل شتر اکٹھا کر بھائی۔ کیوں جانِ عزیز گنواتا ہے؟

اب یہ بھی سن:

قلندروں کے قلندر، میرے یار نے ۳۲ ہزار کی گاڑی خریدی تھی، پانسو روپے کا ڈرائیور نوکر

رکھ لیا ہے۔ تیس ہزار کی زمین پر ڈیڑھ لاکھ کا مکان بنوا رہا ہے۔ موجودہ فریج چھوٹا پڑ رہا ہے، دوسرا خریدے گا۔ اُس کی بیوی نے دو ہفتے پہلے سری لنکا سے گوتم سدھارتھ کا ہاتھی دانت کا بت خریدا تھا۔ بت چار سال کے بچے کے قد اتنا ہے۔ ایک رسالے میں اُس بی بی نے لکھا ہے کہ وہ ادب کی آدمی ہیں زیورات وغیرہ بھی خرید سکتی تھیں مگر انھوں نے نہیں خریدے کیوں کہ مسئلہ کلچر کا ہے اور ہائی تھنکنگ کا ...... کہ بدھ حال شرناں گچھاں می.. میں عالم پناہ بدھ کی شرن میں آتا ہوں۔

مگر یہ sarcasm نہیں سیدھی سیدھی jealousy ہے جو مجھ سے یہ سطور لکھوا رہی ہے۔ (کیا اچھی بات لکھی تھی خاں صاحب نے۔ اب سوچتا ہوں کہ میری یہ sermonizing ایک جھلسے ہوئے have-not کی بڑبڑ تھی۔ اس تحریر کے سولہ سترہ برس بعد جیسے ہی موقع ملا الف میم نے exactly وہی سب کر دکھایا۔ یعنی گاڑی (اور شروع میں) ڈرائیور، زمین، مکان یہاں تک کہ فریج کی بدلی تک بالکل اُسی طرح وقوع پذیر ہوئی)۔

خیر تو جے لسی ہے جو مجھ سے یہ سطور لکھوا رہی ہے۔ کمینہ آدمی ہوں اس لیے کڑھ رہا ہوں۔ میرے اندر کوئی بدھیا بھینسا بیل شتر جمع کرنے والا خبیث بیٹھا ہوا ہے جو بڑا فریج اور ڈرائیور اور گوتم (؟) رکھنا چاہتا ہے اور ہیرلڈ روبنز کی طرح اپنا ذاتی طیارہ خود اُڑانا چاہتا ہے۔

تو ہم تم ایسا کرتے ہیں محمود خاں! کہ ایک بھوت ڈائجسٹ نکالتے ہیں اور اس میں بھوتوں سے مُچھوں کے ذاتی تجربے، برما کے پاگل ہاتھی اور کھٹمنڈو کے آدم خور شیر کے شکار کے قصے اور مارلن برانڈو اور راکیل ویلش کے fornication کے ساگا پر اور امریکا کے کسی بھی ملٹی ملینے نیئر کی eccentricity اور اولیا اللہ کے mini adventure پر مواد جمع کرتے ہیں۔

سلیم احمد اور فراق کو، عسکری اور علی عباس جلالپوری کو خلیل الرحمان اعظمی اور سید عبداللہ کو، علی عباس حسینی اور انور سجاد کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ آئیں اور برما کا پاگل ہاتھی شکار کریں، آدم خور کا جبڑا توڑیں، برانڈو صاحب کو fornicate کرتے دکھائیں۔ میرا خیال ہے اولیا اللہ کے منی ایڈونچر پر انور سجاد کو، راکیل ویلش کی سُلگتی راتوں کی تفاصیل پر حسینی اور جلالپوری کو اور ہاتھی، شیر وغیرہ پر فراق، عسکری یا سلیم احمد کو مامور کیا جائے۔ ملٹی ملینے نیئر سے اعظمی اور ڈاکٹر سید عبداللہ نمٹ لیں گے۔ کہو کیسی رہی؟

بھائی عمیق حنفی سے سلام کہنا۔ نیت یہ تھی کہ ان کے نام ایک عریضہ اسی لفافے میں روانہ کروں گا مگر اس الارم کلاک کی طرح کہ جس میں ضرورت سے زیادہ چابی بھر دی گئی ہو، چل پڑا اور اتنا کاغذ خراب کر دیا۔ میری طرف سے شکریہ ادا کر دینا، انھوں نے مجھ ایسے بے نوا کم آمیز پر اتنا کچھ لکھ دیا۔ محبت ہے ان کی۔ میں نے رگھوویر سہائے، سرویشور دیال اور شری کانت ورما کو خط لکھے ہیں۔ باقی بھائی سے شرمندہ ہوں، جب تک ایک اور چکر دلی کا نہیں لگا لیتا شرمندہ ہی رہوں گا۔ کس محبت سے یہ سب لوگ ملے تھے۔ محبتوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا ورنہ ایک ایک کو خط لکھتا اور شکریہ ادا کرتا۔

ہاں، ساقی ایک لفافہ لایا تھا جو ہماری بھاوج نے اہلیہ کے نام لکھا تھا۔ اے جدید جوتا پوش! اُس میں تیرا خط نہیں تھا۔ بھائی کیا کاہل ہوگیا ہے میاں؟ سلیم بھائی سے میں نے کہا تھا کہ عمیق حنفی نے بعثتِ نبویؐ پر ایک زبردست epic لکھی ہے۔ وہ منتظر ہیں۔ پوچھتے رہتے ہیں کہ محمود نے حنفی صاحب کی وہ نظم (صلصلۃ الجرس) بھجوائی یا نہیں؟ اطہر بھائی سے ملاقاتیں رہتی ہیں۔ اب وہ زیادہ ہی تنگ دائرے میں گردش کررہے ہیں۔ دفتر، اصغر بھائی کے گھر، کبھی سلیم احمد کے جمالی کے یا میرے گھر۔ اور بس۔

کیا ہم سب لوگ بوڑھے ہورہے ہیں؟ ہم لوگ خود کو اور زیادہ insecure کیوں محسوس کررہے ہیں؟ کیا اس لیے کہ ہمارے بچے بڑے ہورہے ہیں۔ اور وہ دنیا کو face کرنے کو تیار ہوتے جارہے ہیں۔ ایک دن جب وہ دنیا کا head on سامنا کررہے ہوں گے تو انھیں پتا چل جائے گا کہ پاپا ڈیڈی ابو فضول آدمی تھا۔ یہ کوئی ایسی مشکل دنیا تو نہیں ہے۔ پھر وہ ابو اس قدر سہما سہما جھنجھلایا ہوا اور high strung کیوں رہا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ادب ودب نے اُسے بے عمل اور خوف زدہ کردیا ہو۔

یہ سوچنے کا کام بڑا ذلیل کام ہے۔ میری رائے میں بھوت ڈائجسٹ والی اسکیم اچھی ہے۔ اس پر غور کرنا۔

میں پھر چل پڑا ہوں اس لیے خدا حافظ! بھابی کو سلام، بچوں کو پیار، دعائیں۔

☆ تمھارا اسد

۱۲ ستمبر ۱۹۸۵ء

اسد محمد خاں۔ سی ۱۴۔ شہر بانو پلازا۔

ایف بی ایریا، کراچی۔ ۳۸۔

برادرِ عزیز انور خاں!

ہر طرح سلامت اور خوش رہو۔ بے شک اللہ نے اپنے فضل وکرم اور صلاح الدین پرویز کے مالی تعاون سے یہ کائنات بنائی اور زمین کو فرش کی طرح بچھایا اور پھل پھول پودے اور گینگلو پیدا کیے۔ اور تمام تر معدنیات اور خونی اور بادی بواسیریں مہیا فرمائیں۔ اور اُس نے ڈاکٹر فلاں ابن فلاں کو ریٹائر کیا پھر انھیں پروفیسر ایمیریٹس بنایا اور پھر ریٹائر کیا اور پھر بنایا اور پھر گیا اور اپنے جودوکرم سے انھیں وہ جہل عطا کیا کہ ابوجہل کا پتہ پانی ہووے، پھر انھیں چار اضافی انگریمنٹ وے کر گرینڈ کیٹین پر مامور فرمایا تاکہ صاحبِ موصوف اُسے بھی اپنے فضلے سے پاٹ دیویں۔ اُس کی رحمت کے قربان جائیے کہ اُس نے جناب الف کو علم عروض (اور علم لدنی) سے نوازا، تاہم عوام الناس پر یہ منکشف نہ ہونے دیا کہ (اُس کی عظیم المرتبت اسکیم اوف تھنگز میں) ہر دو علوم کی غرض وغایت کیا ہے۔

اور اُس نے آٹھ بجے کی لوکل ٹرین ٹھیک وقت پر چلوائی اور اُستاد اختر انصاری اکبر آبادی کو

ایک ہوٹل کے کمرے میں ہلاک فرمایا (مگر یہ سب مقامی انتظامات ہیں۔ کائنات کے super-duper infra-structure میں ان کے نافذ ہونے یا نافذ نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے کا)۔

غیر کائناتی سطح پر ہی اس نے، اس کی رحمت کے قربان جایئے، کچھ اور ایسے انتظامات کیے کہ بعض باجبروت جرنیلوں کو دولت سخن عطا کی اور کمالِ نثرنگاری سے بھی نوازا، ہر چند کہ ان باتوں کا کوئی جواز نہ تھا۔ تاہم اُس نے انھیں صاحب دیوان اور صاحب تصنیف اس کینڈے کا بنایا کہ اُن کا طرۂ دستار طوطیِ ہند کے طرّے سے لگا کھاتا ہے۔ اور اُسی نے ایک محترم کے قلب گداختہ میں ان سب جرنیلوں کے لیے حدورجے کی محبت پیدا کی اور دوسرے مکرّم کو بھی ان کا والہ وشیدا بنایا اور کچھ ایسا اہتمام کیا کہ مذکورہ محترم اور دوسرے مکرّم ایک گھاٹ پانی پیتے پکڑے گئے۔ اور اُس نے کمربند کی پکّی بعض عورتوں کو مدیرانِ رسائل کے گرد پروانہ وار.... (مگر یہ اہتمام تراشی ہوگی جو کہا جاتا ہے کہ گناہِ کبیرہ ہے اور میں گناہگار اپنے نامۂ اعمال کو اور سیاہ کرنا افورڈ نہیں کرسکتا)۔

میاں تم جس دنیا میں رہتے ہو اس میں معتدل درجے کی منافقت اور نیم گرم حرم زدگی اور گاہے گاہے کی back biting اور کام چلاؤ قسم کی سازشوں سے گزارا ہو جاتا ہوگا۔ یہاں منافقت، حرم زدگی اور سازش سب اعلا درجے کی ہوتی ہے اور پبلک ریلیشننگ، زناکاری اور دلالی سطحِ اوّل پر کی جارہی ہے۔ ہمارے یہاں made to order اولیاء اللہ ہیں کہ ان کے تنخواہ دار، کمیشن خوار خلیفوں کا ایک حلقہ ہے جو حضرت صاحب کی کرامات اور خرقِ عادات کی تصنیف وتالیف اور نشرواشاعت میں ہر وقت منہمک رہتا ہے اور خوب خوب مال بناتا ہے۔ یہ اولیاء اللہ مذہب، ادب، سیاست، فنونِ لطیفہ وکثیفہ کی جملہ شاخوں میں موجود ہیں۔ آپ کے وہاں صلاح الدین پرویز اپنے اعلانِ ربوبیت کے چھٹے مہینے میں ایکسپوز ہو جاتا ہے اور باقی عمر سنگسار ہوتے ہوئے بسر کرتا ہے۔ یہاں ہر آدمی دوسرے کے سامنے ایکسپوزڈ ہے اور ننگا کھڑا ہے مگر دوسرے کی ستر پوشی کر رہا ہے اور اپنے دل کی طمانیت میں اس بات سے پوری طرح واقف ہے کہ دوسرا اس کی ستر پوشی کر رہا ہوگا، اس کے مفادات اور جینیٹلز کو دھوپ کی تمازت سے بچا رہا ہوگا۔

یہ تمام باتیں، اخی انور خاں! تمھارے کسی خط کے جواب میں نہیں ہیں۔ نہ ہی کسی نے مجھے خصوصیت سے ان دنوں ستایا ہے۔ یہ دراصل کتھارسس ہے۔ خود میں لوگوں کے ساتھ mild (ہاہ!) درجے کی منافقت کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ مگر مجھے یقین کامل ہے کہ ٹھیک اس وقت کہیں کوئی بیٹھا ہوا میری کمینگیاں یاد کر رہا ہوگا اور اسی طرح زمانے کو برا کہہ رہا ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کسی خط میں لکھ رہا ہو۔

مثلاً ابھی ابھی میں ایک خاتون کو ٹیلی فون پر یہ بتا کر آیا ہوں کہ دفتر کی طرف سے سندھ کے صاحب حال بزرگ شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ کی یاد میں کل جو جلسہ ہوا تھا اور جس میں وزرا

اور علما اور فضلا آئے تھے تو اس کا دعوت نامہ میں نے فلاں کے ہاتھ آپ تک پہنچوایا تھا اور زبانی تاکید کرائی تھی تس پر بھی آپ تشریف نہ لائیں۔ یہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ مجھ سے شکایت نہ کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے انھیں دعوت نامہ نہیں بھیجا تھا۔ میں بھول گیا تھا۔ سو میں نے جارحانہ شکوہ کرکے مسئلہ ختم کردیا۔ دیکھا آپ نے؟ الف۔ میم۔ ف 12-9-1985

☆

(فیروزہ جعفر سال ہا سال سے لندن میں قیام رکھتی ہیں، کہانیاں لکھتی ہیں۔ اُن کے نصف بہتر علامہ طالب جوہری کے ماموں ہیں۔ عزیزہ فیروزہ نے پروین شاکر سمیت کتنے ہی شاعروں ادیبوں کی میزبانی کی ہے۔ خوردوں میں اتنی شفیق خاتون میں نے کوئی اور نہیں دیکھی۔ عُمرش دراز۔ ضد کرکے اس مہمان کے بھی کپڑے دھودیے۔ بڑا شرمندہ کیا)۔

Karachi. 21-7-91.

بہن فیروزہ! دُعائیں۔ ۱۷ر جولائی کو ہیتھرو کے لاؤنج سے آپ کو فون کیا تھا۔ ۱۸ر کو کراچی پہنچ کر اب کہیں وقت پا سکا ہوں کہ آپ محبت کرنے والوں، میزبانوں، دوستوں، خوردوں کو چند سطریں لکھ سکوں۔ پندرہ ساڑھے پندرہ گھنٹے کی مسلسل فلائٹ کا پہلا تجربہ تھا۔ تین دن زبردست jet lag میں رہا۔

لندن جاتے وقت جمال احسانی کی ہم نشینی تھی تو پتا ہی نہ چل سکا کہ کب کوپن ہیگن اور پھر کب لندن آیا۔ پر لوٹتے وقت صرف حضرت مولانا قبلۂ عالم تحی لاغیرۃ (یہ لاغیرۃ پتا نہیں کیا ہے) جناب فلاں فلاں نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ و مشہدہٗ کا ساتھ ہوا۔ حضرت قبلۂ عالم پانچویں قطار میں دو نہایت چھوٹی چھوٹی افریقی طالبات کے ساتھ فروکش تھے، یہ عاصی پانچ قطار پرے دو میلے شیشن لڑکیوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ 'میری والی' لڑکیاں سخت خوف زدہ تھیں۔ جب بھی طیارہ جھٹکے سے ہوا کی آدھی سیڑھی اُترتا تھا، یہ بھیانک آواز میں سسکتی تھیں۔ میں نہایت بزرگانہ طیارہ شناس لہجے میں سمجھاتا تھا: It's nothing... just a little turbulance۔ لفظ ٹربیولینس کا آئیڈیا sell کرنے میں ناکامی ہوئی تو اُن سے A Tale of Tow Cities اور ڈکنس کے بارے میں بات کرنے لگا۔ ایک لڑکی مسلسل A Tale.. پڑھتی آرہی تھی۔ ادب نے دستگیری کی۔ اُن کا خوف کچھ دور ہوا تو میں نے بتایا کہ میرے ایک co-delegate پانچ قطار پیچھے برابر درود تاج پڑھ رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ طیارے میں کوئی بنیادی خرابی پیدا ہوگئی ہے اور اب بس چل چلاؤ ہے۔ حضرت قبلہ نور اللہ مرقدہٗ کو تازیانۂ عبرت کے طور پر استعمال کیا تو لڑکیوں کا کچھ حوصلہ بڑھا۔ انھوں نے ٹربیولینس کے ہنگام خوف کی آوازیں نکالنی بند کردیں۔

یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ میری اپنی بیٹیاں کمرے میں چھوٹے سے کاکروچ کی آمد پر جو فیل مچاتی ہیں وہ اس قبیل کی diversionary tactics سے روکی نہیں جاسکتی۔ مگر یہ دونوں قابو میں آچکی تھیں۔ (Malaysia اپنے نوجوانوں کی خوب تربیت کر رہا ہے)۔ میں نے سوچ لیا کہ گھر پہنچ کر اپنی دونوں کو

بتاؤں گا کہ دیکھو ایک تم ہو۔ ایک (یا دو) وہ لڑکیاں تھیں کہ میرے بھڑے میں آ گئیں اور مائیکل جیکسن سے لے کے مسز اکی نو کی بیٹی (جو شاید ٹی وی اداکار ہے) اور بی سی سی آئی تک، turbulance کے سوا، ہر موضوع پر بات کرنے لگیں۔ ہوا کا ہیجان ختم ہوا تو میں حضرت قبلہ نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ پی آئی اے کی انتظامیہ پر برہم تھے کہ انھیں نا جنسوں کے درمیان سیٹ دی گئی تھی۔ میں نے سوچا اچھا ہوا جو حضرت مشبد تخن قبلہ کو میرے برابر سیٹ نہ دی گئی ورنہ میں تمام رستے نثری نظم اور بلیک کومیڈی یا اینٹی اسٹوری پر بک بک کرتا ہوا لاتا اور حضرت کا پلاسٹک کے برتنوں میں پلاسٹک چڑھی PIA کی پلاسٹک جیلی تک کھانا حرام کر دیتا۔

روم پر طیارے کا رکنا، نہ رکنے کی طرح تھا کیوں کہ ہمیں اُترنے کی اجازت تو رہی ایک طرف، سیٹ چھوڑنے تک کی رُخصت نہ ملی۔ بیٹھے رہے اور لمبی لمبی تیل چپڑی دھول بھری چیکٹ زُلفوں والے پاکستانی seamen کو بورڈ کرتے دیکھتے رہے۔ یہ ملاح شاید وہ تھے جو یونانی بحری جہازوں پر ڈیوٹیاں پوری کرنے کی بعد رُخصت پر گھر جا رہے تھے۔ کچھ عجب سی دہشت گردوں والی صورتیں تھیں ان کی۔ یعنی ایسا لگ رہا تھا کہ لالوکھیت کے backwoods میں موساد اور خاد اور را اور آر ایس ایس کی مشترکہ کوششوں سے میرے شہر کے چند خوف ناک بچوں کو تربیت دے کر سروں میں تیل چپڑ دیا گیا ہے اور فلائٹ پی کے سات سو بیاسی پر اب روم سے سوار کرایا جا رہا ہے۔ خدا معلوم یہ مانوس شکلوں صورتوں والے ہمیں ہائی جیک کر کے 'کہاں کو' لے جائیں گے۔ مگر یہ تو بڑے docile سلیم الطبع 'دہشت گرد' نکلے۔ سب اپنے سیٹ بیلٹ باندھے، کانوں پر اسٹے تھسکوپ جیسی ہیئرنگ ایڈ لگائے حاجی فرید حاجی مقبول صابریوں کی دہشت کاری سنتے اور سر دُھنتے رہے۔ ایک بار بھی جو ہاتھ میں بم لے کے بے چارے اپنی سیٹ سے اُٹھے ہوں۔ میں ہی گنہ گار اپنے گیلس میں انگوٹھے پھنسائے کرسیوں کے درمیان ٹہلتا رہا۔

گیلس پر خیال فوراً محب گرامی جعفر صاحب کی طرف جا رہا ہے۔ بھائی جعفر ہی نے تو ہم بوڑھے طوطوں کو گیلس پہننا سکھایا ہے۔ بتایئے کہ ان کی مصروفیات اب کس نہج پر چل رہی ہیں؟ فرینک فرٹ تشریف لے گئے یا علامہ صاحب کو لندن ہی سے خدا حافظ کہہ دیا؟

بھائی جعفر نے، میاں سلمان نے اور ظاہر ہے آپ نے ہم مسافروں کو (جمال تو خیر آپ کا لاڈلا بھائی ہے) جس طرح توجہ اور مہمان نوازی سے سرشار کیا، اُس کی یاد تا عمر رہے گی۔ اگرچہ B.C.C.I. کے مسئلے میں آپ کا پورا گھر اُلجھا ہوا تھا۔ محرم کی آمد آمد ایک الگ مصروفیت تھی مگر جعفر گھرانے کی وضع داری اور غریب غربا نوازی (یہ غریب الدیار سے آگے کی ترکیب لفظی ہے) بہرصورت ایک روایت تھی جسے نباہنا تھا۔ خدا آپ سب کو خوش و خرم رکھے۔ میں نے لندن میں دوستوں کے ساتھ کمال وقت گزارا ہے اور اس کمال وقت میں آپ تینوں دوستوں یعنی بھائی جعفر کا، آپ کا اور سلمان دوست کا زبردست حصّہ ہے۔ دعا گو، اسد محمد خاں۔

ماما بندیل کھنڈی کے بارے میں۔ (انور سن رائے کو ای میل)11-8-2004

میرے گیتوں کا مجموعہ پڑھ کے ایک ذہین نوجوان، ناصر کمال نے جو شعر کہتے ہیں، ایک بڑے انگریزی روزنامے سے وابستہ ہیں اور وہیں کالم بھی لکھتے ہیں، میرے عزیز ہیں (ان کا ذکر اس mail کے آخر میں آیا ہے) تو انھوں نے mail بھیج کر اور محبت میں خوش گمان ہوکر کہا، کہ اسد بھائی! آپ شاید پہلے شاعر ہیں جس نے بُندیل کھنڈی میں نعتیں لکھی ہیں، (بندیل کھنڈی میری پیدائش کے علاقے وسط ہند کے دیہات کی بولی ہے)۔ مَیں نے کہا، ''نا عزیزم نا! یہ اعزاز مجھ 'کم خوش نصیب' کو کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ نا میاں! مجھ سے پہلے بھی کتنے بہت سے بندیل کھنڈیوں نے نعتیں لکھی ہوں گی۔

نعتوں کے بارے میں اب ایک بات کسی عقیدت مندی کے اثر میں نہیں، خوب سوچ سمجھ کر کہتا ہوں کہ رسول ﷺ کی ذاتِ گرامی، آباد دنیا میں ہر جگہ، کسی لاگ، لالچ کے بغیر سراہی جاتی ہے۔ (Inferno والے حرام الدہر Dante اور اُس مجہول النسب سلمان رُشدی☆ کے سوا) ساری دنیا میں کتنے ہی لوگ، جو طے شدہ نا مسلم ہیں یا بوجوہ practicing Muslim نہیں سمجھے جاتے، (جیسے کہ کوئی عاجز.. جس سے آپ بخوبی واقف ہیں) محمد عربی ﷺ کو خراجِ تحسین پیش کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح جیسے آپ اور میں حضرت یسوع مسیح اور جناب زرتشت اور مہاتما بدھ سے 'اللہ واسطے کا' پیار کرتے ہیں کیوں کہ یہ سارے ہی اعلیٰ ترین سطح کے انسان ہیں، آدمی کے محسنوں میں سے ہیں۔

تو نبی کریمؐ کو ہر زمانے میں، ہر جگہ، بے گنتی لوگوں نے اپنی اپنی زبانوں میں یاد کیا اور سراہا ہے، اُن کے لیے اپنی محبت ظاہر کی ہے۔

بھائی! یہ ممکن نہیں ہے کہ صاحبِ دل لوگوں سے بھرم پور بھرے بُندیل کھنڈ میں، وہاں کی بھولی زبان، سچے محاورے میں رسول ﷺ کے لیے پیار کے بول اب تک نہ لکھے گئے ہوں۔ نا عزیزم، نا! یہ ممکن نہیں! بہت پہلے ہی، بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے بول لکھ دیے ہوں گے۔

پھر میاں سن رائے! مَیں اپنی زاد بوم، بُندیل کھنڈ کے بارے میں شروع ہوگیا۔ میں نے لکھا:
بھیّا! میں ان لوگوں کا پرانا بالک ہوں.. بُندیل کھنڈیوں کا۔

بچپن، لڑکپن میں تو گاؤں دیہات میں ان کے ساتھ خوب وقت گزارا ہے۔ میرے مالوے دیس والے گیت کی چندن موسی اور تلسی اور چھیا... اور 'یوم کپور' کا دو جوروؤں والا ٹھاکر اور منّو اور اُس کا ماما (دونوں آخر الذکر ابھی تک کسی کہانی میں نہیں آئے، مگر آئیں گے ضرور) اور ایسے کتنے ہی جن کے نام میں نہیں جانتا، میری یادوں کے بندی خانے میں براجتے ہیں۔ تم سے بھی ملواؤں گا۔ یہ میرا

☆۔ گمان غالب ہے کہ یہ شخص رُشدی بھی اپنے ناول "Shame" کے protagonist کی طرح تین مجہول موروں کی مشترکہ اولاد ہے۔ "Shame" on him۔

وعدہ ہے۔ لواب سنو:

یہ ماما بہت دانش مند آدمی تھا۔ 'مہامائی' کے باغ کی باوڑی پہ اپنے پچھواڑے کو پانی دے رہا ہوتا اور ڈول کھینچتے بیلوں کو منکارتا تو اس کی آواز سن کر، میں کبھی تو ناشتا چھوڑ کر، بھاگا بھاگا باوڑی پہ جا پہنچتا اور دیکھتا کہ ماما بھرا ڈول کھینچتے ہوئے اپنے بیلوں کو جگت کے ڈھلوان پرے اُتارے لیے جاتا ہے، یا ڈول خالی کر کے جوڑی کو اُلٹے قدموں incline پہ چلاتا واپس باوڑی کے جگت کی طرف لارہا ہے۔

وہ 'اُتار' پہ جب اپنی جوڑی کو کھینچتا چلتا تو پانی بھرے ڈول کے 'بھار' سے تنے ہوئے رسّوں پر بالکل جھک جاتا اور اُن پر اپنا 'بوجھا' ڈالتے ہوئے، بیلوں کے ساتھ ساتھ اُترنے لگتا۔ پھر جب اُچھل کر اُن تنے ہوئے رسّوں پہ بیٹھتا تو (میں آج کی analogy میں کہوں گا کہ) کسی ماہر 'بیلے' رقاص کی طرح foot work کرتا اور رسّوں سے لٹک لٹک کر ڈھلوان پر پھسلتا جاتا۔ گھٹنوں تک کھلی اس کی پتھر سی پنڈلیاں، مٹی میں سنے اُس کے چرمودھے جوتے اور اس کی rythmic 'ہے ہیا! ہا'..... مجھے یہ سب ناچ جیسا لگتا تھا۔

ماما ہنس کے کبھی پوچھ بیٹھتا، 'ای تم کا او کیھ رئے او بھیا!؟'

میں کہتا، 'تمھارا ناچ' اور وہ ہنستے ہنستے رسّے پہ جھول جاتا۔

یہ ماما، مٹی اور پانی اور بادل اور بجلی اور زمین سے اُگتی ہوئی چیزوں کے اور گرد و پیش کے سب احوال جانتا تھا۔ میں بھی ان سب چیزوں کے بارے میں اس سے جب چاہتا سوال کرتا اور ماما ترنت جواب دیتا۔ اُس کے پاس ہر چیز کا جواب ہوتا تھا۔

''یہ بادل کہاں سے آتے ہیں؟''

وہ بیلوں کو ہنکانے والی سونٹی سے 'پاتر' ندی کے پچھّن کو اُلا گھتا ہوا اشارہ کرتا، ''وو وپلّے پار سے۔''

''مٹی میں کیا ہوتا ہے جو بیج سے پیڑ بن جاتا ہے؟''

وہ جیسے گا کے کہتا، ''یامائی ماں تو سبھی لیلا اپرم پار کو ہے بھیا!'' ... کیا پتا کسی بھجن کی لائن سناتا ہو۔ ('گو۔ بندیلی میں 'کی' ہوتا ہے)

''یہ جو باوڑی میں سیڑھیاں اُتر رہی ہیں یہ کہاں تک ہیں؟''

ماما فیصلہ کن جواب دیتا، ''جہان تو لے باوڑی، بہان تو لے سِڈھی'' (جہاں تک باوڑی ہے وہیں تک سیڑھی ہے)۔

برادرم انور سن رائے!

میں شکر گزار ہوں اپنے دادا اور باپ کا جنھوں نے میرے شعور کی عمر میں 'کمّی' کاریوں کو، میرے سامنے ہوتے، برابر کا پروٹوکول دیا (ہمارے تمھارے دیس میں تو بعض جگہ انھیں 'کمّی کمین' کہا جاتا ہے۔ جسے سن کر ہم تم اور ہمارے بہت سے دوست بہت اداس اور برہم ہوجاتے ہیں)۔ وہ 'اوچیر گاؤں'

کے ہمسایہ کسان اور کھیت مزدور تھے جو کبھی دادا کے مزارعے ہوتے تھے۔ دادا کے بعد بھی وہ برابر ہم سے ملنے آیا کرتے اور جنگل کی اور اپنے کھیتوں کی سوغاتیں لاتے تھے۔ ابّا کے آگے کرسیوں پر بیٹھ کے وہ میرے دادا کو اور اپنے بچھڑے ہوؤں کو یاد کرکے روتے اور تسلّی کے دو بول سن کے چلے جایا کرتے تھے.... کتنی نسلیں گزر گئیں۔

نہ اُن کے بچوں، نیک بختوں کو کوئی بتانے والا رہا کہ اس پھیلتے ہوئے شہر کے اس بے شکل و صورت مکان میں ایک 'بڑے میاں صاب' رہا کرتے تھے جو اپنی جاگیر (بعد میں) مُستاجری کے گاؤں 'اونچیر' کے دیہاتیوں کو برابر کا انسان جانتے تھے۔

نہ وہاں کے بچوں اور اُن کے بچوں سے کوئی کہنے والا رہا کہ یہ جو سامنے بیل گاڑی ہنکاتا، اپنے بیلوں کو مٹکارتا گاؤں والا جا رہا ہے، ہوسکتا ہے یہ 'اونچیر گاؤں' کا ہو اور اس کے بڑے بوڑھوں کو تمھارے بڑوں سے کبھی بہت 'اللہ واسطے کا' پیار ملا ہو۔

ابھی ایک سوال ذہن میں آیا ہے — بہت عامیانہ سا: کہ کیا معاملات اب 'اللہ واسطے' نہیں ہوتے؟ اور کیا ہر معاملے میں کوئی لاگ لالچ موجود ہے؟ ثواب کا لالچ؟ اور good will کی چنتا؟ اور ووٹ اور پیسے حاصل ہونے کی امید؟ اور کیا لوگ اچھی اچھی باتیں کرکے یا کچھ دے دلا کے لوگوں سے کام نکال کے چلتے نہیں بنتے؟ کیا وہ پٹاتے seduce نہیں کرتے؟ اور کیا جنھیں بندوں سے بے تعلق اور بے نیاز یا خود غرض اور حرام الدہر کہا جاتا ہے وہ ابھی کے، اسی نئے millenium کی پیداوار ہیں؟ کسی اور زمانے میں ایسے لوگ نہیں ہوتے تھے؟ (ہوتے ہوں گے۔ بلکہ اب یاد آیا کہ... ہوتے تھے۔ بے شمار تھے۔ لیکن I don't care to recall them۔ کیسا؟) اور کیا میری یادوں میں جو goody goody باتیں اور پیے پیے لوگ ہیں وہ ختم ہوگئے اور اب ویسے بالکل نہیں ہوتے؟

ہوں گے — بہت ہیں!

But I have no patience (& time) left to dig them out. Let younger persons do it.

مجھے تو اپنی یادوں کی بازیافت میں مزہ آرہا ہے۔

یارا... انور سین رائے!

دو روز سے اس کہانی "مہامائی کا ماما" پر کام کر رہا تھا۔ نیت تھی کہ پوری ہوجائے گی تو پڑھنے کو تمھیں بھیجوں گا۔

ابھی صبح ہی صبح جب تم نے اپنے گھر لندن سے فون کیا تو اسد بھائی نہال ہوگیا اور نامکمل (ہی سہی) اُس نے یہ کہانی تمھیں اور عذرا کو بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ او میاں جب یہ پوری ہوگی تب بھی پڑھ ہی لوگے۔

اسے اب تک خود میں نے، میرے اُس عزیز، میاں ناصر کمالؔ نے (جو بہ یک وقت میرا کزن بھی ہے اور بھتیجا بھی) پڑھا ہے۔ اب تم پڑھ رہے ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ دو چار دن میں یہ پوری ہو جائے گی۔

بات جو پھیل گئی ہے... وہ جو میرا بائی قدسؔ سرّۂ العزیز نے کہا ہے کہ "اب تو بات پھیل گئی..." وغیرہ وغیرہ۔

دُعائیں، اسد بھائی۔ 11-8-2004

(اپنے بھتیجے/ بھائی ناصرؔ کمال کو ایک ای میل)

ناصر میاں!

اُس ای میل میں جہاں یوسفیؔ صاحب کا اور ضمیر نیازیؔ صاحب مرحوم کا اور میری نظم "مناجات" کا ذکر چل رہا تھا میں نے جم کے لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ آسمانی سلطانی ہوئی، بجلی چلی گئی اور mail ایریز ہو گئی۔ میں نے بے مزہ ہو کے، مختصر وضاحت ہی لکھ کر قصہ ختم کر دیا۔ لیکن آدمی ضدی ہوں (اپنی لکھت کے حوالے سے) جب تک اُس طرح بیان نہ کر لوں جیسے بیان کرنا چاہتا تھا، مجھے چین نہیں آتا۔ تو میاں اب سنو:

مگر پہلے کچھ اُن محاوروں کے بارے میں جو نظم "مناجات" میں آئے ہیں:

بکرا بُلانا.. Ululating.. صحیح کہا آپ نے۔

"بڑھک مارنا" یہ لاف زنی کے معنوں میں ہے۔ ہماری پنجابی فلموں میں جب تک ۳۰ یا ۴۰ بڑھکیں نہ ہوں ایک عام viewer کو مزہ نہیں آتا۔ ہیرو یا ولین اردو کے ۸ کی طرح ٹانگیں کھول کے سینہ پھلا کے دونوں بازوؤں کو غوطہ مارتے پرندے کے پروں کی طرح stiff کر کے بکنا شروع کرتا ہے اور دیر تک بکے جاتا ہے کہ میں "اینج کر دیاں گا، اونج کر دیاں گا" کرتا کراتا کچھ نہیں۔ یہ badhak! ہوتی ہے۔

ایک بھوپالی expression ہے: لُو لُو بولنا (Lu Lu Bolna) تو ایک دُور دراز امکان ہے۔ wild thinking۔ یہ لُو لُو کہیں Ululating کا بگاڑ تو نہیں ہے؟ on second thought. یا یہ اپنی دِلّی کے محاورے میں۔ "لُو لُو ہے بے لُو لُو!" تو نہیں ہے؟

"لال قلعے کی ایک جھلک" خواجہ حسن نظامی (علیہ الرحمۃ) کا ایک مضمون یا کتابچہ ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ جب قلعہ معلّٰی کے آگے سے ایک گورا صاحب گزر رہا تھا تو رہائش گاہِ سلطانی سے نظر ڈالتے ایک شہزادے نے نفرت سے پکار کے کہا تھا کہ "لُو لُو ہے بے لُو لُو" گورا صاحب سمجھ گیا۔ اُس نے رولا ڈال دیا۔ پکڑو پکڑو ہونے لگی تو ایک وابستۂ دولت نے سمجھایا کہ حضور! لُو لُو فارسی میں موتی کو کہتے ہیں۔ شہزادہ تو صاحب کے حُسنِ جہاں سوز (my words) کی تعریف کرتا ہے۔ ہا ہا ہا Wild thinking continues مثلاً ان دنوں اسلام آباد سے گزرتے ہوئے اپنے چچا میاں عنایت محمد خاں

صاحب، کونڈولیزا چاول کو دیکھ کر مجھ سے کہیں، "دیکھنا خاں چاول بائی جارہی ہے۔" ہوسکتا ہے وہ اُسے بریانی کہہ کر وضاحت کریں کہ اپنی طرف اس نام کی ایک بیڈنی رہتی تھی۔ ha ha! ان کی جھلسن کی وجہ، ظاہر ہے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

خیر، dot dot برسیاہ رویانِ جہاں! یہ 'سیاہ رویاں' ہرگز ہرگز colour of the skin نہیں ہے۔ آپ کو تو پتا ہے black is beautiful۔

اب یوسفی صاحب کے بارے میں:

عصمت کی نوکری کے سلسلے میں جو کچھ کیا وہ یوسفی صاحب نے اُس سے دس منٹ بات کرکے اور مجھ سے پوچھ کے کہ 'کیا یہ تمھارا حقیقی بھائی ہے؟' کر دیا تھا۔ بعد میں جب بھی میں نے یہ ذکر چھیڑا، انھوں نے جملہ پورا نہیں کرنے دیا.... "بھئی خاں صاحب! بینک نے مجھے پابند کیا ہوا تھا کہ میں نئے افسر بھرتی کروں، صاحب زادے اچھے موقعے سے آگئے، میں نے رکھ لیا۔"

... سبحان اللہ! کیا وضع داریاں ہیں!

میاں عصمت نے بھی انھیں مایوس نہیں کیا۔ ۱۶/۱۵ برسوں میں وہ senior manager بن چکا تھا۔ اور ایک عجیب بات ہوئی تھی ... اُس کے انتقال کے پچاسویں دن بینکرز اکادمی کا ایک خط گھومتا گھامتا میرے پتے پر آیا تھا کہ "مسٹر آئی ایم کے نے AVP کے لیے کوالیفائی کرنے والا امتحان پاس کرلیا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ انھیں اگلے چند برسوں میں (other things remaining the same) اے وی پی پروموٹ کیا جاسکے گا۔"

تو اب یوں ہے کہ صاحبو! اللہ ہی اللہ ہے۔ Man proposes, the Oldman disposes. اس لیے برادرم! میں، م الف، یوسفی صاحب سے اُن کے لٹریری کام کی وجہ سے بھی محبت کرتا رہوں گا اور اُن کی بےنفسی اور احسان کو بھی tribute پیش کرتا رہوں گا۔

پچھلے دنوں کسی خبیث حاسد نے ایک گم نام مراسلہ لوگوں کو ڈاک سے بھیجا تھا جس میں میرے ان دو دوستوں، افتخار عارف اور یوسفی پر درجنوں بہتان لگائے گئے تھے اور حرم زدگی کی باتیں کی گئی تھیں۔ میں، اور سبھی احباب، بہت بے کیف ہوئے تھے۔ میں کیا کرتا... نوجوان دوستوں کے سمجھانے پر ہوا میں گالیاں بک کر چپ ہو رہا (پنجابی میں گالیاں بکنا نہیں نکالنا کہا جاتا ہے۔ شاید کیتھارسس کے حوالے سے کہتے ہوں گے)۔

کل آپ کا بے پناہ اہم میسیج ملا۔ وہ جو آپ نے "مہامائی" کے باغ کی حالیہ وزٹ کے بعد بھیجا ہے۔ جیتے رہیے، خوش رہیے۔

سوچتا ہوں آپ کے اس narration کو بالکل اسی طرح، ترجمہ کرکے، اس بُنت کا حصہ بنادوں۔ دیکھیے اللہ مالک ہے۔ مگر کیا بربادی، کیسا desolation ہے!

اس کے بارے میں پھر کبھی لکھوں گا۔ اس وقت بہت تھک گیا ہوں۔
میرے حساب سے دو صفحے پورے ہو گئے۔ خدا حافظ! بامانِ خدا! فی امان اللہ! وغیرہ۔
اسد بھائی۔ ۹ ستمبر، دو ہزار چار۔

☆

(اپنے بھتیجے / بھائی ناصر کمال کو ایک اور ای میل) .Karachi.9-9-2004

ناصر میاں!

زندہ و سلامت باش۔ بھائی، بہت کمال کا کالم لکھا ہے آپ نے۔ میری طرف سے پوری اجازت اور بھرپور حمایت شامل حال سمجھی جائے۔ میں نے صبح کی mail میں لکھا تھا کہ آپ کی تحریر نے ...وہ کیا کہتے ہیں؟... نہ صرف move کیا ہے، بلکہ ہلا کے رکھ دیا ہے۔ ماشااللہ۔

گنتی کے لفظوں میں زندہ لکھت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں کالمسٹ کی مشکلوں کو سمجھتا ہوں۔ تاہم، کچھ کر کے، اپنے ریڈرز کو بتا دیجیے کہ جس نالے کے culvert کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سارا سال بہنے والی پاترا ندی تھی جس پر چھوٹے خاں (Ref. History of Bhopal State) نے بند باندھ کے ایک آبشار بنایا تھا اور پاترا ندی کو 'مہا مائی' کے اُس رُخ سے نکالا تھا جو ریلوے اسٹیشن کو face کرتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ باغ سے ماڈل ہائی اسکول کے لیے نکلنے کو ہمیں ٹھنڈی سڑک Starting from "Narbada Ice Factory" پر آنے کے لیے 'چیل' کے ایک تناور درخت کے 'ڈالے' کو (جو پاترا ندی پر کسی پُل کی طرح جھکا ہوا تھا) straddle کرتے ہوئے ایک ایک چپا (چپّا چپّا چڑھ چلے) سرکنا پڑتا تھا۔ پاترا کے اس پتّن ('pattan' in Punjabi means Saahil) اُس پرلے کنارے پر ڈالے سے چھلانگ لگا کر آئس کریم فیکٹری کی طرف دیوانہ وار دوڑنے کی مسرت کو میں ابھی بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اُسے ناول کے ایک باب کے لیے بچا رکھا ہے۔

عزیزم! اس کرتب کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ آٹھ سے گیارہ بارہ برس کے eloquent بچوں سے... جو ماشااللہ گھر ہی میں ہیں... پوچھ لیجیے۔

میں نے ۱۹۸۰ء کی ایک کہانی ''گھر'' میں (جسے قاسمی صاحب نے بہت پیار سے چھاپا تھا) پاترا ندی کو بیان کیا ہے:

''... میں ایک دفعہ کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا۔ میں باہر کس لیے نکلوں؟ میرے گھر میں، گھر کے گرداگرد بڑی دل موہ لینے والی چیزیں ہیں۔ گھر کے پچھواڑے کی باڑ سے ملے ہوئے بانسوں اور سرکنڈوں کے چھدرے چھدرے جھنڈ ہیں جن سے بچتی بچاتی پاترا ندی بہتی ہے۔ نقشہ نویسوں نے اسے کوئی نمبر دے رکھا ہے۔ وہ اُسے نالہ بارانی شمالاً جنوباً نمبری فلاں فلاں کہتے ہیں اور اپنی بے خبری میں اسے بہت مسکین جانتے ہیں۔ مگر چار پانچ دن لگاتار ایک ہی رفتار سے ننھی ننھی سوئیوں جیسی پھوار بھی پڑتی

رہے تو یہ پاترا ندی اپنی بانہیں اور جانگھیں پھیلا دیتی ہے اور آس پاس کے سب کھیتوں کو اپنی خواہش کا نشانہ بناتی ہے اور انھیں اپنی کاہل، تیل چپڑی، آہستہ رَو شہوت میں لتھیڑ دیتی ہے اور مجھے بڑی شرم آتی ہے جب میں اُس کی بغلوں سے اور پیڑو سے جھانکتے ہوئے سرکنڈوں اور بانسوں کے گیلے جھنڈ دیکھتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنے کسی محرم کو، جس سے کوئی جنسی ربط ممکن نہ ہو، کھلے ستر دیکھ لیا ہو۔ تب میں ... جو اس کا وستر، اس کا ستر پوش ہوں... میں اپنی پلکیں گرا کر اس کی ستر پوشی کرنا چاہتا ہوں، اسے محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔ پر ساون بھادوں میں جہاں تک نظر ڈالو یہ بھاری اَستھوں والی اَبلا، کالی مٹی پر اپنی کایا کا بوجھ ڈالے، آلس کے ساتھ کروٹ بدلتی دکھائی دیتی ہے اور بڑی غیر محفوظ لگتی ہے۔ اور میں سوچتا ہوں اسے کون سمیٹ سکتا ہے۔ کہاں تک سمیٹ سکتا ہے۔

ننھی سوئیوں جیسی پھوہار، کہر کی دبیز چادر کی طرح دوسرے کنارے کے جانے پہچانے نشانوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور ندی کا پاٹ کئی میل کا دکھائی پڑتا ہے۔ گہری دھند میں ندی کے پار سے آوازیں کچھ اس طرح آتی ہیں جیسے یگوں کے پار سے آ رہی ہوں۔ تب ایسے میں، میں ندی میں اُتر جاتا ہوں اور کندھوں تک پانی میں ڈوبا ہوا ان آوازوں میں لپٹی ہوئی ایک خاص آواز کو ڈھونڈتا ہوں جو پکار کر کہتی ہے کہ ہے پاترا! ہے پتریا! ہے ویشیا! ہے کلنکنی! پھر یہی آواز ہچکیاں لے لے کر روتی بھی ہے۔ پتا نہیں کون بوڑھا بدمعاش ہے جو ننھی ننھی سوئیوں کی ٹھنڈی دھند کے پار کھڑا ہوا ندی کو برے برے نام دے رہا ہے۔ میں کسی روز اسے گدّی سے پکڑ کے اس کا منھ کیچڑ میں دے دوں گا۔

ایک روز میں نے چیخ کر کہا بھی تھا کہ او بڈھے سُورا بکواس بند کر! اور مارے غصّے کے پانی میں کھڑے کھڑے میرا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ یہ ایسی پریشانی کی بات تھی کہ میں ندی سے نکل کر سیدھا اپنے گھر بھاگ آیا اور بہت دنوں تک پانی کے پاس نہیں گیا۔ بس گھر میں بیٹھا رہا اور برگد کی چار ماترائیں سنتا رہا کہ تا!!!! نا نا نا ہو وو...“

برادرم!

یہ برگد کا آوازہ، وغیرہ، صوفیہ کے آوازے ”تا نا نا ہو“ کے مماثل ہے اور کہانی کی ابتدا سے جاری موسیقی کی terminology میں ایک refrain کی طرح ہے جو اس کہانی کو اپنے logical windup کی طرف لے جاتا ہے۔ پاترا ندی اس کہانی میں کم و بیش اتنی ہی ہے۔

اب میں چلتا ہوں۔ سہ پہر کے ساڑھے چار بجے ہیں۔ سوتا ہوں۔

دعائیں۔ اسد بھائی۔

پس نوشت:

ناصر میاں!

میں اس ناول / ناولٹ کو یہ بر حال 'مہا مائی کے باغ' سے آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے

پاترا ندی کے معدوم ہونے کو جس دکھ سے بیان کیا ہے وہ بہت متاثر کن ہے۔ آپ اپنے شہر سے... جی نہیں، بلکہ زمین سے، زمین کی ہریاول سے، بہتے پانی سے اور نمو سے پیار کرتے ہیں۔ بے شک پیار کرتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں.. مگر کمال کی بات ہے یہ۔

میرا یہ ہے کہ میں اپنی زندہ ندی کو سن پینتالیس میں پہنچ کر آسانی سے 'ری کری ایٹ' کرلوں گا۔ اس لیے کہ میرے پاس تو وہی پرانے نقش ہیں دھندلے ... اور خوب صورت۔ پھر وہ مرحلہ درپیش ہوگا کہ جب اُس 'ناموجود' کو.. ناموجود صرف میرے لیے.. اُس ناموجود پاترا ندی کو گاڑھے کیچڑ میں بدلتے یا زخم سے رِستے ست رو puss کی لکیر میں بدلتے دکھانا ہوگا تو پھر کوئی اور جتن کروں گا۔

بھائی! میں کچھ تو جان گیا ہوں کہ چیزوں پر موت کا اور decay کا ورود کس طرح ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور بھی سمجھ میں آجائے گا۔ لو، اب دیکھو پاترا ندی اور مہامائی پر تم سے جو سوال جواب ہو رہے تھے، ان کی تخلیقی شکل اس طرح بنی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کہانی سے متبدل ہو کر یہ ناول کا باب کیسے ہوگیا۔ پڑھو:

اسد بھائی

خانوں

(اسد محمد خاں کے آنے والے ناول کا ایک باب)

کسی برکتوں والی اُمید کے ساتھ خانوں میاں نے ہلکی آوازوں والے ایک شہر میں، سارے سال بہتی ایک ندی سے کوئی میل بھر دور ایک ایسے مکان میں آنکھ کھولی تھی جسے ڈیڑھ دو سو برس پہلے، بے سوچے سمجھے، بہت سی جگہ میں، بہت سی اینٹوں پتھروں سے بنا لیا گیا ہوگا۔

مکان ایسا بُرا نہیں تھا۔

شہر کے باہر ندی کے دوسری طرف ایک باغ تھا۔ باغ میں ایک مسجد، ایک باؤڑی، بہت سی پرانی قبریں اور دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنی چھ آٹھ کمروں کی ایک عمارت تھی جو 'میاں کی باکھل' کہلاتی تھی۔ باکھل کی چھت کویلو کی تھی۔ ساون بھادوں میں ٹوٹ کے برستی برساتیں چھت کو کائی جما کے ہرا کردیتی تھیں اور گرمیوں کی دھوپ اس ہرے کو سیاہ بنا دیتی۔ سردیوں میں یہ چھت مٹ میلی دکھائی دیتی اور دیکھنے والوں میں سے بہت سوں کو اُداسی میں ڈال دیتی تھی۔

خانوں کو یہ باغ اچھا لگتا تھا۔

باکھل والے میاں لوگ، خانوں کے بہت قریبی عزیز ہوں گے، اسی لیے خانوں کے گھر والے سال میں ایک دو بار یہاں آ آ کے رہتے اور خود کو زمین سے اُگتی اُن چیزوں کے قریب پاکر خوش ہوتے تھے کہ جن کے رنگ سبز اور نیلے اور سیاہ اور سرخ اور زرد اور نارنجی اور کئی طرح کے ہوا کرتے تھے۔

اُگنے والی ان چیزوں کے رنگ بعد کو خاتوں میاں کے لیے آہستہ آہستہ مٹ میلے ہوتے گئے اور دھندلا گئے... مگر ایسا برسوں بعد ہوا تھا۔ اور وہ ایک الگ کہانی ہے۔

خاتوں میاں دس برس کا تھا تو اُس نے جھاڑیوں کے بیچ چھپا کر بنایا ہوا ایک دیوی استھان دیکھا تھا۔ سو پچاس برس پہلے کسی نے پیپل کے چھتنار کے تنے سے، ایک بے شکل سا دو ہاتھ اونچا پتھر ٹکا کر اُس پر گیرو مل دیا تھا، آس پاس پھول بکھرا دیے تھے۔ جھاڑیوں نے دیوی استھان کے گرداگرد آگ کر اُسے اُن لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا جنھیں اس دیوی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ہاں پوجا پاٹھ والے آتے، جھاڑیاں ہٹا کے اپنی آرادھنا کرتے، کچھ دیر ٹھیرتے اور چلے جاتے۔

پچھواڑے میں کام کرنے والے کاچھی ہرؔی لال نے خاتوں کو بتایا تھا کہ یہ دیوی مہا مائی کا استھان ہے۔

خاتوں نے کہا تھا، اچھا!

پھر اُس نے خود سے کہا تھا، ہاں جبھی تو اس باغ کو مہا مائی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

ہرؔی لال کاچھی نے، جسے سب ہریا کہہ کے بلاتے تھے، خاتوں کو مہا مائی کی اور بھی باتیں بتائی ہوں گی مگر اُسے اب کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

ہریا سولہ اٹھارہ برس کا ہوگا پر اس وقت بھی بہت سی باتیں اُسے دوسروں سے زیادہ معلوم تھیں۔ بہت دانش منداور گھنا تھا یہ ہریا۔

وہ مہا مائی کے باغ کی باوڑی سے پچھواڑے کو پانی دے رہا ہوتا اور ڈول کھینچتے بیلوں کو ہنکارتا تو اس کی آواز سن کر خاتوں میاں، ناشتا چھوڑ، بھاگا بھاگا باوڑی پہ جا پہنچتا اور دیکھتا کہ ہریا پانی سے چھلکتا، پوروں پور بھرا ڈول کھینچتے ہوئے زور لگاتے بیلوں کو جگت کے ڈھلوان پرسے ایسے اُتار رہا ہے جیسے سرکس کا تماشا دکھاتا ہو۔ یا پھر وہ ڈول خالی کر کے سیدھے سبھاؤ اپنی جوڑی کو اُلٹے قدموں ڈھلوان پہ چڑھاتا، بیلوں سے باتیں کرتا، واپس باوڑی کے جگت کی طرف لا رہا ہوتا۔ یہ محنتی کاری، ہریا — ہرؔی لال کاچھی۔

وہ جب اُتار پہ چلتا تو پانی بھرے ڈول کے بھار سے تنے ہوئے رسّوں پہ جھک جاتا اور اُن پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے، بیلوں کے ساتھ ہولے ہولے "اُترنے" لگتا... اور جب اُچھل کر تنے ہوئے رسّوں پر بیٹھتا تو ماہر رقص کار کی طرح قدم لیتا یا رسّوں سے لٹک لٹک کے ڈھلوان پر پھسلتا۔ گھٹنوں تک کھلی اس کی پتھر جیسی پنڈلیاں، کیچڑ مٹی میں سنے اُس کے چرودھے جوتے اور تال کے ساتھ چلتی اس کی "ہہ ہہا! ہاہ!" خاتوں میاں کو یہ سب ناچ جیسا لگتا تھا۔

ہریا ہنس کے کبھی پوچھ بیٹھتا، "ای تم کا او دیکھ رئے او بھیا؟ ہیری بیری آئے کے کا او دیکھے او؟"

خاتوں کہتا، "تمھار ناچ دیکھتا ہوں"... اور ہریا ہنستے ہنستے رسّے پہ جھول جاتا۔

یہ ہریا، مٹّی اور پانی اور بادل اور بجلی اور زمین سے اُگتی ہوئی چیزوں کے اوران کے آس پاس کے سب احوال جانتا تھا۔ خانوں ان سب چیزوں کے بارے میں جب چاہتا اس سے سوال کرتا اور ہریا سے تُرنت جواب پاتا۔ لگتا تھا اس سیانے کے پاس ہر بات کا جواب ہے:

''یہ بادل کہاں سے آتے ہیں؟''

وہ ہاں میں سر ہلاتا یعنی ٹھیرو، بتاتا ہوں۔ پھر بیلوں کو ہنکانے والی سونٹی سے وہ 'پاترا' ندی کے پتّن کو اُلانگھتا ہوا اشارہ کرتا کہ ''وودوپلے پار سے۔''

''مٹّی میں کیا ہوتا ہے جو بیج سے پیڑ بن جاتا ہے؟''

ہریا جیسے گا کے کہتا، ''جامائی ماں تو سبری لیلا، سبرا کھیل تماسا ایکّی ان عد، ایکّی اَیرم پار کو ہے۔'' کیا خبر کبھی کے سنے ہوئے کسی بھجن کے بول پڑھ دیا کرتا تھا وہ... یا کچھ بھی۔

خانوں اُس سے پوچھتا، ''ہری لال! باوڑی میں جو سیڑھیاں ہیں یہ کہاں تک گئی ہیں؟''

ہریا بدّھی مانوں کی طرح سر ہلا کے کہتا، ''ہاآں ں۔ جھان تو لے باوڑی رے بھیّا! بھان تو لے ای سدّھی ہوئے گی۔ اوور نھیں تو؟''

جاڑوں میں ڈول سے اُلٹتے اور برہوں میں بہتے پانی سے بھاپ اُٹھتی اور خانوں حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ ان ہونی ہوتے دیکھتا، تو ہریا کسی گھمنڈی چمتکاری کی طرح ہنستے ہوئے گردن اکڑا کے خانوں پہ نظر ڈالتا۔ مانو ہریا ہی باوڑی کے پانی سے بھاپیں اُٹھاتا ہے اور خانوں کو حیرتوں میں ڈالتا ہے۔ یہ رُتوں موسموں کا پالنہار، جل داتا! — یہ ہریا — ہری لال کاچھی! پچھواڑوں کا سیوک! خانہ آباد!

''اے خانہ آباد! ہریا! خوش بختا!'' ولایتن بوا کی آواز آتی، ''اُسے باتوں میں نھیں لگا اوے! ابی ناشتا بی نھیں کیا اُس نے۔ بھیجو، اِدر بھیجو اُسے... خانہ آباد کو۔''

ہریا آنکھیں نکال کے دبی آواز میں خانوں سے جانے کو کہتا کہ جاؤرے بھیّا، بوا اماں گُصّہ کرری ہے۔ تو مجبوراً خانوں، ہری ہری آنکھوں، مہندی رنگے بالوں اور لال بھبھوکا گالوں والی ولایتن بوا کے پاس... اور ناشتے کے پاس لوٹ آتا۔

مگر اے بیلوں کو ہنکارتی ہریا ہری لال کی آواز برابر آتی رہتی۔ وہ خوب سمجھ رہا ہوتا کہ ڈول سے اترتا، لشکارے مارتا پانی، بہت ہی بھاپیں اُٹھاتا، برہوں میں بہتا، پچھواڑوں میں پہنچ کے مٹّیوں کو تر بتر کرتا جارہا ہے۔

وہ پہلے سے جانتا تھا کہ ہریا کی ہنکارتی آواز تمام سبز اور نیلی اور سیاہ اور سرخ اور زرد اور نارنجی چیزوں کو اُگنے پہ اُکسا رہی ہے، اُکساتی رہے گی۔

ٹھیک تو ہے:

(یہ سب کچھ ویسا ہی تو ہو رہا ہے۔ کچھ اوپر ستر برس کے خانوں نے دل میں دُہرایا) ویسا ہی تو ہو رہا ہے جیسا کہ توریت کے باب اوّل "کتاب پیدائش" میں درج ہے... کہ یہوواخداوند نے پہلے زمین اور آسمان بنائے تھے۔ اور زمین پر (جو ابھی برومند نہ ہوئی تھی) نہ تو وحشی جھاڑیاں ہی تھیں، اور نہ کسی خودرو پودے نے ابھی سر اٹھایا تھا، کیوں کہ 'یہووا' نے (تا حال) زمین پر بارش نہیں بھیجی تھی اور نہ زمین پر اُسے جوتنے والا آدمی (یہ ہریا؟) آیا تھا۔ (تاہم) زمین سے ایک سَیل (ضرور) اُٹھ رہا تھا جو مٹی کو تر کرتا جاتا تھا۔

ہئے ہئے...! گویا یہ زمیں آدمی سے آباد نہ ہوئی تھی؟... نصیبوں والی۔

تبھی 'یہووا' نے دھول کو پانی میں گوندھ کر اس آدمی (ہریا؟) کا پتلا بنایا اور 'یہووا' خداوند نے اس کے نتھنوں میں اپنا نفسِ (زندہ) پھونک دیا، اور یہ سانس لینے لگا۔

"اے سبحان اللہ!" ...اور اب دیکھو! یہ خانہ آباد، پانی بھرا ڈول کھینچتے ہوئے کیسے ہولے ہولے بیلوں کی جوڑی کے ساتھ باوڑی کی ڈھلان پر سے اُتر رہا ہے۔ یہ آدمی، ہریا ہری لال۔ اور چیزوں کو اپجاتی، اُنھیں برومند کرتی، ان میں انکر لاتی زمین کیسی چل پڑی ہے۔ کے ے ے... سی۔ اے سبحان اللہ!

چناں چہ، کچھ اوپر ستر برس کا خانوں اپنے دل کی مسرت میں کروٹ لے کر آسائش سے اونگھنے لگا۔
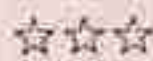
☆☆☆

منشا یاد

برزخ

وہ ایک طویل عرصے سے ایک ایسی اذیت ناک بیماری میں مبتلا تھا جسے معالجوں نے ناقابل علاج قرار دے دیا تھا۔ وہ درد اور اذیت سے ایڑیاں رگڑتا اور مرنے کی دعائیں کرتا۔ اس نے بیماری کا زیادہ تر عرصہ پین کلر دواؤں اور ٹیکوں کے سہارے گزارا تھا مگر اب وہ بھی بے اثر ہو گئے تھے۔ اس نے کئی بار ڈاکٹروں کی منت سماجت کی کہ وہ اسے مرسی کلنگ کی بنیاد پر کوئی انجکشن لگا کر اس تکلیف دہ زندگی سے نجات دلا دیں مگر وہ مذہبی اعتقادات، اخلاقی اور قانونی ضابطوں اور اپنے پیشہ ورانہ اصولوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکتے تھے۔ اس نے خود بھی کئی بار حرام زندگی پر حرام موت کو ترجیح دیتے ہوئے خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر اس کے بے درد لواحقین اور معالجین ہر مرتبہ اس کی کوشش کو ناکام بنا دیتے اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے اذیت کے بھوکے بھیڑیوں کے آگے پھینک کر چلے جاتے جو اس پر ایک ساتھ جھپٹتے، تیز دانتوں اور نوکیلے پنجوں سے اس کی کھال ادھیڑتے، جسم کو کاٹتے، چیرتے، پھاڑتے اور اس کی ہڈیاں چچوڑتے۔ پھر جب وہ سارا کھایا نگلا جا چکتا تو وہ کھائی ہوئی ایک ایک بوٹی اُگل دیتے۔ آن کی آن میں بوٹیاں ایک دوسرے سے جڑنے لگتیں اور ہڈیوں پر ماس چڑھنے لگتا اور وہ درد کے ظالم بھیڑیوں کی خوراک بننے کے لیے دوبارہ پورا بن جاتا۔

کبھی کبھی جب درد کی شدت ناقابل برداشت ہو جاتی اور کوئی دوا یا ٹیکا کارگر ثابت نہ ہوتا تو وہ درد کے مارے بلند آواز میں چیخنے چلانے لگتا۔ اس کی چیخیں اس قدر ہول ناک ہوتیں کہ ڈاکٹر، نرسیں اور لواحقین ہی نہیں ملحقہ جنرل وارڈ کے مریض بھی سہم جاتے اور اس کی موت کی دعائیں کرنے لگتے کہ وہی اس کو تکلیف سے نجات دلا سکتی تھی مگر کسی کی کوئی دعا قبول ہوتی نہ کوئی دوا اثر کرتی لیکن انسانی خوش گمانی خراب سے خراب تر صورت حال سے بھی اپنے فائدے اور تشفی کا کوئی پہلو نکال لیتی ہے۔ آدمی نے مذہب اور عقیدے کے نام پر جو بہت سے ڈھکوسلے بنا رکھے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دنیا میں جن لوگوں کو حد سے زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑے انھیں اسی دنیا میں اپنے گناہوں کی سزا مل جاتی

ہے اور وہ اگلی دنیا کے عذاب سے بچ جاتے ہیں۔

لیکن پھر ایک ایسی رات آئی جس کا اسے مدت اور شدت سے انتظار تھا اور جس کے لیے وہ دعائیں مانگتا تھا۔ ہسپتال کی بند کھڑکی سے چند سیاہ پوش سائے اندر آئے اور حالاں کہ وہ مزاحمت نہیں کر رہا تھا مگر وہ اسے کھینچنے اور گھسیٹنے لگے۔ پھر اسے ایک تنگ و تاریک پائپ ایسی سرنگ میں لے گئے جس کے دوسرے سرے پر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ یہ سرنگ آگے جا کر مزید تنگی اور تنگ ہوتی جا رہی تھی اور گھسیٹے اور دھکیلے جانے کے بغیر پار نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ بارے (جنتری) میں سے گزارا جانے والا تار ہو مگر جوں ہی وہ اس سرنگ سے باہر نکلا اسے اچانک درد اور اذیت سے نجات مل گئی اور اسے لگا ہر طرف رحمت کی ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ وہ ایک عجیب سکون و سرور کی فضا میں پہنچ گیا اور خود کو خوش و خرم اور ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اب وہ خلا کے سمندر میں تیر اور ہوا کے دوش پر اڑ سکتا تھا۔

پھر اس نے دیکھا اس کا مادی جسم ابھی تک بے سدھ اور بے حرکت ہسپتال کے بیڈ پر پڑا تھا اور اس کے عزیز و اقارب ایک اطمینان بخش دکھ کے ساتھ رو رہے تھے۔ وہ انھیں دیکھ سکتا تھا، ان کی باتیں سن سکتا تھا اور ان کے اصلی اور دکھاوے کے آنسوؤں کو پہچان سکتا تھا مگر انھیں چھو سکتا تھا نہ ہی وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔

پھر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اچانک انھیں کفن دفن کی جلدی پڑ گئی ہے حالاں کہ ڈاکٹر نے میت خراب ہونے کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی تھی۔ ان میں اس کا وہ عزیز جو مذہبی رجحان کا حامل تھا، سب میں پیش پیش اور پُر جوش تھا۔ اسے حیرت اس وجہ سے بھی ہوئی کہ وہ عزیز ہر کام میں سست اور کاہل مشہور تھا مگر اس کی تدفین میں وہی سب سے زیادہ آگے تھا، جیسے مردے کو جلد از جلد قبر میں اُتارنے اور حساب کتاب کے لیے پہنچا کی ذمہ داری اسی کی ہو اور تاخیر کی صورت میں نکیرین کی باز پرس کا ڈر ہو۔

" وہ اس کی میت کو ایمبولینس میں ڈال کر گھر لے گئے۔ اڑوس پڑوس اور محلے کے لوگ آنے لگے۔ پھر رشتے داروں کی آمد شروع ہوئی۔ ہر کوئی آتے ہی بلند آواز میں نعرہ مار کر روتا یا بلند آواز میں سسکیاں لیتا مگر پھر فوراً ہی نارمل ہو کر ایک جیسے بے معنی سوال کرنے لگتا۔ کب اور کیسے فوت ہوئے؟ آخری وقت میں کون پاس تھا؟ کیا وصیت کی؟ کس کس کو اطلاع دی ہے؟ جنازے کا کیا وقت مقرر کیا ہے؟ وغیرہ۔

وہ ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ کیسے اسے نہلایا اور کفنایا گیا۔ کس کس نے اس کا چہرہ دیکھنا پسند کیا۔ مرنے کے بعد اس کی شکل اور بگڑ گئی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کوئی اس کی صورت نہ دیکھے مگر سبھی ایک نظر ڈال لینا ضروری سمجھتے بلکہ بعض ایسوں نے بھی اس کا چہرہ دیکھا جنھیں وہ جانتا تک نہ تھا اور جنھیں اس نے زندگی میں کبھی اپنا چہرہ نہیں دکھایا تھا۔ اسے بہت سے عزیزوں اور رشتہ داروں کے رویوں پر

افسوس بھی ہو رہا تھا اور ان کی منافقت اور اداکاری دیکھ کر غصہ بھی آ رہا تھا مگر وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔ یوں بھی زندگی کی یہ چھوڑی ہوئی منزل اسے حقیر اور بے معنی لگ رہی تھی اور وہ جلد از جلد ایک لمبی اور پُرسکون نیند سونا چاہتا تھا۔

اس کے جسم کو قبر میں اتارا گیا تو اس نے محسوس کیا وہ بھی قبر میں بند ہو گیا ہے۔ پھر انھوں نے قبر پر عرق گلاب چھڑکا، پھولوں کے ہار ڈالے اور اگر بتیاں سلگائیں اور دعا مانگ کر چلے گئے۔ وہ اطمینان سے اپنی میت کے ساتھ ہی لیٹ گیا اور گہری نیند سو گیا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر تک سوتا رہا پھر اچانک آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اسے لگا کہ چوہا، سانپ، نیولا یا تازہ مردے کی تلاش میں بجو قسم کا کوئی چوپایہ ہے۔ اس نے بجو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر بجوؤں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا کہ وہ تازہ مردوں کے انتظار میں رہتے اور انھیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں بلکہ اس کے ایک دوست کا دادا جسے لوگ بابا جی کہتے تھے، ان کی بڑی خوف ناک تفصیل بتایا کرتا تھا کہ وہ کیسے مردے کو قبر سے نکال کر اور ٹخنے کو دبا کر سیدھا کھڑا کر لیتے اور اپنی پسند کی بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں، مگر وہ بجو تھے نہ سانپ اور نہ ہی نیولے۔ وہ دو تھے اور ان کی صورتیں نورانی مگر تھوڑی تھوڑی غیر انسانی تھیں مگر پھر بھی ایک کی مشابہت ان مولانا سے تھی جو ٹیلی وژن پر درس دیتے تھے اور جن کی بڑی بڑی غضب ناک آنکھیں تھیں اور درس کے دوران میں سامعین، ناظرین اور مخاطبین کو گردنوں تک گناہ ہائے کبیرہ میں ڈوبے ہوئے فرض کر کے یوں دھاڑتے تھے جیسے دیہاتی تھانے میں کوئی تھانے دار گمی اور مفلس قسم کے مجرموں پر۔ اور عورت کا ذکر آتا تو اور بھی بپھر جاتے اور وجودِ زن کو کائنات میں باعثِ خرابی اور بدی قرار دیتے۔ دوسرے کی صورت اس کے چھٹی جماعت کے ریاضی ٹیچر ماسٹر عبدالغفار سے مشابہ تھی جو لڑکوں کو غلطیوں پر یوں سزا دیتے تھے جیسے انتقام لے رہے ہوں۔ ساتھ ساتھ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتے بھی جاتے۔ ظاہر ہے یہ ایسی گالیاں ہوتی ہوں گی جن کا بلند آواز میں اظہار نامناسب تھا ورنہ عام گالیاں جیسے نالائق، پاجی، گدھا، الو اور حرام خور وغیرہ بلند آوازوں میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان کے صرف سر ہی نظر آتے تھے پتا نہیں دھڑ تھے یا نہیں اور دھڑ کی انھیں ضرورت بھی کیا تھی؟ اس نے انھیں پہچان لیا۔ مگر پتا نہیں ان میں منکر کون تھا اور نکیر کون؟

''تمھارا نام؟''

ان میں اس ایک نے جس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں، آتے ہی تحکم آمیز لہجے میں پوچھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ عربی بول رہا تھا مگر وہ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی حالاں کہ عربی اس نے ساتویں جماعت ہی میں عربی کے ٹیچر کی وجہ سے چھوڑ دی تھی۔ وہ اچھی شکل اور گورے رنگ کے لڑکوں کو گھر بلا کر مفت ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ اس نے سوچا جس بات کا کھٹکا تھا اور جن آسائشوں کے چھن جانے کے خوف سے وہ زندگی بھر حکومتی احتساب کے بہت سے اداروں سے ڈرتا رہا وہ سب تو چھن چکیں اب ڈر کیسا؟

''الف بے جیم دال۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ تمھارا نام نہیں ہے۔'' دوسرے نے دانت پیستے ہوئے کہا، ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''اپنا اصلی نام بتاؤ۔'' پہلے والا دوبارہ بولا

''اگر تمھیں میرا اصلی نام معلوم ہے تو پوچھتے کیوں ہو؟''

''نام ہی نہیں ہمیں تمھارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے مگر ہم تمھارے منھ سے سننا چاہتے ہیں۔''

''اگر میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو تو سوال و جواب میں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟''

''تم وقت کی فکر نہ کرو۔ وہ تمھارے پاس بھی بہت ہے حشر تک اور ہمیں بھی کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے تم بے کار لوگ ہو۔ سادہ اور معصوم انسانوں کو تنگ کرنے کے سوا تمھیں کوئی کام نہیں ہے۔''

''منھ سنبھال کر بات کرو۔''

''کیسا اور کون سا منھ؟''

''ہم بے کار نہیں ہیں۔ ہمارے ذمے حساب کتاب اور احتساب کرنا ہے۔ کیا یہ کام نہیں؟''

''نہیں۔ یہ نہایت فضول سا کام ہے جس سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا۔ کام وہ ہوتا ہے جس میں جسمانی یا ذہنی محنت درکار ہو اور جس سے کچھ حاصل ہوتا ہو۔ جیسے کسان کے زمین میں ہل چلانے اور بیج بونے سے فصل تیار ہوتی ہے۔ مزدور کے کارخانہ چلانے سے کپڑا اور دیگر مفید چیزیں بنتی ہیں یا جیسے مٹی، لکڑی اور لوہے کو خاص شکل دینے سے اپنے یا دوسروں کے استعمال کی چیزیں اور اوزار بنتے ہیں۔ غور وفکر کرنا بھی کام ہے کہ زندگی کے سربستہ رازوں سے آگاہی ہوتی ہے حتیٰ کہ فنونِ لطیفہ سے بھی احساس اور جذبے کی سطح پر تسکین اور مسرت حاصل ہوتی ہے مگر تمھاری تنقید اور احتساب سے کیا حاصل ہوتا ہے؟''

''نیکی کا اجر ملتا ہے اور بدی کی سزا۔''

''چھوٹی بڑی خوشیوں اور لذتوں سے محروم پوری زندگی گزارنے کے بعد اب میں تمھارے اجر کا کیا کروں گا؟''

''سزا اور عذاب سے تو بچ جاؤ گے۔''

''میں سزا اور عذاب دنیا میں جھیل آیا ہوں، میرے گناہ جھڑ چکے ہیں۔''

''تمھیں سزا اور عذاب کا اندازہ نہیں ورنہ ایسا نہ کہتے۔''

''مجھے سب معلوم ہے۔''

''تم نے صرف جہنم کا نام سنا ہے جب دیکھو گے تب پتا چلے گا۔ اس میں ایک وادی ہے

جس کا نام لم لم ہے۔ اس میں سانپ ہیں جو اونٹ کی گردن کے برابر موٹے ہیں اور ان کی لمبائی ایک مہینے کی مسافت کے برابر ہے۔ جہنم میں ایک میدان ہے جس کا نام جُب الحزن ہے۔ وہ بچھوؤں کا گھر ہے اور ہر بچھو خچر کے برابر بڑا ہے۔ تم نے بہت سی نمازیں قضا کی ہیں اور جانتے ہو جو شخص نماز کو قضا کردے گو وہ بعد میں پڑھ بھی لے پھر بھی وقت پر نہ پڑھنے کی وجہ سے ایک حقب جہنم میں جلے گا اور حقب کی مقدار اسّی برس کی ہوتی ہے اور ایک برس تین سو ساٹھ دن کا اور قیامت کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہوگا۔ اس حساب سے ایک حقب دو کروڑ اٹھاسی لاکھ برس کا ہوا۔''

''تم مجھے کسی مدرسے کا کم سن طالب علم یا نیم خواندہ مسلمان نہ سمجھو جو ایسی مبالغہ آمیز باتوں پر بے تامل یقین کرلیتا ہے۔ مجھے خدا نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے۔''

''تمھارا نامۂ اعمال سیاہ ہے اور تم جہنم رسید کیے جاؤ گے۔''

''تم مجھے ڈرانے کی ناکام کوشش کررہے ہو۔''

''ابھی تمھیں اس کی ایک جھلک دکھائیں گے تو تمھیں خود ہی اندازہ ہوجائے گا۔'' ایک بولا۔

''میں خود اذیت کے جہنم زار سے گزر کر آیا ہوں۔''

''وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ابھی تمھیں عنق (لمبی گردن) کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔''

دوسرا کہنے لگا، ''جہنم میں جب یہ ظاہر ہوگی تو لوگوں کو پھاندتی ہوئی چلی آئے گی۔ اس میں دو چمک دار آنکھیں ہوں گی اور نہایت فصیح زبان ہوگی۔ وہ کہے گی کہ میں ہر اس شخص پر مسلط ہوں جو متکبر، بدمزاج ہو اور مجمع میں سے ایسے لوگوں کو اس طرح چن لے گی جیسا کہ جانور دانہ چگتا ہے۔ ان سب کو چن کر جہنم میں پھینک دے گی اس کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ ظاہر ہوگی اور —''

''بس بس۔ مجھے ایسی اصطلاحات سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرو، میں ایسا سادہ لوح نہیں ہوں کہ سزاؤں کی غیر منطقی باتوں پر بے تامل یقین کرلوں اور خوف سے کانپنے لگوں۔ میں خدا کو ایسی قہار اور انتقام لینے والی ہستی تصور نہیں کرتا۔ اُسے سب سے بڑا تخلیق کار اور حیات و کائنات کی مادرِ اعظم سمجھتا ہوں۔ جو اپنی مخلوق کے لیے شفیق، مہربان اور سرتاپا رحمت ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک بڑی عظیم المرتبت عارفہ رابعہ بصری نے جنت کو جلانے اور جہنم کی آگ کو سرد کرنے کی بات کی تھی تاکہ انسان جنت کے لالچ اور دوزخ کی آگ کے خوف سے بالاتر ہو کر خدا سے محبت کرے۔''

منکر یوں زیرِ لب مسکرایا جیسے کبھی آمریت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے شیر صفت سیاست دان کو دیکھ کر انصاف و احتساب کی کرسی پر براجمان قدِ آدم چوہا مسکرایا ہوگا یا جیسے تباہی کے سکندرِ اعظم نے تیل کے پورس کی گرفتاری کی تصویر دیکھ کر تبسم فرمایا ہوگا۔ اس نے بغل سے مہاجنوں کی بہی جیسی کتاب نکالی اور اس میں دیکھ کر بولا:

''یہ ہے تمھارا نامۂ اعمال۔ تمھارا سارا کچا چٹھا اس میں درج ہے۔ تمھاری زندگی کی ہر

حرکت۔ تمھارے بچپن سے لے کر یہاں آنے کے لمحہ تک ہر چھوٹی بڑی نیکی اور گناہ کا احوال۔"

"اگر میں اسے ماننے سے انکار کردوں تو؟"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔" نکیر نے جواب دیا۔

"جب سارے فیصلے پہلے سے کر لیے گئے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی تو مجھے پریشان کیوں کرتے ہو۔ جاؤ جو کرنا ہے کرو۔ میں بہت تھکا اور جاگا ہوا ہوں۔ مجھے سونے دو۔ قیامت کے روز اٹھوں گا تو دیکھا جائے گا۔"

"حساب کتاب تو تمھیں دینا ہی ہوگا۔"

"کس چیز کا؟"

"دنیا میں تم نے جو کچھ کیا ہے اس کا۔"

"دنیا کو چھوڑ دو۔ وہ پیچھے رہ گئی ہے۔ گزری باتوں کو جانے دو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم ایک ایک بات کا حساب لیں گے۔"

"جب تمھیں انسانی زندگی کا تجربہ ہی نہیں، تم نے بھوک دیکھی ہے نہ بیماری، تمھیں کبھی دشمنوں سے واسطہ پڑا ہے نہ کسی سے محبت کی ہے تو تمھیں ان انسانی ضرورتوں، مجبوریوں، جذبوں اور احساسات کا کیسے اندازہ ہوسکتا ہے۔ تم عرش پر رہنے والے بے حس اور جذبات سے عاری، خیر ہی خیر نوری کیا جانو انسانی زندگی کتنا بڑا امتحان ہوتی ہے؟"

"ہمیں یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔"

منکر غصے سے بولا مگر وہ اپنی ہی رو میں کہتا رہا، "قدم قدم پر ضرورتوں کی دلدلیں، مجبوریوں کے الاؤ، محرومیوں کے خارزار، ناکامیوں کے جہنم، رشتے داروں کے ہمہ وقت تپتے حسد کے تنور، دوستوں کی درپردہ رقابتوں کے گھپے وار اور زور آوروں کی ناانصافیاں اور مقتدر لوگوں کی چیرہ دستیاں — تم کیا جانو ان مصائب سے نکلنے کے لیے انسان کو کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں؟ پھر طرح طرح کی ترغیبات۔ مال و دولت، سونا چاندی، زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے والی سہولتیں اور طرح طرح کا سامانِ تعیش اور حسین و جمیل صورتیں۔"

"یہی تو تمھارا جرم ہے کہ تم ان مادی چیزوں کے لالچ میں پڑ گئے۔"

"اگر خدا نہیں چاہتا تھا کہ ہم ان مادی چیزوں کے لالچ میں پڑیں تو اُس نے یہ سب کیوں بنایا؟ کیوں کم زور انسان کو گمراہی کی راہ پر چلنے کے اسباب پیدا کیے؟"

"تاکہ برے اور صالح لوگوں کی پہچان ہوسکے۔"

"لیکن خدا تو اپنی بنائی ہوئی ہر اچھی بری چیز سے محبت کرتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو برے اور گناہ گار لوگوں کو پیدا نہ کرتا۔"

''تم حجتیں بہت کرتے ہو۔''

''اس لیے کہ جس زندگی کا تم امتحان لے رہے ہو میرا، اس زندگی کا تجربہ اور معلومات تم لوگوں سے زیادہ ہیں۔ تم نے دنیا کو دور سے دیکھا ہے جب کہ میں نے اس میں زندگی کے بہت سے برس گزارے ہیں۔''

پھر ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اشارے کرنے لگے۔

اچانک زلزلے کی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور ایک شدید جھٹکے کے ساتھ زمین شق ہوگئی اور دونوں اطراف کی دیواریں ستر ستر قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ ابھی اس کی حیرت دور نہ ہوئی تھی کہ پیچھے ہٹ جانے والی دونوں دیواریں تیزی سے آئیں اور اسے بھینچ ڈالا۔ یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ایک دوسری میں پیوست ہوگئیں۔ درد کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ تب اسے انسانی آوازیں سنائی دینے لگیں:

''ہوش آرہا ہے۔''

''آپریشن کامیاب ہوگیا۔''

''اللہ کا شکر ہے۔''

☆☆☆

رشید امجد

گلاب کا موسم

وہ گلاب کا موسم تھا۔

رات بھر عجب طرح کا سیلن زدہ حبس رہا، لیکن پچھلے پہر کسی وقت بادل اُمڈ آئے، تیار ہو کر دفتر جانے کے لیے باہر نکلا تو ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے نظر اچانک بونٹ پر پڑی سرخ رنگ کا گلاب سفید بونٹ پر پڑا مسکرا رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اُس نے لان کی طرف دیکھا۔ اُس کی بیوی کو سرخ گلاب بہت پسند تھے۔ اس موسم میں روز صبح وہ اُسے سرخ گلاب توڑ کر دیتی، لیکن جب سے وہ فوت ہوئی تھی، لان اُجڑ گیا تھا۔

''یہ سرخ گلاب -'' اُس نے سوچا، خیال آیا، رات گھر آتے ہوئے چوک پر پھول بیچنے والے کئی لڑکے اُس کی طرف لپکے تھے، لیکن اُس کے نفی میں سر ہلانے پر دوسری گاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ شاید ان میں سے کسی کا پھول بونٹ کے سرے پر ہوا کی جالی میں اڑ گیا ہو . . یہی بات ہوگی۔ اُس نے اطمینان سے سر ہلایا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر نکل آیا۔

دن بھر دفتر کے کاموں میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ شام کو ایک جگہ کھانے پر جانا تھا، وہاں دیر ہوگئی۔ واپسی میں چوک پر صرف ایک ہی لڑکا پھول بیچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی طرف آتا، اشارہ کھل گیا۔ کچھ دیر صبح کا اخبار پڑھتا رہا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ صبح تیار ہوتے ہمیشہ دیر ہو جاتی، اس لیے اخبار رہ جاتا۔ شام کو گھر آ کر جتنی دیر میں بیوی چائے بناتی، وہ اخبار کھنگال لیتا۔ کسی دن دیر ہو جاتی تو بستر پر لیٹے لیٹے ایک نظر ٹی وی پر ایک نظر اخبار پر۔ بیوی بہت چڑتی لیکن وہ بہ یک وقت اخبار بھی پڑھ لیتا اور ٹی وی بھی دیکھ لیتا۔

اُس رات بھی اخبار اور ٹی وی دیکھتے دیکھتے نیند آ گئی۔ صبح اٹھا تو طبیعت بشاش تھی، ناشتا کیا، نوکر کو شام کے کھانے کے بارے میں بتایا اور میز سے گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکلا، ایک پاؤں دہلیز کے اندر، ایک باہر — بونٹ پر سرخ رنگ کا گلاب مسکرا رہا تھا، مسکرائے جا رہا تھا۔

معلوم نہیں وہ کتنی دیر اسی طرح کھڑا رہا۔ نوکر نے پیچھے سے پوچھا، ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

وہ چونکا، ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمی کا احساس دلا رہی تھیں۔

''یہ ــ!'' اُس نے بونٹ کی طرف اشارہ کیا، ''گلاب تم نے رکھا ہے۔''

''نہیں تو۔'' نوکر نے اُس کے کندھے سے اچک کر بونٹ کی طرف دیکھا۔ ''میں نے تو نہیں رکھا۔''

اُسے احساس ہوا نوکر عجب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے، آگے بڑھ کر اس نے گلاب اٹھایا اور گاڑی کھول کر اُسے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

راستے بھر، وہ کن انکھیوں سے گلاب کو دیکھتا رہا۔ لگ رہا تھا جیسے دماغ سُن ہو گیا ہے۔ دفتر میں کام کرتے ہوئے بار بار گلاب سامنے آ جاتا، دوپہر تک سر درد سے پھٹنے لگا۔ اُس نے پی اے سے سر درد کی گولیاں منگوائیں اور ایک ساتھ دو گولیاں چائے کے ساتھ پی کر گھر لوٹ آیا۔ نوکر نے حیرت سے دیکھا، ''جلدی آ گئے ہیں، طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔'' ''ہاں'' ۔ اُس نے سر ہلایا۔۔۔ ''سوؤں گا، کوئی فون آئے تو جگانا مت، کہہ دینا، میں گھر پر نہیں۔''

شام کو سو کر اٹھا تو طبیعت بشاش تھی۔ کپڑے بدلے اور کلب کی طرف نکل آیا، کئی جان پہچان والے مل گئے۔ باتیں ہوئیں، کھانا بھی وہیں کھایا۔

واپسی پر دو تین چوکوں میں پھول بیچنے والے لڑکے اُس کی طرف لپکے لیکن اُس نے ہر بار سر ہلا کر نفی میں جواب دیا، گھر سے پہلے والے چوک میں کچھ زیادہ رکنا پڑا۔ ایک چھوٹی سی بچی کھڑکی کی طرف آئی۔

''صاحب جی!'' اُس نے پھول اُس کی طرف بڑھائے، ان میں سرخ گلاب بھی تھا۔

جی چاہا کہ پھول لے لے لیکن اس سے پہلے کہ کوئی فیصلہ کر پاتا اشارہ کھل گیا۔

گاڑی پارک کرتے ہوئے اُس نے اچھی طرح بونٹ کا جائزہ لیا۔ دروازہ بند کیا اور اندر آ گیا۔

نوکر نے پوچھا، ''کھانا لگاؤں۔''

''نہیں، میں کھا آیا ہوں۔''

بیڈ روم میں اخبار بڑی نفاست سے تہ کیا سرہانے پڑا تھا۔ اُس نے ٹی وی کھول دیا اور اخبار پڑھنے لگا۔ اخبار ختم ہو گیا، لیکن نیند نہیں آئی ــ سرخ گلاب بار بار آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ سر جھٹک کر ٹی وی اسکرین پر نظریں جمانے کی کوشش کی لیکن سرخ گلاب اسکرین پر بھی ابھر آتا۔ آدھی سے زیادہ رات اسی کش مکش میں گزر گئی۔ غنودگی میں آنکھیں بند ہوتیں تھوڑی دیر بعد چونک کر آنکھیں کھولتا، ٹی وی اسکرین پر تصویریں دھندلا گئی تھیں اور سرخ رنگ کا گلاب اپنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اُس

نے کئی چینل بدلے، ہر چینل پر گلاب موجود تھا، تنگ آ کر ٹی وی بند کر دیا۔ سونے کی کوشش کی، شاید کچھ دیر نیند آ بھی گئی، آنکھ کھلی تو صبح ملگجی لباس اتار رہی تھی۔ وہ، جیسے کسی ہیجانی کیفیت میں ہو، دروازے کی طرف بھاگا۔ دروازہ کھولا، سامنے بونٹ پر تازہ تازہ گلاب، سرخ گلاب۔

اُس نے ہیجانی انداز میں لپک کر گلاب اٹھایا اور زمین پر پھینک کر پاؤں سے کچل دیا۔ اُسی لمحے ایک سسکی سنائی دی۔ وہ ساکت ہوگیا — معلوم نہیں کتنا عرصہ یہ حالت رہی۔ اس سسکی کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ رفعت کی ماں اچانک ہی بیمار ہوگئی تھی، اُسے فوراً چھٹی نہیں مل سکتی تھی، اس لیے طے ہوا کہ وہ اکیلی ہی گاڑی پر گاؤں چلی جائے، وہ دوسرے دن آ جائے گا۔ صبح جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تو دفعتہً اس سے لپٹ گئی اور اس کے منھ سے سسکی نکلی — یہ سسکی —!

لیکن حیرت اور دکھ تو یہ تھا کہ اب تو وہ سب کچھ جان چکی ہوگی کہ رات کو سونے سے پہلے اُس نے انشورنس کے لالچ میں گاڑی کے اگلے پہیوں کے نٹ ڈھیلے کر دیے تھے — پھر بھی وہ —!

یہ گلاب کا موسم ہے!
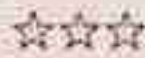
☆☆☆

مرزا حامد بیگ

لالہ جسونت کی حویلی

واہگہ سے کلیرنس کے بعد جب سمجھوتا ایکسپریس، لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچی تو چرونجی اور کاجو کے پیکٹ، پان چھالیا کے تھیلے، بنارسی اور زردوزی کے بوری بند تھان تھیلوں پر لادے قلیوں اور پھیری بازوؤں کی دھکم پیل میں ایک وہ بھی تھا۔

وہ، جو لاہور میں اپنے پرکھوں کی حویلی اور گلی محلّہ دیکھنے آیا تھا، تاکہ دلّی واپس جا کر اپنے بوڑھے اور بیمار باپو کو بتا سکے کہ اُس نے جو کچھ اُن کی زبانی سنا تھا، سب ویسا ہی ہے یا بدل گیا۔ اور چند ایک چھوٹی چھوٹی فرمائشیں تھیں باپو کی، جنھیں پورا کرنا تھا اُسے۔

واہگہ میں کلیرنس کے اُلجھیڑے ازحد تھکا دینے والے تھے اور اُسے کسی بات کی جلدی نہ تھی۔ گاڑی سے اُتر کر وہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے دُور تک پھیلے آہنی شیڈ کے ایک محرابی ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا دیر تک اپنے باپو کی ہدایات یاد کرتا رہا تھا۔

دہلی ریلوے اسٹیشن پر جب ٹرین کے ڈبے جوڑے جا رہے تھے تو باپو نے تاکید کی تھی کہ پاکستان پہنچ کر سب سے پہلے پولیس اسٹیشن میں اپنی آمد کی رپورٹ کرنا، پھر ریلوے اسٹیشن سے قریب ہی کسی صاف ستھرے ہوٹل میں کمرہ لینے کے بعد خیریت کا فون کر دینا۔

''جی۔''

''کچھ دیر آرام کر کے ہی نکلنا کہیں۔''

''جی باپو۔''

''لاہور ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دُور نہیں ہے اپنی حویلی۔ تمھیں تانگا، ٹیکسی لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پیدل کا راستہ ہے حویلی کا۔''

''جی۔''

''اگر اب بھی تانگا چلتا ہے نا، تو بھاٹی لوہاری کی آواز لگائے گا کوچوان۔ جی چاہا تو پکڑ لینا

تانگا۔ لنڈا بازار اور سرائے سلطان والی سڑک کے متوازی ریلوے روڈ نکلتی ہے۔ اُسی روڈ پر ہے اسلامیہ کالج اور عرب ہوٹل۔ چوک برف خانہ سے گوالمنڈی کی طرف وہی سڑک جاتی ہے۔ تم اُتر جانا چوک دنگراں میں۔ قریب ہی ہے سرائے سلطان کا پچھلا گیٹ۔ چوک دنگراں سے گزر کر ساری لاریاں سرائے سلطان ہی میں جا کر رُکتی ہیں۔ پھر نکل جاتی ہیں ریلوے اسٹیشن، نولکھا اور دو موریہ پُل کی طرف۔"

"جی باپو۔"

"کہیں پاتھی گراؤنڈ کی طرف نہ نکل جانا۔ بعد میں بے شک اُدھر بھی چلے جانا لیکن حویلی سے ہو کر۔ اُدھر گجر گوالے رہتے ہیں۔ میرے یار، بالے کا گھر وہیں تھا۔ چوک دنگراں سے ہی پوچھ لینا لالہ جسونت کی حویلی۔ قریب ہی تو ہے۔ جو کوئی بھی وہاں رہتا ہو، مل لینا۔ پرنام، نمستے نہیں۔ سلام کرنا۔ اُنھیں بتانا کہ میں لالہ جسونت کا پوتا ہوں۔ بیٹھنے کو کہیں تو بے شک تھوڑی دیر بیٹھ جانا، شرمانا نہیں۔ پھر اگر وہ اجازت دیں تو صحن میں سے ضرور ہو آنا۔ اُن دنوں صحن میں برآمدے کی پرچھتی کے نیچے لکڑی کا بھاری تخت دھرا رہتا تھا۔ میں جب چھوٹا سا تھا نا تو رام گلی والے اسکول میں پڑھتا تھا اور تختی اُسی تخت پوش پر بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔ صحن میں بازو والے گھر کی ساجھی دیوار کے عین نیچے ایک کنواں تھا۔ ادھر سے ہم چرخی کی رسّی سے بندھا ڈول ڈالتے، اُدھر سے وہ۔ کون پانی سے بھرا ڈول پہلے کھینچ نکالتا ہے، اس کا مقابلہ ہوتا تھا، چندو لوگوں کے ساتھ۔ اُوپر، چھت پر جانے کی ضرورت نہیں۔ بے شک صحن میں سے ہی کھڑے کھڑے چھت پر نظر ڈال لینا، چھجے پر کبوتر ہوئے تو وہیں سے دکھائی دے جائیں گے۔ ہم نے اُن دنوں شیرازی، لقا اور لوٹن پال رکھے تھے۔ بالے اور چندو لوگوں نے بھی ہماری دیکھا دیکھی پال لیے تھے کبوتر۔ اس لیے برابر والی چھتیں بھی شاید خالی نہ ہوں کبوتروں سے۔ اگر اپنی حویلی کے چھجے پر بیٹھے کبوتر دکھائی دے جائیں نا تو باتوں باتوں میں حویلی والوں سے یہ ضرور پوچھ لینا کہ کبوتروں کو لگدی میں کیا دیتے ہیں۔ جو کچھ بتائیں، کاغذ پر لکھ لینا۔ بھولنا نہیں۔"

"جی اچھا۔"

"حویلی کسی خاندانی آدمی ہی کو الاٹ ہوئی ہوگی۔ شاید وہ کہیں تمھیں اپنے ہاں ٹھہرنے کے لیے۔ لیکن بیٹا، اُن پر بوجھ نہ بننا۔ ہوٹل ہی میں رہ لینا۔ پیسے ہیں نا، لو اور رکھ لو۔"

"باپو، پیسے ہیں میرے پاس۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"بچت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا دیکھ بھال کر بیٹا۔ پاسپورٹ کو قمیض کے نیچے بنڈی میں ہی رکھنا، احتیاط سے۔"

"جی باپو۔"

"حویلی سے نکل کر رشی بھون بھی ہو آنا۔ قریب ہی تو ہے۔ رشی بھون کی دیکھ ریکھ کیسی ہو رہی ہے، واپسی پر بتانا۔"

"جی اچھا۔"

جب ٹرین نے وسل دی تھی تو قلیوں کی بھاگ دوڑ میں اضافہ ہو گیا تھا اور سامان سے لدے پھندے ریڑھوں کا شور بڑھ گیا تھا۔

"باپو اونچی آواز میں بات نہ کر سکتے تھے لیکن اُس سے اتنے شور میں اُن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ "ہاں بیٹا، حویلی سے ہو کر گوالمنڈی کی طرف نکلو گے نا تو رام گلی والے اسکول کے سامنے سے ہو کر گزرنا۔ بے شک باہر ہی سے ایک نظر ڈال لینا اور ہاں، عرب ہوٹل میں ضرور جھانک لینا۔ بڑے بڑے ادیب شاعر بیٹھتے ہیں وہاں — بہت ادب احترام سے بیٹا —"

"جی باپو۔"

اس وقت آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی ٹرین کے ساتھ باپو تیز تیز چل رہے تھے اور شور بہت تھا۔

"چوک برف خانہ سے ناک کی سیدھ میں گوالمنڈی کی طرف نکلو گے نا تو وہیں پر بہت بڑا پتنگ بھنڈار ہے۔ واپسی پر اگر کچھ پیسے بچ گئے نا تو میرے لیے وہیں سے کوئی پرانا ناول خرید لانا۔ چاچا جی ناستک سے تھے۔ ہمارے ہمسائے تھے نابالا لوگ — اُن کے گھر سے منگوا کر پڑھا کرتے تھے ہر طرح کے ناول — بہت سے نام تھے ناولوں کے، بس اُنھی میں سے کوئی ایک — نام لکھوا دیے تھے تمھیں۔"

"جی باپو، سب کچھ کاغذ پر لکھ رکھا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"دیکھو، ہو سکے تو لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر ریگل سینما ہو آنا — میں نے ریگل ہی میں سہگل اور جمنا کی 'دیوداس' دیکھی تھی — ٹھنڈی سڑک پر چیئرنگ کراس — ایک طرف چڑیا گھر اور دوسری جانب وائسرائے کا دفتر — اُسی چوک میں رکھا ہے ملکہ وکٹوریہ کا بڑا سا پیتل کا مجسمہ — ملکہ، وائسرائے کے دفتر کی جانب منھ کیے بیٹھی ہو گی۔ میں اکثر گرمیوں کی دوپہروں میں نکل جاتا تھا اُدھر... ملکہ کے قدموں میں لیٹ جاتا تھا — سو جاتا تھا وہیں — اور گھر والے —"

باپو وہی باتیں دُہرا رہے تھے، جنھیں وہ بچپن سے بار بار سنتا چلا آیا تھا۔

"— اور ہاں بیٹا —"

"جی باپو۔"

پھر چلتی ہوئی ٹرین کے ساتھ مسلسل دوڑتے چلے آنے سے اُن کا سانس پھول گیا اور وہ پیچھے رہ گئے۔ کھڑکی سے مڑ کر دیکھا تو وہ سب سے الگ پلیٹ فارم پر اکڑوں بیٹھے، جھک کر کھانستے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے اور پس منظر میں مسافروں کو الوداع کہنے والے بقیہ لوگ کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

اس کے بعد ٹرین نے رفتار پکڑ لی اور سب کچھ پیچھے رہ گیا۔

"توجہ فرمائیے — کراچی سے آنے والی عوام ایکسپریس —"

اُس نے اپنا چرمی تھیلا اور سُوٹ کیس اُٹھا کر باہر کا رُخ کیا۔

لاؤڈ اسپیکر پر کراچی سے لاہور آنے والی کسی گاڑی کے لیٹ ہوجانے کی اناؤنسمنٹ جاری تھی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اُس نے ویزا آفس سے ملنے والی پرچی دکھا کر معلوم کرلیا کہ بھارت سے پاکستان آمد کی رپورٹ کہاں کرنا ہے۔

باہر ابھی اچھی خاصی روشنی تھی اور شام سے پہلے پہلے یہ معاملہ نمٹا دینا ضروری تھا۔

واہگہ سے پہلے اٹاری میں اُس نے پانچ سو روپے کی کرنسی تبدیل کروالی تھی جو فوری ضرورت کے لیے کافی تھی۔ اُس نے آٹو رکشا پکڑنے میں دیر نہیں کی اور رپورٹنگ سینٹر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

ایس ایس پی آفس، ضلع کچہری میں داخل ہوتے وقت وہ قدرے گھبرایا ہوا اور تھکا تھکا سا تھا۔ اُس کے کاغذات ہر طرح سے مکمل تھے۔ پاسپورٹ درست تھا۔ ویزا صحیح لگا تھا، اس کے باوجود ایک اَن جانا سا خوف تھا جیسے سر پر آسمان موجود نہ ہو۔

رپورٹنگ آفیسر کے سامنے بچھی ہوئی بڑی سی میز کے برابر میں اپنا سامان رکھ کر وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ تو گیا لیکن جیسے ملزم بیٹھتے ہیں۔ رپورٹنگ آفیسر نے ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے لحظہ بھر کے لیے اُس کی جانب لاتعلقی سے دیکھا۔ اُس نے فون بند کردیا اور کُرسی سے اُٹھتے ہوئے سرد مہری سے بولا، ''جی۔۔۔ فرمایئے۔''

''میں آج ہی دہلی سے لاہور پہنچا ہوں۔''

''جی۔۔۔ دکھایئے کاغذات۔''

رپورٹنگ آفیسر نے اتنا کہا اور باہر نکل گیا۔ کمرے کا دروازہ ازخود بند ہوگیا تھا۔

اب وہ کمرے میں تنہا تھا اور اُس کے لیے اکیلے میں ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا تو رپورٹنگ آفیسر نے جلد ہی سارا کام نمٹا دیا۔

''واپس جاتے ہوئے بھی آپ کو یہیں رپورٹ کرنا ہوگی۔ اُس وقت تک آپ کے یہ کاغذات ہمارے پاس رہیں گے۔''

''بالکل صاحب۔۔۔ میں تو بہت گھبرایا ہوا تھا۔۔۔ آپ کی کرپا، نمسکار۔''

جب وہ دوبارہ ریلوے اسٹیشن کی حدود میں پہنچا تو شام گہری ہوچلی تھی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے بہت سے چھوٹے بڑے ہوٹل تھے، جن کے نیون سائن جل بجھ رہے تھے۔

وہ آٹو رکشا سے اُتر کر ہوٹلوں کا جائزہ لینے کی خاطر پارک کے ساتھ فٹ پاتھ پر ہولیا۔ پارک میں بیٹھے اور لیٹے ہوئے بہت سے لوگ اُس وقت مٹھی چپی کروا رہے تھے اور پارک کے گرد چکر کھاتی ہوئی موٹر کاریں اور منی بسیں چہار جانب روشنی کی کمندیں پھینکتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

''بھائی صاحب! یہاں سے چوک دالگراں کتنی دور ہوگا؟'' اُس نے پارک کی ریلنگ کا سہارا

لیے ہوئے ایک بھلے مانس سے پوچھا۔

''قریب ہی تو ہے جی۔ اُن ہوٹلوں کے سامنے سے وہ جو سڑک دائیں ہاتھ جا رہی ہے، اُس پر ہو جائیں۔ چند قدم ہی ہوگا۔''

''جی اچھا۔'' وہ آگے بڑھ آیا۔

باپو سچ کہتے تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ اسٹیشن سے چند قدم پر چوک دنگراں۔ رشی بھون کے قریب لالہ جسونت کی حویلی۔ اُسی سڑک پر سارا کچھ اور آخر میں پُتنگ بھنڈار۔ سارا پیدل کا راستہ۔

رہائش کے لیے اُس نے جو ہوٹل چنا، اُسی کے سامنے والے منی چینجر سے اُس نے مزید کرنسی تبدیل کروالی اور ہوٹل کا رُخ کیا۔ اُس وقت پارک میں مٹھی چپی کرنے والے لڑکوں کے ہاتھوں میں تھامی تیل کی بوتلوں کی جھنکار صاف سنائی دے رہی تھی۔

دوسری منزل پر ہوٹل کا کمرہ خاصا کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ فوم کے گدے، کھڑکیوں پر بھاری پردے، ٹھنڈے گرم پانی کی ٹونٹیاں اور ٹائلڈ باتھ۔ ایسا ہوٹل تو جامع مسجد کے قرب و جوار میں ایک نہ ہوگا، ہاں البتہ کناٹ پیلس میں ضرور ہوں گے۔ نہا دھو کر ہال میں کھانا کھاتے ہوئے اُس نے سوچا۔

ہوٹل کے باہر اور لاؤنج میں چکا چوند روشنی کے سبب وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ زیادہ وقت نہیں گزرا، لیکن جب اُس نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ رات کے دس بج رہے ہیں۔

بہت دیر ہوگئی۔ باپو تو نو بجے سو جاتے ہیں اور اس وقت بھارت میں آدھ گھنٹے کے فرق کے ساتھ ساڑھے دس ہوں گے۔ خیریت کا فون تو کیا نہیں۔ اُس نے سوچا اور تیزی سے نکلا۔

پبلک کال آفس کے آپریٹر نے جب گھر کا نمبر ملا کر دیا تو باپو جاگ رہے تھے۔

''۔ ہیلو ۔ ہیلو باپو ۔ جی پہنچ گیا ۔ آپ ابھی تک جاگ ۔ جی بالکل ٹھیک ہوں ۔ آپ پلیٹ فارم پر کھانس رہے تھے، طبیعت تو ۔ جی رپورٹ کر دی ۔ آپ ٹھیک کہتے تھے، سب ویسے کا ویسا ہی ہے ۔ جی، ہوٹل سے چند قدم کی فاصلے پر ۔ ماتا جی سے بات ۔ جی مجھے یاد ہے چوک دنگراں سے سیدھی سڑک نکلے گی۔ تاج کمپنی، اسلامیہ کالج اور عرب ہوٹل پھر چوک برف خانہ اور گوالمنڈی سے پہلے دواخانہ حکیم اجمل ۔ جی مجھے یاد ہے، دارالاشاعت ۔ جی باپو ۔ باپو میں نے سب کچھ کاغذ پر لکھ رکھا ہے ۔ اب تو صبح ہی نکلوں گا ۔ جی حویلی سے ہو کر نکلوں گا۔ فکر نہ کریں۔ فون لمبا ہو رہا ہے ۔ سب ویسے کا ویسا ہی ہے باپو ۔ بس باپو۔''

اُس نے فون رکھ دیا۔ اچھا خاصا بل بن گیا تھا۔

خیر کوئی بات نہیں۔ باپو کی پریشانی تو ختم ہوئی۔ پبلک کال آفس سے ہوٹل تک آتے آتے اُس نے سوچا۔

کمرے میں آیا تو دروازے کو اندر سے لاک کرنے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے اسٹیشن کی

جانب کھلنے والی کھڑکی کے قریب کھڑا ہوگیا۔

رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اب نیچے سڑک پر ٹریفک کم ہوگئی تھی اور اسٹیشن کے سامنے والے پارک کے گرد روشنی کی کمندیں پڑ تو رہی تھیں پر ذرا رُک رُک کر۔

اچانک اُس کی نظریں پارک کے بیچوں بیچ ایستادہ روشن پہاڑ پر جم گئیں۔

''ارے، یہ کیا ہے؟''

پارک کے بیچ پہاڑ تھا اور اُس کے برابر میں ایک بہت بڑا میزائل آسمان کی سمت سر اُٹھائے کھڑا تھا۔

یہ سب دن کے اُجیارے میں تو نہیں تھا یہاں۔ یا شاید دن کو ہنگامہ بہت تھا ان کے گرداگرد، اس لیے نظر نہیں پڑی، ان پر۔

دن کو یہ پہاڑ یہاں پر تھا بھی یا نہیں؟ وہ مخمصے میں پڑ گیا۔

پارک میں پہاڑ اور میزائل چہار جانب سے پڑنے والی سرچ لائٹوں سے روشن تھے اور پارک کی مدھم روشنی میں جو لوگ شام کو چادریں تانے مٹھی چپی کروا رہے تھے، اب پہاڑ کے دامن میں بے حس وحرکت گٹھڑیوں کی صورت پڑے تھے۔ مٹھی چپی کرنے والے لڑکوں کے ہاتھوں میں تھامی تیل کی بوتلوں کی جھنکار اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوگیا۔ وہ سخت چکرایا ہوا تھا۔

پھر وہ کھڑکی سے دُور ہٹ آیا۔ اُس نے کمرے کی لائٹ بجھا دی اور بستر پر لیٹ گیا۔

بابو نے اُسے پاتھی گراؤنڈ کی طرف جانے سے منع کیا تھا لیکن وہ اَن دیکھے چوک دنگراں سے سیدھا اُدھر ہی کو ہولیا۔ رام گلی والے اسکول میں چھٹی کے بعد سارے بچے پاتھی گراؤنڈ میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔ او بالے، اے چندو — اُن کی مائیں چلا چلا کر اُنھیں کھانا کھانے کے لیے بلا رہی تھیں اور بچے، پسینے میں شرابور، جواب میں کہہ رہے تھے کہ نہیں کھانا، بس کھیلنے دو۔ اور سرائے سلطان کی جانب نکل جانے والی بسیں تھیں کہ بھوپو بجاتی ہوئی، قطار اندر قطار چلی جاتی تھیں۔

صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو خاصا دن چڑھ آیا تھا۔

ہوٹل کی لابی میں ناشتا کرنے کے دوران منیجر سے بات ہوئی تو اُس نے بتایا کہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے والے پارک میں چاغی کے اُس پہاڑ کا نمونہ دے دیا گیا ہے جو پاکستان کے پہلے ایٹمی تجربے میں اپنا رنگ بدل گیا تھا۔

''اوہ۔'' اُس نے گہرا سانس لیا۔

پھر منیجر نے اُسے لاہور کے تمام قابلِ دید مقامات کے نام کاغذ پر لکھوا دیے۔ بھاٹی گیٹ، مینار پاکستان، شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد... غرضے کہ بہت سے نام تھے۔

ہوٹل کی لابی سے اُٹھ کر جب وہ اپنے کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے گیا تو اُس نے سوچا حویلی تو قریب ہی ہے، محض چند قدم کے فاصلے پر... کسی بھی وقت جایا جاسکتا ہے وہاں۔ کیوں نا آٹو رکشا پکڑ کر پہلے چند قابلِ دید مقامات سے ہو آؤں۔

پھر یوں بھی بہت دن چڑھ آیا تھا۔ مارچ کا اخیر تھا اور دھوپ کی حدت بڑھ چلی تھی۔ اُس نے سوچا اور آٹو رکشا پکڑ کر نکل کھڑا ہوا۔

بھاٹی گیٹ کا علاقہ تو جامع مسجد پرانی دِلّی جیسا ہی تھا۔ جب گھومتا گھماتا مینار پاکستان پہنچا تو سورج عین سر پر آ گیا تھا۔

رنجیت سنگھ کی سمادھی سے ہو کر شاہی قلعے کا چکر لگایا اور حضوری باغ میں بادشاہی مسجد کے سامنے بیٹھ گیا۔

بھاٹی گیٹ سے مینار پاکستان پیدل چل کر آنے اور قلعے کی سیر کے بعد وہ قدرے تھک سا گیا تھا۔ واپسی پر آٹو رکشا پکڑتے ہوئے اُس نے انارکلی بازار اور پنجاب یونی ورسٹی جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ عجائب گھر جانے کی خواہش ضرور تھی۔

''بھائی، عجائب گھر چلو۔''

وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ملکہ وکٹوریہ کا ایک بہت بڑا پیتل کا مجسمہ عجائب گھر کے اندر رکھا ہے۔ کیا باپو بچپنے میں عجائب گھر آیا کرتے تھے یا کوئی اور مجسمہ ہے یہ؟ وہ تھوڑا سا گڑبڑایا۔ وقت بھی تو بہت گزر گیا۔ بہت ممکن ہے باپو بھول کر غلط جگہ بتا گئے ہوں۔ اُس نے سوچا۔

''بھائی، وائسرائے کا دفتر کہاں ہوگا؟'' اُس نے قریب ہی کھڑے عجائب گھر کے ایک اہلکار سے پوچھا۔

وائسرائے کا دفتر؟ نہیں معلوم کون سے دفتر کا پوچھ رہے ہیں آپ۔''

غلطی ہوگئی۔ پہلے کیوں نا ہو آیا ٹھنڈی سڑک کے چیئرنگ کراس سے۔ اُس نے احساسِ ندامت کے ساتھ سوچا۔

کوئی بات نہیں۔ اب چلتا ہوں ٹھنڈی سڑک کے چیئرنگ کراس پر۔

اُس نے عجائب گھر سے نکل کر آٹو رکشا روکا۔

''ٹھنڈی سڑک جانا ہے بھائی۔ چیئرنگ کراس لے چلو۔''

''جی؟ ٹھنڈی سڑک کا تو مجھے معلوم نہیں۔ چیئرنگ کراس پہنچا دیتا ہوں آپ کو۔ وہاں سے معلوم کر لیجیے گا ٹھنڈی سڑک کا بھی۔''

''چلو۔''

ابھی سورج نہیں ڈوبا تھا، اس کے باوجود سڑک کے دونوں اطراف میں جیسے روشنیوں کا

سیلاب اُمڈ آیا تھا۔

چیئرنگ کراس پہنچے تو وہاں نہ تو ٹھنڈی سڑک تھی نہ وائسرائے کا دفتر۔ چیئرنگ کراس پر کھڑے کھڑے اکا دُکا راہ گیروں سے پوچھا۔ کبھی اُس روشنیوں کے سیلاب میں نہائی ہوئی بڑی سڑک کو شاہراہِ قائداعظم یا مال روڈ بتاتے تھے اور وائسرائے کے دفتر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ چڑیا گھر کی موجودگی تو ثابت تھی لیکن چیئرنگ کراس کی ایک جانب واپڈا ہاؤس کی فلک بوس عمارت تھی اور دوسری جانب پنجاب اسمبلی ہال۔ چیئرنگ کراس کے تکونے احاطے میں پارک تو تھا لیکن اردگرد کا نقشہ وہ نہیں تھا جو باپو نے بار بار ذہن نشین کروایا تھا۔

پھر اُس نے چیئرنگ کراس کے اُس نیم روشن تکونے احاطے کے اندر جا کر دیکھا تو ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ غائب تھا اور اُس کی جگہ سنگِ مرمر سے تراشی گئی ایک بہت بڑی رحل دھری تھی اور اُس کے اوپر سنگِ مرمر سے تراشا گیا قرآن۔

وہ پیچھے ہٹ آیا۔

اب وہ اس بات پر حیران تھا کہ اگر یہی چیئرنگ کراس ہے تو ٹھنڈی سڑک کیا ہوئی، جس کے دونوں اطراف میں گھنے درخت تھے اور وائسرائے کا دفتر کدھر گیا۔

تو کیا باپو کی یادداشت گڑبڑ ہوگئی؟

آج کسی طور باپو کو فون کرنا نہیں بنتا۔ اُس نے سوچا۔

ٹھنڈی سڑک، ملکہ وکٹوریہ کے مجسمے اور وائسرائے کے دفتر کا چیئرنگ کراس سے غائب ہو جانا یقیناً اُن کے لیے صدمے کا باعث ہوگا۔

کل کر دوں گا فون، کوئی بہانہ بنا دوں گا۔ کہہ دوں گا کہ فون کی لائنیں نہیں مل رہی تھیں۔

اُس نے سوچا اور دیر تک چیئرنگ کراس پر ششدر کھڑا رہا۔

ہوٹل کی لابی میں رات کا کھانا کھاتے ہوئے اُس نے بیٹھے بیٹھے منیجر سے کہا، ”بھائی صاحب! مجھے وائسرائے کے دفتر جانا تھا، بہت ڈھونڈا پر نہیں ملا۔“

”کہاں جانا تھا؟“

”بھئی ٹھنڈی سڑک پر وائسرائے کا دفتر ہے نا۔“

”جی، کون سا دفتر؟ ابھی معلوم کیے دیتا ہوں — میں تو یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔“

پھر منیجر نے کام میں منہمک ایک ویٹر سے پوچھا اور سوچ میں ڈوبا رہا۔

”مجھے لاہور میں رہتے آٹھ دس برس تو ہو گئے، پر اس دفتر کا نام نہیں سنا میں نے۔ خیر معلوم کرلیں گے اور سنائیں آپ ہو آئے مینارِ پاکستان اور شاہی قلعے سے؟“

”جی، ہو آیا — کسی طرح معلوم کر کے بتائیے۔ میں نے جانا تھا اُدھر۔“

''ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔''

رات کو سوتے وقت اس خیال نے ڈھارس بندھائی کہ کل حویلی کا چکر لگے گا تو گلی محلے اور حویلی کی خیر خبر سن کر باپو خوش ہو جائیں گے۔

رات سوتے وقت اُس نے گھڑی پر الارم لگا دیا تھا تا کہ صبح اُٹھنے میں تاخیر نہ ہو اور دھوپ کی حدت بڑھنے سے پہلے ہی حویلی سے ہو آئے۔

صبح اُٹھ کر اُس نے دیر نہیں کی۔ واش روم سے جھٹ پٹ تیار ہو کر نکلا اور ہوٹل کی لابی میں چلا آیا۔ اُس وقت منیجر اپنی سیٹ پر نہیں تھا۔ پھر اُس نے ہلکا سا ناشتا کیا اور ہوٹل سے نکل کر باپو کے بتائے ہوئے راستے پر ہو لیا۔

باپو کی ہدایت کے عین مطابق اُس نے لنڈا بازار والی سڑک کے متوازی نکل جانے والی ریلوے روڈ ہی کو چنا لیکن دُور تک اُسے اُدھر کو جاتا نہ تو کوئی تانگا دکھائی دیا نہ سرائے سلطان کی جانب سے ریلوے اسٹیشن کی سمت آتی کوئی لاری دکھائی دی۔

وقت بھی تو بہت گزر گیا۔ اُس نے سوچا۔

اس کے باوجود راہ چلتے وہ کئی بار ٹھٹک کر رُکا لیکن اُس وقت سب جلدی میں تھے اور فٹ پاتھ کے برابر والی دکانیں ابھی کھلی نہ تھیں۔ وہ کس سے پوچھتا۔ بس چلتا گیا۔

جب ایک چورستے میں پہنچا ہے تو نان چنے کی ریڑھی کے گرداگرد ناشتا کرنے والوں کا ہجوم دیکھ کر رُک گیا۔

''بھائی صاحب! کیا یہی چوک دنگراں ہے؟ میں نے جانا تھا اُدھر۔''

یہ سن کر ناشتا کرتے ہوئے ایک بھاری تن و توش والا شخص خوش طبعی سے بولا، ''جانا نہیں تھا۔ آپ خیر سے چوک دنگراں پہنچ گئے۔ آؤ بسم اللہ، ناشتا کرو۔''

''جی ــ جی شکریہ۔ میرا مطلب ہے، سرائے سلطان کا لاری اڈا قریب ہی ہے کیا؟''

''سرائے سلطان کا لاری اڈا؟''

سب حیرانی سے بڑبڑائے اور اِک دُوجے کی جانب استعجابیہ انداز میں دیکھنے لگے۔

''چلیے یہ بتا دیجیے لالہ جسونت کی حویلی کس طرف کو ہے؟''

''لالہ جسونت کی حویلی؟''

ایک بار پھر سب کے سب حیرانی سے بڑبڑائے۔

''اچھا... کوئی بات نہیں۔ رشی بھون تو قریب ہی ہوگا۔''

''رشی بھون؟''

اب سارے کے سارے تعجب سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

وہ بوکھلا کر تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے بڑھ آیا۔

پھر جب تک چورستے کی ساری دکانیں نہیں کھل گئیں وہ اُسی بدحواسی میں کبھی دائیں اور کبھی بائیں اُسی بازار میں بھٹکتا پھرا۔ دوبارہ کسی سے پوچھنے کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

وہ مایوس ہو چلا تھا کہ اچانک اُس کی نظریں ایک کباڑ خانے کے چھجے سے ملحقہ بڑے سے محرابی گیٹ پر جم گئیں۔ اُس گیٹ کی کائی زدہ دیوار پر ''سرائے سلطان'' درج تھا۔ اُس کے نیچے نہ پڑھی جاسکنے والی کوئی سنہ لکھی تھی۔

خوشی کی ایک لہر سی اُٹھی، جس نے اُس کے بدن میں بجلی سی بھر دی۔

وہ کباڑ خانے کی جانب یوں بڑھا جیسے سب کچھ پالیا۔

سرائے سلطان کے محرابی دروازے کے اندر نیم تاریک کباڑ خانے میں ایک خمیدہ کمر بڈھا کباڑ کے ڈھیر سے اشیا کی چھانٹی کا کام کر رہا تھا۔

''بابا جی سلام! یہی سرائے سلطان ہے نا؟''

''ہاں — کبھی تھی۔''

خمیدہ کمر کباڑیے نے اُس کی جانب مُڑ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔

''بابا جی، کیا یہی لاری اڈہ تھا پہلے؟''

ہاں، تھا۔ پُرانی بات ہے۔''

''میں لالہ جسونت کا پوتا ہوں بابا جی — دِلّی سے آیا ہوں۔''

''کیا کہا — لالہ جسونت؟''

بڈھا کباڑیا کام چھوڑ کر مڑا اور اُس کے بیٹھنے کو مونڈھا آگے کو سرکایا۔

''جی میں لالہ جسونت کا پوتا ہوں۔ حویلی جانا تھا۔ باپو نے بتایا تھا کہ رشی بھون کے قریب چوک ہی میں ہے کہیں۔''

اُس نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں — لالہ جسونت کی حویلی — پر اب کیا جاؤ گے حویلی۔ وہاں تو خرادیے بیٹھ گئے۔ اِس چوک سے بائیں ہاتھ امام باڑے کا علَم دکھائی دے گا۔ اُس سے ذرا پہلے خراد کا کارخانہ ہے۔ وہی حویلی تھی، لالہ جسونت کی۔''

''اوہ — کیا سب کچھ ختم ہوگیا بابا جی؟''

''نہیں — عمارت موجود ہے۔ پر اب وہاں کوئی رہتا نہیں۔ خرادیے جو بیٹھ گئے — چائے پیو گے؟''

''اور رشی بھون بابا جی؟''

"پی لو چائے، دور سے آئے ہو، کوک، فانٹا پیو گے؟"

"بابا جی، بہت مہربانی آپ کی۔ ابھی ناشتا کر کے آیا ہوں۔ چلوں گا۔ آپ کام کیجیے۔ آگے بھی جانا ہے مجھے، گوالمنڈی کی طرف ۔ رشی بھون کا تو بتایا نہیں آپ نے۔"

"بیٹا، بتایا تو ہے ۔ تمھاری حویلی کے برابر والا امام باڑہ ہی کبھی رشی بھون تھا۔ سن سینتالیس کے بعد محکمہ اوقاف والوں نے بڑی مدت بند رکھا۔۔۔ پھر امام باڑہ بن گیا۔"

یہ سن کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا لیکن ٹانگوں میں جیسے جان نہیں تھی۔

"بیٹھو نا بیٹا۔"

"بس بابا جی۔ کچھ کام ہیں چھوٹے موٹے۔ اب چلتا ہوں۔ نمسکار۔"

"جیتے رہو۔"

کباڑی بابا نے دوبارہ کباڑ کے ڈھیر سے چھانٹی کا کام شروع کر دیا۔

جب وہ سامان سے لدے پھندے ریڑھوں اور دھواں اگلتے آٹو رکشوں میں سے رستہ بناتا، ڈولتا سنبھلتا چوک سے بائیں مڑا تو سامنے امام باڑہ تھا۔

اُس نے وہ چند قدم کا فاصلہ صدیوں میں طے کیا اور امام باڑے کی برابر والی بوسیدہ حویلی کی ڈیوڑھی کے سامنے دیر تلک کھڑا رہا۔ اندر مشینوں پر خرادیے جھکے ہوئے تھے اور مشینوں سے چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔ لوہے کو لوہا کاٹ رہا تھا۔

اُس نے وہیں کھڑے کھڑے رشی بھون پر نگاہ کی۔

امام باڑے کے اُوپر سیاہ علم لہرا رہا تھا اور پرانی عمارت نئے سرے سے پلستر کر کے رنگ دی گئی تھی۔

وہ پلٹا اور چوک دلگراں سے ہوتا ہوا گوالمنڈی کی جانب چل دیا۔

سامنے والے ایک خستہ مکان کی ممٹی پر کبوتر بیٹھے تھے۔ کیا پتا ان کبوتروں میں شیرازی، لقا اور لوٹن کبوتر بھی ہوں۔ اُس نے سوچا۔

چلتے چلتے تاج کمپنی کے صدر دروازے پر نگاہ پڑی تو اُس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ میں سے شادمانی کی ایک لہر اُٹھی اور ساتھ ہی دم توڑ گئی۔ اُس نے تاج کمپنی کی گرانڈیل بلڈنگ کی بیرونی دیوار پر آویزاں نیلامی کا اشتہار پڑھ لیا تھا۔

آگے دائیں ہاتھ اسلامیہ کالج تو موجود تھا لیکن اُس کے سامنے عرب ہوٹل کا نشان تک نہ تھا۔ جستی پائپ، سینیٹری اور ربڑ کی دو طرفہ دکانیں تھیں اور بس۔ معلوم کیا تو پتا چلا کہ برسا برس ہو گئے عرب ہوٹل کو ختم ہوئے۔ ساتھ ہی رام گلی تھی۔ وہ اُدھر کو مڑ گیا۔

رام گلی کی وہی پرانی بالکونیاں، جو باپو کی یادوں میں آباد تھیں، اب منہدم ہونے کو تھیں۔

رام گلی میں آگے چل کر ایک اسکول دکھائی دیا، جو اب مسلم ماڈل اسکول بن چکا تھا۔ عمارت پرانی تھی۔ یقیناً باپو، اسی اسکول میں بالا اور چندو لوگوں کے ہم جماعت رہے ہوں گے۔ اُس نے خیال کیا۔ اُس وقت اسکول کا گیٹ بند تھا اور بچوں کی بھاگا بھاگ سے پیدا ہونے والی ہلچل پوری گلی میں محسوس کی جارہی تھی۔

چوک برف خانہ سے آگے دواخانہ حکیم اجمل خاں تو موجود تھا لیکن دُور ونزدیک کسی پُتنگ بھنڈار کا وجود نہ تھا۔ اُسی علاقے کے دکان داروں سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ گزشتہ برس دارالاشاعت پنجاب کی عمارت گرادی گئی، جو ایک مدت سے اُجاڑ پڑی تھی۔

اب دارالاشاعت کی جگہ ایک نوتعمیر شدہ پلازہ کھڑا تھا، ”حمزہ سینٹر“ کے نام سے۔ جس کے اندر جستی پائپ، سینیٹری کے سامان اور ربڑ کی شیٹوں کے انبار لگے تھے۔

ذرا فاصلے سے کھڑے ہو کر اُس نے نوتعمیر شدہ عمارت پر نظر ڈالی تاکہ باپو کو بتا سکے کہ وہ جگہ کیسی تھی۔

پھر اچانک اُس کی نظریں حمزہ پلازہ کی بیرونی دیوار اور بجلی کے کھمبے کے بیچ جھولتے ہوئے کینوس کے ایک بہت بڑے اشتہار پر جم گئیں۔ پر اُردو میں کم زور ہونے کے سبب اُس سے پورا اشتہار پڑھا نہیں گیا۔ لکھا تھا:

چلو چلو، ملتان چلو
تین روزہ سنّتوں بھرا اجتماع
شیر شاہ بائی پاس صحرائے مدینہ، ملتان
فرزندانِ اسلام کے قافلوں کا سلسلہ جاری ہے

وہ تھکے تھکے قدم اُٹھاتا ہوٹل کی جانب پلٹ پڑا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ آج باپو کو فون بھی کرنا ہے۔

اب اُس کی مشکل یہ تھی کہ باپو کو کیا بتائے اور کیا نہ بتائے۔

ہوٹل کی لابی میں پہنچا تو وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”آج تو آپ سویرے سویرے ہی نکل لیے۔ کہاں کہاں کا چکر لگا؟“ منیجر نے خوش مزاجی سے پوچھا۔

”سبھی جگہوں سے ہو آیا، منیجر صاحب۔ بہت تھک گیا۔ آج بیٹھوں گا نہیں، کھانا اُوپر ہی بھجوا دیجیے گا۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟“

”ہاں، ٹھیک ہوں۔ بس ذرا تھک گیا۔“ اُس نے کمرے کی چابی وصول کرتے ہوئے اُوپر کا رُخ کیا۔

سارا دن کمرے ہی میں گزار کر جب وہ نیچے آیا تو شام گہری ہو چلی تھی۔

منیجر نے اُسے دیکھ کر دُور سے ہاتھ ہلایا لیکن وہ لابی میں نہیں رُکا اور باہر نکل آیا۔

جب پبلک کال آفس کے آپریٹر نے اُسے دہلی فون ملا کر دیا تو گزشتہ کل، فون نہ کرنے پر باپو ناراض ہو رہے تھے۔

''۔ لیکن باپو، آج میں ہو آیا حویلی سے ۔ سب ویسے کا ویسا ہی ہے باپو ۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا ۔ میں تو حیران ہوں باپو کہ چوک دلگراں اور رام گلی کے سارے ورشٹ ناگرک، دادا جان کو ابھی تک نہیں بھولے ۔ اقبال گجر جنھیں آپ بالا کہتے ہیں نا، وہ زندہ اور صحت مند ہیں۔ ملے تھے بہت محبت سے ۔ کہہ رہے تھے کہ تیرے پتاجی تو مجھ سے دو چار ماہ چھوٹے ہی ہوں گے، وہ بوڑھے اور کم زور کس طرح ہو سکتے ہیں۔ پھر اُنھوں نے آپ کی صحت کے لیے بھگوان سے پرارتھنا بھی کی ۔ حویلی والے خاندانی لوگ ہیں باپو۔ مجھے اپنے ہی ہاں ٹھہرنے کو کہہ رہے تھے پر میں ہوٹل ہی میں ٹھہروں گا ۔ باپو، میں اندر گیا تھا حویلی کے صحن میں۔ برآمدے کی پرچھتی کے نیچے اب تخت پوش تو نہیں ۔ زمانہ بھی تو بہت گزر گیا نا ۔ پر صحن کا کنواں ویسے کا ویسا ہی ہے، جیسا آپ نے بتایا تھا ۔ بس کنوئیں پر موٹر لگا لی اُنھوں نے۔ اُوپر چھجے پر کبوتر بھی تھے ۔ رشی بھون کی سُندرتا دیکھنے کے قابل ہے باپو ۔ مندر میں پرارتھنا اور دین دھرم کے معاملے میں کوئی پابندی نہیں، دان پُن بھی بہت کیا جاتا ہے ۔ سب ویسے کا ویسا ہی باپو ۔ واپسی پر سب بتاؤں گا ۔ دو چار دن میں سیر کر کے آ جاؤں گا ۔ زیادہ نہیں رُکنا ۔ ٹھیک ہے باپو۔''

بات جاری تھی پر اُس نے خود ہی فون بند کر دیا۔

''ایک بوجھ اُتر گیا۔'' وہ بڑبڑایا۔

ہوٹل پلٹ کر اُس نے لابی میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور کچھ دیر منیجر سے گپ شپ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دوپہر سے شام تلک سوچ بچار کرنے اور بے کلی سے کمرے میں ٹہلتے رہنے کے باعث وہ تھک گیا تھا۔ بستر پر لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد سو گیا۔

اُس نے دیکھا کہ گرمیوں کا موسم ہے اور ہر طرف گرم لُو چل رہی ہے۔ ایسے میں ٹھنڈی سڑک پر دو رویہ درختوں کی گھنی چھاؤں میں لوگ بیٹھے ستا رہے ہیں اور چیئرنگ کراس کے تکونے احاطے کے بیچ ٹھنڈے سائے میں باپو کروٹ لیے لیٹے ہیں۔ اس بات سے بے نیاز کہ وہ ٹھنڈا سایہ ملکہ وکٹوریہ کے مجسمے کا ہے یا سنگ مرمر سے تراشی گئی رحل کا۔

☆☆☆

محمد حمید شاہد

کیس ہسٹری سے باہر قتل

سب ڈاکٹرز ایک دوسرے سے کسی نہ کسی بحث میں بُجتے ہوئے تھے سوائے ڈاکٹر نوشین کے، جس کے پورے بدن میں دوڑنے والی بے کلی اتنی شدت سے گونج رہی تھی کہ وہ بلانے والوں کو 'ہیلو ہائے' سے آگے کچھ نہ کہہ پاتی تھی۔ اس نے قصداً اپنی اس کیفیت پر قابو پایا اور ایک نظر بیضوی میز کو گھیرے اپنے کولیگز پر ڈالی جو سرکتی، پھسلتی سامنے کینوس کی دیوار پر پہنچی اور وہیں ٹھہر گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہاں اس کے اپنی کیس ہسٹری کی سلائیڈز چل رہی تھیں۔

وہ مصروف عورت تھی، صبح پنڈی والی شاخ میں اور شام یہاں۔ اس کا شوہر بھی مصروف آدمی تھا جس نے اپنے ہنر اور فرض کو کمال نفاست اور عجب ہوشیاری سے سرمایہ کاری بنا ڈالا تھا۔ شروع شروع میں دونوں کی یہ بے پناہ مصروفیت کام کی لگن کی وجہ سے تھی پھر اس میں بہت سارے خواب شامل ہو گئے۔ دونوں ان خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے میں یوں الجھے کہ ایک دوسرے کے لیے جینے کا تصور ان کے ہاں سے معدوم ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ انھیں بھول ہی گیا کہ ایک دوسرے کے لیے پریشان کیسے ہوا جاتا ہے، بے نتیجہ باتوں سے لطف کیسے کشید کیا جاتا ہے اور بلا سبب کیسے ہنسا جاتا ہے۔

ان کا ایک ہی بیٹا تھا نبیل۔ اس کی ایجوکیشن کا مرحلہ آیا تو اس وقت تک کوالٹی ایجوکیشن کی ڈھنڈیا پڑ چکی تھی۔ اس نئی وبا کی اپنی ضروریات اور تقاضے تھے، جو دونوں کو پورے کرنا تھے اور جس نے انھیں اس قدر الجھایا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے فکری سے بات کرنے کو بھی ترس گئے حتیٰ کہ یہ مصروفیت ان کے وجود میں اتر گئی۔ گھر بن گیا، خوب صورت اور بڑا، ویسا ہی جیسا وہ چاہتے تھے۔ کلینک بنا جو بعدازاں کئی بستروں کے ہسپتال میں کنورٹ ہوگیا، اس کی شاخ ایک پنڈی میں بھی کھل گئی اور بیٹا پڑھنے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔

شروع شروع میں نبیل سے فون پر بات ہو جاتی تھی، بعد میں وقفے پڑنے لگے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ رابطہ معطل ہو کر رہ گیا۔ جب اسے وہیں اپنی مرضی کی جاب اور لڑکی دونوں مل گئیں

تو یہ سلسلہ بہت جلد موقوف ہو گیا۔ ادھر سے فون چلا جاتا تو کرنے کو کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ اگر ادھر سے کوئی کرید کی جاتی یا اس کی آواز سننے کو یوں ہی بات بڑھائی جاتی تو نبیل یہ کہہ کر بات ختم کر دیتا تھا کہ اس بارے میں ای میل کر دے گا۔

اس کا میل باکس ہر روز رنگ رنگ کی میلز سے بھر جاتا تھا جن میں چند ہی اس کے اپنے پروفیشن سے متعلق ہوتیں۔ بیش تر کو ان وانٹڈ کے زمرے میں ڈالا جا سکتا تھا۔ اس نے شروع میں اپنے بیٹے کی ای میلز لینے کے لیے ہاٹ میل پر جا کر یہ اکاؤنٹ بنایا تھا، اور روز ہی اسے کھول کر دیکھتی تھی۔ اس پر اس نے بیٹے کی کچھ ای میلز موصول بھی کیں مگر جب یہ باکس زیادہ تر خالی کنستر کی طرح بجنے لگا تو اس نے اس پر اپنے شعبے سے متعلق الیکٹرانک جریدے منگوانے شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی آلائشیں بھی آنے لگیں جنھیں وہ پہلے تجسس سے دیکھا کرتی مگر بعد میں دیکھے بغیر ہی ڈیلیٹ کر دیتی کہ ان میں دکھایا جانے والا ہر جسم اسے اپنے شوہر کے جسم کی طرح بے ہودہ اور پھسپھسا لگتا جب کہ ہر عورت کا وجود بالآخر اس کے اپنے وجود کی طرح باسی ہو جاتا تھا۔

"جی ڈاکٹر نوشین!"

ایک آواز نے براہِ راست اسے مخاطب کر کے چونکا دیا تھا۔

یہ ڈاکٹر نعمان تھا، جس کے آتے ہی سب اپنی باتوں سے نکل آئے تھے اور اب تعظیم کے لیے اٹھنا چاہتے تھے، مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تو رکوع ہی سے لوٹ گئے تھے۔

ڈاکٹر نوشین کو اپنے دھیان سے نکلنے اور سنبھلنے میں کچھ وقت لگا، تاہم اس اثنا میں وہ اپنی سیٹ سے کھڑی ہو چکی تھی اور اندازہ لگا چکی تھی کہ اسے کیس کی پریذنٹیشن کا کاشن دیا جا چکا تھا۔

یہ کیس ڈاکٹر نوشین نے بورڈ کو ریفر کیا تھا لہٰذا اس کا نام لے کر ڈاکٹر نعمان کا "جی" کہنا اس کے لیے اتنا غیر متوقع نہ ہونا چاہیے تھا۔ شاید ڈاکٹر نعمان پوری طرح بیٹھ چکنے کے بعد، حسبِ عادت مسکرا کر اور سب کی طرف دیکھنے کے بعد ایسا کہتا تو تب تک وہ سنبھل چکی ہوتی اور یوں نہ بوکھلاتی۔ اس نے بہت جلد بھانپ لیا کہ اس کا "جی" کہہ کر فوراً ہی میٹنگ شروع کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ بہت جلدی میں تھا۔

یہ جلدی دونوں کے وجود میں اتری ہوئی تھی مگر اس کیس کے بارے میں ڈاکٹر نوشین کا خیال تھا کہ یہ جلدی کا نہ تھا، پوری توجہ چاہتا تھا۔

اس امید پر کہ شاید آنے والے لمحات میں ڈاکٹر نعمان طبیعت سے چھلک پڑنے والی عجلت کو جھٹک کر اس کیس کو انہماک دینے کے قابل ہو جائے، اپنی الجھن کو جھٹک دیا۔ سب جانتے تھے کہ معمولی اور غیر معمولی باتوں کی تفصیلات، جو مریض یا پھر کنسلٹ کرنے والا کوئی ڈاکٹر کسی کیس کے بارے میں دینا چاہتا، تھا ڈاکٹر نعمان اسے سننے کو پوری توجہ سے تیار ملا کرتا تھا کہ بہ قول اس کے ان ہی میں بہت سی

پیچیدگیوں کی کنجی ہوتی تھی۔ وہ اپنے جونیئرز کو بھی کیس ہسٹری توجہ سے لینے اور اس پر بھرپور توجہ دینے کی تلقین کیا کرتا تھا جن میں سے اکثر عام سی، بے رس یا پھر غیر متعلق باتوں سے جلد ہی اوب جایا کرتے تھے۔

"عین آغاز میں صرف سننا ہی ایک مفید کیس ہسٹری کی بنیاد بن سکتا ہے۔"

یہ ڈاکٹر نعمان کا نقطہ نظر تھا۔ سوالات کی اہمیت سے اسے انکار نہیں تھا مگر اس کا خیال تھا کہ عموماً عصبی مریض اپنی خالص ذہنی پراگندگی کو تشخیص سے پہلے ہی انھی سوالات کے نتیجے میں کوئی اور جہت دے کر الجھا سکتے تھے۔ اس کا اپنا تجزیہ تھا کہ سائیکو اینل سز کے دورانیے میں بہت سے پے شنٹ اپنے معالج کے بے جا سوالات سے کانشس ہو کر نفسی لذتیت میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے یا پھر نفسیاتی ایذا پرستی کو وتیرہ کر کے سائیکو ڈرامے پر اتر آتے تھے۔

ڈاکٹر نعمان نے اس کیس کی ساری ہسٹری پڑھ ڈالی تھی اور اسے بورڈ کے سامنے رکھنے سے ہچکچا رہا تھا کہ اس کیس میں کوئی کمپلی کیشن تھی نہ سویرٹی۔ مریض کو صرف پراپر کونسلنگ اور میڈیسن تھراپی چاہیے تھی۔ اس نے ڈاکٹر نوشین کو بلا کر اس حوالے سے کچھ مشورے بھی دینا چاہے مگر وہ اس روز لگ بھگ اتنی ہی اکتائی ہوئی تھی جتنا کہ ڈاکٹر نعمان میٹنگ والے روز نظر آ رہا تھا۔ وہ ٹیم ورک کا حامی تھا، لہٰذا اس کی ساری ٹیم اسے باس کی بجائے ایک محترم دوست کی طرح سمجھتی تھی اور یہ طرز عمل اس اسپتال کے حق میں خوب جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نوشین کا اکھڑا ہوا مزاج دیکھ کر اس کی تجویز کو تب تو مان لیا گیا مگر وہ اندر سے اُچاٹا ہوا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ یہ مریض اتنی توجہ اور ڈاکٹرز کے قیمتی ٹائم کو افورڈ اسی صورت میں کر سکتی تھی کہ اسے ڈاکٹر نوشین کے علاوہ کوئی اور فالو کرتا۔ ڈاکٹر نوشین اس کیس میں اموشنلی انوالو ہو گئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر نعمان کو بتایا تھا کہ یہ یونی ورسٹی کے زمانے میں اس کی کلاس فیلو رہی تھی۔

سامنے والی اس نشست تک جاتے جاتے کہ جہاں سے اسے پریذنٹیشن کرنا تھی، وہ بے طرح چمٹ جانے والی اس بے اطمینانی کو دل سے کھرچنے کے جتن کرتی رہی جو ڈاکٹر نعمان کے اکتائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہی اس کے اندر اتر گئی تھی۔ اس کے لیے اس نے یہ حیلہ کیا کہ اس نے ڈاکٹر نعمان کے چہرے کی طرف دیکھنا ہی موقوف کر دیا۔ اس کے سامنے ٹیبل پر وہ لیپ ٹاپ پڑا تھا جس کے سی پی یو سے ملٹی میڈیا کو کنکٹنگ لیڈ کے ذریعے جوڑ دیا گیا تھا۔ اس نے گھوم کر دیوار سے لگے اپنے اسسٹنٹ کو دیکھا تو اس نے ہال کی باقی روشنیاں مدہم کر دیں۔ اب ڈاکٹر نوشین میں حوصلے اور خود اعتمادی کا تحرک پیدا ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نعمان کے چہرے سے جو عجلت اس نے بجتی دیکھی تھی اب وہ کہیں نہیں تھی۔ ہال کی مدہم روشنی نے، ملٹی میڈیا سے نکل کر کینوس کی دیوار پر پڑتی دودھیا تصویر نے یا پھر اس کے اپنے تصور نے جواب پوری طرح مربوط ہو گیا تھا سب کے چہروں پر دھندلاہٹ مل دی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ایسی لمبی تصویر دیکھ رہی تھی جس میں ابھرے ہوئے سارے نقوش اس نے میلی

روشنی کے ریزرے رگڑ رگڑ کر خود ہی مٹا ڈالے تھے۔

سامنے کینوس پر پڑنے والی روشنی کے اندر سے انگریزی کے حروف زوم اِن ہوئے۔ پاور پوائنٹ میں بنی ہوئی پریذنٹیشن کی پہلی سلائیڈ کے متحرک الفاظ جوں ہی پوری طرح ساکت ہوئے ڈاکٹر نوشین نے ذرا سا کھانس کر سب کی توجہ چاہی اور امید ظاہر کی کہ ان کی دل چسپی اور توجہ سے وہ اس کیس کو پوری طرح ایکس پلین کر پائے گی۔

سب کی نظریں اب سامنے اجلے کینوس کی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ پہلی سلائیڈ صرف اس عنوان کی تھی:

''معالجین کے بورڈ کے لیے کیس ہسٹری کی تلخیص''

دوسری سلائیڈ میں ابتدائی نوعیت کی معلومات کے باوصف، خلاف معمول قدرے کم طاقت کے ڈجیٹل کیمرے سے کھینچی گئی ایک عورت کی رنگین تصویر بھی تھی۔ معصوم سا چہرہ، نیچے دی گئی عبارت کی طرف متوجہ ہونے سے روک رہا تھا۔

ڈاکٹر نوشین کی آواز سارے میں ایک لذت بھری سسکاری کی طرح گونج رہی تھی:

''یہ ہے وہ عورت جس کی کیس ہسٹری آج ہماری پریذنٹیشن کا موضوع ہے۔''

اس نے اضافہ کیا:

''یہ تصویر میں نے اپنے سیل کیمرے سے لی ہے۔''

ایسا کہتے ہوئے اس کی آواز میں ایک عجب طرح کی اپنائیت بھر گئی تھی۔ تصویر کے نیچے کی معلومات کو ڈاکٹر نوشین نے ویسے ہی پڑھ دیا جیسے کہ وہ سلائیڈ پر دی گئی تھیں:

نام: نفیسہ بیگم

عمر: سینتالیس سال

جسمانی ساخت: قد پانچ فٹ پانچ انچ، وزن ایک سو سینتالیس پونڈ، رنگ سنہری مائل گورا، جلد صاف اور چمک دار

جسمانی صحت: بظاہر کسی بیماری کے آثار نہیں، بلکہ قابل رشک حد تک صحت مند بدن

ازدواجی حیثیت: بیوہ

کیس کی نوعیت: دل کے دورے سے مر جانے والے اپنے شوہر کے بارے میں مریضہ کو یقین کی حد تک وہم ہو گیا ہے کہ اسے اس نے قتل کیا ہے۔

عین آخری سطر کو پڑھتے ہوئے اس نے ایک سرگوشی سنی:

''مورونزم (moronism) کا کیس لگتا ہے۔''

اسے جان لینے میں قطعاً دیر نہ لگی تھی کہ یہ آواز ڈاکٹر انیس کی تھی۔

ڈاکٹر انیس کے مزاج میں پارہ بھرا ہوا تھا۔ فیصلہ دینے اور اندازے قائم کرنے میں ہمیشہ پھرتی دکھاتا اور اپنا فیصلہ بدلنے میں بھی اسے کوئی تردد نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نوشین بالعموم اس کی اس طرح کی باتوں کو اگنور کر دیا کرتی تھی مگر اس روز اسے نظر انداز نہ کر سکی اور لفظ چبا چبا کر کہا:

''نو، ڈاکٹر انیس، ناٹ ایٹ آل۔ یہ کیس طفل دماغی کا نہیں ہے۔ اور خدارا بچوں کی سی جلد بازی سے گریز کیجیے۔''

ڈاکٹر انیس نے اسے خود پر براہ راست حملہ جانا، تاہم وہ اس حملے سے پوری طرح سنبھل نہ پایا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اسے لگا جیسے سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے، کھسیانا ہو کر فوری طور پر اپنی پوزیشن واضح کرنا چاہی۔

''ڈاکٹر نوشین، میں فزیانومی (physiognomy) کو بھی قابل اعتماد علم مانتا ہوں اور آپ کی کھینچی ہوئی تصویر میں اس عورت کا چہرہ بچے کی طرح معصوم لگتا ہے، ایسے بچے کی طرح جس نے بلوغت نہ دیکھی ہو۔ یہ تصویر اس عورت کی ذہنی کیفیت بھی واضح .....''

''نو کمنٹس ڈاکٹر انیس۔''

ڈاکٹر نعمان نے اسے بات پوری نہ کرنے دی اور کیس کو مکمل طور پر سن لینے کی تلقین کی۔ ڈاکٹر نوشین نے سر جھکا اور اگلی سلائیڈ پر آ گئی۔ بعد میں آنے والی ہر سلائیڈ پر بلٹ فارم میں انفرادی جملوں کی صورت اہم اشارے دے دیے گئے تھے تاہم ان نامکمل جملوں سے ڈاکٹر نوشین نے ایک کہانی مکمل کر دی۔

ڈاکٹر نعمان کے لیے یہ کہانی وہ کیس ہسٹری نہیں تھی جو ڈاکٹر نوشین کی آواز سنا رہی تھی۔ وہ تو اس آواز میں اُترا ہوا تھا جو ایک اور عورت کے وجود میں پوری طرح اتری ہوئی تھی۔ اور جب ڈاکٹر نوشین نے عین آغاز میں یہ کہا تھا کہ یہ آج کے عہد کی ایک متروک مگر ناگزیر عورت کا کیس ہے تو وہ بہت دیر تک ان جملوں کو معنی دینے میں الجھا رہا۔

۲

گھر کی جھاڑ پونچھ سے جوں ہی وہ فارغ ہوتی اسے ہانڈی روٹی کا اہتمام کرنا ہوتا تھا۔ اس کا شوہر انور عین دو بجے گھر کھانے پر پہنچ جایا کرتا تھا۔

یہ شروع ہی سے اس کا معمول تھا اور اس معمول کے ساتھ اس نے خود کو یوں ڈھال لیا تھا جیسے گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کرتی ہر بار ایک خاص وقت پر اپنے لیے مخصوص مقام پر پہنچتی تھی۔

دو بجے کھانا، پانچ بجے چائے اور ٹھیک آٹھ بجے پھر کھانا اور کھانے کے بعد باہر سڑک پر کچھ دور تک چلنا، جی بھر کر باتیں کرنا، کسی بھی موضوع پر یا پھر بے سبب ہنسنا اور قہقہے لگانا، واپسی پر انور کے پہلو میں ڈھیہ جانا حتی کہ وہ اسے یوں ہی لیٹے رہنے پر مجبور کر دیے یا پھر خود ہی آنکھیں بند کر کے حلقوم

سے خرخراہٹیں اگلنے لگے ۔ دوسری صورت میں وہ بغیر آہٹ کیے پھر کچن میں گھس جاتی، گندے برتن صاف کر کے سلیقے سے رکھتی اور اس کے ساتھ نیند میں اس کی شریک ہو جاتی ۔ جب کہ پہلی صورت میں اگلی صبح اسے اس کے جاگنے سے بہت پہلے اٹھنا پڑتا تھا، غسل، نماز اور اس کے بعد انور کے لیے لمبی دعائیں...... پھر وہی کچن...... حتیٰ کہ رات ادھر ادھر ہو جانے والی ساری ترتیب صحیح صحیح بیٹھ جاتی تھی۔

یہ سب اس کے لیے عبادت کا سا ہو گیا تھا تب ہی تو اس گھر کی ایک ایک چیز سے انور کو اس کی محبت خوش بو اور نور کی طرح پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے سارے معمولات اس کے اندر سیکنڈ ظاہر کرنے والے نشانات کی طرح سما گئے تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک ہی محور پر گھومتی رات دن کی مسافت کو تین پہروں میں بانٹ رکھا تھا جو ایک خاص رفتار اور ڈھنگ سے گزرتے ۔ ان پہروں کے دورانیے میں یکسوئی سے اپنے معمولات کا حصہ ہو جاتی اور سانس لینا بھی بھول جاتی تھی۔ تاہم ایک پہر کٹتا اور پلٹ کر دیکھتی تو سرشاری کی مہک اس کے بدن کو اجال دیتی تھی ۔ ہر پہر کے آخر میں انور کو ایک ٹک بے ریا محبت سے دیکھتے رہنا، سانسوں کو پوری طرح سینے میں ہموار کر لینے کے لیے کافی تھا۔ اس طرح وہ ایک اور نئے پہر کو اپنے کامل انہماک سے کاٹ ڈالنے کے لیے تیار ہو جاتی تھی ۔

وہ انور کے بارے یقین کی جس دولت سے مالا مال تھی اسی یقین کو ایمان بنائے رکھنا چاہتی تھی۔

جب اس کے آنے کا وقت ہو جاتا تھا تو وہ اپنے اس ایمان کو تازہ رکھنے یا پھر اپنے خوابیدہ ماحول کو استقبال کے لیے کچوکے لگا کر تیار کرنے کو دھیرے سے کہہ دیا کرتی تھی ۔

''دھوپ، بارش، آندھی، طوفان ناس مارے کس میں ہمت ہے کہ انھیں روک لے ۔''

مگر اس روز جب وہ اپنے آپ یہ بڑبڑائی تھی اس کی آواز میں ایک نامانوس سی تلخی بھی شامل ہو گئی تھی جس نے اس کی آواز کو قدرے بلند کر دیا تھا۔ اپنی ہی اجنبی سی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک کر کھسیانی ہوئی ۔ اس نے بے اختیار باہر کی سمت نگاہ کی ۔ ابھی انور نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا اور اپنے کام میں پہلے کی طرح مگن ہو گئی۔

اسے اب کچھ زیادہ وقت نہیں چاہیے تھا۔

جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے وہ اس گھر کو سیدھا کرنے میں جتی ہوئی تھی ۔ چیزیں یہاں وہاں ڈھنگ سے رکھتے رکھتے وہ بے سدھ سی ہو جاتی تھی، تاہم ہمت کر کے اسے اٹھ کھڑا ہونا پڑتا کہ اپنے مزاج کے مطابق اشیا کو نہ دیکھ کر وہ چین سے لیٹ بھی تو نہ سکتی تھی ۔ وہ چیزیں گھسیٹ گھسیٹ کر ان کی ترتیب بدلتی رہی حتیٰ کہ اس کی اپنی کمر دوہری ہونے لگی ۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بستر پر گر گئی ۔ اسے اونگھ آ گئی مگر خواب میں بھی ایک ہی ایڑھی پر گھومتی رہی اور اسے اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ کتنا وقت گزر چکا تھا۔ باہر کسی کی گاڑی نے ہارن دیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھی، چونک کر گھڑی کو دیکھا، اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ اس کے شوہر کے آنے میں محض بیس منٹ رہ گئے تھے ۔

وہ خوف زدہ نہیں تھی، یہ تو سدھائی ہوئی محبت کا شاخسانہ تھا کہ معمول کے ٹھیک نہ بیٹھنے سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

ایک چولھے پر کوکر دھرا تھا دوسرے کا برنر ٹھیک طرح سے کام نہ کرتا تھا ذرا سی گیس کم کھولو تو شعلہ بھک کر کے بجھ جاتا۔ شعلہ بڑھائے رکھو تو توے کا وسطی حصہ جو کثرتِ استعمال سے پتلا ہو گیا، بہت تپ جاتا تھا، اتنا کہ ادھر چپاتی ڈالو ادھر رنگ سنہرا ہوا اور چپاتی درمیانی حصے سے پھولنا شروع ہو جاتی۔ کنارے اتنا جلدی پکتے نہ تھے لہٰذا اسے ایک ہاتھ بار بار توے کے تپتے ہوئے کڑے پر رکھنے کے لیے تاکی اٹھانا پڑتی جو ہر بار چولھے کے نیچے کھسک جاتی۔ اسے اس کا اندازہ ہو جاتا تھا، لہٰذا وہ انگلیاں لڑھکا کر اسے تلاش کر لیا کرتی تھی۔ کڑے سے توا کھینچ کر روٹی کے کچے رہ جانے والے حصوں کو سینکتے ہوئے اسے اپنے دونوں ہاتھوں کے یوں مصروف رہنے اور تاکی کے بار بار ادھر اُدھر ہو جانے پر طیش آ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کوکر کے سیفٹی والو کو اوپر کھول کر گھومتے ہوئے ویٹ کو ہٹا دینا ہے کہ اسے بونیاں کھڑی کھڑی رکھنا ہی اچھا لگتا تھا۔ اس نے اپنے تجربے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر یہ کچھ اور وقت گلتی رہیں تو آخر میں خود ہی ہڈی چھوڑ کر مزہ کر کرا کر دیں گی۔

ایسے ہی ایک لمحے میں اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی تھی اور اسے لگا تھا جیسے اس کی ہڈیوں نے گوشت چھوڑ دیا تھا۔

کھانا پکاتے پکاتے یوں اپنے وجود کے بارے میں سوچنا، اسے دھیان ٹوٹنے جیسا لگا تھا، ایسی مکروہ حرکت جس سے اس کی ریاضت میں رخنے پڑ گئے تھے۔ اس نے پھر سے دھیان جوڑنا چاہا۔ اس کی نظر بار بار کوکر کے جھوم جھوم کر گھومتے اور چھوں چھاں کر کے بھاپ چھوڑتے ویٹ پر پڑتی تھی مگر جب وہ تاکی کی تلاش میں انگلیاں چولھے کے نیچے گھسیڑ رہی تھی تو یہ فیصلہ ہی نہ کر پاتی تھی کہ پہلے وہ کوکر کے سیفٹی والو کو کھولے گی، اس کا اپنے ہی محور پر گھومتا اور جھومتا ویٹ اتارے گی یا توے کے کڑے کو پکڑ کر اسے ایک جانب کرتے ہوئے چپاتی کے کچے کنارے سینکے گی کہ اس کی نظروں کو ہاتھ کی ہڈیوں سے اچھلتے ہوئے گوشت نے جکڑ لیا تھا۔

وہ شروع سے ایسی نہ تھی۔ اسے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تو اپنا دھیان باندھ لیتی تھی۔ یوں سب مخمصے دھواں ہو جاتے تھے۔ چوں کہ وہ اندر سے اڑیل اور خود سر نہ تھی، لہٰذا بہت جلد اسے، سب ہو چکے فیصلے اپنے کیے ہوئے لگنے لگتے۔ اس رویے نے اسے اس قدر سہل اور اتنا میٹھا بنا دیا تھا کہ اس کا شوہر انور اس کی وجود سے بندھ سا گیا تھا، اس پالتو جانور کی طرح جو ایک کھونٹے پر باندھ باندھ کر اس قدر سدھا لیا جاتا ہے کہ بعد ازاں گردن میں پڑی ہوئی رسی کھلی بھی رہے تو وہ خود کو اسی سے بندھا ہوا جان کر ہمیشہ وہیں آ کر کھڑا ہوتا ہے۔

جب انور نے کار مین گیٹ کے سامنے روکی ہو گی تو معمول کے مطابق اسے نیوٹرل کرنے

اور ہینڈ بریک کھینچنے کے بعد ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھایا ہوگا۔ اس روز بھی یہ آواز ہر روز کی طرح اس تک پہنچ گئی تھی۔ یہ آواز ادھر اُدھر خطا ہو گئی کہ اس کی نظر کو ہڈیاں چھوڑنے والے گوشت نے جکڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں جانتی تھی کہ انور نے کتنی بار ایکسی لیٹر پر پاؤں کا بوجھ بڑھایا تھا، تاہم وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ انور نے ہارن نہ دیا ہوگا۔ عین گیٹ پر کار کھڑی کر کے ہارن دینا اسے بہت معیوب لگتا تھا اور ویسے بھی اس نے اسے کبھی اتنا انتظار کرنے ہی نہ دیا تھا کہ وہ اکتا کر ہارن بجانے لگے۔ انور نے ہارن نہیں بجایا ہوگا مگر اس کا دل وسوسوں سے بھر کر زور زور سے ضرور بجنے لگا ہوگا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کار کے انجن کی آواز پر نہیں چونکی تھی بلکہ ڈھلکے ہوئے گوشت نے خود ہی اس کی نظروں کو چھوڑ دیا تھا۔ اس نے جلدی سے ادھ پکی روٹی کو گھسیٹ کر توے سے ہٹا لیا اور مڑتے مڑتے کوکر کے ویٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پہلے تو اس کے اردگرد سے نکلتی بھاپ نے اس کا ہاتھ جلایا اور پھر ویٹ کے لمس نے۔ اس نے ارادہ بدل دیا اور چولھے کا شعلہ مدہم کرنے کو ناب گھما کر باہر نکل گئی۔

باہر اس کا شوہر اپنی کار میں یوں مرا پڑا تھا کہ اس کی طرف والا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا، دایاں پاؤں نیچے جھول رہا تھا جب کہ بائیاں ایکسی لیٹر تک کھسک آیا تھا۔

۳

ڈاکٹر اتنی محویت سے ایک ایک تفصیل بتا رہی تھی کہ اس کا سارا وجود ہال کی یخ بستگی کے باوصف پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ محبت اور موت کے اس تذکرے نے ماحول کے پیالے میں ایک نامانوس سا لطف اور عجب سی بے کلی انڈیل دی تھی۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر ساکت ہو گئے تھے سوائے ڈاکٹر نعمان کے جو مسلسل پہلو بدل رہا تھا۔

مدہم روشنیاں جیسے خود ہی معمول پر آ گئی تھیں۔

''بورڈ کے معزز ممبران''

ڈاکٹر نوشین نے اپنی منی سی ناک کے نیچے جمع ہو جانے، اور شفاف پیشانی سے پھسل کر آنے والے پسینے کو ٹشو میں جذب کرتے ہوئے کہا، ''ایک عورت اپنے وجود میں ہی زندہ رہتی ہے۔ اس کا کام کرنا بھی دراصل اس کے اسی وجود کی ایکسٹنشن ہوتا ہے اور ایک مرد......''

اس نے جان بوجھ کر لمبا سانس لیا تھا، کسی بوجھ کو دل سے اتارنے کے لیے۔

''جی مرد تو اپنے اختیار اور اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی دنیا سے نکلتا ہی نہیں ہے۔ عورت کا وجود بھی اس کے اختیار کی دنیا کا علاقہ ہے۔ مگر نفیسہ اور اس کا شوہر انور ان معمولی مردوں اور اگلی عورتوں میں سے نہیں تھے۔ یہی سبب ہے کہ مرد اپنی عورت کی محبت میں مر گیا — اور عورت اسے ایسا قتل گردان رہی ہے جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا — اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے وہ بار بار اپنے ہاتھوں

کا گوشت دانتوں سے کاٹ کاٹ کر زخمی کر ڈالتی ہے۔''

ڈاکٹر نوشین کی سانسوں کی بے ترتیبی اسے مزید کچھ کہنے سے روک رہی تھی۔

''فوری شاک کے بعد کا مینٹل ڈس آرڈر، ڈپریشن یا پھر زیادہ سے زیادہ بیک ہسٹری کی بنیاد پر سکوو فرینیا کا کیس بنتا ہے۔'' ڈاکٹر انیس نے ایک بار پھر عجلت میں تخمینے لگائے۔ ڈاکٹر نوشین نے اپنی سانسوں کی پروا نہ کی اور اس بار بھی برسنے میں ایک لمحے کا توقف نہیں کیا۔ تاہم لگ بھگ پھٹ پڑنے سے پہلے اس نے بالعموم شیزوفرینیا کہے جانے لفظ کو ڈاکٹر انیس کے اختیار کردہ تلفظ میں زبان اور تالو کے درمیان لڑھکایا، ''نہیں ڈاکٹر انیس یہ سکوو فرینیا، ڈپریشن یا مینٹل ڈس آرڈر کا معمولی کیس ہے نہ اڈیوسی (idiocy) کا، بلکہ یہ تو۔۔۔۔۔۔''

''ایک منٹ ڈاکٹر نوشین، ابھی آپ کو اپنی رائے نہیں دینا چاہیے۔'' ڈاکٹر نعمان نے نوشین کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور خیال ظاہر کیا، ''ابھی اس کیس ہسٹری میں کچھ خلا باقی ہیں۔''

ڈاکٹر نوشین نے ایک بھرپور نظر ڈاکٹر نعمان پر ڈالی جو ریوالونگ چیئر میں دھنس کر کچھ اور چھوٹا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نعمان نے نوشین کی نظروں کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا، ''پہلے سوالات کا سیشن ہو جانا چاہیے۔''

''جی ضرور، موسٹ ویل کم۔''

وہ بول پڑی، جیسے پہلے ہی سے اس کے لیے تیار ہو۔ ممبران کے چہرے چغلی کھا رہے تھے کہ وہ اسے غیر معمولی کیس ماننے کو تیار نہ تھے۔ ان کے سوالات سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ایک عمومی کیس پر اپنے وقت کے ضیاع پر بھی ناخوش تھے۔ تاہم انھوں نے اب تک کی گئی کونسلنگ اور میڈیسن تھراپی کے حوالے سے کئی سوالات کیے۔ ڈاکٹر نوشین نے سب سوالوں کے جوابات نہایت تحمل سے دیے۔ تاہم پریذنٹیشن کے خاتمے تک اس کا وجود ٹوٹنے لگا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ بہت جلد بخار اسے آلینے والا تھا۔ اس نے ڈاکٹر نعمان کے آفس چل کر کافی پینے کی دعوت کو نظر انداز کیا، گاڑی نکالی اور سیدھے گھر چلی آئی۔

۴

اگلے ایک گھنٹے تک اس کا بدن بخار میں پھنکتا رہا۔ اسے سینے کے اندر اوپر کی طرف ایک چبھن سی محسوس ہوئی جو بہت گہرائی میں اترتی تو تھی، پوری طرح معدوم نہ ہوتی تھی۔ بخار اور بھی تیز ہوا تو وہ اپنے بدن کی تپش اور سینے کی دکھن سے بے نیاز ہو گئی۔ اسی کیفیت کے کسی لمحے میں وہ اٹھی، چاروں طرف دیکھا، سارے کمرے میں ایک خلا سا گونج رہا تھا۔ اس نے بغیر کسی پیش بندی کے اپنے آپ کو اس خلا میں جھونک دیا۔ حتیٰ کہ باہر اسے کسی کار کے رکنے کا احساس ہوا۔ آنے والے نے کار کا انجن بند کیا نہ ہارن بجایا تھا۔ اسے اشتیاق ہوا، تاہم اس نے حیرت سے اس تصویر کو دیکھا جس میں وہ اپنے بیٹے اور شوہر کے ساتھ مل کر اتنی بے ریا ہنسی ہنس رہی تھی کہ پوری تصویر روشن ہو گئی تھی۔ تصویر میں بیٹے کے چہرے کا رخ ماں کی طرف تھا اور وہ خود اپنے شوہر کو گوشۂ چشم سے دیکھتے ہوئے پورا منہ کھول کر ہنس رہی

تھی۔ اس کے شوہر کے بھیگے ہوئے ہونٹوں میں سے دب دب کر مسکراہٹ یوں نکل رہی تھی جیسے گیلے ہاتھوں سے تڑپتی ہوئی مچھلی پھسلتی ہے، زور لگا کر اور اپنے وجود کی چمک اچھال کر۔ عین اس لمحے اسے کا نی پے بغیر گھر چلے آنا ایک فاش غلطی لگا تھا۔ جب آنے والے نے ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھ کر انجن کی آواز پیدا کی تو اس کا ہاتھ تصویر کو تھام چکا تھا۔ اب تو وہ باقاعدہ خود کو کوس رہی تھی کہ اتنی عجلت میں کیوں نکل آئی تھی۔ دوسری بار کار کے انجن کی آواز نے اسے اس قدر حیرت اور بوکھلاہٹ سے دوچار کیا کہ اسے خود کو کوسنا موقوف کرنا پڑا مگر اس اثنا میں تصویر پھسل کر نیچے گر گئی تھی۔ وہ تصویر اٹھانے کو جھکی اور اسے تھاما ہی تھا کہ ایک بار پھر ویسی ہی آواز آئی۔ اس بار اس کا دل اس کے حلقوم تک یوں اچھلا کہ واپس اپنے ٹھکانے پر بیٹھ نہ سکا۔ وہ باہر کی سمت لپکی مگر وسطی میز سے الجھ کر وہیں ڈھیر ہو گئی۔ پہلے تصویر کے فریم پر جمی انگلیاں ڈھیلی پڑیں اور جب فریم دبیز قالین پر بغیر آواز پیدا کیے گر گیا تو اس کا ہاتھ میز سے ڈھلک کر عین تصویر کے اوپر یوں جا پڑا کہ اس کے نیچے ڈاکٹر نعمان کی دبی دبی ہنسی پوری طرح دفن ہو گئی تھی۔

☆☆☆

خصوصی مطالعہ

شمیم حنفی

غالبؔ، دلّی تھا جس کا نام اور انتظار حسین

خوشونت سنگھ کا خیال ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی دلّی اپنے ماحول اور مزاج کے لحاظ سے ایک ''مسلم شہر'' (a Muslim city) تھی۔ اس شہر کی ثقافت، تہذیبی روایتیں، ادبی معاشرہ، فنون، طرزِ احساس، زندگی کے عام اسالیب، سب کے سب ایک واضح اور غالب ''مسلم شناخت'' رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سترھویں، اٹھارھویں اور نصف انیسویں صدی کے دوران (یعنی کہ مغلیہ اقتدار کے آغاز ۱۵۲۶ء سے مغلیہ اقتدار کے خاتمے ۱۸۵۷ء تک) اس شہر کا جو ثقافتی اور تہذیبی خاکہ مرتب ہوا تھا، اس کی پہچان بے شک لفظ ''مسلم'' سے ہوتی تھی۔ برطانوی سامراج کے اختتام (۱۹۴۷ء) تک یہ پہچان، ہر چند کہ مغربی اثرات کی تابع رہی لیکن دوسرے تمام دیسی (native) شناس ناموں کی بہ نسبت اسے ثقافت، تہذیب اور ادب کے میدانوں میں ایک نمایاں برتری حاصل رہی۔

میرا خیال ہے کہ آزادی سے پہلے تک کی دلّی کا ثقافتی خلقیہ ''مسلم'' تو تھا، لیکن اسے اسلامی نہیں کہنا چاہیے۔ ہندوستان میں سلاطین کے دور سے لے کر مغلوں کے عہدِ زوال تک، جس گھنی، گہری اور رنگا رنگ تہذیب کا خاکہ مرتب ہوا اُس پر مسلمانوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے جغرافیے کا سایہ بہت گہرا تھا۔ تہذیبوں اور زندگی کے آداب و اقدار کی تشکیل صرف تاریخ کے ہاتھوں نہیں ہوتی۔ طبیعی اور جغرافیائی ماحول اور حالات کا عمل دخل بھی اس طرح کی تشکیل کے ہر عمل میں اپنی ایک خاص جگہ رکھتا ہے۔ پھر ہندوستان کیا، کم و بیش پوری مشرقی دنیا میں تاریخ اور جغرافیے میں اشتراکِ عمل کی جو صورتیں نمودار ہوئیں ان کی نشان دہی اساطیر، مذاہب، عقاید، روایات، رسوم، اقدار اور اسالیبِ زیست، ان سب کی سطح پر ہوئی ہے۔ مظاہر پرستی اپنی ایک فکری اور تصوراتی بنیاد بھی رکھتی ہے۔

انڈو مسلم (یا اسے ہند ایرانی کہہ لیجیے) مزاج کی تعمیر غیر منقسم ہندوستان کی ایک ہزار سالہ تاریخ اور اس علاقے کے جغرافیائی اور طبیعی ماحول کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ دلّی اس پورے سلسلۂ عمل کا نتیجہ اور اس کی سب سے نمائندہ مثال ہے۔ اس سچائی کی شہادت ہمیں ایک تو اُردو زبان سے ملتی ہے،

دوسرے ان تمام فکری اور ثقافتی قدروں سے جنھیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک جتن سے فروغ ملا۔ اس شہرِ خرابی کے ماضی اور حال کی بابت اپنا معروضہ پیش کرنے سے پہلے میں محمد حسن عسکری کے دو مضامین کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو آزادی کے حصول اور پاکستان کے قیام کے بعد لکھے گئے۔ پہلے مضمون کا عنوان ''تقسیم ہند کے بعد'' ہے (اشاعت اکتوبر ۱۹۴۸ء)۔ لکھتے ہیں:

> اُردو زبان سے عظیم تر کوئی چیز ہم نے ہندوستان کو نہیں دی۔ اس کی قیمت تاج محل سے بھی ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ ہمیں اس زبان پر فخر ہے، ہمیں اس کی ہندوستانیت پر فخر ہے اور ہم اس ہندوستانیت کو عربیت یا ایرانیت سے بدلنے کو قطعاً تیار نہیں ہیں۔ اس زبان کے لب و لہجہ میں، اس کے الفاظ اور جملوں کی ساخت میں ہماری بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں اور ہم نے مانجھ مانجھ کر اس زبان کی ہندوستانیت کو چمکایا ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا مضمون صرف مہینے بھر بعد کا ہے (نومبر ۱۹۴۸ء)، ''پاکستانی ادیب'' کے عنوان سے۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں:

> میں نے تو اسلامی تہذیب (انڈو مسلم!) اور اُردو، فارسی علم و ادب کے بارے میں بھی جو کچھ تھوڑا بہت سیکھا ہے وہ صرف و محض ہندوؤں ہی سے سیکھا ہے۔ بلکہ حسرتؔ موہانی اور مرزا محمد سعید کے علاوہ مجھے آج تک کسی ایسے مسلمان عالم یا پروفیسر یا ادیب، شاعر یا فن کار سے ملنے کا موقع نہیں ملا جس کے پاس بیٹھ کر میں نے یہ محسوس کیا ہو کہ میرے وقت کا اس سے بہتر مصرف نہیں ہوسکتا تھا — اگر کل کو پاکستان میں ملّاؤں کا دور دورہ ہوجائے تو یہی مسلمان ''عالم'' جو آج غیروں کے کلچر کے مطالعے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، کل اپنے ہاتھ سے دیوانِ حافظؔ جلائیں گے اور اگر بہ فرضِ محال پاکستان میں کمیونسٹ زور پکڑ جائیں تو یہ لوگ جو آج کہہ رہے ہیں کہ امیر علی پاکستان کے نہیں تھے کیوں کہ انھوں نے انگریزی میں لکھا ہے جو غیر ملکی زبان ہے، کل کو کہیں گے کہ میرؔ اور غالبؔ اور اقبالؔ کا بھی پاکستان سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ انھوں نے اُردو میں لکھا ہے جو پاکستان کے کسی علاقے میں نہیں بولی جاتی۔

ان اقتباسات کو یہاں دُہرانے کا مقصد، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ دلّی کی حیثیت ایک شہر کی تو ہے ہی، یہ ایک وسیع تہذیبی تجربہ بھی ہے جس کا ظہور انڈو مسلم تہذیبی روایات اور ہماری قدیم و جدید اجتماعی زندگی کی تہ سے ہوا ہے۔ کسی بھی قوم کی اجتماعی زندگی اس کی تاریخ سے بڑی چیز ہوتی ہے۔ تاریخ کی نظر حاشیوں پر کم جاتی ہے اور بالعموم انھی حقائق تک محدود ہوتی ہے جو روشنی کے سیلاب میں نہائے

ہوئے ہوں، جب کہ اجتماعی زندگی روشن اور ظاہر سطحوں اور ہموار راستوں سے زیادہ تاریخ کے کونوں کھدروں اور مضافاتی علاقوں میں اپنے وجود کا جشن مناتی ہے اور اپنے ہونے کا پتا دیتی ہے۔

انتظار حسین کی کتاب "دلّی تھا جس کا نام"☆ کو اسی لیے، تاریخ کا وسیع تر تصور رکھنے والوں نے بھی، تاریخ کی کتاب کے طور پر قبول نہیں کیا۔ انتظار حسین کی ایک اور کتاب "اجملِ اعظم" جو حکیم اجمل خاں کے سوانح پر مشتمل ہے، اسے بھی بہتوں نے ایک قصہ سمجھ کر پڑھا۔ ایک نام ور مورّخ (مرحوم) سے تاریخ کے سیاق میں لکھے جانے والے بعض ناولوں کا ذکر آیا اور بات چیت کی رو میں، میری زبان سے کہیں یہ جملہ نکل گیا کہ میں نے تو نشاۃ ثانیہ، فرانس اور روسی انقلاب یا صنعتی انقلاب کی طرح ہندوستانی تحریکِ آزادی کی تاریخ کے معاملے میں بھی، تاریخ سے زیادہ اعتبار فکشن پر کیا ہے تو وہ ناخوش ہو گئے اور تاریخ بنام ادب کا قصہ لے بیٹھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مجھے یہ سمجھانے لگے کہ تاریخ بہ ہرحال تاریخ ہے، ادیب بے چارہ تو بس یوں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے۔

انتظار حسین کی اس کتاب کو پڑھنے کے دوران اور پڑھنے کے بعد یہ دونوں سوال میرے ذہن میں ایک ساتھ ابھرے۔ ایک تو شہر دلّی کے حوالے سے انڈو مسلم ثقافت اور روایت کا سوال، دوسرا اس کتاب کے واسطے سے مصنف کے مجموعی تناظر (perspective) کا مسئلہ۔ تاریخ کی کتاب تو اسے خود انتظار حسین بھی نہیں کہتے اور ان کی سوانحی کتاب "اجملِ اعظم" بھی اگر تاریخ تھی تو صرف اسی حد تک جس حد تک "سینٹ ٹرینیٹ" یا "اریل" یا "لسٹ فار لائف" کو تاریخ کہا جاسکتا ہے۔

انتظار حسین کی یہ کتاب ایک سو بانوے صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے کُل پچیس ابواب قائم کیے ہیں جن میں سے کچھ کے عنوانات یوں ہیں۔ "اندر پرستھ سے دلّی تک"، "نئی تہذیب نیا شہر"، "یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا"، "ایک شہر پانچ ہنگامے"، "دس انگلیاں دس ہنر"، "کتنے مشغلے کتنی بازیاں"، "رنگ، خوش بوئیں، ذائقے"، "بائیس خواجہ کی چوکھٹ"، "جن ویری پیر فقیر"، "بانکے انوکھے نرالے"، "کہاں گئے وہ لوگ"، "یادش بخیر دلّی کالج"، "نیا راج نئی راج دھانی"، "محبت کا آخری ابال"۔ عنوانات سے کتاب کی سرشت کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن سرشت جو بھی ہو، انتظار حسین نے اس کی تیاری میں "آثار وصنادید" (سرسیّد) "واقعات دارالحکومت دہلی" (بشیر الدین احمد)، "سیر المنازل" (مرزا سنگین بیگ)، "بزمِ آخر" (منشی فیض الدین) اور "آبِ حیات" (آزاد) سے لے کر "دلّی کالج میگزین" (۱۹۵۹ء) تک میرزا حیرت، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، مہیشور دیال، خواجہ حسن نظامی تک ایسے بہت سے لکھنے والوں سے مدد لی ہے جو باضابطہ مورّخوں میں شمار نہیں ہوتے۔ سٹینلی لین پول (Stanley Lane Poole) سے لے کر ولیم ڈیل ریمپل (William Dalrymple) اور نارائن گپتا تک، اس کتاب میں جابجا انگریزی کی معروف تاریخوں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ گویا کہ شعر و ادب، سنی سنائی قصہ کہانی، دستاویزی

☆۔ اشاعت ۲۰۰۳ء، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

مصادر اور تاریخ کی کتابوں نے مل جل کر انتظار حسین کو اس کتاب کا مواد مہیا کیا ہے۔

لیکن یہ کتاب اس اعتبار سے منفرد اور دلّی سے متعلق تاریخی مآخذ پر فوقیت رکھتی ہے کہ اس کے صفحوں پر ہم ایک شہر کو انسانوں کی طرح چلتے پھرتے، ہنستے کھیلتے، اداس اور افسردہ ہوتے ہوئے، پُر امید اور مایوس، بنتے اور بگڑتے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ کتاب ایک آئینہ خانہ ہے جس میں ایک چھوٹی سی بستی کے مہانگر بننے کا عمل، اپنی کامرانیوں اور ناکامیوں کی داستان سمیٹے ہوئے، اپنی مختلف صورتوں اور کیفیتوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ ایک مہم کا بیان ہے جس کا انجام انسانی زندگی کو درپیش عام المیوں سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ غالبؔ کے خطوط کی روشنی میں ان کے سوانح اور دلّی کے سوانح کا احاطہ کرتے ہوئے، انتظار حسین نے لکھا تھا:

> سمجھ لیجیے کہ کلکتہ پہنچ کر غالبؔ الف لیلہ کا ابوالحسن بن گیا۔ دلّی میں وہ ایک تہذیب کے غروب کا وقت تھا۔ کلکتہ میں ایک نئی تہذیب طلوع ہو رہی تھی۔ اس برِعظیم میں مغرب نے اپنی پہلی جھلک کلکتہ ہی میں تو دکھائی تھی۔ سائنسی ایجادات کے کرشمے بھی پہلے پہل یہیں نظر آئے۔ غالبؔ نے یہ سب کچھ دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ایک چکا چوند پیدا ہوگئی۔ ہاں ایک ایجاد فورٹ ولیم کالج میں بھی تو ہو رہی تھی۔ غالبؔ کی تیز نظر اُس طرف بھی تو گئی ہوگی۔ سوچا تو ہوگا کہ دلّی سے دور یہاں اُردو کے ساتھ کیا کارستانی ہو رہی ہے۔ مرصّع اُردو کو بالائے طاق رکھ کر ایک سادہ سہل اندازِ بیاں وضع کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں دو اور اقتباسات بہت اہم اور توجہ طلب ہیں:

> غالبؔ کو ناول کے فارم سے کوئی شناسائی نہیں تھی مگر جس تجربے سے اب اسے شناسائی ہوئی تھی اور اس کے اثر میں اندازِ نظر اور طرزِ احساس میں جو تبدیلی آئی تھی، اُس نے اُس کے قلم کو اظہار کے اس راستے پر ڈال دیا تھا جو ناول کی طرف جاتا ہے۔
>
> ''میری جان، سنو داستان۔ میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال۔ یہاں کبھی کسی نے اس دریا کی کوئی ایسی حکایت نہیں کی کہ جس سے استعباد اور استعجاب پایا جائے۔''
>
> یہ احساس اندازِ نظر کی تبدیلی کا شاخسانہ ہے۔ غالبؔ کی غزل کے مضامین میں تو جمنا ندی جگہ نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ مضامین اور تھے۔ وہ طرزِ احساس اور تھا۔ اب جب زمینی حقیقتوں کے شعور نے جنم لیا، جب یہ احساس پیدا ہوا کہ چیزیں جس طرح ہیں اس طرح بھی تو انھیں دیکھنا اور بیان کرنا چاہیے کہ دیکھنے اور بیان کرنے کی اپنی معنویت ہے، تب جمنا دھیان میں آئی۔ یہ ندی کیا ہے، اس

ندی کے کنارے جو ایک نگر آباد ہے کہ پوری ایک تہذیب ہے، وہ کیا ہے؟

یہ بازار، یہ گلی کوچے، یہ حویلیاں، یہ محلات آخری سانس لے رہے ہیں — مشاعرے، محفلیں، صحبتیں، سب بجھی بجھی ہیں:

''مشاعرہ شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں، کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں۔ کیا معلوم ہے اب ہو نہ ہو۔ اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔''

''شہر چپ چاپ۔ نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے۔ نہ آہنی سڑک آتی ہے۔ نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلّی شہر شہرِ خموشاں ہے۔''

انتظار حسین آگے لکھتے ہیں:

مکانوں کے گرنے، کوچوں کے اجڑنے اور خلقت کے تتر بتر ہونے کی یہ جو چھوٹی چھوٹی تصویریں خطوں میں بکھری پڑی ہیں، انھیں ذہن میں یک جا کیا جائے تو شہر کے اجڑنے، برباد ہونے کی ایک بڑی ہی ہول ناک زندہ تصویر نظروں میں ابھرتی ہے۔ شہر کی بربادی کی ایسی تصویر اُردو فکشن میں شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ تو اس تصویر کا موازنہ اگر مقصود ہے تو پھر ہمیں مغربی فکشن سے رجوع کرنا پڑے گا۔ لیجیے دو ایسی زندہ تصویریں تو فوراً ہی میرے دھیان میں آ گئیں۔ ''وار اینڈ پیس'' میں نپولین کی فوجوں کی یلغار کے ہنگام ماسکو کے جلنے اور خالی ہونے کا نقشہ۔ سارتر کے ''آئرن ان دی سول'' میں جرمن فوجوں کی یلغار کے ہنگام پیرس کے خالی ہونے کا نقشہ۔

غالب کے خطوں میں دلّی کے اس تذکرے کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ انتظار حسین دلّی کے بربادی کے بیان اور غالب کے سوانحی تجربوں کی روداد میں فکشن کے حوالے سے اپنی گفتگو کا سرا نیچرلزم اور ریئلزم کی روایت سے جوڑ دیتے ہیں اور غالب کی دلّی کو ایک بستی کے ساتھ ساتھ انسانی صورت حال کے ایک استعارے کے طور پر بھی دیکھتے دکھاتے ہیں۔ کہتے ہیں:

غالب کی پیش کردہ بربادی کی تصویر کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں اسمائے معرفہ کی کثرت ہے جو شاید ان تصویروں میں نظر نہ آئے جن کا میں نے ابھی حوالہ دیا ہے۔ اسمائے معرفہ کی اس کثرت کی آخر معنویت کیا ہے؟ کیا اس کی وجہ سے بربادی کا یہ بیان مقامیت کا شکار تو نہیں ہو جاتا؟ مجھے تو اُلٹی بات نظر

آتی ہے۔ مقامیت سے ایک عمومیت یا آفاقیت جنم لیتی نظر آتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ اسمائے معرفہ کی کثرت سے ایک آفاق گیر اسم نکرہ ابھرتا دکھائی پڑتا ہے۔ جب عمارتوں، بازاروں، کوچوں کے نام لگاتار گنائے جاتے ہیں تو ان کے ساتھ بربادی کا منظر پھیلتا چلا جاتا ہے۔ پوری دلّی دھنستی نظر آتی ہے۔ خالی دلّی نہیں، ایک پوری تہذیب سمجھ لیجیے کہ بربادی کا یہ بیان جو اصلاً نیچرلزم یا واقعیت نگاری کی ایک مثال ہے، اس سطح سے بلند ہو کر ایک علامتی معنویت اختیار کر لیتا ہے۔☆

حقیقت سے استعارے تک، اپنے خطوط میں دلّی کے ساتھ جو سفر غالب نے طے کیا ہے، اپنی کتاب ''دلّی تھا جس کا نام'' میں انتظار حسین نے بھی اسی سے ملتے جلتے ایک تجربے کا احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے ہم صرف ایک بستی سے روشناس نہیں ہوتے، ہمارا سامنا ایک جیتے جاگتے کردار سے ہوتا ہے جس نے اندر پرستھ سے نئی دلّی تک بہت سے سوانگ رچائے ہیں، عین اسی طرح جیسے فراق نے اپنے گھر کے باہر نہ جانے کب سے کھڑے ہوئے ایک چھتنار برگد کو دیکھ کر کہا تھا:

میں دیکھتا تھا اسے ہستی بشر کی طرح
کبھی اداس، کبھی شادماں کبھی گمبھیر

انتظار حسین نے اپنی کتاب میں اسی طرح کی تصویریں سجائی ہیں۔ ان تصویروں کے رنگ کبھی شوخ اور تیز نہیں ہوتے، ان اوراقِ مصور میں بھی نہیں جو کھلنڈری طبیعت رکھنے والے کرداروں اور اس بستی کے سنہرے دنوں کی یاد دلاتے ہیں۔ افسردگی کا ایک غبار پہلے صفحے سے کتاب کے آخری جملے تک پھیلا ہوا ہے۔ کتاب کے نام ''دلّی تھا جس کا نام'' میں لفظ تھا بجائے خود ایک طرح کی محرومی یا نقصان کا تاثر پیدا کرتا ہے، ایک متاعِ گم شدہ، ایک بیتے ہوئے پل، ایک جدوجہد کی شکست اور ایک دنیا کے اجڑ جانے کا احساس۔ کتاب شروع اس طرح ہوتی ہے کہ:

> کوئی بھی بستی اپنا آپ آسانی سے نہیں دکھاتی اور پھر دلّی ایسی بستی جس کے متعلق میر نے خبردار کیا تھا کہ اور بستی نہیں یہ دلّی ہے۔
>
> — یہ تقسیم کے ڈھائی تین برس بعد کی ایک شام تھی۔ میں جتن کر کے دلّی پہنچا ہوا تھا۔ جب ہم نے اس مبارک کوچے میں قدم رکھا جسے حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کہتے ہیں، تو دونوں وقت گلے مل رہے تھے۔
>
> — ہم پگڈنڈی سے اتر کر لمبی لمبی گھاس کے بیچ چلنے لگے۔ جنم اشٹمی گزر چکی تھی۔ گھاس ساون بھادوں کے چھینٹے کھا کھا کر کتنی سبز اور کتنی لمبی ہو گئی تھی۔ اسی گھاس کے بیچ ایک اجاڑ چبوترہ نظر آیا۔ اردگرد پکی پکی چہار دیواری۔ اندر

☆۔ مضمون ''غالب، غزل سے ناول کی طرف'' مشمولہ ''نظریے سے آگے'' اشاعت ۲۰۰۴ء، سنگِ میل، لاہور

تین خستہ حال قبریں۔ ایک قبر غالبؔ کی تھی۔

— اس کے بعد مجھے دلّی جانے کے لیے تیس سال تک انتظار کرنا پڑا۔ پھر کہیں اس بستی کے پھیرے کی صورت نکلی۔ ایک پھیرا، پھر دوسرا پھیرا، پھر تیسرا پھیرا۔ ہر پھیرے میں حضرت نظام الدین اولیا کے کوچے کا پھیرا ضرور کیا۔ مگر اب تو سارا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ گہما گہمی، کھوے سے کھوا چھلتا ہوا۔ ہر دکان پر گلاب کے پھولوں کے ڈھیر کے ڈھیر۔ چوکھٹ کو پار کر کے مزار تک پہنچنے کے لیے دھکم پیل۔ اور ہاں غالبؔ کی قبر والا چبوترہ غائب۔ گھاس ندارد۔ اب یہاں سنگِ مرمر کا وسیع چبوترہ تھا۔ اس کے اردگرد خوب صورت جالی۔ اندر سنگِ مرمر سے بنی ہوئی قبر۔ اس سے متصل ایک وسیع غالب ہال۔ ہر پھیرے میں گہما گہمی پہلے سے زیادہ نظر آئی۔ اور ہر مرتبہ مجھے بھادوں کی وہ اداس شام بے طرح یاد آئی اور جنگلی گھاس کے بیچ وہ اجڑی اجڑی کچی پکی قبر۔ یا اللہ وہ شام کہاں جا کر چھپ گئی اور وہ قبر کہاں گم ہوگئی۔ میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔

انسانی دماغ بستیوں کے ساتھ ساتھ ویرانوں کی یادیں محفوظ رکھنے کا عادی بھی ہوتا ہے۔ آبادی کی قدر و قیمت کا پیمانہ اور اس کا بدل صرف آبادی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی سنسان راستے، اجاڑ محلّے اور کھنڈر ہوجانے والے مکان دماغ سے اس طرح چپک جاتے ہیں کہ ان کے بغیر اپنی دنیا اجنبی دکھائی دیتی ہے۔ روشنیوں کے بے پایاں ہجوم میں اندھیری راتیں یاد آتی ہیں، جشن اور چہل پہل کے ماحول میں اُداسی اور اضطراب سے بھری ہوئی گم شدہ ساعتیں۔ صرف ایک جیسی چیزیں ایک دوسرے کا نعم البدل نہیں ہوتیں۔ انتظار حسین نے دلّی کی بار بار آباد ہوتی ہوئی اور اُجڑتی ہوئی زندگی کا جو مرقّع ترتیب دیا ہے، اس میں انسانی بناؤ اور بگاڑ کے تجربے نے ایک عجیب و غریب گورکھ دھندے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اسی لیے، یہ کتاب دلّی کی رونقوں، میلوں، ٹھیلوں، بازاروں اور بستیوں کے بیان میں بھی ایک غم آلود تاثر اور خسارے کے ایک مستقل احساس سے بوجھل دکھائی دیتی ہے۔ پرانی چیزیں کھو جائیں تو ان کی جگہ نئی چیزیں آجاتی ہیں۔ لیکن پرانے جذبے، احساس کے پرانے زاویے ہمیں بے چین اس لیے رکھتے ہیں کہ کوئی بھی نیا جذبہ اور نیا احساس ان کی جگہ لینے پر قادر نہیں ہوتا۔ یہ ایک انوکھی وجودی واردات ہے، ایک ناقابلِ فہم روحانی تجربہ جس کی گونج اس کتاب کے مطالعے کے دوران مسلسل سنائی دیتی ہے۔ انتظار حسین کے اسلوب کی حزینہ لَے نے ان تاثر کو مزید گہرا کردیا ہے۔ بار بار جنم لینے والی پرانی دلّی کے ملبے سے جس نئی، چمکیلی اور روشن دلّی کا ظہور ہوا، بے شک زمانے کے کبھی نہ ختم ہونے والے راگ اور ہماری اجتماعی زندگی کے ارتقا کی نشان دہی بھی اس سے ہوتی ہے، لیکن دھندلکے کی فضا اور ملال کی ایک کیفیت ایسی ہے کہ اس پوری روداد کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔ یہ کیفیت نہ تو دلّی کا پیچھا

چھوڑتی ہے، نہ دلّی کے تذکرے پر مبنی اس کتاب کے پڑھنے والے کا۔ نارائن گپتا نے اپنی معروف تاریخ Delhi Between Tow Empires میں لکھا ہے کہ دلّی کی ثقافت کا سب سے بڑا المیہ ہماری اجتماعی تاریخ میں اس شہر کی مرکزیت ہے اور اس شہر کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والا سب سے بڑا سانحہ اس کا دارالسلطنت ہونا یا اس کی غیر معمولی سیاسی حیثیت ہے۔ دلّی کی ہزیمت اس کی عظمت کے باعث ہے۔ غالب کے ورثے کی بربادی کے اسباب بھی اس کے شکوہ میں پوشیدہ ہیں۔ اس کتاب میں انتظار حسین کے بیانیے کا خاتمہ جن لفظوں پر ہوا ہے، ان پر تبصرہ یہاں شاید غیر ضروری ہے۔ سو، میں اسے بس نقل کیے دیتا ہوں۔ آخری عبارت اس طرح ہے کہ:

> اب شمع پوری طرح روشن تھی۔ بارہ کھمبے سے اس طرف نئی دہلی کا نقشہ جم چکا تھا۔ انگریز کی راج دھانی شاد آباد نظر آرہی تھی۔ سچ مچ کا ایک نیا نگر نئے چراغوں، بجلی کے قمقموں کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ نئے بازار اپنی کشادہ راہوں اور کشادہ دکانوں کے ساتھ آراستہ تھے۔ وسیع و عریض پارک، چوڑی گلیاں، روشن کوچے، نئی طرز کے مکان یعنی آنگن، چھجے، چوبارے، اونچے پھاٹک، سب غائب۔ اب نئے طرز کے گیٹ تھے۔ اندر قدم رکھو تو پہلے گھاس کے تختے، آگے پورچ۔ یہ مکان نہیں کوٹھیاں تھیں۔ اندر جاؤ تو دیوان خانہ غائب۔ نہ چاندنی نہ مسند نہ گاؤ تکیے، نہ حقے اور اگال دان، نہ گلوریوں سے سجی طشتریاں۔ نہ مہمانوں، میزبانوں کی وہ پرانی سج دھج یعنی نہ بر میں انگرکھا نہ سر پہ پگڑی یا ٹوپی نہ پیروں میں سلیم شاہی جوتی۔ ساتھ میں جوتیاں باہر اتارنے کا تکلف بھی گیا۔ سوٹ ان کا ملبوس، پیروں میں بوٹ، سر پر ہیٹ۔ بے تکلف ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور صوفوں کرسیوں پر ڈٹ گئے۔ باہر نکلے تو موٹر پورچ میں کھڑی ہے۔ ہاتھیوں، گھوڑوں کا زمانہ گزر گیا۔ ساتھ میں پالکی نالکی بھی گئی اور ڈولی یہاں کیوں نظر آئے گی۔
>
> زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا، جو صاحب کی سواری وہی میم صاحب کی سواری۔ یہ نیا دارالسلطنت ہے۔ نئی اس کی تہذیب ہے، جہان آباد قصۂ ماضی ہوا۔ رہے نام اللہ کا۔

گویا کہ پرانی اشیا کی جگہ نئی اشیا آگئیں، پرانی تعمیرات کی جگہ نئی عمارتیں بن گئیں مگر بہت کچھ بگڑا بھی تو ہے۔ مقام شکر ہے کہ یہ بگاڑ دکھائی نہیں دیتا۔ آخر انسانی بصارت کی کچھ ایسی حدیں بھی تو ہوتی ہیں —!

☆☆☆

ڈاکٹر انوار احمد

سمیع آہوجا، آدرش کے لیے تشدد سہنے اور دینے والا افسانہ نگار

سمیع آہوجا اپنے افسانوی مجموعے ''جہنم + میں'' کے دیباچے میں لکھتا ہے: ''زمین کے باسیوں کی گھٹی گھٹی خواہشوں سے اگتی سسکیاں اور غلامانہ تشدد سے پھوٹتی چیخیں اتنی دراز ہیں کہ ان داستانوں کے تمام معلوم و نامعلوم گلیکسی نظام چھپ جائیں۔'' (آئینوں کے روبرو، ''جہنم + میں'')

اس کے ہاں استعارے کا پیچیدہ نظام اور نئی لسانی تشکیل کی کوشش ملتی ہے، مگر اس کی افسانوی کائنات میں چوں کہ بعض امیجز بار بار آتے ہیں گولہ بارود، ٹینک اور تشدد سے ویران ہوتے کھیت، کوڑوں سے ادھڑتی کمریں، کم ہوتی ہوئی آواز، بکھرتے ہوئے انسانی عزائم اور ریزہ ریزہ ہوتی انسانی آرزوئیں، اس لیے اس کے افسانوں کے مجموعی تاثر کی تفہیم تذلیل مسلط کرنے والے نظام کے شکار لوگوں کے لیے زیادہ مشکل نہیں رہتی ہے۔ سمیع آہوجا کا وژن بین الاقوامی ہے، وہ ملکی صورت حال کو مقامی قوتوں کی منشا اور ارادے کا کھیل نہیں سمجھتا بلکہ وہ سامراجی ممالک کے پھیلائے دام میں جکڑی تیسری دنیا کو دیکھتا ہے، جہاں آزادی اور خوش حالی سامراجی ملکوں کے مقامی ایجنٹوں کی آمریت تلے سسک رہی ہے اور عوامی امنگوں کو کچلنے کے لیے ترقی یافتہ ممالک اپنے ''دوست'' ممالک کی جانب دھڑا دھڑ اسلحہ روانہ کررہے ہیں، اسی لیے اس نے جو افسانے بیروت، دمشق، آبادان اور اصفہان میں بیٹھ کر لکھے، ان کی فضا اور تاثر ان افسانوں سے ہم آہنگ ہے، جو لاہور اور ملتان میں لکھے گئے۔ اس کے تین افسانوں کے اقتباسات دیکھیے: ''دنیا کے سارے تنخواہ دار فوجی، سانسوں کے پیراہن چاک کرنے کی ہوس میں ڈھالے جاتے ہیں۔'' (پور پور بلٹ، منقل جسم آوازیں، ''جہنم + میں''، ص ۴۷) ''سارا بے سر ہجوم صحن کے بیچ، اپنے بالوں بھرے سروں کو ہاتھوں میں لٹکائے مینار کی طرف سینہ کوبی کرتا، اپنی فرد جرم کا منتظر تھا۔'' (چار آئینوں میں رات، ایضاً ص ۹۳) ''سسکیاں لیتے ملزم کا سر ڈنگ پر دباتے ہی فرد جرم بھی غائب ہوگئی، ملزم پچھلے مجرم کی سزا دیکھ کر رو دیا تھا اور اب تک روئے چلا جاتا ہے۔ بائیں یعنی خلق خدا کو ہم سے متنفر کرنے کا حربہ؟'' (بائی می پلازہ، ایضاً، ص ۱۴۰-۱۴۱)

سمیع آہوجا کے ہاں اپنے عہد کے کسی بھی افسانہ نگار کے مقابلے پر نہ صرف ایک ہول ناک تشدد سہنے کا غیر معمولی ذاتی اور تخلیقی تجربہ ہے بلکہ عملی طور پر انڈر ورلڈ میں موجود عالم گیر انقلابیوں سے رابطے کی سرشاری بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شاہ حسین اور بلھے شاہ جیسے ملامتیہ فرقے کے عظیم انقلابیوں سے جذباتی طور پر وابستہ ہے۔ اس کے علاوہ افتخار جالب، احمد ہمیش اور لسانی تشکیل کے اُن حمایتیوں کا بھی ہم نوا ہے جنھیں بعض لوگ آلاتِ تشدد میں شمار کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے نیم سوانحی ناول ''راکھ'' میں سابق شہنشاہ ایران کی ساواک کے ہاتھوں سمیع آہوجا کے وجود میں گاڑے جانے والے تشدد کا ذکر کیا ہے۔ رشید امجد نے بھی اپنی آپ بیتی میں سمیع آہوجا کا اور خصوصاً ان کے والد کے ردِ عمل کا ذکر کیا ہے، جنھیں بتایا گیا تھا کہ اُن کا بیٹا اسلام ترک کر چکا ہے۔ ''قید در قید'' میں اُس کا سوانحی رنگ اس تخلیق کار کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کر دیتا ہے مگر یہ محض ذاتی معلومات نہیں، خود وطن عزیز کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہوتا ہے، خاص طور پر یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو جیسے مدبر سیاست دان نے بلوچستان میں ملٹری ایکشن کیوں کروایا تھا: ''ہر امداد میں کوئی نہ کوئی پہلوی شاہ کی ایک رمز چھپی ہے جو ڈھائی صد ملین ڈالر کی امداد عمومی پاکستان کے نام پر بڑے بھائی نے چھوٹے پاکستانی بھائی کو دی، اس میں لپٹی ہوئی اک ننھی سی خواہش کہ وہ بلوچستان میں مخفی اک چھوٹے سے ایرانی مارکسی گروہ کو کہ جو پناہ میں تھا روشن فکر بلوچیوں کی، انھیں سلی سلائی لاشوں میں بشوے گورستان پارسل کر دیا جائے۔'' (علوژن ڈشعلوژن، قید در قید، ص۴۴۔۴۵) اسی افسانے میں افسانہ نگار نے اپنے اوپر ہونے والے تشدد کے لمحے کو بڑی اذیت کے ساتھ بازیاب کیا ہے: ''دفعتاً ایک قوی ہیکل کا پشت سے آہنی شکنجہ اور دوسرے کے تین فولادی مکوں سے منھ سے اُبلتی خون کی دھاریں، ٹوٹے دانت حلق میں جا گرے پہلے ہی تھوک میں خون میں لتھڑے سامنے کے دو دانت، ساتھ ہی چار مکوں سے ناک کا بانسا ٹوٹ گیا، آنکھوں کے دونوں پھٹتے کناروں سے بہتا خون اور تڑپتے، اپنے آپ کو شکنجوں سے چھڑاتے زور آزمائی کرتے، چیختے، پنجابی میں گالیاں — گونجتی، غراتی، سسکتی آوازیں گالیوں کی بوچھاڑ میں کمرے کی آہنی دیواروں پر جھپٹتی ٹکریں مار مار کر تھک ہار کر گرلاتی وہیں سو جتیں، وہی کمرا — ! بلکہ وہی پہلو پیشاب گاہ بھی تھا، مگر رفع حاجت — ؟ وہ تو آنتوں کی دیواروں سے ہی چپک کر خشک ہو چکی تھی، تیسری شب — ! نقاہت سے ذہن اور آنکھوں پر طاری غنودگی، تو چند ہاتھوں نے سردی سے اکڑے جسم کو گھسیٹا اور کرسی پر لا پھینکا، پیروں ہاتھوں کلائیوں گردن اور ماتھے کو چوڑے چمڑے کے تسموں نے اپنی گرفت میں بے حرکت کر دیا — ہاتھوں کے حصار میں نشست پر اور ان کے جبر کا نت نیا برستا انتہائی قہر، ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کے بلاتمیز ٹوٹے جوڑ، ہاتھوں کی انگلیوں کا گوشت تیز چاقوؤں کی مدد سے تراشا جاتا اور پھر چھلی ٹکڑیوں پر تیز ذائقہ کے لیے نمک مرچ کا چھڑکا، جسم کے مختلف حصے بلو لیمپ سے سُرخ کیے جاتے، سر کو شکنجے میں کسنے سے کانوں کے پیچھے کی اُبھرتی ہڈیاں، دن بہ دن گم شدگی کا اعلان کرتے قوتِ سماع سے

محروم ہوتے کان، دید بینی کا شعور اور سلیقہ دھیرے دھیرے مدھم ہوتا، صرف بہتر پاؤنڈ کا ہڈی ڈھانچ، چلنے سے معذور دونوں ہتھیلیوں پاؤں کی ایڑیوں کے بل اور چوکلوں کی چوکھٹ اندر فرش پر گھسٹتا، بازپرسی کا پہلا ٹارچر اُسی دن سے ایک سو اسی ایام گزرنے کے باوجود، زخم سُرین بل جل کی بدولت مندمل ہونے سے قاصر اور رستے خون سے ہر لمحہ بھیگا تھڑا جانگیا، ریڑھ کی ہڈی پر نجانے کیسے کیسے قہر نامے لکھے گئے۔"
(ایضاً، ص ۴۲_۴۳، ۴۵)

سمیع آہوجا کا ظاہری طور پر تو ادبی نصب العین زبان کے مروجہ سانچے کو نذر تخریب کرنا ہے مگر وہ حقیقت میں تاریخ اور تہذیب کی مروجہ توضیح اور تشریح پر بھی معترض ہے۔ وہ اپنے ایک افسانے "قید در قید" میں جعفر زٹلی جیسے حریت اظہار کے قتیل شاعر کا ذکر کرتا ہے جس کی گردن میں تسمہ ڈال کر فرخ سیر نے مار دیا تھا اور اس تہذیب سے تخلیقی طور پر وابستہ اُردو کے دو عظیم افسانہ نگاروں سے سوال کرتا ہے کہ وہ طاقت وروں کی منشا سے تشکیل دی جانے والی تاریخ و تہذیب کے روبرو کوئی باغیانہ سوال کیوں نہیں کرتے؟ "پھر اک انبوہ خوشامدیوں میں سے صرف اور صرف جعفر زٹلی جیسے دو چار کا منک مکا، سرکار عدلیہ کے تحریری حکم نامے بیچ لکھت، پھنگ ٹل ڈیتھ، کیا قصیدہ گوئی سے انکار؟ نہیں! اک زہر ہلاہل میں ڈوبا برچھی شعر!! سیدھا، جگر پار اُترا اور تخت ہندوستان شہر دلّی بیچ شیعوں کے مجتہد اور شمس العلما مولوی آزاد کے والد ماجد علامہ محمد باقر! اُن کے ایام محشر خیز غدر سن اٹھارہ سو ستاون، اپنے اخبار میں کیا لکھنے پر توپ دم کیا گیا، یہ آپ جناب انتظار حسین سے پوچھیے کہ وہ تو اب بھی اُسی زمان و مکان میں رہتے ہیں، اُتر پردیش، مدھیہ پردیش اور بہار کی لٹائی اور لاشوں کے ڈھیر میں اک بے توقیر لاش زٹلی کی بھی ہے، اُس پر کیا اور کیسے بیتی یہ تعلق داروں کی قبیل محترمہ قرۃ العین حیدر سے پوچھیں، میں نے تو ازخود ذمہ اُٹھایا ہے ستلج بیاس سے ورلی طرف کا۔" (قید در قید، ایضاً، ص ۸۶_۸۷)

اپنے تیسرے افسانوی مجموعے "طلسم دہشت" کے دیباچے (اک مکالمہ بے حجاب) میں سمیع آہوجا نے اپنے ادبی اور فکری منشور کا برملا اعلان کیا ہے: "میں آقا کی اپنے وجود میں ٹھونس ٹھونس کر بھری زبان میں بات کر ہی نہیں سکتا کہ گماشتہ حکیم تشخص آقا کی زبان میں سوالی ہے اور اُن کے ٹیکسوں، سودوں، قرضوں کے پیہم ضربوں سے جو جواب نکلتا ہے وہ اُن کے فہم و ادراک سے پرے ہوتا ہے، مگر سوال نامہ جواب اپنی زبان میں مانگا جاتا ہے، میں تو اس زبان کو ملیامیٹ کرتا ہوں اور اپنی تخلیق کے لیے اپنی زبان تعمیر کرتا ہوں، ان چہ تخلیقات کے باہم گتھے تجربے آپ کے کانوں میں کیا اُنڈیلتے ہیں، بے کار بکھرے پتھروں سے گھڑے الفاظ سے بنے میوریل روبرو ہیں آپ کے۔" اس میں شک نہیں کہ وہ بہت سے ثقافتی خطوں کے لوگوں سے اس طرح ملا ہے کہ اُن سے ہم فکری و ہم زبانی بھی پیدا کی ہوگی، مگر جس طرح وہ افغانیوں، ایرانیوں اور ترکوں کے ساتھ ساتھ عربوں کے بھی مختلف لہجوں کو نیم جناتی اُردو میں برتتا ہے، اُس سے وہ ایک طرح سے لسانی دہشت گرد نظر آتا ہے، جو اپنے تخلیقی وجود پر ہونے

والے تشدد کا بدلہ اپنے قارئین سے لینے کا خواہش مند ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُسے پنجاب، پنجابی زبان اور پنجابی لوک رہتل سے زیادہ وسطی پنجاب کی دانش ورانہ سوچ عزیز ہے جس کے انتہا پسندوں کے مطابق جنوبی پنجاب میں بے شناخت شودر بستے ہیں۔

اپنے چوتھے اور تازہ ترین افسانوی مجموعے "ٹڈی دل آسمان" (۲۰۰۳ء) کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے: ''علم گیا بھاڑ میں، اک عالم نے کیا دینا ہے۔۔ صرف صبر وتحمل اور فاقہ، ہونہہ زندگی کرنی ہے تو پیسہ مطلوب ہے — اُتّم القوم، اسی از قسم قحط کی بدولت اپنی سرزمین کو چھوڑ کر کسی سبزہ و پانی کی سرزمین میں چلے جانا اب عام ہے — ایلینین ایشن کی فراوانی اور محبت، آزادی، ہنر، سوچ، فکر، ثقافت اور فنون لطیفہ سارے عالم سے مفقود اور جو کچھ بھی دکھائی دے، وہ سارے شاہوں کے شاہ کی عقل و فراست سے پھیلایا، کندھوں پر سوار شکنجہ کس اک فرعونی جال ہے — میرے یہ اُنیس افسانے کوئی تیس پینتیس برس پرانے ہیں لیکن مسئلے مسائل تو وہیں کھڑے ہیں۔'' (ص۱۲۔۱۳) اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں وہ لسانی دہشت گردی موجود نہیں، جسے مسیح آہوجا نے شعوری طور پر اپنی شناخت بنالیا ہے، تاہم افسانے کی نئی ساخت بنانے کی اُس کی تمنا اور سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی حربوں سے اُس کی ازلی نفرت ان بظاہر پرانے افسانوں میں بھی ہے۔ "تیز بارش میں بھیگتا انتظار" فسادات پر لکھے گئے تمام یادگار افسانوں میں فنی اعتبار سے شمولیت کا سزاوار ہے بلکہ اشفاق احمد کے ''گڈریا'' کے تاثر کا ہم پلہ ہے۔ "بند پنجرے میں مینا کا خواب" دسمبر ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا ہے جو ہمارے مردانِ آہن کے بارے میں ایک مستقل سیاسی حوالہ ہے۔ "لائف لانگ پریذیڈنٹ۔۔ یہ کون سا پریذیڈنٹ ہے —؟ یہ تو انگریز کے ماکھن توس میں پلا جوان ہے —! اور اس کے کاندھے پر بجے کراؤن، اسی کے ساختہ قانون کے محافظ —!! جس قانون کے مطابق آزادی پسندوں کو غدار قرار دیا جاتا ہے —!!! یہ ہمارا پریذیڈنٹ کیسے ہوسکتا ہے —؟ ہمارا پریذیڈنٹ تو انگریز سرکار کے حکم کے آگے سیسہ پلائی دیوار —'' (بند پنجرے میں مینا کا خواب، ''ٹڈی دل آسمان'' ص۶۹)۔ اسی مجموعے میں یحییٰ خان اور اُس کے ساتھیوں کی جنسی بداعمالیوں اور قومی تاریخ کے ایک نازک موڑ پر مجرمانہ غفلتوں کی افسانوی رُوداد "اغیار کی کھلی دہلیز پر دعوت بُوقلموں" کی صورت میں موجود ہے، جسے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی اشاعت نے افسانوی اسراریت اور تہ داری سے محروم کردیا ہے مگر اس مجموعے کا سب سے موثر افسانہ "ٹڈی دل آسمان" ہے جو علامتی انداز میں ایک استحصالی نظام کے اُن کارندوں کے بارے میں ہے جو کسی بھی دھرتی کی ہریالی اور اُمید کے دشمن ہیں۔ ایسے ٹڈی دل کے رُوبرو نحیف اور نہتے لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ خالی کنستر بجانے اور آگ جلانے سے ٹڈی دل اپنے رُخ بدل لیتے ہیں، تاہم اس افسانے میں بھی آخری تین سطریں آغا محمد یحییٰ خان کے حوالے سے ایسی ہیں جو اس افسانے کو ایک مخصوص زمان سے منسلک کردیتی ہیں۔ "الف ننگا، سرخ وسپید، بھاری تن و توش — نشے میں غراتی نیزہ آنکھیں — اور چوپٹ راج دھانی کا خزانہ خالی —" (ٹڈی دل آسمان، ص۹۱)۔

☆☆☆

رشید امجد

''جدید سندھی ادب'' — ایک جائزہ

پاکستانی زبانوں میں سندھی زبان کو اپنی قدامت اور ادبی ذخیرے کی وجہ سے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اُردو کے پھیلاؤ نے ابلاغ کے بہتر ذرائع کی وجہ سے مختلف علاقوں کے ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری زبانوں میں ادبی تخلیقات خاصی کم ہوگئیں اور آہستہ آہستہ مرکزی دھارے سے بھی دور ہوتی گئیں، لیکن سندھی ادیبوں نے اپنی روایت اور زبان سے رشتہ نہیں توڑا، چناں چہ سندھی ادب ہمیشہ قومی زبان کے ساتھ قدم ملا کر چلتا رہا۔ موضوعاتی حوالے ہی سے نہیں فنی اور تکنیکی سطح پر بھی سندھی ادب عصری رویوں اور رجحانات سے ہم آہنگ رہا۔ پاکستانی زبانوں کے ادب کا عمومی جائزہ لیں تو یہ بات واضح طور پر محسوس ہوتی ہے کہ سندھی ادب کے سوا، دوسری پاکستانی زبانوں کا ادب بڑی حد تک ان نئے رجحانات خصوصاً فنی اور تکنیکی تبدیلیوں سے محروم ہے جو اُردو میں عصری حوالوں سے ہوئی ہیں۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ سندھی ادیب اپنی زبان کی محبت کے ساتھ ساتھ نئی تبدیلیوں سے بھی آشنا ہیں۔

پاکستان کی زبانیں، اُردو کے علاوہ، نشر و اشاعت کی دشواریوں کا سامنا بھی کرتی ہیں، مثلاً پنجابی ایک بڑے علاقے کی زبان ہے مگر اس میں کوئی روزنامہ نہیں، اخبار نکلتے ہیں اور بند ہوجاتے ہیں، ادبی رسالوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی حال پشتو، بلوچی اور کشمیری کا ہے لیکن سندھی کے یہ مسائل نہیں۔ سندھی ادیب کو اشاعت کا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ اس کے پڑھنے والے بھی موجود ہیں۔ یقیناً اس میں سندھی ادیبوں کی کاوشوں کو بھی بڑا دخل ہے۔ اسی لیے آج سندھی ادب اپنے معیار اور تعداد کے حوالے سے اُردو زبان کے ادب سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ سندھی زبان میں تنقید و تحقیق کی بھی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ سندھی ادب کے بے شمار تراجم اُردو زبان میں بھی ہوئے ہیں اس لیے اُردو داں سندھی ادب سے ناواقف نہیں، لیکن سیّد مظہر جمیل نے جس پھیلاؤ، تحقیق اور محنت کے ساتھ سندھی ادب کے جدید میلانات

ورجحانات کو متعارف کروایا ہے، وہ ایک منفرد کاوش ہے۔ کہنے کو کتاب کا نام ''جدید سندھی ادب'' ہے لیکن جدید سندھی ادب کی روایت کو تلاش کرتے ہوئے وہ ماضی کی گہرائیوں میں اترے ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر کا آغاز سندھی زبان و ادب کی ابتدا سے کیا ہے۔ چناں چہ یہ کتاب سندھی ادب کا ایک بھرپور تحقیقی جائزہ ہی نہیں، سندھی ادب کی ایک مبسوط اور معیاری تاریخ بھی ہے، اس لیے کہ ادبی تاریخ کے جو لوازم گنائے جاتے ہیں، وہ اس کتاب میں موجود ہیں۔

کتاب کے پہلے دو ابواب معاشرتی و تہذیبی تغیرات اور تاریخی و معاشرتی تناظر سے متعلق ہیں۔ پہلے باب میں عروج و زوال کے عالمی فلسفے سے بحث کرتے ہوئے وادیِ سندھ میں تہذیب کے ابتدائی آثار تلاش کیے گئے ہیں۔ سندھ کے قدیم تاریخی ماخذات سے گزر کر سندھ پر پڑنے والے مختلف اثرات کا، جن کا تعلق برِصغیر کی مجموعی تاریخ سے ہے، جائزہ لیا گیا ہے۔ اشوک سے محمد بن قاسم تک جو مختلف قومیں اور ان کے اثرات وادیِ سندھ میں آئے ان کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ کسی تعصب کی بنیاد پر نہیں بلکہ حقائق اور ان کے اثرات کی بنیاد پر ہے جو ایک محقق کا بنیادی فرض ہے۔ اس باب کو سندھ پر مختلف اوقات میں ہونے والے حملوں اور ان کے اثرات کی تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دوسرا باب سندھ کے مقامی حکمرانوں کے حالات سے متعلق ہے، اس باب کا خصوصی حصہ وہ ہے جو سندھ میں یورپی اقوام کی آمد اور ان کے اثرات پر مشتمل ہے۔ سندھ کی اس دور کی سیاست میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کھیل اسی بساط پر ہے جو بنگال اور بعد میں پورے ہندوستان میں بچھائی گئی تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے یہاں بھی وہی کردار ادا کیا جو دیگر ہندوستان میں ادا کیا گیا۔ انگریزوں نے سندھ کو تباہ و برباد بھی کیا اور جدید سندھ کی بنیاد بھی رکھی، لیکن یہ جدت انگریزوں کے اپنے مفاد میں تھی۔ دیگر ہندوستان کی طرح یہاں بھی انھوں نے بھلائی کے وہی کام کیے جو ان کے اپنے مفاد میں تھے۔ زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے بھی انگریزوں کے مقاصد متعین تھے اور انھوں نے اُسی دائرے میں رہتے ہوئے سندھی زبان خصوصاً رسم الخط کی طرف توجہ کی، لیکن جس طرح فورٹ ولیم کالج کے سیاسی مقاصد نے غیر ارادی طور پر اُردو زبان میں سادگی کو فروغ دیا، اسی طرح سندھی زبان کو انگریزی افسروں کے لیے لازمی قرار دینے کے فیصلے نے سندھی زبان کے فروغ میں ایک کردار ادا کیا۔

> ۱۸۵۱ء میں کمشنر سر بارٹل فریئر نے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ سرکاری افسر سندھی میں امتحان پاس کریں تاکہ سندھی رعایا تک ان کی براہ راست رسائی ممکن ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے ایک جدید رسم الخط کا تعین بھی ضروری تھا۔

یہ وہی مقصد اور سوچ تھی جس کی بنیاد پر فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا تھا۔

کتاب کا تیسرا باب سندھی زبان، اس کے رسم الخط اور قواعد و لغت سازی کے مباحث پر

مشتمل ہے۔ سندھی زبان برصغیر کی قدیم زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ مرزا قلیچ بیگ سندھی زبان کا تعلق آریاؤں کی قدیم زبانوں سے جوڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ پراکرت کی بیٹی اور سنسکرت کی نواسی ہے۔ دیگر سندھی ماہرینِ لسانیات بھی سندھی کو بگڑی ہوئی سنسکرت قرار دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں سندھی زبان سنسکرت سے بھی قدیم ہے۔ گویا سندھی زبان کی تاریخ برِصغیر کی کئی زبانوں کے مقابلے میں بہت قدیم ہے۔ جس سے اس کی تاریخی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ سید مظہر جمیل زبان کی اس بحث میں مختلف مغربی اور مشرقی ماہرینِ لسانیات کی آرا درج کرنے اور ان پر تنقید کرنے کے بعد کہتے ہیں:

> اب صورتِ حال یہ ہے کہ سندھی زبان کے ماہرین و محققین واضح طور پر تین گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ ایک گروہ سندھی زبان کو سنسکرت، قدیم پراکرت وغیرہ کی زائیدہ بتاتا ہے جب کہ دوسرا گروہ سندھی زبان کو سنسکرت سے بھی قدیم تر اور اپنی ذات میں مکمل زبان ٹھہراتا ہے اور سنسکرت اور سندھی کو ایک ہی ماخذ کی زائیدہ جانتا ہے۔ تیسرا گروہ جس کی سربراہی ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کرتے ہیں، اس خیال کا حامی ہے کہ سندھی زبان کسی قدیم سومیری، عبرانی یا مغرب سے آئی ہوئی زبان سے نکلی ہے اور اس کی ساخت اور صوتیات سنسکرت کی ساخت اور صوتیات سے مختلف ہیں۔

بھارت کے سندھی دانش ور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی رائے سے اس لیے اتفاق نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک عربی رسم الخط کی وجہ سے سندھی زبان کا مزاج بدل گیا ہے۔ ان کی رائے میں اگر سندھی دیوناگری یا گورمکھی میں لکھی جائے تو اس کی اصل سنسکرت سے جا ملے گی۔

یہ بیان ان لوگوں کے لیے قابلِ غور ہے جو اُردو کو عربی کی بجائے رومن رسم الخط میں لکھنا چاہتے ہیں۔ رسم الخط صرف لکھنے کا ایک انداز نہیں، اس کے پس منظر میں پوری تہذیبی روایت اور قوم کی ذہنی اور تخلیقی تاریخ ہوتی ہے۔

کتاب کا چوتھا باب جسے "زندہ روایت کا سفر" کہا گیا ہے، سندھی ادب کے آغاز اور ان فن کاروں کے جائزے پر مشتمل ہے جنھوں نے سندھی ادب کی بنیاد رکھی اور زندہ روایت کے طور پر آج بھی موجود ہیں۔

اگلے ابواب میں سندھی ادب کی مختلف اصناف، شعری و نثری، کا فن کارانہ محاکمہ کیا گیا ہے۔ ان ابواب میں تخلیقات کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں کے فنی سفر کا جائزہ بھی شامل ہے۔ تخلیقی ادب کے پہلو بہ پہلو تنقید و تحقیق کے میدان میں ہونے والی عہد بہ عہد سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے سندھی ادب کا ماضی اور حال پوری طرح سامنے آجاتا ہے ایک باب سندھی میں لکھے جانے والے

مزاحمتی ادب سے متعلق ہے جو اس حوالے سے اہم ہے کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف جبری ادوار میں سندھی ادیب نے اپنا کردار کس طرح ادا کیا ہے۔ کتاب کے آخری باب میں سرحد پار کے سندھی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے اور اہم لکھنے والوں کی تخلیقات سے متعارف کروایا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب پورے سندھ کا احاطہ کر لیتی ہے۔

تاریخ ادب اور سیاسی سماجی پس منظر کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ منتخب سندھی تخلیقات کے اُردو تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں، جن کی وجہ سے سندھی زبان سے ناواقف لوگ بھی اس کتاب سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ سیّد مظہر جمیل نے جس محنت اور لگن سے یہ کام کیا ہے ان چند صفحات میں اس کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ محمد ابراہیم جویو نے اس سلسلے میں بنیادی بات کہی ہے:

> مظہر جمیل نے اپنے موضوع سے متعلق ضروری مواد کو غیر معمولی جاں فشانی اور لگن کے ساتھ جمع کر کے مناسب اور موثر انداز میں سمیٹا ہے، ویسے تو کتاب کا موضوع 'جدید سندھی ادب' ہے لیکن مظہر جمیل نے سندھی ادب کے کلاسیکل اور اوائلی عہد کی خصوصیات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور سندھ کی معاشرتی تبدیلیوں کے پس منظر میں سندھی ادب کے رویوں اور رجحانات کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔

ادبی تاریخ لکھنے کے سلسلے میں مؤرخ کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان میں پہلا مرحلہ مواد کی فراہمی ہے، دوسرا، اسی مواد کو تحقیق کی چھلنی سے گزارنا ہے، ترتیب و تحریر کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔ پہلے دونوں مرحلے تلاش کے ساتھ ساتھ جذباتی لگن چاہتے ہیں۔ مظہر جمیل کے یہاں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ ان کی ایک انفرادی خوبی یہ ہے کہ وہ صاحب ذوق ہیں اور مواد کی چھان پھٹک میں معیار اور غیر معیار کی تمیز کر سکتے ہیں۔ ان کے مقاصد میں صرف سندھی ادب کی تاریخ لکھنا شامل نہیں تھا بلکہ اس حوالے سے انھوں نے سندھ کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ تقسیم کے بعد سندھ جس آشوب سے گزرا ہے اور مختلف بااثر اور حاکم طبقوں نے اپنے مفاد کے لیے جس طرح سندھی اور غیر سندھی کی تفریق پیدا کی ہے، وہ زیادہ دور کی بات نہیں۔ آج کا سندھ ایک نئی کروٹ لے رہا ہے۔ سماجی شعور نے سندھیوں کو غیر اہم نعروں سے نکال کر حقیقی مسائل سے آشنا کیا ہے۔ سیّد مظہر جمیل کو اس کا پورا احساس ہے، وہ کہتے ہیں:

> میں سمجھتا ہوں جدید سندھی ادب ہی جدید سندھ کے فکری اور سماجی عوامل کا آئینہ دار ہے اور اُس نے سندھی معاشرے، تاریخ، سیاست، ثقافت، قومی سائیکی اور مستقبل کی بابت متعدد اہم سوال اٹھائے ہیں۔

انھوں نے کوشش کی ہے کہ یہ کتاب محض تذکرہ نگاری تک محدود نہ رہے بلکہ ان میلانات، رجحانات اور رویوں کی تلاش کرے، جو سندھی ادب کے حوالے سے سندھیوں کے خوابوں کے ترجمان ہیں۔ سیّد مظہر جمیل ایک کومیٹڈ ترقی پسند ہیں۔ وہ ادب کی جمالیاتی قدروں کو سماجیات سے الگ نہیں کرتے، اس لیے سندھی ادب کے جائزے میں انھوں نے تخلیقی عمل اور اس کی جمالیاتی اقدار کے ساتھ ساتھ ان سماجی سیاسی رویوں کو بھی اہمیت دی ہے جو مختلف ادوار میں سندھی ادب کے بنیادی رجحانات رہے ہیں۔ سیّد مظہر جمیل کو سندھی زبان و ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ اُردو اور سندھی دونوں زبانوں پر دسترس کی وجہ سے ان کے اظہار میں کوئی لکنت نہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ "سندھی ادب سے شغف ہمیشہ میرے شوقِ فراواں کا حصہ رہا ہے۔" اس شوق کا ایک اظہار تو ان کی کتاب "آشوبِ سندھ اور اُردو فکشن" میں ہو چکا ہے۔ یہ کتاب بھی حوالے کی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کا یہ تازہ سفر بھی اسی شوق کی عاشقانہ روداد ہے۔ اس کتاب کی سندھی زبان و ادب میں تو جو اہمیت ہوگی، سو ہوگی لیکن اُردو داں طبقے کے لیے اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے درست کہا ہے:

> جدید سندھی ادب کی اتنی جامع اور مکمل عکسی تصویریں اس سے قبل کسی ایک ہی جگہ یوں اُردو قاری کے سامنے موجود نہ تھیں۔ مظہر جمیل کی مذکورہ کتاب کے توسط سے آج ہم سندھی ادب کی بابت خود کو زیادہ باعلم اور سندھی ثقافت کی رمزیت سے خود کو کہیں زیادہ سرشار پاتے ہیں۔

یہ کتاب محض ادبی تاریخ نہیں بلکہ سندھ کی ایک جامع دستاویز ہے جس میں عہد بہ عہد ہونے والی مجموعی تبدیلیوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ ممتاز مہر کی رائے میں:

> اس میں سندھی سماج اور معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور سیاسی و معاشی حالات کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے ادبی رویوں اور رجحانات کا جس انداز میں جائزہ لیا گیا ہے اس سے ادب اور معاشرے کے درمیان نظر آنے والے رشتے زیادہ واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

سیّد مظہر جمیل ایک نظریاتی شخص ہیں، انھوں نے سندھی ادب کو اس کے سیاسی سماجی حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یوں یہ کتاب سندھی ادب کی ایک عمومی تاریخ نہیں بلکہ سندھ کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ ہے جس کے مطالعے سے سندھ اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ مشفق خواجہ کہتے ہیں:

> مظہر جمیل نے اس کتاب میں یوں تو جدید سندھی ادب کا جائزہ لیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس ادب کو صدیوں کے سیاق و سباق میں جس انداز سے دیکھا، وہ ان کی محققانہ کاوش اور ناقدانہ بصیرت کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔

یہ یقیناً سید مظہر جمیل کے صاحب مطالعہ ہونے کے ساتھ صاحبِ ذوق ہونے کی دلیل ہے۔ انھوں نے جس محنت سے سندھ کی تاریخ کو اس کی جڑوں سے تلاش کیا ہے اس کے لیے انھیں سال ہا سال محنت کرنا پڑی ہوگی۔ مظہر جمیل اُردو اور سندھی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ سراج الحق میمن کی یہ بات بالکل درست ہے کہ:

> حیرت کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں جب فراہمیِ مواد ایک مشکل کام ہے، انھوں نے اس قدر مواد حاصل کرنے میں کس طرح کامیابی حاصل کرلی۔

یہ کام ایک شخص کا نہیں ادارے کا ہے۔ سید مظہر جمیل نے اسے تنہا مکمل کر کے ایک نئی تاریخ مرتب کی ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ وہ خود سندھی نہیں ہیں، ڈاکٹر فہمیدہ حسین نے درست کہا ہے کہ سندھی زبان و ادب پر اتنی جامع کاوش کسی سندھی بولنے والے محقق نے بھی نہیں کی۔

یہ کتاب قومی یک جہتی میں اُس بدلتے مثبت رجحان کی ترجمان ہے جو اب پاکستانی قومیتوں میں جنم لے رہا ہے۔ ایک اُردو بولنے والے نے جس طرح لسانی رابطوں کی نئی بنیاد رکھی ہے وہ مستقبل میں باہمی اعتماد اور بھائی چارے کی علامت ہے۔ ایک عرصے تک سندھ کے اُردو بولنے والوں پر یہ اعتراض تھا کہ وہ سندھی زبان اور کلچر سے دور ہیں۔ سید مظہر جمیل نے اس کو رد کر دیا ہے۔ اس کتاب کی افادیت اور اہمیت کا اعتراف خود سندھی محققین نے بھی کیا۔

ڈاکٹر ادل سومرو کہتے ہیں:

> ''سندھی زبان اور ادب پر ایسی جامع کتاب سندھی میں بھی موجود نہیں۔''

سراج الحق میمن کی رائے ہے:

> ''مظہر جمیل کی سندھی ادب پر اُردو زبان میں تحریر کردہ کتاب دراصل اہلِ سندھ کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل ہے۔''

ممتاز مہر نے کہا ہے:

> ''انھوں نے اس کتاب کو لکھ کر فرزند سندھ ہونے کا حق ادا کیا ہے۔''

یہ کتاب سندھ میں یک جہتی کے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ اس کی اہمیت صرف یہ نہیں کہ یہ اُردو زبان میں لکھی گئی سندھی ادب کی ایک جامع تاریخ ہے جس سے غیر سندھی مستفید ہوں گے بلکہ اس سے پاکستان کی مختلف قومیتوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے میں مدد ملے گی۔ آغا سلیم نے بہت عمدہ بات کہی ہے:

> مظہر جمیل نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف سندھیوں کو مقروض کیا ہے بلکہ سندھی نہ جاننے والوں کو بھی مقروض کیا ہے۔ ہم سب ان کا یہ قرض صرف اس طرح اتار سکتے ہیں کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ بڑے حلقوں میں پڑھا جائے۔

خاص طور پر نئے سندھی کہ جنھوں نے سرزمین سندھ کو اپنا وطن بنالیا ہے۔ اب
سندھ کی تاریخ، علم اور ادب اُن کا ورثہ ہے۔

یہ ورثہ صرف نئے اور پرانے سندھیوں کا نہیں بلکہ ہر پاکستانی کا ہے۔ اس کتاب کو یا اس کے منتخب حصوں کو پاکستانی ادب کے کورس میں شامل ہونا چاہیے تا کہ ہمارے درمیان موجود اجنبیت محبت میں بدلے اور ہم ایک دوسرے کے قریب آئیں کہ یہی جدید دور کا تقاضا ہے اور اس کتاب کو تحریر کرنے کا مقدس مقصد ہے۔

☆☆☆

محمد حمید شاہد

"جدید سندھی ادب" پر ایک نظر

رگ وید میں لکھا ہے:

○ اے سندھو! تیری موجوں کی گھن گرج زمین سے آسمان تک پہنچتی ہے۔

○ تیری بپھری ہوئی لہروں میں زندگی کی برق رفتار روانی اور بہاؤ ہے اور جب گرجتے بادل تجھ پر برستے ہیں تو تُو کسی حاملہ عورت کی طرح اٹھلا اٹھلا کر چلتا ہے۔

○ اے سندھو! دوسری ندیاں دودھ دیتی ہوئی گایوں کی مانند ہیں جو اپنے بچھڑوں کو دودھ پلانے کے لیے بے چینی کے ساتھ دوڑتی ہیں اور تو کناروں کے بیچ اُچھل اُچھل کر ان کی یوں رہ نمائی کرتا ہے جیسے کوئی سیناپتی یا راجا، جنگ کرنے کے لیے یلغار کرتا ہو۔

○ ہمیشہ رواں دواں سفید جھاگ اڑاتے شفاف چمکتے پانیوں والے سندھو دریا! تیرا بہاؤ سرکش اور کرشماتی گھوڑوں کی طرح تیز وتند ہے اور تیرا روپ ایسا ہے جیسے کوئی خوش جمال حسینہ۔

○ جل دیوتا، تیرے شایانِ شان استقبال کے لیے سات سات ندیوں کو تیری پیشوائی میں حاضر رکھتا ہے کہ تو ایک عالم کو سیراب کرتا رہے۔

○ سندھو! تو عمدہ اور پُر وقار گھوڑوں والی رتھ پر خوش خرامی کے ساتھ بہے چلا جاتا ہے۔

○ ہم اس عالی شان رتھ والے سندھو کا جگ جگ خیر مقدم کرتے ہیں۔

"آشوبِ سندھ اور اردو فکشن" کے فوراً بعد لگ بھگ سولہ سو صفحات پر مشتمل سید مظہر جمیل کی ایک اور شان دار کتاب "جدید سندھی ادب۔ میلانات، رجحانات، امکانات" پڑھ کر اٹھا تو دریائے سندھ کا وہ منظر جو رگ وید میں دکھایا گیا تھا، میری نظروں میں سمایا ہوا تھا۔ بس فرق تھا تو اتنا کہ سات سرکش ندیوں کی جگہ ان پندرہ ابواب نے لے لی تھی جنھوں نے سندھ کے پانیوں سے سیراب ہوتی مٹی کی مہک کو اپنے اندر سمولیا ہے اور وہ بھی صاحب یوں کہ اس کا قاری نہ صرف اس دھرتی پر بنتی بگڑتی زندگی، تہذیبی سماجی اور سماجی شعور کی تاریخ سے آگاہ ہوتا ہے بلکہ وہ سندھی زبان و ادب کے خمیر، معنیاتی نظام اور جمالیاتی

دھاروں کے مقابل بھی ہو جاتا ہے۔

''آشوب سندھ اور اردو فکشن'' میں مظہر جمیل نے اردو فکشن کے ذریعے سیاسی، تہذیبی اور سماجی زندگی کو دیکھنے کا چلن اختیار کیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ تخلیقات کے تجزیے بھی کرتے چلے گئے۔ اردو فکشن کے ساتھ تخلیقات کی تفہیم کے اس قرینے نے اسے ایک اہم تنقیدی حوالہ بنا دیا تھا۔ جدید سندھی ادب کی تاریخ لکھتے ہوئے بھی یہی پیمانہ مظہر جمیل کے پیش نظر رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں اسے صرف سندھی ادب کی تاریخ نہیں سمجھتا، اسے تنقید کی نہایت اہم کتاب بھی گردانتا ہوں۔

کتاب کے پہلے دو ابواب میں سندھ کا معاشرتی، تہذیبی اور تاریخی تناظر مفصل بیان ہوا ہے۔ اس کتاب میں وادی مہران کی صدیوں پر پھیلی تاریخ کے بیان کا مقصد مصنف نے کتاب کی ابتدائی سطور میں ہی واضح کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ:

''ہر دور کا ادب معاصرانہ زندگی، معاشرتی عوامل، انسانی گروہوں اور قبائل کے سماجی تفاعل، اجتماعی خوابوں، امنگوں فتوحات اور محرومیوں کا نہ صرف حساس ترجمان اور صورت گر ہوتا ہے بلکہ کسی نہ کسی سطح پر سماجی سرگرمیوں کا فعال حصہ بن جاتا ہے۔''

اس ایقان نے مظہر جمیل کو حوصلہ دیا ہے کہ وہ زبان کے بھید بھنوروں میں الجھ کر رہ جائے اور متن کی ساخت سے آگے بڑھ کر اس کے اندر رواں اس روح تک بھی پہنچ پائے جو فی الاصل اس کی تشکیل کا محرک رہا ہے۔ وادی سندھ کے تہذیبی عناصر اور تاریخی تسلسل میں دیکھنے کے بعد وہ تیسرے باب میں سندھی زبان، رسم الخط اور لغت سازی کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس باب میں سندھی زبان کی تشکیل کے حوالے سے ان دونوں گروہوں کے نقطہ نظر پر بحث کی گئی جن میں سے ایک سندھی زبان کو خالص سنسکرت سے جوڑتا ہے جب کہ دوسرا آریاؤں کی قدیم زبانوں کے شجرے میں شامل کرتے ہوئے اسے پراکرت کی بیٹی اور سنسکرت کی نواسی کہتا ہے۔ اس باب میں پروفیسر لیلو رچندانی کا یہ کہنا بھی جگہ پا گیا ہے کہ سندھی زبان تو صدیوں سے اپنی اصل صورت میں موجود رہی ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ سندھی ادب میں بیش تر تصنیف و تالیف کا کام 'وچولی' بولی میں ہوا ہے اس لیے وچولی بولی کے لہجے کی چھاپ پورے سندھی ادب پر گہری نظر آتی ہے۔

زبان کی تشکیل کی بحث کے بعد وہ زبانی شعری روایت سے لوک ورثے، عوامی گیتوں، رومانی داستانوں اور قدیم اصناف کے تذکرے تک آتے ہیں اس باب میں سورٹھے، سکھے، رزم نامے، نسب نامے، گنان، جھمر، چو، ہو جمالو، ڈھولو، چھلوبیت، لوریوں اور سیارو جیسی لوک شاعری کا تذکرہ ہوتا ہے۔ وہ ابیات، کافی، وائی، گیت اور دوہے کے باب میں قابل قدر معلومات فراہم کرنے کے بعد سندھی زبان کے اس شاعر تک پہنچتے ہیں جس کا احوال سندھ کی ادبی تاریخ میں ذرا تفصیل سے ملتا ہے۔ میری مراد قاضی قاضن سے ہے جسے قاضی قادن بھی لکھا جاتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے جد امجد شاہ کریم بلڑی والے کے

ابیات کی تفصیل بھی بہم کی گئی ہے۔ شاہ کریم بلڑی والے جن کا زمانہ ارغونوں کا زمانہ بنتا ہے، نے شاہ عبداللطیف پر شاعری کا راستہ آسان کیا اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کیا تھا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حوالے سے جو معلومات اس کتاب میں ہیں وہ بجا طور پر ایک مستقل تصنیف کے لیے کافی ہیں۔ علی نواز وفائی نے یہ جو کہا تھا، ''لطیف سند آئیں سند لطیف آ'' یعنی لطیف سندھ ہے اور سندھ لطیف، تو بجا کہا تھا کہ سندھی زبان وادب اور روحانیات کے علاقے میں سب سے زیادہ اور سب سے گہرے اثرات شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہیں۔ شاہ صاحب کا زمانہ وہی بنتا ہے جب مغلوں کی مرکزی حکومت کم زور پڑنے کے بعد سندھ میں ختم ہی ہوگئی تھی۔ یہاں کلہوڑہ خاندان اقتدار میں تھا اور پورا سندھ ایک جامد معاشرے کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ شاہ لطیف ایسے زمانے میں اپنی شخصیت اور اپنے کلام سے ایسا جادو جگاتے ہیں کہ سینوں کو منور کرتے چلے جاتے ہیں۔ سچل سرمست اور شاہ عنایت شہید جھوک والے کے صوفیانہ کلام کا تذکرہ ہو یا بھائی چین رائے لنڈ سامی کی ویدانتی شاعری کا، اس کتاب میں نہ صرف قابلِ قدر معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کے کلام کی روح اور اسلوب سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ اس باب میں قادر بیدل بخش، میر عبدالحسین سانگی اور سید ثابت علی شاہ کے نام سے الگ الگ عنوانات کے تحت جدید سندھی ادب کی بنیادوں کو تلاشا گیا ہے۔

فاضل مصنف پانچویں باب سے جدید سندھی ادب کی طرف متوجہ ہوا۔ سندھی ادب کی رفتار اور رجحانات کو قریب سے جاننے کے لیے اسے چار ادوار میں تقسیم کیا گیا۔ عبوری دور ۱۷۰۰ء میں شروع ہوتا ہے ۱۸۵۳ء تک چلتا ہے۔ عہدِ تاسیس ۱۸۵۳ء سے ۱۹۰۰ء کے زمانے کو قرار دیا گیا، عہدِ تعمیر کا دورانیہ ۱۹۰۰ سے ۱۹۴۷ یعنی قیامِ پاکستان تک کا زمانہ ٹھہرا جب کہ عہدِ جدید قیامِ پاکستان کے بعد کا زمانہ۔ عبوری اور تاسیسی ادوار کے سندھی ادب کی نمایاں خصوصیات کے مفصل بیان کے بعد عہدِ تعمیر کے لیے چھٹے اور ساتویں باب میں تخلیق کاروں کے ناموں کے عنوانات قائم کرکے اس عہد کی بھرپور ادبی تاریخ اور تجزیوں کے علاوہ نمونہ ہائے کلام کے اردو تراجم سے اس کتاب کو اس عہد کا آئینہ بنا دیا گیا۔ اسی باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ سندھی نثر کی نئی نئی اصناف اسی زمانے میں سامنے آئیں اور اس کا سبب دوسری زبانوں کے سندھی میں تراجم کو قرار دیا گیا۔ طبع زاد ناول نگاری، ڈراما نگاری، یادداشتیں اور سفرنامے لکھنے کا رجحان چل نکلا اور بہت مقبول ہوا۔ مظہر جمیل نے بتایا ہے کہ مختصر کہانی اور افسانے کی صنف بھی اس عہد میں پیدا ہوئی اور پھر بڑی تیزی سے پھلی پھولی۔ ناول نگاری، ڈراما نگاری، ناٹک، اور افسانے کے الگ الگ عنوانات کے تحت اس عہد میں شائع ہونے والی تصانیف کا بھرپور تذکرہ اس حصے میں جگہ پا گیا ہے۔ مرزا قلیچ بیگ کے اثرات قبول کرکے شروع ہونے والے عہدِ تعمیر کے جن منتخب نثر نگاروں کے مفصل احوال بیان ہوئے ہیں ان میں ڈاکٹر ہوت چند مول چند گر بخشانی، حکیم فتح محمد سیوہانی، جیٹھ مل پرس، دلرام گل راجانی، کاکو بھیرو مل آڈوانی، لعل چند امر، خلیق مورائی، صدیق مسافر، محمد صدیق میمن، مرزا نادر بیگ،

علامہ عمر بن محمد داؤد پوتہ، نارائن داس میورام بھمبھانی، صاحب سنگھ چندا سنگھ شاہانی، میلا رام منگت واسوانی، عثمان علی انصاری، محمد دین وفائی، آسانند مامتورا، امر لعل ہنگورانی، محمد عثمان ڈیپلائی، عطا حسین شاہ موسوی، عبدالحسین شاہ موسوی اور محمد اسماعیل عرسانی شامل ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد کے عہد کو فاضل مصنف نے رجحانات و میلانات کے سیلِ رواں کا زمانہ قرار دیا ہے اور یہی وہ عرصہ ہے جسے جدید سندھی ادب کا دورانیہ کہا گیا ہے۔ تاہم جدید سندھی ادب پر بات کرنے سے پہلے سندھ کے تہذیبی تناظر میں ہو چکے کام اور اس کے اثرات کو گہرائی سے جانچتے ہوئے ان زیریں محرکات کو بھی تلاش کیا گیا جو نئے ادب کی نمو کا باعث اور جواز ہوئے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ قیامِ پاکستان کے آس پاس اور اس کے بعد سندھی شاعری کا نیا لب ولہجہ بننے لگا تھا۔ نئے موضوعات، مسائل اور انداز اظہار پانے لگے تھے۔ اس مدت میں افسانہ ناول اور ڈرامے میں نئے نئے تجربات ہوئے جس نے سندھی ادب کو ثروت مند کر دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد فوری طور پر سامنے آنے والی نسل میں نمایاں ترین نام شیخ ایاز کا تھا، لہٰذا شیخ ایاز کی شاعری اور نثر کا اس کتاب میں بھرپور احاطہ ملتا ہے۔ تقسیم کے آس پاس جو لوگ لکھ رہے تھے ان میں شیخ عبدالرزاق سے لے کر میراں محمد شاہ، محمد ہاشم مخلص، حاجی محمود خان اور برکت علی آزاد تک بیسیوں اہم لوگوں کے کام سے اسی حصے میں تعارف ہوتا ہے اور پھر اس کارواں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جیسے مخدوم طالب المولیٰ، نیاز ہمایونی، ایاز قادری، جمال ابڑو، شمشیر الحیدری، تنویر عباسی جیسے اہم تخلیق کار ہوں یا ۱۹۵۵ سے ستر کے عرصے اور پھر بعد ازاں اپنا مقام بنانے والی نسل، چاہے ان میں ترقی پسند تھے یا قومیت پرست، روایت کے ساتھ خلوص سے جڑے ہوئے لوگ تھے یا جدیدیت پسند اور تخلیقی عمل کو تمام وقتی رویوں اور ہنگامی رجحانات سے الگ رکھنے والے تخلیق کار، تمام کا تذکرہ ان کے تخلیقی رویوں کے ساتھ اس کتاب کا حصہ ہو گیا ہے۔ جدید سندھی شاعری کے کیا خدوخال نکلے اور وہ کون سے موضوعات تھے جو اسے مرغوب رہے اس کتاب کے ذریعے اس سب کا مطالعہ بہت اہم ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں سندھی زبان میں سرحد کے پار کیا ہوا اور کیا کچھ لکھا جا رہا ہے، وہ بھی اس کتاب کے قاری کے لیے بہم کر دیا گیا ہے۔

یہیں مجھے سندھی فکشن کا تذکرہ کرنا ہے جس کا مطالعہ میرے لیے بہت دل چسپی لیے ہوئے تھا۔ سندھی فکشن کا یہ تذکرہ کتاب کے ابتدائی صفحات سے شروع ہو کر باقی اصناف کے ساتھ ساتھ آخر تک چلتا ہے۔ سومروں کے زمانے کے روایتی قصے کہانیاں اور عشق ومحبت کی داستانیں ہوں یا پھر مراٹھی، بنگالی، اردو، انگریزی اور دیگر زبانوں سے سندھی میں فکشن کے تراجم کا ارتقائی دور یا پھر نئی طبع زاد کہانی کا جدید زمانہ، کوئی بھی ایسا گوشہ نہیں رہ جاتا جسے اس کتاب کے مرتب نے ان چھوا چھوڑ دیا ہو۔ یوں یہ کتاب سندھی فکشن کی ایک مستند تاریخ بھی ہو گئی ہے۔ میں فکشن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے سمجھتا ہوں کہ سندھی ادب کے ساتھ ساتھ اردو والوں کے لیے بھی یہ ایسا اہم کام ہے جس کے اردو فکشن پر

مثبت اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ سندھی فکشن میرے لیے حیرت کا ایسا دریچہ ثابت ہوا ہے جو اس کتاب میں سندھ [illegible] حل کیا گیا ہے [illegible] تحسین کی وہ صورت پیدا ہوگئی ہے جس کے زیرِ اثر سندھی فکشن کو مزید توجہ سے پڑھا جائے گا اور وہاں کے آدمی کی حسیات کو بھی اردو کے مجموعی مزاج کا حصہ بنا لیا جائے گا۔

سید مظہر جمیل نے سندھی افسانے کے پہلے دور میں مرزا قلیچ بیگ کو بہت اہم گردانا ہے جس کے قصوں اور کہانیوں جیسے مضامین نے افسانے کے لیے فضا تیار کی۔ سندھی افسانے کے سامنے بھی اردو افسانے کی طرح درآمدہ شارٹ اسٹوری کا ماڈل تھا۔ اس کے تشکیلی دور میں جہاں موپساں، چیخوف، گورکی، اوہنری، ہیمنگ وے، ٹالسٹائی، خلیل جبران، ٹیگور وغیرہ کے سندھی میں تراجم ہوئے وہیں بعد میں پریم چند، کرشن چندر، منٹو، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی کو بھی ترجمہ کیا گیا اور اس کے اثرات سندھی فکشن نے قبول کیے۔ سندھی افسانے میں سماجی حقیقت نگاری کا دور ۱۹۳۰ سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۴۲ میں ترقی پسند افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سرد آہوں'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا جس میں غریب عوام مزدور طبقے اور کسانوں کے مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا گیا تھا۔ یہیں شیخ ایاز کی کہانیوں کے ۱۹۴۶ء میں شائع ہونے والے مجموعے ''سفید وحشی'' کا ذکر بطورِ خاص کرنا چاہوں گا جو اسی عنوان سے کتاب میں شامل ہوا اور جو کتاب کی ضبطی کی وجہ ٹھہرا۔ مظہر جمیل نے شیخ ایاز کے اس مجموعے کو سندھی افسانوں کا ایسا پہلا مجموعہ قرار دیا ہے جسے باغیانہ قرار دے کر پابندی لگائی گئی۔ مظہر جمیل کا کہنا ہے کہ قیامِ پاکستان تک سندھی افسانہ کم و بیش نصف صدی کی مسافت طے کر چکا تھا۔

سندھی افسانے کے جدید عہد کا ابتدائی مزاج حقیقت نگاری کی صورت میں متعین ہوتا ہے جس میں رفتہ رفتہ ترقی پسندانہ سوچ اور مزاحمتی رویہ نمایاں ہوتا چلا گیا۔ سندھی افسانے کا ہیرو وہی غریب، مفلس، بے چارگی کا مارا ہوا اور آگ میں تپا ہوا ہاری اور کسان ہے جو صدیوں سے زمین کا سینہ چیر کر رزق کا ڈھیر لگاتا چلا آتا ہے۔ سندھی فکشن کا دوسرا اہم کردار جسے مظہر جمیل نے شناخت کیا وہ وہاں کا وڈیرا، جاگیردار ہے جو اپنی خونی انگلیوں سے فطرت کے پیدا کیے ہوئے وسائل کو غاصبانہ انداز میں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ شرافت اور نیکی کے روپ میں مکروہ کرداروں اور اپنے مطلب کے لیے ظلم کے جانب دار بن جانے والا سندھی فکشن کا تیسرا اہم کردار ہو گیا ہے۔ اسی طرح غریب الدیار سفید پوش بابو، اسکولوں میں پڑھانے والے مدرس، کالجوں میں پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں اور اپنے اپنے مردوں کے ساتھ وفا کے رشتے کے ساتھ بندھی ہوئی عورتیں سندھی فکشن کے اہم کرداروں کی صورت میں روپ بدل بدل کر ظاہر ہوتے ہیں۔ سندھی کی تہذیبی روایت، دیہی زندگی اور معاشرہ سندھی کہانی کا منظر نامہ بناتے ہیں جب کہ سندھی قومیت کی بازیافت، مزاحمت، اور احتجاج سندھی کہانیوں کا ایک نمایاں موضوع ہے۔ سید مظہر جمیل نے اس باب میں امر جلیل، انجم عباسی، غلام ربانی آگرو، عبد القادر جونیجو، سراج میمن، ایاز قادری، رشید بھٹی، حفیظ شیخ، بشیر موریانی، رشید اخوند، ابن حیات پنھور، رسول بخش پلیجو وغیرہ کی کہانیوں

سے مثالیں دے کر اپنا مقدمہ قائم کیا ہے۔

آگے چل کر جدید افسانے کے بنیاد گزاروں میں جمال ابڑو، شیخ ابراہیم خلیل، لطف اللہ بدوی، حمید سندھی، مقبول صدیقی، مراز مراد علی، علی احمد بروہی، جمال رند اور خواجہ سلیم وغیرہ کا تذکرہ آتا ہے۔ سندھی افسانے پر نئے نئے میلانات کے در وا کرنے والوں کی ذیل میں مظہر جمیل نے مذکورہ افسانہ نگاروں کے علاوہ آغا سلیم، منیر احمد مانک چانڈیو، مہتاب محبوب، امر جلیل، نسیم کھرل، رسول میمن، غلام نبی مغل، طارق اشرف، عبدالحق عالمانی، بیدل مسرور، نور عباسی، زیب بھٹی اور نور الہدیٰ شاہ کا بھرپور ذکر کیا ہے۔ یوں دیکھیں تو جدید سندھی افسانے کے تین ادوار بنتے ہیں ۱۹۴۷ سے ۱۹۶۰ کا زمانہ، جس میں تخلیقی جوش ہر کہیں ابلتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور جس میں سیکڑوں کی تعداد میں افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۵ کا زمانہ، سندھی افسانے میں رجحانات کی تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ جب کہ بعد کے زمانے میں ذات کائنات میں تحلیل ہوگئی ہے اور کائنات ذات کے اندر سماتی ہوئی محسوس ہوتی ہے

غرض شاعری ہو یا افسانہ، ناول ہو یا سوانحی ادب اور دوسری اصناف، سندھی زبان ہو یا سندھی تہذیب کی کروٹیں سب کچھ اس کتاب کا ایک سلیقے سے حصہ ہوگیا ہے۔ صاحب، جب سید مظہر جمیل کی کتاب ''آشوب سندھ اور اردو فکشن'' آئی تھی تو میں پہلی بار مصنف کی طرف متوجہ ہوا تھا اور حیران ہوا تھا کہ یہ شخص کہاں چھپا رہا، اتنی محنت اور اپنے کام کے ساتھ اتنا بے پناہ خلوص اس نئے زمانے میں اس نے کیسے افورڈ کر لیا۔ اب ''جدید سندھی ادب'' کی اس ضخیم اور معتبر تاریخ کو دیکھ کر حیرتیں ایک بار پھر مجھ پر ٹوٹ پڑی ہیں کہ اتنا اہم کام اس نے تنِ تنہا کیسے کر لیا، ایسے کام تو اداروں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سندھی ادب کے حوالے سے یہ کتاب آئندہ بنیادی مآخذ کے طور پر استعمال ہوگی کہ سندھی ادب کے حوالے سے اس سطح کا کام قبل ازیں اردو کیا خود سندھی زبان میں بھی نہیں ہوا۔ اب اگر فہمیدہ ریاض نے یہ کہا ہے کہ سید مظہر جمیل کو اس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنی چاہیے تو یہ مطالبہ قطعاً بے جا بھی نہیں ہے۔

☆☆☆

رضی مجتبیٰ

بیداری کے خوابوں کی شاعری

اجمل سراج کا مجموعۂ کلام ''میں سوچتا رہ گیا'' پڑھ کر میں اس کی شاعرانہ استعداد اور genuinness پر حیران گیا۔ حیران اس لیے کہ میں نے اجمل کی شخصیت میں ان گنت روایتی اور جدید شعری رویوں کے پرتو دیکھے تھے اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اجمل اپنی ذات اور اپنی شاعری کے حوالے سے کسی form کی جستجو میں بھٹک رہا ہے اور عمر کے جس حصے میں وہ اس وقت ہے اس عمر میں جو بھی شاعر ہوتا ہے وہ اس کش مکش یا جستجو میں مبتلا تو رہتا ہی ہے، بشرطے کہ وہ واقعی شاعر ہو۔

اس کے مجموعۂ کلام کے دیباچے میں جناب افضال احمد سید نے لکھا ہے کہ ''اجمل سراج نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ اپنے اندر کی گہرائیوں میں نمو پانے والے بے پایاں سکون کا راستہ ہے۔ اس سکون کا حصول ایک خاص رویے سے ممکن ہے جس کی بنیاد لمحۂ موجود میں فنا ہوجانے کی خواہش پر ہے۔ وہ وقت کے دھارے سے آزادی حاصل کرکے زندگی کے سفر پر گامزن ہے۔'' اجمل سراج کا جو شعر انھوں نے اپنے اس مقدمے کی تائید میں نقل کیا، وہ ہے:

ترک غمِ رفتہ و اندیشۂ آئندہ بھی
دل کو رکھا ہے تری شان کے شایاں ہو کر

اور اس بات میں وقت اور اندیشے کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ اجمل وقت کے دھارے سے آزاد ہیں۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ رفتہ و آئندہ سے متعلق اس کی اپنی ایک الگ مابعد الطبیعیاتی فکر ہو۔ شاہنواز فاروقی صاحب نے بڑے پتے کی بات لکھی ہے یہ کہ، ''اجمل کی زبان اس کی ایک بڑی قوت ہے۔'' پھر یہ بھی کہ اجمل کی شاعری ایک بڑی مسلسل غزل معلوم ہوتی ہے۔ میں اجمل کی غزل کے بارے میں جو کچھ بھی لکھوں گا اس میں مغرب کی lyrical شاعری اور غیر lyrical شاعری کے متعلق اپنے مشاہدے اور اعتبارات کے حوالے سے لکھوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری اور غزل کے حوالے سے اصولِ ابلاغ کو شاعر کی آواز کے Phenominalization پر منحصر ہونا چاہیے اور جب ہم ابلاغ کی بات کرتے ہیں تو لازماً ایک ایسی زبان کی بات کرتے ہیں جو intelligible ہو۔ لہٰذا وہ ادب کی کوئی

بھی صنف ہو (چاہے ادب برائے ادب ہی کیوں نہ ہو) خرد کی راہ سے گریز ممکن ہی نہیں۔ غزل کی جدیدیت کے سلسلے میں تو جو رویہ پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ غزل کو اظہار ذات یا خود آگاہی کی ایک intense تخیلاتی حسیت سے مملو ہونی چاہیے۔ اگر کسی اور کا نہیں تو میرا اپنا تو یہی خیال ہے اور اس بات پر آپ مجھے Romanticism کا مارا ہوا آدمی کہہ دیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شاہنواز صاحب نے جو لکھا ہے کہ شاعری تو بہ ہر طور خود کلامی ہی سے جنم لیتی ہے، مجھے ان کی اس بات میں صرف اتنا اضافہ کرنا ہے کہ اس خود کلامی میں شاعری کی علامتی توانائی کا ہونا لازم ہے کیوں کہ یہ علامتی توانائی اشاروں اور کنایوں کے ذریعے غیر موجود حقیقتوں کو آشکار کرتی ہے اور شعری اسلوب کی تاب ناکی کو اپنے لسانی واسطے سے ہم کو قائل کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے التباسِ تاثر کو بھی۔ مجھے اجمل کی غزلوں کی خود کلامی میں وہ معصومیت نظر آتی ہے جسے ہنری جیمز نے "The terrible fluidity of self-revelation" کہا ہے۔ جہاں تک اس کے لمحہ موجود میں فنا ہو کر زندگی بسر کرنے کا تعلق ہے، ہم اسے دریائے عدم میں ایک لمحاتی غوطہ زنی پر محمول کر سکتے ہیں۔ اول تو وقت کے دھارے سے الگ ہو کر جینا اس لیے ممکن نہیں کہ ہر انسان اپنا وقت تخلیق کرتا ہے۔ شاعر کو شعر لکھنے اور تخلیق کرنے کے لیے بھی وقت درکار ہوتا ہے۔ اس لیے وقت کے دھارے سے الگ ہوتا نہ conceptualy ممکن ہے ورنہ تو وقت سے آپ کی علاحدگی خود وقت کی گرفت میں ہوتی ہے۔ مگر اس فلسفیانہ بحث میں الجھنے کے بجائے ہمیں اجمل کی غزل کی طرف پلٹنا چاہیے اور چند باتیں جو قدرے آسانی سے طے کی جاسکتی ہیں انھیں طے کر کے آگے بڑھنا چاہیے۔ چند باتیں جنھیں ہم اجمل کی غزل کے حوالے سے فوری طور پر طے کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ نکتہ رسی کے بارے میں اس کے یہاں ماورائیت اور فلسفیانہ dimension نہیں ہے۔ وہ اپنے تجربے کو اس کی سچائی اور شدید احساس ہی سے poetic بناتا ہے۔ اس فن میں اسے کمال حاصل ہے۔ اجمل کی غزل باطنی یا قلبی سکون سے زیادہ اس گریز سے توانائی حاصل کرتی ہے جسے ہم کسی بھی بات پر کوئی ناخوش گوار ردعمل کے اظہار کے گریز سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اگر چہ موجودہ غزل پر ہزاروں اعتراضات ہو رہے ہیں اور اس کے متعلق، اس کے امکانات کے سلسلے میں ایسی ہی بحثیں ہو رہی ہیں جیسی مغرب میں lyrical poetry سے متعلق ہوتی رہی ہیں اور جس میں Olson اور Appolonmire جیسے شعرا کے نام سرفہرست ہیں مگر میرے خیال میں غزل ہی ہماری شاعری کی نمائندہ صنف ہے۔ مجھے اجمل کی غزل یا اس کے اشعار میں ایک utopin content نظر آتا ہے اور وہ content خود اس کی اپنی ذات ہے۔ اچھی شاعری اس بات کی اہلیت رکھتی ہے کہ وہ مادیت پرستی کو اپنی زبان کی قوت سے پسپا کر دے اور اجمل کی غزل بھی اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس نے جدید یا موجودہ زندگی کے سائنسی اور ٹیکنالوجی bearings کے حصار کو توڑ کر ایک ایسی آزادی حاصل کی ہے جس کے سوتے ایک بے نیازانہ تعلق سے پھوٹتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا بدھ مت یا جین مت کے پیروکاروں کی قوت

برداشت کے مترادف ہے۔ یہ کوئی دور کی کوڑی لانے کی بات نہیں جن لوگوں نے چین کی شاعری پڑھی ہے وہ اجمل سراج کی غزل میں اس کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔

شاعر وہ ہوتا ہے جو شاعری کو حد سے باہر نہیں نکلنے دیتا مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی ذات ہی کو شاعری کی حد سمجھتا ہے۔ اس لیے میں یہ بھی نہیں مانتا کہ اجمل سراج اپنے آپ میں کھوئے رہنے والا شاعر ہے۔ اجمل اپنی ذات میں کھوئی زندگی اور حقیقتوں کی تلاش میں گم ایک ایسا شاعر ہے جس کے لہجے کا گداز اور زبان کی خوب صورتی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ زندگی کی بے ثباتی اور اس کے حسن کا ایک عمیق شاعرانہ ادراک رکھتا ہے۔

جس بات پر اجمل کو غور کرنے کی ضرورت ہے یہ کہ وہ جہاں پہنچ گیا ہے اس کے آگے اس کے لیے کیا ہے؟ اس کے ہاں مجھے abondance نظر نہیں آیا اور نہ کسی بھی نظریۂ حیات سے کوئی وابستگی۔ ویسے یہ کوئی ضروری بھی نہیں مگر اجمل سراج جیسے شاعر کو اگر کسی افسانوی دنیا میں گم ہو کر نہیں رہ جانا ہے تو لازم ہے وہ اپنی طرف سے دوسروں کی لاتعلقی یا اپنی دوسروں کی طرف سے بے نیازی کو ایک poetic depth بخشے۔ اس کا اپنی غزل میں روایت کا پاس مجھے اس سلسلے میں پرامید بناتا ہے کہ وہ جدیدیت کی بے راہ روی کے جن کو بوتل میں بند کر سکتا ہے یا اسے الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ ایک بات جس کا ذکر شاہنواز فاروقی نے کیا مگر بغیر کسی comment کے، وہ ہے اجمل کی غزل کے موڈ کی یکسانیت کی۔ مجھے امید ہے کہ اجمل جلد ہی اس پر قابو پالے گا ورنہ اس کی شاعری کلیشے ہو کر رہ جائے گی۔ ویسے بھی interoir monologue کی شاعری زیادہ دور تک نہیں جا سکتی اور پھر یہ شعر ایسی شاعری پر تنقید کے لیے کافی ہوتا ہے کہ:

اور تو خیر کیا رہ گیا
ہاں مگر اک خلا رہ گیا

لیکن اس مجموعے میں یہی شعر اس کی حسیت کا نمائندہ شعر ہے اور یہ حسیت آخر تک اس کی شاعری پر حاوی ہے۔ ایک اچھے اور سچے شاعر کو سب کچھ ہونا چاہیے مگر اپنا وفادار نہیں۔ اس کے بجائے اسے اپنے آپ سے کبھی چشم پوشی، کبھی چالاکی اور عیاری حتیٰ کہ بے وفائی تک کرتے رہنا چاہیے۔ چاہے ایسا کرنے سے اس کی شاعری مجروح ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔

ابھی تک میں نے اجمل سراج کے ایک دو شعر ہی نقل کیے ہیں اس لیے کہ صرف شعر نقل کر دینے سے کسی شاعر کی عظمت ثابت نہیں ہوتی۔ آخر مجموعۂ کلام کس لیے ہے؟ شعر پڑھنا ہو تو آپ کتاب پڑھیے۔ میں تو شعر اور شاعر کے باہمی ربط پر زیادہ زور دیتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں شاعر کو اس کی شاعری کی کلیت کی بنیاد پر پرکھتا ہوں۔

اجمل سراج اپنی کلیت میں ایک بڑا شاعر بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو کسی

نصیحت کی بھی ضرورت نہیں لیکن اجمل کو تھوڑا سا rugged ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ ایک فیشن ہوگیا ہے بلکہ اس لیے کہ ruggedness اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر اپنی ذات اور کائنات کے تناظر میں زندگی میں مصنوعیت کی آمیزش بھی دیکھتا ہے۔ اس کو اپنی شاعری کو non- commital ہونے سے بھی بچانے کی ضرورت ہے۔ اجمل کا یہ شعر کہ:

خوب تھا خواب کا سہارا بھی
اب ہمیں نیند ہی نہیں آتی

اس شعر کے حوالے سے میں اجمل کی شاعری اور اس کے اندر پوشیدہ اجمل کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اجمل کی شاعری کی کلیت کے حوالے سے کہ اجمل کا ''میں'' کیا ہے۔ اس کا جواب دینا اچھا خاصا دشوار ہے کیوں کہ اس کے شعر اس کی ذات کے نت نئے نقوش بناتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی شاعری میں تو ہم اس کی ذات کی وہ جھلک دیکھ پاتے ہیں جو اس کی شاعری بہ یک وقت ہم پر ظاہر بھی کرتی ہے اور ہم سے چھپاتی بھی ہے۔ جو اتنی واضح نہیں کہ ہم اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرسکیں۔ تو کیا ٹی ایس ایلیٹ کے نظریے کے مطابق اجمل کی شاعری غیر ذاتی کہلانے کی مستحق ہے؟ کیا اجمل شعوری یا غیر شعوری طور پر extinction of personality کا قائل ہے؟ کیا اجمل کی آواز کو ہم لمحہ موجود کی impersonal آواز کہہ سکتے ہیں؟

میری دانست میں تو اجمل کا ''میں'' ایک خواب ہے یا اس کی روح اور اس کے وجود کی اپنی خوابوں سے ایک devotion اور یہ معاملہ ارادے اور جزو سے زیادہ اس کی ساری زندگی کا اور نظارۂ جہاں کا ہے، ہر شاعر کی طرح مگر اجمل کی شاعری کچھ زیادہ ابہام لیے ہوئے ہے۔ اس کی ذات کو ہم dream-self یا language-self کہہ سکتے ہیں۔ ایک ایسی ذات جو شاعر کی زبان یا ڈکشن نے اجاگر کی ہو اور جو بس اس کے ڈکشن ہی میں پائی جاتی ہے، لہٰذا اس کی زبان کو ہم اس کے تجربات کی کلیت سے عبارت سمجھ سکتے ہیں۔ اس کو ہم اصولی انفرادیت کا نام بھی دے سکتے ہیں اور اسی کے تحت شاعروں میں مشابہت اور اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مماثلت اس لیے کہ ہر شاعر کے کچھ خواب ہوتے ہیں اور فرق اس لیے کہ تمام شاعروں کے خواب ایک سے نہیں ہوتے۔ اسی طرح تمام شاعروں کو ہم ترقی پسند اور غیر ترقی پسند گروہوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

جس شاعر کو ہم لامحدود وسعتوں میں سفر کرتے ہوئے تیر کی مثال دے سکتے ہیں وہ شاعر اپنے آپ کو رفتہ رفتہ دریافت کرتا ہے اور وہ بھی نظارۂ خیال کے حوالے سے۔ اس نظارے میں ہر وہ شے شامل ہے جو نظر میں سما سکے۔ اس کی اپنی ذات کی دریافت بھی نظارۂ جہاں ہی سے ممکن ہوتی ہے۔ ہم اس کو دنیا اور شب و روز کے حوالے سے اپنی شناخت کا عمل بھی کہہ سکتے ہیں، لہٰذا اس کی رہ گزر تجربات کی رہ گزر سے ہوکر گزرتی ہے۔ شاید اجمل اس کو جزو کی راہ سے الگ سمجھتا ہے۔ ایسا شاعر

تجربات کے راستے پر سفر کرتا رہتا ہے اور اس کی پشت پر یہ تجربات کسی بوجھ کی طرح لدے رہتے ہیں۔ اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ دم لینے کے لیے کہیں رک جاتا ہے، مثلاً وہ گوئٹے جس نے Gotz تخلیق کی تھی اور وہ گوئٹے جس نے پودوں کی ماہیت قلب کے عنوان سے کتاب لکھی تھی، ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ جو شاعر منزل بہ منزل سفر کرتا ہے، اس کے پاس مڑ کر دیکھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ اسے تو بس آگے بڑھتے رہنا ہوتا ہے۔ ایسے شاعر کو ہم کسی تھیم کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کے سفر کے دوران اس کے سفر سے باخبر نہیں ہو پاتے تو کم از کم اس کے منزل پر پہنچ جانے کے بعد تو ہمیں آگاہی ہو جاتی ہے کہ وہ سفر میں تھا۔ ایسے شاعروں کا کینوس بہت بڑا ہوتا ہے اور اس کے مقابل اپنی ذات بہت چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے فن بھی اتنا وسیع ہوتا ہے کہ بالآخر آفاق کے کناروں کو چھونے لگتا ہے، (مثلاً گوئٹے اور Pushkin)۔ انسانوں کی ساری دنیا اور سارے ہزاریے اور تمام لوگ ان کی ذات بن جاتے ہیں (شاید لوگ اسی کو آفاقیت کہتے ہیں) مثلاً گوئٹے کے یہ الفاظ کہ میں ہزاریوں میں پایا جاتا ہوں (live in millian)۔ ایسے شاعر کا تھیم ایک نیا ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ وہ self انسان ہی ہو۔ ان کی تمام تر ارضی رہ گزر یا زندگی بار بار جنم لینے کا سلسلہ ہوتا ہے اور یہ جنم بھی ضروری نہیں کہ انسانی شکل میں ہو سکتا ہے، یہ پتھروں کی شکل اختیار کرے یا ستاروں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخلیق کے ہر لمحے کی تجسیم کرتے رہے ہیں۔ خالص lyrical شاعری کا کوئی project نہیں ہوتا۔ خالص lyrical شاعری ہمارے خوابوں اور محسوسات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ایسی شاعری کرنے والا شاعر کسی مخصوص شئے کو اپنی گرفت میں نہیں لے پاتا۔ وہ خلا میں معلق رہتا ہے۔ غزل کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ہم اس کو نہ تو خالص Lyrical شاعری کہہ سکتے ہیں نہ ذاتی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

Thought is an arrow

Feeling is a circle

اجمل کی غزل کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ اس کے پاس thought بھی ہے اور احساس بھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے تجربات کی راہ میں ابھی بہت سے پیچ و خم آنے باقی ہیں اور ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ میرے خیال میں اجمل کی شاعری کا سفر آہستہ آہستہ thematic ہونے لگے گا۔ کسی فرانسیسی شاعر نے کہا ہے کہ "its better to be than to have" اس لیے مجھے سو فی صد یقین ہے کہ اجمل اب اظہار کے نئے نئے روپ اختیار کرے گا۔ اس کا ایک شعر ہے:

مری نگاہ کو آئندگاں سے نسبت ہے
سو دیکھتا ہوں بہت دور تک دھواں ہی دھواں

میرا خیال ہے اجمل کو اس دھوئیں کو اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے۔

☆☆☆

ڈاکٹر طاہر مسعود

ظریفانہ شاعری کی عنایتیں

نقادوں کے ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ شعر میں مقصدیت نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ اس سے شعر کا حسن متاثر ہوتا ہے۔ وہ شاعری کو حصولِ مسرت کا ذریعہ تصور کرتے ہیں اور مقصدیت کو مصلحوں، انقلابیوں اور سیاسی کارکنوں کے درجے کی چیز سمجھتے ہیں جس کا شعر میں استعمال اس کے جمال کو خیرہ کن نہیں رہنے دیتا۔ ان کی رائے میں مقصدیت زندگی کے عملی پہلو سے وابستہ ہوتی ہے جس پر اصرار شاعر کے تخیل کو محدود کردیتا ہے اور اس کا شعری سفر معلوم دنیا سے شروع ہو کر معلوم دنیا ہی پر ختم ہوجاتا ہے، حالاں کہ وہ نامعلوم دنیا (unknown world) کی خبر لانے والا پیغمبر ہوتا ہے۔ اس نکتۂ نظر میں یقیناً جزوی صداقت پائی جاتی ہے۔ چناں چہ اردو ادب میں ترقی پسند رجحان کے زیرِ اثر جو مقصدی ادب لکھا گیا، اس کا بیش تر حصہ سطحی، کھوکھلا اور نعرے بازی پر مشتمل تھا اور اسی لیے وہ اپنی موت آپ مرگیا۔ لیکن اسی رجحان کے ایک نمائندہ فیض احمد فیض اور ان کی شاعری بھی ہے جو ترقی پسندانہ رجحانات کی عکاس ہونے کے باوجود اعلیٰ معیار کی حامل ہے، بلکہ وہ ایک ''رجعت پسند'' قاری کو بھی جمالیاتی مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس سے بڑی مثال علامہ اقبال کی شاعری ہے جو سراسر مقصدی، تعمیری اور حیات بخش ہے اور ساتھ ہی اتنی بلند پایہ کہ عالمی ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے نیز اپنی روح میں اسلامی ہونے کے باوجود وہ ایک غیر مسلم، ایک اشتراکی اور لبرل و سیکولر ذہن کے قاری کے لیے بھی یکساں باعثِ انبساط ہے۔ سوال یہ ہے کہ اقبال اور فیض کی شاعری کی وہ کون سی قدر ہے جو اس کے شاعرانہ جوہر کو مقصدیت کے ہاتھوں زخمی ہونے سے بچالیتی ہے؟ میرے نزدیک یہ جمالیاتی اظہار ہے۔ شعر کی اوّلین قدر جمالیات ہے۔ شعر میں مقصدیت جمالیاتی اظہار کے تابع ہو تو اس کا اثر کبھی غارت نہیں ہوتا۔ یہ سادہ سی حقیقت ہمارے وہ شعرا نظر انداز کردیتے ہیں جو مقصدیت کو شاعری کے لیے وصف لازم سمجھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء القیس کو بہ یک وقت شاعروں اور جہنمیوں کا سردار قرار دیا تھا تو آپؐ نے دراصل امراءالقیس کی شاعری کے دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ فرمایا تھا

یعنی یہ کہ اس کی شاعری میں جمالیاتی اظہار کا معیار تو بہت اعلیٰ ہے اور اس میں کوئی دوسرا عرب شاعر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن اس کا مقصدِ شعر پست ہے اور اپنی شاعری کے پیغام سے وہ عرب معاشرے میں غیر صحت مند جذبات پیدا کررہا ہے۔ یہی چیز اسے جہنم کے راستے کا سردار بنادے گی۔ اس وضاحت کی روشنی میں ہم ٹی ایس ایلیٹ کے اس قول کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں:

> ادب کا معیار محض فن سے قائم نہیں ہوتا۔ عظیم ادب کو مذہب اور اخلاق کے معیارات پر بھی پورا اُترنا چاہیے۔

اس بحث کو اٹھانے کی تحریک مجھے پروفیسر عنایت علی خاں کے مضمون ''میرا مسلکِ سخن'' پڑھ کر ہوئی جو ان کے کلام کے انتخاب ''نہایت'' میں بہ طور تمہید شامل ہے۔ ان باتوں کی صراحت اس لیے ضروری تھی کہ ان کا بہت گہرا تعلق پروفیسر عنایت علی خاں کی شاعری سے ہے۔ ان کی شاعری بھی مقصدیت سے وابستہ ہے اور اسے انھوں نے شعوری طور پر اختیار کیا ہے۔ وہ شاعری کو پاکیزہ اور نیک جذبات کو جگانے اور مہمیز کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں، یوں بھی اعلیٰ شاعری کو نیکی، خیر اور حسن کے اظہار کا ذریعہ ہونا ہی چاہیے۔ جمالیات جن اقدار سے تشکیل پاتی ہے، وہ یہی تو ہیں۔ سلیم احمد کہا کرتے تھے کہ ادب پانی کی طرح بے رنگ ہوتا ہے، اسے جس رنگ کے گلاس میں ڈالا جائے، اسی رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پروفیسر عنایت علی خاں کے پاس مقصدیت کا سبز رنگ گلاس ہے۔ یہ رنگ میرے آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ ہے۔ آپ ﷺ کے روضۂ مبارک پر موجود گنبدِ خضرا کا بھی یہی رنگ ہے۔ ایک دن میری ننھی بچی نے پوچھا، ''پاپا! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے درختوں اور ان کے پتوں کو سبز رنگ کا کیوں بنایا ہے؟'' پھر خود ہی بولی، ''اس لیے کہ یہ رنگ ہمارے پیارے نبی ﷺ کے روضے کا رنگ ہے۔'' بلاشبہ اس رنگ میں ٹھنڈک، روشنی اور گہرائی ہے۔ یہ آنکھوں کو راحت اور قلب کو سکون بخشتا ہے۔ پروفیسر عنایت علی خاں کی شاعری بھی ان ہی خصوصیات سے عبارت ہے۔

پروفیسر عنایت علی خاں کے کلام کے انتخاب ''نہایت'' کا میں نے کئی بار مطالعہ کیا۔ اس مطالعے نے مجھے کئی طرح کے احساسات سے مغلوب کیا۔ افسردگی، نشاط، فکرمندی اور گمبھیرتا۔ ان کی شاعری کے بارے میں یہ میرا مجموعی تاثر ہے لیکن سرشاری کی جو کیفیت ان کے حمدیہ اور نعتیہ اشعار سے طاری ہوئی، اسے میں صحیح طور پر بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ ان اشعار کو میں نے بار بار پڑھا اور طبیعت پھر بھی سیر نہیں ہوئی، مثلاً عشقِ الٰہی میں ڈوبی ہوئی حمد کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھے تو نے جو بھی ہنر دیا بہ کمالِ حسنِ عطا دیا
مرے دل کو حُبِ رسولؐ دی، مرے لب کو ذوقِ نوا دیا
میں مدارِ جاں سے گزر سکا تو تری کشش کے طفیل سے

یہ ترے کرم کا کمال تھا کہ حصارِ ذات کو ڈھا دیا
میں ہمیشہ اپنے سوالِ شوق کی کمتری پہ خجل رہا
کہ تری نوازشِ بے کراں نے مری طلب سے سوا دیا
جو مجھے دیا ہے مجھے اسی کا حساب دینے کی فکر ہے
مجھے اس سے غرض ہو گیا، اسے کیا دیا اُسے کیا دیا

حمدیہ اشعار کی روایت اردو شاعری میں قدیم زمانے سے ملتی ہے لیکن عنایت علی خاں کی اس حمد میں تاثیر کا سبب اللہ عزوجل سے وہ سچا اور پرخلوص تعلق ہے جس کی نادیدہ ڈور سے شاعر خود کو بندھا ہوا محسوس کرتا ہے اور درحقیقت اسی رشتۂ احساس نے اس میں ان لازوال نعمتوں کی شکرگزاری پیدا کی جن کا شعور ہر ایک کو نہیں ہوتا۔ اسی لیے یہ حمد ان حمدوں سے منفرد ہے جو حمدیہ مشاعروں میں شرکت اور رسائل میں چھپنے کی ضرورت کے پیشِ نظر لکھی جاتی ہیں۔ مذکورہ حمد کا آخری شعر بہ ظاہر زاہدانہ اور نفسِ مضمون میں نصیحت کی خشکی کا اثر ہے لیکن خشیتِ الٰہی کے گہرے احساس نے اس میں وہ پُر تاثیر عاجزی پیدا کردی ہے جو بندگی کی معراج ہے۔

عنایت علی خاں نے اسی بحر میں ایک نعت بھی کہی ہے۔ نعت کے اشعار میں جو مضامین ظاہر ہوئے ہیں وہ اغلباً دوسرے نعت گو شعرا کے ہاں نہیں ملتے۔ ایک مخصوص مکتبِ فکر کے زیرِ اثر ہمارے معاشرے میں عشقِ رسول ﷺ کا جو ایک خود ساختہ تصور عام ہو گیا ہے، اس نعت میں دردمندی کے ساتھ اس کی نشان دہی بھی کی گئی ہے اور گرفت بھی۔

ترے حسنِ خلق کی اک رمق مری زندگی میں نہ مل سکی
میں اسی میں خوش ہوں کہ شہر کے در و بام کو تو سجا دیا

میں ترے مزار کی جالیوں کی ہی مدحتوں میں مگن رہا
ترے دشمنوں نے ترے چمن میں خزاں کا جال بچھا دیا

یہ مری عقیدت بے بصر یہ مری ارادت بے ثمر
مجھے میرے دعوئ عشق نے نہ صنم دیا نہ خدا دیا

اس نعت پر معترض ہونے کے بجائے اسے اس واقعے کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ جب ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بازوئے مبارک سے بہتے ہوئے وضو کے پانی کو چومنا اور آنکھوں سے لگانا چاہا تو آپ ﷺ نے ان صحابی کو اعمال میں اپنے اتباع کی نصیحت کی اور اسی کو ذریعۂ نجات بتایا۔

اب میں چند باتیں عنایت علی خاں کے سنجیدہ اور ظریفانہ کلام کے بارے میں عرض کرنے کی

اجازت چاہوں گا۔ ایک نقاد نے انھیں اکبر ثانی قرار دیا ہے اور اکبر و عنایت کا ایک تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس تقابلی مطالعے سے میں اس حد تک متفق ہوں کہ بعض موضوعات دونوں شعرا میں مشترک ہیں۔ لیکن پیرایۂ اظہار اور مضامین کا اختلاف بہت زیادہ ہے، جس بات کی نشان دہی نہیں کی گئی وہ یہ کہ اکبر کی سنجیدہ شاعری جس طرح ان کے ظریفانہ کلام کی دھوم دھام اور چرچے میں نظر انداز کردی گئی، کم و بیش یہی سانحہ ہمارے ممدوح شاعر کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اکبر لسان الغیب تھے، عظیم شاعر اقبال کے روحانی مرشد، جنھوں نے ایک عرصہ اپنے مرشد کے رنگ میں شعر کہنے میں گزارا۔ اگر عنایت علی خاں نے ان کا کوئی اثر قبول کیا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ عنایت علی خاں کی سنجیدہ شاعری سنجیدہ توجہ سے محروم رہ گئی لیکن ان کا کم از کم ایک شعر ایسا ضرور ہے، جو مشاہدے کی صداقت کی بنا پر ضرب المثل کی طرح مشہور ہے:

حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

پروفیسر عنایت علی خاں کا سنجیدہ کلام ہو یا ظریفانہ، اس کا اختصاص عصری آگہی اور ناقدانہ شعور ہے۔ وہ اپنے زمانے کی بوالعجبیوں، ناآسودگیوں اور تضادات سے نہ صرف باخبر و آگاہ ہیں بلکہ ان کا گہرا تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں۔ اس شعور میں حال کی امریکی اور ماضی کی روسی استعماریت کے خلاف شدید ردعمل بھی شامل ہے، جو ان کی سنجیدہ نظموں میں انھیں افغان مجاہدین کی شجاعت و سرفروشی کے گیت گانے اور طنزیہ نظموں میں امریکا اور اس کے صدر بش کی دستار سے کھیلنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ چوں کہ ہمارے خاکی اور غیر خاکی حکمران بھی امریکی استعماریت کی ہی توسیع ہیں اور اسی کے اشارے اور تائید سے عوام کی گردن پر مسلط رہتے ہیں چناں چہ عنایت علی خاں ان سے بھی چھیڑ چھاڑ کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ بسا اوقات تو وہ انجام سے بے پروا ہو کر اپنی نظموں میں ان کے چٹکیاں بھی بھر لیتے ہیں، لیکن یہ کام وہ اتنے شائستہ اور شگفتہ طریقے سے کرتے ہیں کہ حکمراں طبقہ بھی دانت پیسنے سے پہلے مسکرا اٹھتا ہے۔ یہ ان کی کامیاب ظرافت کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح مغربی تہذیب کو قوم نے بنا سوچے سمجھے جس طرح قبول کرلیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو مضحکہ خیز تہذیبی مظاہر سامنے آرہے ہیں، وہ بھی عنایت علی خاں کی شاعری کا دل پسند مصالحہ ہیں۔ اس مصالحے سے وہ جو چٹ پٹی نظمیں تیار کرتے ہیں، اسے مشاعرے کے سامعین اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں۔ چناں چہ مشاعروں میں انھیں جو پُرشور داد ملتی ہے اس سے دوسرے شعرا کی بڑی دل آزاری ہوتی ہے کیوں کہ عنایت صاحب کی شوخ و شنگ نظموں کے سامنے ان کے کلام کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ موضوع سیاست ہو یا کرکٹ، تختۂ مشق سیاسی لیڈر ہوں یا کوئی مخصوص قومی رویہ، وہ تعلیمی اداروں کے کھوکھلے پن کو موضوع بنائیں یا کسی فیشن ایبل دوشیزہ کے ہیجان انگیز لباس و اطوار پر شرارت آمیز نگاہ ڈالیں، وہ کبھی تلخی، جھنجھلاہٹ اور غصے کا شکار نہیں ہوتے۔ حتیٰ

کہ باشرع ہونے کے باوجود پند ونصیحت سے بھی گریز کرتے ہیں۔ وہ معاشرتی بوالعجبیوں کو کنکھیوں سے کسی شرارتی بچے کی طرح دیکھتے اور ان منظروں میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں لیکن یہ ان کی شاعری کا ایک رخ ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنی دوسری نظموں میں دل گرفتہ اور مغموم بھی نظر آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب کوئی چہیتا بیٹا تلاشِ رزق میں بوڑھے والدین کو آزردہ چھوڑ کر سمندر پار اوجھل ہو جاتا ہے تو دکھیارے والدین کے چوٹ کھائے دلوں پر کیا گزرتی ہے یا جب ملک میں بھاری بوٹوں والا انقلاب آ کر خزاں کی رخصتی کی نوید دیتا ہے تو نادان، خوش فہم عوام کس طرح فریبِ بہاراں میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا کوسوا کے لہولہان مسلمانوں کی حالتِ زار پر ان کی آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں اور وہ ان ستم رسیدہ مسلمانوں کو برگ خزاں دیدہ کی شاخوں سے جھڑنے والے پتوں سے تشبیہ دیتے ہیں، ریزہ ریزہ ہو کر پیروں سے روندا جانا جن کا مقدر ہے۔ وہ اپنی نظموں میں مجاہدین کے حوصلوں کی داد بھی دیتے ہیں اور دجّالِ جدید کے داہری لیڈروں کو بے نقاب بھی کرتے ہیں۔ وہ سچے اور کھرے پاکستانی ہیں۔ چناں چہ سقوطِ ڈھاکا کی درد انگیز یاد انھیں وہاں کے مشاعرے میں شرکت سے روک دیتی ہے کیوں کہ:

در خور بزم کوئی شعر نہیں کہہ سکتا
مرگِ احساس کا دشنام نہیں سہہ سکتا

پروفیسر عنایت علی خاں کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا یہ تنوع ان کی شاعرانہ شخصیت کی وسعت کا پتا دیتا ہے۔ وہ اپنی ذات پر کتنے اور کیسے کیسے غم واندوہ جھیلتے ہیں، لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان میں بیش تر غم اجتماعی ہیں۔ ان کی شاعری میں نجی زندگی کی محرومیوں کا ایک آدھ نظم کے سوا مشکل ہی سے سراغ ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے اپنی ذات کو اجتماع میں گم کر دیا ہے۔ خواہ یہ اجتماع قوم کی شکل میں ہو یا مسلم امہ کی صورت میں۔ حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ ان کی ذاتی زندگی دکھوں اور محرومیوں سے عبارت ہے لیکن یہ کتنی عالی ظرفی کی بات ہے کہ ان کی پرچھائیاں، اُن کی شاعری پر نظر نہیں آتیں۔ ان کے باطن میں معرکۂ کہن بپا رہتا ہے جس کا اظہار ان کی شاعری میں کبھی آنسوؤں اور کبھی قہقہوں کی صورت میں ہوتا ہے لیکن ان کے آنسو کسی ذاتی المیے پر کبھی نہیں چھلکے۔ یہ قول کتنا سچا ہے کہ ہر مزاح کے پیچھے غم کا سایہ ہوتا ہے۔ اپنے غموں سے دوستی عالی حوصلگی کے بغیر ممکن نہیں کیوں کہ شکوہ سنج ہونا انسان کے لیے ہمیشہ سے آسان رہا ہے اور شکر بجا لانے میں وہ غفلت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پروفیسر عنایت علی خاں کو جو قابلِ رشک ہر دل عزیزی ملی ہے، وہ میرے نزدیک ان کے صبر و شکر کا انعام ہے، جو قدرت نے انھیں ان سے راضی ہو کر عطا کیا ہے۔

آخری بات ان کی شخصیت کے بارے میں۔

پروفیسر عنایت علی خاں اپنی بود و باش اور دیکھنے دکھنے میں شاعروں سے زیادہ فقیہوں کے قبیلے کے آدمی نظر آتے ہیں۔ لیکن ملنے ملانے میں وہ زندہ دل، گرم جوش اور منکسر المزاج واقع ہوئے

ہیں۔ یہ بھی معجزہ ہے کہ ان کے تقویٰ و پارسائی اور مصلحانہ افکار و نظریات نے ان کی حسِ مزاح اور لطافتِ احساس کو متاثر نہیں کیا ورنہ بالعموم متقی حضرات اپنے احساسِ تقویٰ سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ہنسنا تک بھول جاتے ہیں یا قہقہہ لگانے کو بھی آدابِ تقویٰ کے منافی جانتے ہیں۔ اگر واقعتاً ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد ہے، پھر تو ایک ظاہر بیں شخص کو پروفیسر عنایت علی خاں مجموعۂ اضداد ہی نظر آئیں گے لیکن میں ان کی شخصیت اور شاعری میں ہم آہنگی پاتا ہوں اور انھیں ایک ایسا پابندِ شریعت مسلمان سمجھتا ہوں، جسے دیکھ کر دین پر چلنا آسان بھی لگتا ہے اور پُرلطف بھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

"انگارے سے پگھلا نیلم تک" پر ایک نظر

کچھ عرصے قبل مظہر جمیل کی ضخیم کتاب "جدید سندھی ادب – میلانات، رجحانات، امکانات" پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ "مظہر جمیل صاحب کے قبضے میں کوئی جن ہے یا کیا ہے جو اس طرح کے جناتی کام اتنی آسانی سے کرلیتے ہیں؟" دراصل اس سے قبل مظہر جمیل کی کتاب "آشوب سندھ اور اردو فکشن" میں دیکھ چکا تھا۔ ضخامت اس کی بھی کم نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ مظہر جمیل صاحب وکیل ہیں اور عمر عزیز کی ستر بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ بڑا تعجب ہوا کہ وکالت کب کرتے ہیں، ادب کس وقت پڑھتے ہیں اور لکھنے کے لیے وقت کہاں سے نکالتے ہیں؟ اور جب "انگارے سے پگھلا نیلم تک" میرے ہاتھ میں آئی تو ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ اس شخص کے قبضے میں جن نہیں ہے کیوں کہ یہ تو خود —

ترقی پسند ادبی تحریک، ترقی پسندوں کے سیاسی نظریات اور ترقی پسندانہ ادب کے معیار اور مقاصد سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے، اسے یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ترقی پسند ادبی تحریک اردو بلکہ برعظیم پاک و ہند کی چند عظیم ترین تحریکات میں سے ایک تھی، بلکہ اس کے پائے کی صرف ایک ہی تحریک نظر آتی ہے اور وہ ہے سرسید کے اثرات کے تحت افادی اور اصلاحی ادب کی تحریک، جس کے ردعمل کے طور پر ادب میں رومانوی تحریک نے جنم لیا اور پھر جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب یہ سیلِ عظیم آیا تو اپنے ساتھ تمام تحریکوں کو، گو وقتی طور پر ہی، خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ رومانوی تحریک بھی اسی میں غرقاب ہوگئی اور ایک رومانوی تحریک ہی پر کیا موقوف، کچھ دنوں کے لیے تو ہر چیز اور ہر لکھنے والا اسی کے گن گاتا رہا۔

سجاد ظہیر جو اس تحریک کے بانیوں میں سے تھے، ایک طرح سے متنازع شخصیت بن گئے تھے کیوں کہ پاکستان میں ۱۹۵۳ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگ گئی تھی اور اہلِ قلم کی پکڑ دھکڑ جاری تھی۔ سجاد ظہیر پاکستان آئے اور واپس چلے گئے۔ پاکستان میں سیاسی اور ادبی طور پر متنازع فیہ اس شخصیت پر صحیح معنوں میں تحقیقی اور معروضی تنقیدی کام ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ مظہر جمیل

نے اس کتاب کے لیے جن مصادر اور منابع کی نشان دہی کی ہے وہ نہ صرف انتہائی نایاب ہیں بلکہ بعض صورتوں میں انھوں نے ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو اب تک عام طور پر معلوم یا دستیاب نہیں تھیں اور بالکل نئی ہیں۔ تحقیقی اعتبار سے بھی اس کتاب کا درجہ بلند ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ متن میں حوالہ جات کی نشان دہی کرتے جاتے اور صرف آخر میں ماخذات کی فہرست پر اکتفا نہ کرتے۔

اس کتاب سے ان کی تنقیدی بصیرت اور ژرف نگاہی کے علاوہ ان کے تحقیقی جوہر بھی کھل کر سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے سجاد ظہیر کا ایک غیر جذباتی اور معروضی تجزیہ پیش کرنے اور ان کی غیر مدوّن تحریروں کا کھوج لگانے کے ساتھ ساتھ عمومی اور آفاقی حقائق پر بھی غور کر کے اس کے نتائج ہمارے سامنے پیش کیے ہیں، مثلاً سوویت یونین کے خاتمے اور کمیونزم کے عملی طور پر بے اثر ہو جانے اور بائیں بازو کے فلسفے کے اب محض نظریاتی طور پر باقی رہ جانے کی صورتِ حال پر دیگر اہلِ علم و اہلِ قلم کی طرح وہ بھی سوچتے ہیں اور کہتے ہیں: ''یہاں سب سے بڑا سوال تو خود ترقی پسندی کے نئے آفاق اور نئی جہات کے بارے میں سامنے آتا ہے، کیوں کہ آج کی یک قطبی دنیا (uni polar world) میں جہاں نئے عالمی نظام کے نام پر فسطائیت نئے نئے روپ بدل رہی ہو اور مختلف زبانوں اور ثقافتوں کو بھیانک اندیشوں نے گھیر رکھا ہو اور ریاستی طاقت اور قوت کے انسانیت سوز مظاہرے دیکھنے میں آ رہے ہوں تو ہر صاحبِ ضمیر قلم کار کی جانب داری پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔'' (ص ۱۸)

موجودہ عالمی سیاسی تناظر میں ادبی تحریکات اور نظریاتی وابستگی کے بارے میں سوالات ہر ادیب کے ذہن میں اٹھ رہے ہیں اور اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں مظہر جمیل جیسے دانش وروں کی کمی نہیں جو اس صورتِ حال کا نہ صرف صحیح ادراک رکھتے ہیں بلکہ اس صورتِ حال کے آئندہ اثرات و عواقب کا عکس بھی ان کے آئینۂ ادراک میں جھلکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دو وقت کی روٹی کو مقدم رکھنے والے نام نہاد اہلِ قلم اور دانش ور اس طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور قوم کو ترقی اور روشن خیالی کے پردے پر خوش حالی اور امید کی دھندلی تصویریں دکھا کر اپنے دام کھرے کرتے رہیں اور جعلی جمہوریت کے دربار میں ''راگ درباری'' گاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ عوام الناس کی ذہنی بیداری کے عمل میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ انھیں اس سے سروکار ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف آسائشوں کے حصول کی دوڑ میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ کام تو سیّد مظہر جمیل جیسے اہلِ فکر کا ہے کہ وہ بدلتی دُنیا میں انسانی صورتِ حال کا جائزہ لیں، اس پر غور کریں، آنے والے دنوں میں انسانی تہذیب و معاشرت اور فکر و احساس پر ان کے ذریعے مرتب ہونے والے اثرات اور ان کی نوعیت کو سمجھیں اور اس کے بارے میں لوگوں کو باخبر کریں۔

مظہر جمیل جیسے دانش ور جب یک قطبی دنیا میں فسطائیت کو جمہوریت کے نام سے پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں تو انھیں زیادہ اذیت اس لیے بھی ہوتی ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد ایک ایسے

دور میں رکھی گئی تھی جب (جنگ عظیم دوم سے ذرا قبل) دنیا میں فسطائیت سر ابھار رہی تھی اور بائیں بازو کے نظریات کے حامل اور سرمایہ دارانہ نظام کے حامی جو (دراصل ایک دوسرے کے مخالف تھے) فسطائیت کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ہو گئے تھے اور اب سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد خود سرمایہ دارانہ نظام نے فسطائیت کے اصول و نظریات اپنا لیے ہیں اور پوری دنیا پر اپنے مہیب سائے ڈال رہا ہے۔ سید مظہر جمیل کی یہ کتاب سجاد ظہیر کی شخصیت اور فن کو تو سمجھنے میں مدد دیتی ہی ہے اس لیے کہ اس کتاب میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ سجاد ظہیر کی زندگی اور فن کے بارے میں وہ حقائق پیش کیے گئے ہیں جو اس سے پہلے کم کم لوگوں کے علم میں رہے ہوں گے۔ تاہم اس کتاب کی اہم ترین خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اس کے ساتھ ساتھ سجاد ظہیر کے نظریہ حیات کی روشنی میں آج کی فسطائیت کو جاننے کا موقع بھی فراہم کرتی ہے۔

☆☆☆

خواجہ منظر حسن

''خالی ہاتھ'' یا دستِ عیسیٰ؟

ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک ماہر ادیب زندگی کی مقصدیت کا ترجمان ہوتا ہے، لیکن زندگی کے مقاصد ادیب کے ذہنی رجحان کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس دور میں نثر نگاری زندگی کے نشیب و فراز، اسرار و رموز اور اس کی تگ و دو سے متعلق صدق بیانی کا سرچشمہ ہے۔ خیام کے افسانے زندگی کی حقیقتوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ معاشرہ اس تحریر کے آئینے میں اپنی صورت خواہ کیسی ہی ہو، دیکھ سکے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی ایک تحریر میں کہتے ہیں کہ ''ایک ایسے دور میں جب فرد نے دیکھنے کا کام ہی بند کردیا ہو، اُسے آئینہ دکھانے کا کام سب سے اہم ہوجاتا ہے۔'' خیام کے افسانے گردوپیش کے حالات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ وہ حالات جو اُن کے تخیلات کو جھنجھوڑ کر انھیں ایسی تخلیق کی طرف راغب کرتے ہیں جو ایک مہذب معاشرہ بنانے کی طرف ہماری رہ نمائی کرتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی کا یہ قول بھی ہے کہ ''خیال انسان کی عظیم تخلیق ہے اور مہذب انسان خود خیال کی تخلیق۔'' گویا ایک مبصر کے بہ قول مہذب انسان خود خیال کا خالق بھی ہے اور اس کی تخلیق بھی۔

پروفیسر علی حیدر ملک مختصر افسانے کے متعلق ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ:

> افسانے کی حیثیت اپنی نوعیت کے لحاظ سے جزو کو پیش کرتی ہے اور ضروری نہیں کہ جزو ہمیشہ کل سے مطابقت ہی رکھتا ہو۔

اُدھر معروف افسانہ نگار اختر اورینوی کا خیال ہے کہ:

> ایک اچھا افسانہ – باوجود اختصار کے فنی حیثیت سے ایک حسنِ کامل ہوتا ہے اور اپنے حسنِ تکمیل کی وجہ سے ناظرین کے لیے ذہنی مسرت کا سامان۔

میں ان خیالات سے یہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گا کہ اگرچہ افسانہ ایک جزو کو پیش کرتا ہے لیکن اس جزو کے حسنِ تکمیل سے کل کی نشان دہی ہوتی ہے۔

افسانہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، ہمیں زندگی کی حقیقتوں سے قریب تر کرتا ہے۔ گردوپیش

کی اصلیت کو ہم پر واضح کرتا ہے تا کہ ہم اس آئینے میں اپنی ٹیڑھی میڑھی صورت دیکھ کر اپنی صورت گری کی طرف توجہ دیں۔ افسانہ نویس حقیقت کو کہانی کا روپ دیتا ہے۔ وہ سچائی کو چھپاتا نہیں محض اس کی شکل بدل دیتا ہے۔ اس کے کردار معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ خیام کے کردار اُن کے افسانوں میں جیتے جاگتے نظر آتے ہیں خواہ وہ افسانہ ''خالی ہاتھ'' کے اسلحہ بدست نوجوان ہوں، ''نجات دہندہ'' کی صائمہ ہو، ''بے زمین'' کی لیلیٰ ہو یا ''وارث لاوارث'' کا نورا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کردار ہماری نظروں سے گزرے ہیں یا ان کے حالات اخبار کے صفحوں پر نظر آتے ہیں۔ انھی جیتے جاگتے کرداروں سے ہم اپنے گردوپیش کو، اپنے معاشرے کو پہچان سکتے ہیں اور ان تحریروں میں گزرے ہوئے لمحات کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے کہیں آل احمد سرور کی یہ تحریر دیکھی کہ:

> افسانہ محض ایک مختصر قصہ، ایک بھولی ہوئی یاد، ایک چھوٹی سی کہانی، ایک منظر کی تصویر یا غزل کا ایک شعر نہیں۔ یہ ایک لمحے کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ وہ پوری زندگی معلوم ہو۔ یہ ایک ایسا تاثر ہے جو کبھی دل سے محو نہ ہو۔

خیام کے افسانوں نے گزرے ہوئے لمحوں کو دوام بخش دیا ہے۔ اُن لمحوں کو اضطراری کیفیت اور معنویت عطا کر دی ہے۔ خیام کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بغیر کچھ کہے ہوئے سب کچھ کہہ جاتے ہیں جیسے افسانہ ''بے زمین'' کے یہ جملے:

> میں دو نوجوان بھائیوں کی لاڈلی بہن تھی۔ ایک غیور باپ کی بیٹی تھی۔ اب میں دو چھوٹی بہنوں اور ایک چھوٹے بھائی کی ایک ذمہ دار بہن ہوں اور ایک بوڑھی ماں کی ہونہار بیٹی۔

خیام نے ایک دردناک صورتِ حال کو کس خوب صورتی سے واضح کیا ہے۔ افسانہ ''گنی پگ'' میں تیسری دنیا کے ملکوں کی حالتِ زار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ بے چاری تیسری دنیا کچھ کرنے کی ہمت بھی تو نہیں رکھتی۔ ہم کیمیکل ویسٹ (کیمیاوی فضلہ) کے اپنے ساحلوں پر پھینکے جانے کے قصے بھی تو سنتے رہتے ہیں۔ افسانہ ''خالی ہاتھ'' ہمارے معاشرے کی لاقانونیت پر ایک بھرپور طنز ہے۔ ایک بگڑا ہوا کرم خوردہ معاشرہ جس میں ایک معتدبہ طبقہ مادر پدر آزاد ہے۔ اُسے کسی اخلاقی حدود کی پروا نہیں، کسی باز پرس کا اندیشہ نہیں اور کسی تعزیر کا خوف نہیں۔ اُدھر ہی شہریوں کی بے بسی کی ایک سچی اور ہول ناک تصویر ہی جو تک تک دیدم دم نہ کشیدم کا ایک دردناک ہیولہ ہے۔ خیام کے افسانوں کے جیتے جاگتے کردار مادی حیثیت نہیں رکھتے لیکن یہ مکمل طور پر حالاتِ حاضرہ کا نمونہ ہیں اور ہمارے گردوپیش کی زندگی کا بہترین عکس۔ اسی لیے اُن کے افسانوں میں ہماری دل چسپی برقرار رہتی ہے۔ افسانے حقیقت میں ہماری زندگی کے مختلف اجزا کے جستہ جستہ خاکے ہیں، جنھیں خیام جیسا افسانہ نویس ادبی چاشنی ملا کر ہماری نظروں کے سامنے لاتا ہے۔ ہم اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اثر پذیر بھی۔

افسانہ زندگی کی تمام حقیقتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ زندگی کی اُن تلخ حقیقتوں کو بھی جن میں کج فہم ذہنوں کے لیے بہ ظاہر شیرینی ہوتی ہے۔ جنس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے خواہ ضابطے کے اندر ہو یا بے ضابطہ، خواہ شرعی ہو یا غیر شرعی، خواہ پردۂ اخفا میں ہو یا خانقاہی اور محلاتی حصار میں۔ کچھ پیش روؤں نے ان حقیقتوں کو اجاگر کیا اور اس بری طرح واضح کیا کہ قارئین کا ایک خاصا بڑا طبقہ ان حقیقتوں کی تلخی آمیز لذت کو برداشت نہ کرسکا اور وہ سارے پیش رو آج تک ہمارے معاشرے میں خاطر خواہ مقام حاصل نہ کرسکے۔ خیام نے بھی ان حقیقتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ذرا شستہ انداز میں اور اس ضمن میں جتنا زیادہ شستہ انداز اپنایا جاسکے ہمارے معاشرے کے مزاج کے قریب تر ہوگا۔

خیام ایک ماہر افسانہ نگار ہیں اور ایک مدت سے اس دشت کی سیاحی کررہے ہیں۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کپل وستو کا شہزادہ'' قارئین پر اپنا ایک گہرا تاثر چھوڑ چکا ہے۔ اس مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے خیام کو وزیر آغا نے ایک سچا فن کار قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''خیام نے بیسویں صدی کی اجتماعی کرب انگیز کروٹوں کو اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح سدھارتھ نے۔'' اکیسویں صدی میں شائع شدہ افسانوں کا یہ دوسرا مجموعہ ''خالی ہاتھ'' اپنے تاثر میں کچھ زیادہ ہی گہرا اور دیرپا ہے جو ذہنوں کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور انھیں دعوت فکر دیتا ہے۔ میں خیام کو اس خوب صورت اور فکر انگیز مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔

نظمیں

ادیب سہیل

اُترن

ماضی خواہ حسیں ہو کتنا — ماضی ہے
اپنا حال بتا کر کب کا جا بھی چکا اس منڈپ سے
دوبارہ وارد ہونے کا خواب مگر دیکھے جاتا ہے!
حال پہ بیتے سمے کی من و عن تطبیق پہ زور
ایک اچنبھا،
اَن ہونی کا کھیل!
یارو تم جس حال کے صحن میں کھلتے ہو
اُس کو پوری قوت سے محسوس کرو
حال تمھیں جو کہتا ہے تسلیم کرو
حال سے تازہ مستقبل پیدا کرنے پر دھیان دھرو
سمے کے تن پر گزرا لمحہ اُترن ہے
حال کو اُترن پہنانے کی سوچ سراسر رجعت ہے
اُترن تو پھر اُترن ہے
اُترن کا ہر شکل میں تم بطلان کرو!!

☆

سحر انصاری

ایک نظم

(۱)

شہر جس طرح کے بھی شہر ہوں، وہ شہر ہی ہیں
سرد، مغرب کے نئے شہر، خزاں آلودہ
یا کہ مشرق کے تپش خیز، فغاں آلودہ
حدتِ خاکِ تپیدہ سے اُبلتے ہوئے شہر
یا کہیں برف کے مانند پگھلتے ہوئے شہر
ایک ہی طرح کے ہیں
جگمگاتے ہوئے خوش رنگ ستارہ ہوٹل
نغمہ و رقص میں ڈوبے ہوئے سوق و برزن
نیم عریاں سے بدن خلد کی تصویر لیے
ہوس و حرص کے ہر خواب کی تعبیر لیے
بھیڑ انسانوں کی آپس میں شناسا ہی نہیں
کسی چہرے پہ محبت کا اثاثہ ہی نہیں
تیز رفتار بسیں، موٹریں، کھلتے سگنل
شہر ہیں یا کہ مشینوں کے سلگتے جنگل
راکھ بنتی ہوئی تنہائی، بکھرتے ہوئے گھر
راہ کی دھول، دھواں، خاک، چمکتا ڈیزل
عارض و کاکل و لب، غمزہ و آداب و ادا
اشتہاروں میں نہاں ہوگئی سب کی پہچان

(۲)

بے رُخی، بے اعتنائی، اجنبیت، بے حسی
شہر کے کاندھوں پہ آسیبی تھکن رکھی ہوئی
تیز گامی، جنبش و رفتار کی تقدیر ہے
ہر جبیں پر اپنے گھر کا فاصلہ تحریر ہے
ہر گلی، ہر موڑ پر ہیں تاجرانہ زاویے
ہر قدم پر محرمانہ، مجرمانہ زاویے
ہیں کچھ ایسے، جن کے سینوں میں دھڑکتے دل نہیں
شہر میں رہتے ہیں لیکن شہر میں شامل نہیں

(۳)

ہر عمارت ہے یہاں قامتِ انساں سے بلند
آہن و سنگ کے ہاتھوں میں ہے جذبوں کی کمند
شاہراہوں پہ ہیں جلتے ہوئے، بجھتے ہوئے نام
حسرتیں دور سے کرتی ہیں جنھیں جھک کے سلام
نفع سے خوش ہے کوئی، کوئی ہلاکِ نقصاں
شہر ہیں یا کہ فقط سود و زیاں کی میزاں
دن تجارت میں، معیشت میں، سیاست میں مگن
رات، آنکھوں میں کھٹکتی ہوئی، روشن روشن
کچھ علاقہ ہی نہیں خواب کی سرشاری سے
شہر ہیں خوف زدہ اپنی ہی بیداری سے
رات کے وقت چمکتے ہوئے ہیرے ہیں یہ شہر
دن کو انسانوں کے گنجان جزیرے ہیں یہ شہر

☆

امجد اسلام امجد

آس پاس

یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں استعارے بھی ہیں اور مستعارے بھی۔ ان کی بنیاد بنی نوع انسان کی وہ اجتماعی دانش ہے جو ہمارے آس پاس تو ہوتی ہے مگر اکثر نظر انداز ہو جاتی ہے۔

ساحر کے اس شعر کی نذر:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اصلِ حیات

یہ صبح و شام نہیں زندگی کا پیمانہ
نہ یہ کہ زندہ رہا کوئی جگ میں کتنے برس!
یہ ماہ و سال کی گنتی تو صرف گنتی ہے
کسی کی عمر کے جوڑے ہوئے زمانے کی
پر اس کو اہلِ نظر زندگی نہیں کہتے
وہ دیکھتے ہیں فقط ایک ہی حوالے سے
کہ ماہ و سال کے اندر ہے "زندگی" کتنی!!

☆

تجربہ

گزر نہ جاؤ یونہی زندگی کے رستے سے
یہ صرف ایک مسافت نہیں، یہاں ہر پل
تم اپنے ذہن کے اندر بھی قد بڑھاتے ہو!

☆

چپ کی نعمت

اگر خموشی سے بہتر نہ ہو کلام تو پھر
یہی ہے سب سے مناسب کہ چپ رہا جائے

☆

ہمارا حصہ

کیوں پرانی روش کو اپنائیں
اس سے بہتر ہے ہر مسافت میں
ہم نئے راستے نکالیں اور
اپنے نقشِ قدم بنا جائیں

☆

کسوٹی

لمبے رستوں کو چننے والے ہی
درحقیقت یہ جان سکتے ہیں
ان کے اندر ہے حوصلہ کتنا
اور منزل سے فاصلہ کیا ہے!

☆

اور قریب آ جاؤ

سرگوشی میں باتیں کرنا دل کی عادت ہے
اس کی بات سمجھنی ہے تو
اور قریب آ جاؤ

☆

قبر جیہاں دی جیوے ہُو

زندگی کے رستے میں ہر کسی کو مرنا ہے
سب ہی مر بھی جاتے ہیں
جینے کی طرح لیکن کوئی کوئی جیتا ہے

☆

یکساں رعایت

جیسے ہر درویش کے پیچھے اُس کا ماضی ہوتا ہے
یوں ہی ہر ''مجرم'' کے آگے
اُس کا مستقبل بھی ہے!!

☆

جھوٹ سچ

یہی ہے سب سے بڑا فرق جھوٹ اور سچ میں
کہ سچ تو ہوتا ہے
اور جھوٹ گھڑنے پڑتے ہیں

☆

دوسرا رخ

جب کہ آسان ہے اُصولوں پر
سارى دنیا سے بے خطر لڑنا
سخت دشوار ہے مگر ان پر
استواری سے زندگی کرنا

☆

رول ماڈل

بات بے بات ٹوکنا چھوڑو
یوں نہ ہر دم سوال بن جاؤ
اپنے بچوں کے واسطے یارو
ہو سکے تو "مثال" بن جاؤ

☆

خود کفیل

لوگ ہوتے ہیں بیش تر، جیسے
بند کھڑکی کے ملگجے شیشے
جن کو سورج کی تیز چمکیلی
دھوپ دن بھر اُجال رکھتی ہے
شام کے ساتھ ہی مگر ان کی
ملگجاہٹ بھی لوٹ آتی ہے
اور پھر صرف وہ چمکتے ہیں
"جن کے اندر ہو روشنی اپنی!!"

☆

قیمت

یہ زندگی نہیں کوئی جز وقتی مشغلہ
اس کا کوئی بھی لمحہ کبھی رائگاں نہیں
"خدماتِ باہمی" ہیں کرایہ حیات کا
رہنے کو مفت مل سکے یہ وہ مکاں نہیں

☆

شکرانہ

یہ جو بینائی کی نعمت ہے میسر ہم کو
اس کی توصیف کا پیمانہ نہیں ہوسکتا
کسی بھولے کو اندھیرے میں دکھائیں رستہ
اس سے بہتر کوئی "شکرانہ" نہیں ہوسکتا

☆

آئیڈیل

اپنے کام کو سب سے بہتر ڈھنگ سے کرنا
سب سے بہتر ہونے سے بھی
بہتر ہے

رضی مجتبیٰ

پیاس

مجلسوں کی رونقوں کی دل رُبائی سے پرے
آرزو تنہائیوں کی منتظر ——
یہ ہواؤں، آسمانوں اور فضاؤں کے بلاووں کا اُفق
جس پہ جسموں کے تقاضے، قربتوں کے سلسلے
پے بہ پے
دیکھتی ہیں خواہشیں

اور وہ البم میں اپنوں اور پرایوں کے گروپ
کیمرے کی آنکھ سے دیکھے ہوئے
(ایک جھوٹی جاودانی موت سے سہمی ہوئی)
زندگانی کی ضمانت کا فریب
التباسوں کے چراغ
اور سرابوں کے ایاغ
اک گمانِ بے خودی کی آنکھ سے اوجھل کہیں
خود فراموشی کی پیاس

☆

رضی مجتبیٰ

غروب

شام کا نارنجی سورج
ڈوبتے سورج کی کرنیں
جسم و جان و دل سے گزریں

ایکسرے کی جیسی شعاعوں کی طرح
کھولتی سارے ہی راز
درد کے سارے دکھاوے
اور تمھارے دل کے رنگیں سارے شیشے ٹوٹتے

دھیان رکھنا
راز جتنے بھی تمھاری زندگی کے تم چھپاتے آئے ہو
روح کے گوشوں میں وہ
اب ہوا کی زد پہ ہیں
اور تمھاری ساری باتیں
سارے ہی حرف و نوا ہیں پابہ جولاں
دشت در دشت
ڈھونڈتے پھرتے سراب
تا کہ ان میں ڈوب جائیں
جس طرح سے شام کا نارنجی سورج
ڈوبنے سے پیش تر
تھرتھراتا ہے سمندر کے قریب!

☆

صابر وسیم

محبت

یہ آسمانوں کی ہر بلندی سے ماورا ہے
سمندروں کی تمام گہرائیاں بھی کم ہیں
افق کے سارے ہی رنگ مدہم ہیں اس کے آگے
زمیں کے سارے ہی منظروں سے ہے بڑھ کے دل کش

یہ اک محبت جو میرے دل میں تمہارے دم سے بسی ہوئی ہے
اسی کی خوش بو لہو کے اندر رچی ہوئی ہے
اسی محبت کا پھول دل میں کھلا ہوا ہے
اسی محبت نے مجھ کو زندہ رکھا ہوا ہے
مگر مجھے زندگی سے اب یہ گلہ ہوا ہے
کہ زندگی مختصر سی کیوں ہے، قلیل کیوں ہے
ابھی تو مجھ پر محبتوں کا بہت سا قرضہ چڑھا ہوا ہے

سنو! محبت کا قرض مجھ سے ادا نہ ہو تو
یہ قرض میرا معاف کرنا، ثواب لینا
کہ میں سرائے جہاں سے مقروض ہی گزر جانا چاہتا ہوں
کہ میں محبت میں تم سے پہلے ہی جان، مر جانا چاہتا ہوں

☆

صابر وسیم

ایک عجب سی شام

یاد کریں تو یاد آتی ہے
ایک عجب سی شام

کر کے آنکھیں چار کھڑا تھا
چلنے کو تیار کھڑا تھا
چپ تھا آنکھیں کہتی تھیں
عمر کے اس دوراہے پر
اپنی کچھ سوغات ہی دے دو
خوشیوں کی اک رات ہی دے دو

درد کا اک طوفان سا آیا
دل للچایا، خون جلایا
لیکن اُس کو کیسے پاتے
پاس اپنے کچھ ہوتا بھی تو
عمر کی پونجی کچھ بھی نہیں تھی
وقت کا دریا گزر چکا تھا

خواب ہوئے تھے خام
ہائے عجب سی شام
کہاں سے لاتے دام

یاد کریں تو یاد آتی ہے
مجبوروں کی شام
شور بھرا جنگل
درد بھرا انجام

☆

مختار کریمی

آدمی

نہ جانے کتنے جگ بیتے
میں تیری راہ میں تنہا کھڑا ہوں
کسی افسوں سے دونوں پاؤں پتھر ہو گئے ہیں
پلٹ کر دیکھتا ہوں گر
تو آغازِ سفر کی ہر نشانی مٹ گئی ہے
اگر میں جانبِ منزل نظر ڈالوں
تو گردِ کارواں کی دھند چھائی ہے
خضر سے اسمِ اعظم پوچھنا ممکن نہیں ہے
تلافی کے لیے ظلماتِ نو میں کھو گیا ہے
سکندر مر چکا ہے عزم و ہمت ساتھ لے کر
یمن میں کوئی شہزادہ نہیں ہے
جو اس جادو کا تازہ توڑ بتلا دے
مجھے ان پتھروں کو توڑ کر
اب سر کے بل چلنا پڑے گا

☆

سیما شکیب

نشاطِ غم

آئنہ سی آنکھوں میں
خواب جھلملاتے ہیں
دل کو زندہ رکھتی ہے... اک لگن انوکھی سی
زندگی کی تہہ داری
حسن کی فسوں کاری
کو بہ کو پھراتی ہے، خاک کے بگولے کو
گاہے گاہے اٹھتی ہے ایک ٹیس ہلکی سی
ایک رنجِ مستانہ!
ہر زیاں سے بے پروا
شہرِ دل کی گلیوں میں
چھن چھنک، چھنک چھن چھن
رقص کرتا رہتا ہے
دل دھڑکتا رہتا ہے
بے کلی بھی رہتی ہے
سرخوشی بھی رہتی ہے
زندگی برتنے میں زندگی سی رہتی ہے
اک دیا اندھیروں میں
ٹمٹماتا رہتا ہے
غم نژاد راتوں میں روشنی سی رہتی ہے

☆

علی محمد فرشی

دوسرا کون ہے؟

کون ہے ساتھ میرے۔
اندھیرے میں جس کا وجود
اپنے ہونے کے احساس کی لو تیز رکھتے ہوئے
میرے سہمے ہوئے سانس کی راس تھامے ہوئے چل رہا ہے
دیا ایک امید کا جل رہا ہے
کہیں آبشاروں کے پیچھے
گھنی نیند جیسے اندھیروں میں
صحرا کی لاسمت پہنائی میں
پاؤں دھنستے ہوئے
سانس رُک رُک کے چلتے ہوئے
کتنا بوجھل ہے وہ
جس کو صحرا (کی اک سمت سے دوسری سمت) میں
لے کے جانے پہ مامور ہوں
میں رکوں تو زماں گردشیں روک کر بیٹھ جائے
آسماں تھک کے صحرا کے بستر پہ چت گر پڑے

چل رہا ہوں
بہت دھیمے دھیمے
قسم!
چھ دنوں کی،
مسلسل چلوں گا
میں بزاق سے کیا جلوں گا
بس اک سوچ میں دھنس گیا تھا
کہ یہ دوسرا کون ہے
کوئی ہارون ہے
یا کہ ہاروت ہے

☆

علی محمد فرشی

امرت زا

صراحی میں تیزاب ہے
کوئی امرت نہیں!

دل نشیں انگلیوں میں
سنبھالی ہوئی طشتری
طشتری میں چھلکتا ہوا آبگیں
آبِ جلبجا مشیں!
آگ سیال امرت، سنہرا بدن
تم کہاں روک پاؤ گے
اس آگ کو
ممکنات و مکافات کی منزلیں مارتی
سانس کی سیڑھیوں پر کھڑی
ہانپتی آگ کو!

بار ہا غیب سے
ایک آواز آتی ہے

جو آگ اور آب کے درمیاں
فاصلوں کو بڑھاتی ہے
جو سانس اور سانس کے درمیاں سرسراتی ہے
وقفے کے لمحات عمروں میں
عمروں کے صدمات لمحوں میں
تبدیل ہوتے ہوئے
آنچ میں کانچ کو
کانچ کو آنچ میں
گھل ملاتے ہوئے
پاس آتے ہوئے، دور جاتے ہوئے

میں نے یک بارگی
آسماں سے زمیں کے کنارے ملاتے ہوئے
ہونٹ وا کر دیے

☆

علی محمد فرشی

سوراخ

ایک سوراخ ہے
چیونٹیاں جس میں آتی رہیں
دانہ دانہ اٹھائے ہوئے اپنی تقدیر کا
بوجھ دل کا سنبھالے لگاتار آتی رہیں
دور اندر کہیں غار ہے
جس میں بیٹھا ہوا دیو کھاتا ہے
کیڑوں کی محنت!

مسلسل تنگ و دو کی لمبی قطاریں لگی ہیں
افق تا افق
اس وہاں کی طرف یوں سرکتی ہیں
جیسے یہاں تخت پر کوئی بیٹھا (سخی بادشہ)
زندگی بانٹتا ہے

لگاتار دیوار تعمیر کرتا رہا ہوں
مسلسل کوئی دوسری سمت سے چاٹتا جارہا ہے
لگاتار کوہِ ندا کی طرف
لوگ دیوار کو پھاند کر جا رہے ہیں
کہ جیسے وہاں ان کی کھوئی ہوئی
زندگی مل رہی ہو

دہانہ نہیں بھر سکا
چیونٹیوں کی طرح
میں نے سوراخ میں (آتے جاتے ہوئے)
کتنی عمروں کی خوراک
اس میں گرا ائی!

☆

حارث خلیق

جہاں زاد، یہ بھی تو ہے

تمنا کی شدت کی جس کو خبر ہے
وہ گھائل، شکستہ بدن، خاک بر سر
دریدہ دہن، چاک داماں
کسی کی طرف آنکھ بھر کر اگر دیکھ لے —
تو وہ جس پر نظر ہو
سحر سے نکل ہی نہ پائے —
نکلنا بھی چاہے تو کیسے
تمنا کی شدت نظر بن کے
ایسی بلند اور بالا، فزوں تر فصیلیں بنائے
حصار اس طرح کھینچ دے
کوئی بھی بچ نہ پائے...
جہاں زاد، لیلیٰ ہو، عذرا ہو، شیریں ہو، تم ہو
تمنا کی شدت کی جس کو خبر ہے
اُسی کی نظر کے طلسمات کے خواب آگیں جزیروں میں ہو
ہار کر بھی وہ غالب رہا
اور تم جیت کر بھی اُسی کے اسیروں میں ہو...

☆

میر ظفر حسن

اگر میں زندہ ہوں

خشک ہوا ہے خواب کا دریا
چپ ہیں پنچھی پھول بھی سارے
مدھم مدھم سب ہی تارے
بھیڑ میں کھوئے چہرے سارے
سارے سکھ اور دکھ بھی سارے
• ساتھ نہیں ہے کوئی ہمارے
ہم بھی کسی کے ساتھ نہیں ہیں
یاد نہیں ہے بات کوئی اب
گھاؤ کوئی نہ کوئی خوش بو
کوئی دستک کوئی آہٹ
آ کر مجھ کو یہ بتلا دے
میں زندہ ہوں
اور اگر میں زندہ ہوں تو...
مجھ کو ہنسا دے یا وہ رُلا دے
کان میں میرے کہہ دے آ کر
تم زندہ ہو...!
میں اور تم... دونوں زندہ ہیں!!

☆

میر ظفر حسن

ابھی زندگی پڑی ہے

نہ ہو بے قرار اے دل
وہ چلا گیا تو کیا ہے
کوئی خواب اور بُن لے
کوئی گیت اور گا لے
کسی دل میں ڈال ڈیرے
کسی آنکھ میں ٹھہر جا
کسی لب پہ پھر بکھر جا
کسی باغ کی طرف چل
کوئی داستاں سنا دے
کوئی شعر گنگنا دے
کسی دوست سے ملاقات
کوئی بچپنے کی خواہش
کوئی بھولا بسرا قصّہ
وہ گئے دنوں کی یادیں
کبھی اِس طرح کی باتیں
کبھی اُس طرح کی باتیں
مری جان! مسکرا دے
ترا غم بہت بڑا ہے
یہ خبر ہے مجھ کو لیکن
شبِ غم جو آ رہی ہے
اسے بعد میں منانا
ابھی زندگی پڑی ہے!

☆

مصطفیٰ شہاب

ڈھارس

دکھ کے بیج کے سینے میں ہے
سکھ کی فصل گڑی
سارے پتے کھو کر ہوگی
پھر سے ڈال ہری —

دل میں وسعت ہے تو دنیا
گھر کے آنگن سی
تتلی کے پر سوکھے، پھر بھی
کچے رنگ سبھی —

اپنے دھارے لے کر آگے
جائے گی ندی
لہر لہر منظر بدلے گا
دیکھو نئی ناؤ چلی —

پروین نظیر سومرو

مقدّر

بلآخر پھول اک دن سوکھ جاتے ہیں
کسی ٹہنی پہ ہوں چاہے
کسی گل دان میں ہوں
یا کسی کالر کی رونق ہوں
بلآخر سوکھ جانا ہی
لکھا ہے اُن کی قسمت میں
ہوا — جو سب سے پہلے
زندگی کا لمس اُن میں بھرتی ہے
پھر خود اُنھیں بے مہرئ ایام کے
سنسان منظر بھی دکھاتی ہے
کہ جیسے کھلکھلاتی لڑکیوں کے دل میں
خود اُن کی ہنسی
پہلے مسلسل خواب بوتی ہے
مگر پھر یہ ہنسی اُن کو
اُداسی اور خاموشی کی
راہیں بھی دکھاتی ہے
وہ چاہے پھول ہو یا کوئی لڑکی ہو
مقدر ایک ہے دونوں کا —
دونوں سوکھ جاتے ہیں!

☆

پروین نظیر سومرو

ہنستے رہنا

اے دل
ہنستے رہنا
اے پاگل دیوانے
سب ہیں یہاں اَن جانے
سب کے سب بے گانے
تنہائی کا غم ہے سہنا
ہنستے رہنا
دیکھے پھول سے پیکر
آنکھیں جن کی سندر
دل ہیں لیکن پتھر
اپنا دُکھ نہ کسی سے کہنا
ہنستے رہنا
جب تک ڈور بندھی ہے
تب تک آس لگی ہے
غم ہے یا کہ خوشی ہے
یہ جیون ساگر ہے بہنا
ہنستے رہنا

☆

محمد مشتاق آثم

تسکین

کسی نے کبھی جون میں بھی پکارا
تو ٹھٹھرا رہا میں
کبھی جو دسمبر میں آواز آئی
تو چھوٹے پسینے
بہار اور خزاں کے سبھی منظروں سے الگ
میرے خوابوں کی
وہ بستیاں بھی ہیں آباد
جو تیری آواز کی سرحدوں سے پرے ہیں
جہاں پر سماعت مری راج کرتی ہے
اور کوئی آہٹ کرن
میری دہلیز دل پر نہیں جگمگاتی
مجھے ظلمتوں سے پرے
ایسے خوابوں کی سب بستیاں
اپنی آغوش میں لے کے
نوری زمانوں کی دوری کے

مژدے سناتی ہیں
اور میں
اسی خواب آگیں فضا کے تصور میں
عمروں کی تنگی صلیبوں پہ
کتنے ہی فرسخ سفر کاٹتا ہوں
میں تیشے کو اپنے قلم کر کے
کوہِ ہنر کاٹتا ہوں
پہنچتا ہوں وادی میں ایسی
جہاں تیری آواز کا
شائبہ بھی نہیں ہے

☆

سوانح / یادیں

ساقی فاروقی

آپ بیتی/ پاپ بیتی

(نویں قسط)

—— اب کے ہمارے تعلقات پر پچاسواں میٹھا برس لگ رہا ہے، مناسب ہے کہ میں اپنے پیارے دوست جمیل الدین عالی پر اپنے گوناگوں تاثرات قلم بند کرتا چلوں۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے، ان سے میری پہلی ملاقات سلیم احمد کے گھر پر ہوئی تھی۔ سن یاد نہیں، بس اتنا یاد ہے کہ اُس محفل میں مجتبیٰ حسین اور جمیل جالبی بھی موجود تھے۔ سلیم تو میزبان تھے ہی، اُن کے علاوہ ریاض فرشوری، شمیم احمد، قمر جمیل، جمال پانی پتی، اطہر نفیس، فرید جاوید، عزیز ہاشمی وغیرہ بھی (ابھی ابھی جو میں نے دس بارہ نام لکھے ہیں ان میں سے بیش تر کو میری تنہائی پر ترس نہیں آیا۔ عالی اور جالبی کے علاوہ سب چلے گئے، خدا ان دونوں کو تاقیامت سلامت رکھے)۔

ایک ہفتہ پہلے فیض احمد فیض اور سید سبطِ حسن کے مشہور اور خوب صورت رسالے ''لیل ونہار'' میں میری ایک نظم ''سورج کا قتل اور اس کے بعد'' چھپی تھی۔ یہ انھی دنوں کی بات ہے، جب جمیل جالبی نے اپنے ''نیا دور'' میں میری نظم ''کھول دو اور اس کے بعد'' چھاپی تھی۔ اس نظم میں منٹو کی مشہور کہانی کو ذرا آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ دونوں نظمیں اپنے ترقی پسندوں کی ہزاروں نظموں کی طرح یک پرتی تھیں۔ بعد میں انھیں میں نے اپنے کسی مجموعے میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی مگر اُس محفل میں اُس رات میں نے یہ دونوں نظمیں سنائیں۔ مصرعوں کی کاٹ اور بُنت ایسی تھی کہ عالی جی نے کہا، ''تم اپنا تخلص عرفی کرلو۔'' میں نے کہا، ''میں عرفی کو مزید مشہور نہیں کرنا چاہتا۔'' اور بات آئی گئی ہوگئی۔

عالی ایک پُرعزم اور بلند حوصلہ آدمی ہیں۔ دلّی کے نوابی ٹھاٹ دیکھنے کے بعد شروعِ ہجر یعنی مہاجرت کی ابتدا میں اپنے نئے ملک میں دو تین برسوں تک کوئی نہایت معمولی ملازمت کرتے رہے:

پہنیں مولسری کے کنٹھے سونگھیں سرخ گلاب
پاکستان میں جو ہوں عالی، دلّی میں تھے نواب

پھر انکم ٹیکس افسر بنے، کسی بینک کے پریذیڈنٹ بنے، پاکستان رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکریٹری بنے وغیرہ وغیرہ۔ غرض کہ بننے پر آئے تو بنتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ انجمن ترقی اردو، پاکستان، کے جنرل سیکریٹری بننے کے بعد سارے پاکستان کے سینیٹر بھی بن گئے۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ سلیم خاں (یعنی اپنے سلیم احمد) زندہ ہوتے تو مجھ سے کہتے، "یار ساقی، اس لمبے سفر میں اپنا عالی کہیں کھو گیا ہے۔" اور میں کہتا، "سلیم خاں، مگر اس آدمی نے اس طرح کا اردو دوہا بھی لکھ رکھا ہے":

میں نے کہا گوری سپنوں میں بھی شکل نہ تو نے دکھائی
اس نے کہا بھلا مجھ بن تجھ کو نیند ہی کیسے آئی

"شکل نہ تو نے" کو میں "صورت نہیں" پڑھتا ہوں اور غزل میں اس قسم کا تازہ اور قیامت خیز شعر بھی کہہ رکھا ہے:

رات کی کوکھ سے پھوٹا ہے اک سوتا نرم خیالوں کا
دن ہوتے ہوتے یہ کس کس دھارے میں مل جائے گا

سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے بہتوں کی مدد کی اور اپنی حیثیت کے مطابق پل بنائے، چاہ بنائے، تالاب بنائے، دشمن بنائے، مگر فیض کے یہ اسباب بناتے یا بنواتے ہوئے انھیں نام بھی مطلوب رہا۔ افسوس کہ شاعری زینہ بہ زینہ نیچے اترتی رہی، پھر کالم نگاری میں پناہ لی۔ اس سے انھیں اخباری شہرت تو ضرور ملی مگر اُن کی شاعری کی قیمت گھٹ گئی۔ ادب کے مقابلے میں صحافت دوسرے تیسرے درجے کی چیز ہوتی ہے۔ ایک اچھا فن کار صرف اپنے دل اور اپنی روح کی بادشاہت قبول کرتا ہے مگر اچھے سے اچھے صحافی کو بھی اخبار کی پالیسی، مالک کی خودسری اور مدیر کی خوشنودی کا غلام رہنا پڑتا ہے۔ جو صرف صحافی ہی پیدا ہوئے ہیں وہ لوگ یہ کام بخیر وخوبی انجام دیتے ہیں کہ یہ ان کا پیشہ ہے۔ وہ "اہلِ خبر" ہوتے ہیں، "اہلِ نظر" ہرگز نہیں۔ اچھے شاعروں ادیبوں کو اس کوچے میں قدم رکھنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ ان کے نام کو بٹا اور ان کے ادب کو دھکا ضرور لگے گا۔ "شاعروں، ادیبوں کو بی بی سی جیسے اداروں سے پرہیز کرنا چاہیے۔" (ٹی ایس ایلیٹ)

لندن آنے کے بعد جمیل الدین عالی سے (سلیم احمد کے عالی خاں اور میرے نواب صاحب) تعلقات کا دوسرا دور شروع ہوا۔ چوں کہ وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری تھے اس لیے مختلف ممالک کے ادبی سے می ناروں میں شرکت کر چکے تھے۔ ایسے دورے عہدے کا perks کہلاتے ہیں۔ ان سے ہمارے تمام افسر واقف ہیں۔ اور جو واقف نہیں ہیں وہ ان کی حسرت میں کڑھتے رہتے ہیں کہ ہم نے حسرت موہانی پیدا کرنے بند کر دیے ہیں۔ غرض کہ عالی لندن دیکھ چکے تھے۔ میں شروع میں لندن میں بے کراں تنہائی سے بولا بولا کر اپنے تمام دوستوں کو خط پر خط لکھتا۔ یہ لوگ اپنی چٹھیوں میں ڈھارس بندھاتے۔ اُس زمانے کے دو خطوط ایسے ہیں کہ ان کا تذکرہ ضروری ہے۔ ایک اپنے ممتاز حسین کا ہے:

— یہ تو معلوم ہے کہ جس شخص کو یہاں اپنے سائے سے خوف آتا ہو وہ وہاں
تنہائی میں کیا کیا نہ محسوس کرتا ہوگا۔ بھائی تنہائی کا احساس بڑا خلاق ہوتا ہے۔
کاش کہ تم اپنی تنہائی سے کچھ خلق کرو۔ رہ گئی تمھاری پریشانی کہ شہر کاٹتا ہے،
تنہائی ستاتی ہے تو یہ سب تو واں ہوگا ہی۔

دوسرا خط اپنے عالی جی کا ہے:

مسٹر ساقی فاروقی، اگر تم تنہائی اور اداسی محسوس کرتے ہو تو لسٹر اسکوائر کے پاس
اسنور یا ناچ گھر میں چلے جایا کرو۔ اگر تم کمپنی حاصل کرنا جانتے ہو تو تمھیں
بہت اچھی کمپنی ملے گی اور خرچ بھی ڈھائی شلنگ، گڈ لک۔

میں نے یہ دونوں تحریریں اپنی پہلی کتاب "پیاس کا صحرا" میں محفوظ کردی ہیں۔ اس کے بعد عالی بار بار لندن آتے رہے اور اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور محبتیں بڑھتی رہیں۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کے ہاں یا ہوٹلوں میں ٹھہرتے۔ شام کو میں ان کے پاس چلا جاتا یا وہ میرے گھر آجاتے۔ میں اپنے دوستوں کو بلا لیتا۔ میری بیوی عمدہ عمدہ کھانے پکاتیں اور میں عمدہ عمدہ وائنوں کی بوتلیں کھولتا رہتا۔ وہ گنڈی کے بھی بہت اچھے دوست ہیں اور میرے بارے میں انھیں بھی انگریزی اور بھدی ہینڈ رائٹنگ میں خط لکھتے رہتے ہیں۔ وہ یہاں ہوتے ہیں تو ہمیں ہر دوسرے تیسرے دن کبھی اطالوی، کبھی فرانسیسی ریسٹورانوں میں ضرور لے جاتے ہیں۔ خراج ہیں اور خوش پوشاک بھی۔ کاش یہ خراجی اور یہ خوش پوشاکی اُن کی پچھلی تیس سالہ شاعری اور نثر میں بھی نظر آتی۔ ان کی پہلی کتاب مجھے بہت پسند آئی تھی۔ اس کے بعد اُن کے ادب کا گراف نیچے ہی نیچے کی طرف سرکتا چلا گیا۔ اصل میں انھوں نے اپنے آپ کو بہت پھیلا رکھا ہے۔ اُن کا بہتر ذہن سیاست اور دنیا بازی میں لگ گیا، بیسیوں بار میں نے اپنے تیز تیز لہجے میں ان امور کی جانب اشارے کیے، اب سوچتا ہوں کہ دیر ہوگئی شاید۔

وہ زندگی میں صرف ایک بار ہی میرے پاس ٹھہرے۔ میرے پاس کہاں، میرے ٹیلی فون کے پاس۔ ایک دن کسی کا فون آیا، میں نے اٹھایا، آواز آئی: "عالی صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے فون ان کی طرف بڑھا دیا۔ کہاں تو صوفے پر لیٹے ہوئے تھے کہاں ایک دم سے بیٹھ گئے اور آدھ گھنٹے تک "سر سر" کرتے رہے۔ گفتگو ختم ہوئی تو میں نے پوچھا: "کیا یہ صدر پاکستان تھے؟" کہنے لگے: "نہیں یہ ہمارے وزیر خزانہ محمد شعیب صاحب تھے۔ پاکستان سے چلتے وقت میں انھیں تمھارا ٹیلی فون دے آیا تھا۔ وہ امریکا جا رہے ہیں۔ راستے میں رکے تو لندن ایئرپورٹ سے فون کیا ہے۔" میں نے اپنی ستر سالہ زندگی میں آج تک کسی کو "سر" نہیں کہا۔ افسوس کہ میں اپنے معاشرے کا افسری ماتحتی والا نظام بالکل بھول گیا ہوں۔

انھوں نے اپنی شادی کی تین چار سال گرہیں لندن ہی میں منائیں۔ ایک بار طیبہ بھابی بھی

(ان کی دل نواز بیگم) ساتھ تھیں۔ ہمی پیلنڈ کے گلی کوچوں میں میرے بوسے بکھرے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کسی قیمتی فرانسیسی ریستوران کا پتا پوچھا۔ میں نے بتایا، ان دونوں کو ہم دونوں نے اسٹیشن سے گرفتار کیا۔ آگے آگے بھابی اور گُنڈی پیچھے پیچھے عالی جی اور میں خراماں خراماں ریستوران کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک نہایت خوب صورت چہرے نے ہمارے قدم پکڑ لیے۔ ہم نے اسے روک کر ایک دو منٹ تک اس کی نیلی آنکھوں، سنہرے بالوں اور آدھی رانوں تک کٹی ہوئی منی اسکرٹ کی ہوا داری پر رطب اللسانی کی۔ اُسے لجاتا، شرماتا چھوڑ کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ ہماری بیویاں میں پچیس قدم آگے نکل گئی تھیں اور رُک کر ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ہم پہنچے تو میری بیوی نے پوچھا، ''وہ لڑکی کون تھی؟'' میں نے کہا، ''راستہ بھول گئی تھی، پتا پوچھ رہی تھی۔'' طیبہ بھابی نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گُنڈی کو بتایا، ''نہیں گُنڈی نہیں، دنیا بھر کے شاعر مرغ و ماہی تلاش کرتے رہتے ہیں اور گھر کی دال روٹی کا مزہ بھول جاتے ہیں۔'' (کیک کھا کھا کے سویوں کا مزہ بھول گئے، اکبر الہ آبادی)۔

ایک بار علی گڑھ سے ساجدہ زیدی لندن آئیں۔ کسی ہوٹل میں ٹھہریں، جمعہ کو فون کر کے مجھے سنیچر کے لیے مدعو کیا۔ میں نے کہا، ''آپ نے بہت کم وقت دیا، بیوی کی ایک سہیلی کی برتھ ڈے پارٹی پر جانا ہے۔ مگر میں اپنے دوست جمیل الدین عالی کو فون کر سکتا ہوں۔ وہ آپ ہی کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' ساجدہ نے ان کا فون مانگا۔ میں نے دے دیا۔

دوسرے دن نواب جانی کا فون آیا تو معلوم ہوا کہ وہاں اُن کی ملاقات سویڈن کی ایک مطلقہ خاتون انگرڈ سے ہوئی۔ میں نے فون بیوی کے حوالے کیا۔ گُنڈی نے کھانے پر بلایا۔ دوسرے دن وہ انگرڈ کے ساتھ آئے۔ نہایت قبول صورت خاتون تھیں۔ گُنڈی کو پسند آئیں مگر میں اپنے حد سے بڑھے ہوئے احساسِ جمال کے باعث اُس عزیزہ کے چہرے پر چنے ہوئے ایک عظیم مسّے کو قبول نہ کر سکا کہ صرف تِل کا دیوانہ ہوں شاید، مسّے کی رفاقت میری سرشت میں نہیں، مگر عالی جی جب جب لندن آتے ہیں تو مسّے کو فون کرتے ہیں یا سویڈن کا چکر لگا آتے ہیں۔ خیال اغلب ہے کہ ان کا مثانہ کم زور ہے۔

☆

P.S۔ میں اپنے ہندوستانی مدیر ''نیا ورق'' اور پاکستانی مدیر ''مکالمہ'' دونوں کے خلاف ہو گیا ہوں کہ وہ مجھ پر پریشر ڈالتے رہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ میں مرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ساقی۔ ۲۲/ مارچ ۲۰۰۶ء

☆☆☆

مشفق خواجہ

سلطان جمیل نسیم

محفل تو خالی ہوگئی

غالب کی عظمت کا ایک سبب تو یہی ہے کہ وہ زندگی کے تمام اہم مواقع پر اپنی موجود کا احساس دلادیتا ہے۔ جس وقت ایک ٹیلی فون نے سارے وجود میں پہلے ایک زلزلے کی سی کیفیت پیدا کی پھر برف کی طرح منجمد کردیا۔ اُس وقت غالب قریب آیا اور کہا:

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

مجھے ایسا معلوم ہوا کسی نے رونے کو اپنا کندھا پیش کردیا ہو۔

اب اسے اتفاق ہی کے نام سے موسوم کیا جائے کہ دن کے دو بجے کی فلائٹ سے میرا چھوٹا بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ٹورنٹو پہنچا، اُس کے اطمینان سے بیٹھ کر سانس لینے سے پہلے میں نے پوچھا،میری کتابیں لائے ہو؟اپنے شوق کی اور اپنے دیس کی چیزوں کے لیے بے چینی اور تجسس کی کیفیت کوئی غریب الوطن ہی سمجھ سکتا ہے۔ میری سال بھر کی ٹیلی فونک فرمائشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے برادرِ خورد نے اپنے اوورکوٹ کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا، اُس میں سے ایک چابی کو انگلیوں میں دبا کر اپنی بیگم سے پوچھا، یہی ہے؟ جواب اثبات میں پایا تو اُس چابی کو گچھے سے الگ کر کے مجھے دیتے ہوئے ایک سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا،" اُس میں آپ کی ساری فرمائشیں بھری ہیں۔" یہ سنتے ہی میری بیوی نے چھوٹے بیٹے سے کہا، اس بکسے کو ان کے کمرے میں لے جاؤ، ورنہ یہیں اپنا دفتر کھول کے بیٹھ جائیں گے۔

اٹیچی کے ساتھ ساتھ میں بھی کمرے میں آگیا۔ بیٹے نے مجھ سے چابی لے کر صندوق کھولا۔میری آنکھوں میں چمک آگئی۔ میں وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔خطوط ایک پلاسٹک کی تھیلی میں بند تھے ۔ایک ڈوری سے تمام رسالے بندھے ہوئے تھے، البتہ کتابیں سفر کے دوران مل جل گئیں تھیں۔ مجھے وہ دو کتابیں بالکل الگ سے دکھائیں دیں جن کو میں نے خاص طور سے منگایا تھا۔میری خواہش کے

مطابق مصنف نے دستخط کیے تھے۔ چند لمحے تو میں نے ورق گردانی کی۔ مختلف مضامین کے صفحات اِدھر اُدھر سے پڑھتا رہا۔ کبھی ہنستا اور کبھی مسکراتا رہا۔ پھر اطمینان سے پڑھنے کے لیے اُن کتابوں کو ایک طرف رکھا اور دوسری کتابوں پر نظر ڈالنے لگا۔ یہ بھی اتفاق ہے، اُن دونوں میں سے کوئی کتاب ابھی پوری پڑھنے کی مہلت ہی نہ پائی تھی کہ اسی رات نیو یارک سے قمر علی عباسی کا فون آیا۔ جو کچھ اُس نے کہا، میں نے سُن تو لیا مگر سُنتے ہی پہلے تو سناٹے میں آ گیا۔ پھر سارے وجود میں ایک زلزلے کی کیفیت سی پیدا ہوئی پھر سکوت کا لمحہ — پھر جی چاہنے لگا، کوئی مجھے دلاسا دے۔ کوئی ہم دردی کے دو بول کہے — جب کمرے سے باہر آیا تو بیوی نے صورت دیکھ کر پوچھا، کیا ہوا؟

کوششِ ضبط کا حاصل مجھے معلوم نہ تھا
جس قدر غم کو چھپاؤں گا نمایاں ہو گا
(صبا اکبر آبادی)

اب میں کیا جواب دیتا۔ پرسشِ حال پر آنکھوں میں چھلک آنے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے میں پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ آنسو کیا بہے کہ ماضی آنکھوں میں پھر گیا۔ آنکھوں میں تیرتے جزیرے میں دنیا کے رنگ کبھی بہار کبھی خزاں کی صورت کبھی پرانی رفاقتوں کی خوش بو سے معمور کبھی دائمی جدائی کے غم سے بھرپور نظر آتے رہے اور میں اپنے کمرے میں تنہا اُس جزیرے میں کبھی محبت سے اور کبھی تاسف سے پھرتا رہا۔ بھٹکتا رہا۔

۱۹۵۸ء میں اختر انصاری اکبر آبادی سے ملنے کے لیے کراچی سے ایک لڑکا حیدر آباد آیا۔ تعارف ہوا، نام مشفق خواجہ ہے۔ کام، انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہیں۔ مجھے یاد آیا دو چار برس پہلے ایک رسالہ "تخلیق" کے نام سے نکالتے تھے جس کے لیے میں نے افسانہ بھیجا تھا۔ مشفق خواجہ کو یاد تھا۔ مسکرا کے کہا، "جناب جس شمارے میں آپ کا افسانہ تھا وہ پریس جا ہی نہیں سکا"

بعد میں معلوم ہوا یہ سلوک وہ ہر اُس لکھنے والے کے ساتھ کرتے ہیں جس کی کوئی چیز شائع نہ کرنا ہو۔

۷۶-۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ لیاقت نیشنل لائبریری میں کراچی کے اُن بزرگ شعرا کے ساتھ ایک تقریب منائی گئی تھی جن کی مشقِ سخن پچیس سال یا زیادہ تھی، اُن شعرا میں میرے والد بھی شامل تھے۔ میں بینک میں ملازم ہونے کی وجہ سے ذرا تاخیر سے پہنچا، ہال میں داخل ہو کر بیٹھنے کے لیے جگہ کی خاطر نظریں دوڑا ہی رہا تھا کہ ایک مانوس آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور میں مشفق خواجہ کے پاس جا بیٹھا۔ تقریب کے اختتام پر بزرگ افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کے ساتھ سید انور (جو کبھی کمانڈر انور اور کبھی صرف انور کے نام سے افسانے لکھتے تھے) مشفق خواجہ کے قریب آئے اور مشفق خواجہ سے پوچھا،

میرا افسانہ مل گیا۔ مشفق خواجہ نے بلا تامل نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا: "حضرت آپ کو دوسرا افسانہ دینا پڑے گا اس لیے کہ سنسر والے آپ کے افسانے کی منظوری ہی نہیں دے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ افسانہ آپ قاسمی صاحب کو بھیج دیجیے۔ لاہور میں سنسر کی اتنی سختی نہیں ہے اور ہو بھی تو قاسمی صاحب بھی خاصے اثر رسوخ والے ہیں۔" انور صاحب نے جو بات کرنے سے پہلے قہقہہ لگاتے تھے، مشفق خواجہ کی بات کو قہقہہ لگائے بغیر سنا اور کہا، ٹھیک ہے میں دوسرا دیدوں گا۔ مشفق خواجہ نے کہا۔ اس سے ذرا مختلف ہونا چاہیے۔

"Definetly that will be diffrent."

"اور پہلے سے بہت مختصر بھی۔ افسانے کی طوالت پر بھی سنسر والوں کو اعتراض ہے۔"

"کیوں ضخامت پر اعتراض کیوں ہے؟" یہ سوال جناب ابوالفضل صدیقی نے پوچھا۔

"آپ تو جانتے ہیں، یہ سنسر بورڈ والے ادب سے اتنے ہی واقف ہیں کہ صرف غزلیں ہی پڑھتے ہیں اور وہ بھی احمد فراز اور پروین شاکر کی۔ طویل تحریر اور وہ بھی افسانہ۔ بس پڑھے بغیر ہی وہ رد کر دیتے ہیں۔"

اسی طرح کی دو ایک مثالیں مجھے اور یاد ہیں۔

مشفق خواجہ سے پہلی سرسری سی ملاقات ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔

ہم لوگ اختر صاحب کے پاس عام طور سے شام کے وقت جاتے تھے، اُس دن گئے تو مشفق خواجہ سے ملاقات ہوئی، اس کے بعد کئی بار یہ معلوم ہوا کہ مشفق خواجہ کسی ضروری کام سے حیدرآباد آئے تھے، وہ کام نمٹایا اور واپس چلے گئے۔

اور یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اختر انصاری اکبرآبادی، مدیر ماہ نامہ "نئی قدریں" حیدرآباد سندھ کی دعوت پر اردو کالج کے لیے مالی اعانت حاصل کرنے کے سلسلے میں حیدرآباد، سکھر، میرپور خاص اور نواب شاہ کے دورے پر آنے کی ہامی بھری تھی۔ افوہ — کس قدر بے چینی سے ہم نے بابائے اردو کے آنے کا انتظار کیا تھا اور ان کے استقبال کی تیاریوں میں کس انہماک کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اللہ اللہ کر کے وہ دن آیا، کراچی ایکسپریس کے آنے سے بہت پہلے بابائے اردو کے خیر مقدم کے لیے سندھی اور اردو کے سارے ہی اہل قلم ہار پھول لیے حیدرآباد کے اسٹیشن پر موجود تھے۔ گاڑی جب پلیٹ فارم پر پہنچی تو "اُدھر ہیں" کہتے ہوئے اختر انصاری صاحب ایک طرف دوڑ پڑے۔ سب لوگ اُن کے پیچھے چل دیے جب کمپارٹمنٹ کے قریب پہنچے، تو سب سے پہلے جس کی صورت نظر آئی، وہی جواں سال شاعر مشفق خواجہ تھا۔ از سرِ نو تعارف ہوا تو پتا چلا انجمن ترقی اردو کے رسالے "قومی زبان" کے ایڈیٹر ہو گئے ہیں اور انجمن سے ابن انشا کی طرح پورے طور سے وابستہ بھی ہیں — لیکن ایک عجیب بات میں نے دیکھی کہ شاعر ہونے کے باوجود کسی شعری نشست میں شرکت نہیں کی — معلوم ہوا کہ انجمن ترقی اردو میں ابن انشا کی جگہ آئے ہیں تو ابن انشا ہی کی طرح کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے —

اور بات چیت میں بھی وہی شوخی، لطافت اور ظرافت کی چاشنی ہے جو ابن انشا کی خصوصیت ہے۔

ایک مرتبہ جگت استاد اختر انصاری اکبرآبادی حیدرآباد اور میرپور خاص میں دیگر اکابرادب کے ساتھ ابن انشا کو بھی لے آئے تھے، جہاں انھوں نے ایک مشاعرے میں اپنی غزل اتنی بے دلی کے ساتھ سنائی تھی جیسے کسی دوسرے کا کلام سنا رہے ہوں۔ اب اتفاق دیکھیے کہ میرپور خاص ہی کے ایک مشاعرے میں استاد کے حکم پر مشفق خواجہ نے بھی اپنی غزل سنائی، جس کا ایک شعر مجھے آج بھی یاد ہے:

کوئی پیغام سکوں تیری نظر نے نہ دیا
زندگی چھین لی اس طرح کہ مرنے نہ دیا

اس شعر کے دوسرے مصرعے کو میرے دوست سیّد ارتضا عزمی (مجموعہ کلام ''چہرہ نما'') بہت پسند کرتے تھے اور اسی طرح میں انھوں نے خود بھی ایک غزل کہی تھی، غزل کہنے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ خواجہ جیسا ایک مصرع بھی نہیں ہو سکا، حالاں کہ ارتضا عزمی حیدرآباد کے دو چار اچھے غزل گو شعرا میں شمار ہوتے تھے۔

انجمن کی ملازمت، بابائے اردو کی قربت، انجمن میں مشہور و معروف ادیبوں سے صحبت، نادر و نایاب کتابوں کی رفاقت نے خواجہ صاحب کو ادبی تحقیق کی طرف مائل کیا۔ اب وہ صرف ماہ نامہ ''قومی زبان'' کے مدیر نہ تھے بلکہ سہ ماہی ''اردو'' کو بھی ایڈٹ کرتے جس کے نگران اعلیٰ خود بابائے اردو تھے اور جو خالص علمی اور تحقیقی رسالہ تھا۔

جب انجمن سے وابستگی ختم کی اور یہ بات ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں کی ہے، اُس وقت تک ادب کے اعلیٰ اور سنجیدہ حلقے میں یہ اعتبار قائم ہو چکا تھا کہ مشفق خواجہ محققین کی صف میں جگہ بنا چکے ہیں۔ اور ایک عشرے کے بعد وہ جگہ اور مستحکم ہوگئی۔

میری ملازمت کے زمانے کی بات ہے۔ انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ میں ایک معمولی افسر ہوتے تھے، مہدی صاحب۔ اُسی محکمے سے ریٹائر ہوئے، لیکن ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے۔ ہم لوگ حیرت کرتے تھے کہ ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے کتنی ترقی کر لی۔ تقریباً یہی صورت حال مشفق خواجہ کی تھی۔ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ ہر ادیب سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے، خواہ وہ ادیب کسی شہر یا کسی ملک کا ہو۔ خواجہ صاحب ادب اور ادیبوں کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتے تھے۔

اس بات سے سب ہی آگاہ ہیں کہ تخلیقی اہل قلم کے مقابلے میں محققین کی عمومی شہرت کم ہوتی ہے۔ اس کا ازالہ مشفق خواجہ نے یوں کیا کہ جب کراچی سے جماعت اسلامی کے ترجمان اخبار، روز نامہ ''جسارت'' کا اجرا ہوا تو اُس میں ''خامہ بگوش'' کے قلمی نام سے ہر ہفتے ایک کالم لکھنا شروع کر دیا۔ کالم وہ پہلے بھی لکھتے رہے تھے لیکن ان کے قلمی نام کو شہرت ''جسارت'' کے کالموں سے ملی۔

جب مولانا صلاح الدین نے جسارت سے علاحدگی اختیار کر کے اپنا ہفت روزہ ''تکبیر'' نکالنا شروع کیا تو اُس کے لیے لکھنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُن کے وہ تمام کالم جو تین کتابوں میں شامل ہیں، ''تکبیر'' میں ہی شائع ہوئے ہیں۔ ''جسارت'' میں زیادہ تر ''کٹ پیس'' ہی شائع ہوئے۔ ادب سے ایسی وابستگی تھی کہ ہر صنفِ ادب کی تاریخ سے اصول وقواعد، اسرار و رموز سے واقف تھے، چناں چہ اپنے شگفتہ انداز میں اس طرح ادبی تخلیقات اور شخصیات پر لکھتے تھے کہ ہر جملہ طنز و ظرافت کا اعلیٰ نمونہ ثابت ہونے کے ساتھ خود مشفق خواجہ کی علمیت کی آئینہ نمائی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کالموں کے تیکھے لب و لہجے سے بعض شاعر اور ادیب ناراض بھی ہو جاتے تھے اور یہی حال ان کا گفتگو میں تھا۔ ایک واقعہ یاد آ گیا۔

اگست ۱۹۸۵ء میں اختر انصاری اکبر آبادی کا انتقال ہوا۔ مجھے اور دیگر دوستوں کو اطلاع دی، اخبارات کو خبریں بھجوائیں۔ پھر طے کیا، ہم کچھ لوگ اُن کی تدفین میں حیدر آباد جا کر شریک ہوں — وہاں پہنچے —صابر وسیم حیدر آباد کے نوجوان شاعر، اختر انصاری اکبر آبادی کی میت لینے بہاول پور گئے تھے ،جہاں ایک ہوٹل میں اُن کا انتقال ہوا تھا اور صابر وسیم نے ہی تجہیز و تکفین کی تمام تر ذمہ داری اٹھائی تھی۔ ہم لوگ قبرستان سے واپس صابر وسیم کے یہاں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ مشہور مزاح نگار عطاء الحق قاسمی کے بڑے بھائی ضیاء الحق قاسمی جو اس وقت حیدر آباد میں ہی کوئی کام کرتے تھے اور صابر وسیم کے پڑوس میں ہی رہتے تھے، اپنی مرتب کی ہوئی ایک کتاب، سب لوگوں کو دینے کے لیے لے آئے۔ اس کتاب میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کی تعریف میں مختلف شعرا کی نظمیں یکجا کی گئیں تھیں، اپنے اور ضیاء الحق کے نام کی رعایت سے کتاب کا نام ''ضیائے حق'' رکھا تھا۔ سب سے پہلے یہ کتاب مشفق خواجہ کو پیش کی گئی — خواجہ صاحب نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا۔

''معاف کیجیے، ہم سے ایک دن میں دو جنازے نہیں اُٹھائے جائیں گے۔''

اس بات کے تقریباً دو برس کے بعد جب میں لاہور گیا اور ''مجلس ترقیِ ادب'' کے دفتر میں محترم احمد ندیم قاسمی کے نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا تو وہاں عطا اور امجد اسلام امجد بھی آ گئے۔ ان سب کی موجودگی میں مشفق خواجہ کا فقرہ میں نے دُہرایا۔ سب نے لطف لیا۔

ایک بات اور یاد آ گئی۔ باہر سے کوئی بھی اہل قلم آئے وہ مشفق خواجہ کے ہاں حاضری دینا لازمی خیال کرتا۔ ایک مرتبہ ہندوستان سے اردو کے چار پانچ ادیبوں کا ایک وفد سرکاری طور پر آیا، یہ شاید ۱۹۸۴ء کی بات ہے۔ سب کے ٹھہرنے کا بندوبست شہر کے ایک پنج ستارہ ہوٹل میں کیا گیا تھا اور وہ لوگ صرف دو دن کے ہی ویزے پر آئے تھے اور اپنی آمد کی اطلاع خواجہ صاحب کو پہلے ہی دے چکے تھے، چناں چہ جس روز وہ لوگ پہنچے، رات میں مشفق خواجہ نے مجھے ساتھ لیا اور ہوٹل پہنچ کر معلوم کیا کون کس کمرے میں قیام پذیر ہے۔ سب سے پہلے جگن ناتھ آزاد کے کمرے میں گئے کہ اُس وفد میں سب

سے بزرگ وہی تھے۔ انھوں نے مشفق خواجہ سے معانقہ کیا مجھ سے رسمی انداز میں صرف ہاتھ ملایا۔ جب خواجہ صاحب نے میرا تعارف کرایا تو انھوں نے یہ کہہ کر مجھے گلے لگا لیا: ''ارے بھائی میں ہی نہیں، میرے والد بھی آپ کے ابا حضور کی شاعری کے گرویدہ تھے، اب کے تو ان لوگوں نے دو دن میں ایک لمحہ فرصت کا نہیں رکھا ہے لیکن ان شاء اللہ آئندہ جب بھی آیا صبا صاحب سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اور ۔'' ابھی اُن کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ''ایک منٹ'' کہہ کر انھوں نے ٹیلی فون اُٹھا لیا۔ ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور آزاد صاحب پلنگ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، اُن کے کسی پرانے واقف کار کا فون تھا۔ دس منٹ گزرے، بیس منٹ ہوئے، ان کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ جب وہاں بیٹھے بیٹھے آدھا گھنٹا بیت گیا تو مشفق خواجہ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ آزاد صاحب بھی کھڑے ہوگئے اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ کہاں؟ مشفق خواجہ نے کہا، ''آپ کو ٹیلی فون کرنے جا رہے ہیں۔'' یہ سُن کر آزاد صاحب نے جن سے باتیں کر رہے تھے اُن سے معذرت چاہی، اور فون رکھ کر ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

ایک دفعہ اختر انصاری صاحب حیدرآباد سے آئے ہوئے تھے مجھے ٹیلی فون کیا کہ شام پانچ بجے کے قریب وہ مشفق خواجہ کے یہاں ہوں گے میں بھی وہاں پہنچ جاؤں ۔ دس پانچ منٹ کی تاخیر سے میں پہنچا، خواجہ صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ کھولا اور کہا، آپ کے ساتھ گرم چائے پینے کے لیے اب تک استاد کو ٹھنڈی ہوا کھلا رہا تھا (در اصل کمرے کا ائر کنڈیشنر چل رہا تھا) ۔ چائے ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی ۔ معاف کیجیے گا ۔ کہہ کر خواجہ صاحب دروازہ کھولنے کے لیے گئے۔ ذرا دیر میں وہ ایک ایسے شاعر صاحب کے ساتھ آئے جن کو استاد منھ نہیں لگاتے تھے اور خواجہ صاحب بھی کچھ پسند نہیں کرتے تھے۔ آتے ہی خواجہ صاحب نے استاد سے کہا، آپ ان کو حیدرآباد کی نشستوں میں کیوں نہیں بلاتے؟

استاد نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بے نیازی سے کہا، ''بلائیں گے۔''

خواجہ صاحب نے اپنی سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''یہ واقعی بہت اچھے شاعر ہیں ان کو ضرور بلایئے۔''

استاد نے پھر کہا، ''بلائیں گے۔''

''آپ بڑی بے دلی سے کہہ رہے ہیں، یہ واقعی اچھے شاعر ہیں۔''

اس بات کے جواب میں استاد نے اُکھڑے ہوئے لہجے میں کہا، ''کہہ دیا بلائیں گے اب اور کیا چاہتے ہو؟''

خواجہ صاحب نے فوراً کہا، ''ابھی لے کے جایئے۔''

اپنے فقروں سے خود بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔

خواجہ صاحب نے ایک کردار تخلیق کیا تھا ۔ لاغر مراد آبادی، جو اُن کے بہت سے کالموں میں موجود ہے۔

سرگودھا سے ایک شاعر راغب شکیب پہلی مرتبہ کراچی آئے ، واپس جاکے انھوں نے کراچی کا سفرنامہ لکھا۔ جو ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے رسالے ''اوراق'' میں شائع ہوا۔اس میں حضرت راغب مرادآبادی سے اپنی ملاقات کا احوال، اُن کی زود گوئی کا تذکرہ اور شاگردوں کی فہرست بھی شامل تھی ، اور اُس فہرست میں مشفق خواجہ کا نام بھی شامل تھا۔ راغب شکیب جب کراچی مستقلاً آ گئے تو ان کا وہ سفرنامہ کتابی صورت میں ظاہر ہوا۔ اب اُس میں خواجہ صاحب کا نام شامل نہیں تھا۔ لیکن راغب مرادآبادی صاحب کا اصرار ہے کہ مشفق خواجہ شاعری میں اُن کے شاگرد ہیں۔

مشفق خواجہ بزگوں کا احترام کرتے تھے۔ براہِ راست تردید کرنے کے بجائے بس ایک کردار گڑھ لیا۔ لاغر مرادآبادی۔

خواجہ صاحب کو جو بات کہنا ہوتی بغیر کسی مصلحت کے ادا کر دیا کرتے۔ پیدائش لاہور کی تھی۔ ایک مرتبہ لاہور گئے وہاں انٹرویو کرنے والوں میں مرحوم حسن رضوی بھی موجود تھے (ایک ادبی چینل نے انٹرویو کیا تھا)۔ ایک دوست نے پوچھا، پنجابی زبان کی ترقی کے لیے آپ کوئی تجویز دیں۔ مشفق خواجہ نے جواب دیا، ''اردو کو ترقی دیجیے، ہر علاقائی زبان ترقی کرے گی۔''

جہاں تک زبان کا تعلق ہے مشفق خواجہ سے اچھی زبان لکھنے والے آج کل تو دور دور دکھائی نہیں دیتے۔

جب تک میرا قیام ناظم آباد میں رہا۔ وہ مجھے اکثر شام کو فون کرتے، ''آپ کیا کر رہے ہیں۔ میں گھر سے نکل رہا ہوں چورنگی تک آجایئے۔''

عام طور سے وہ شام کو خاصی دور تک چہل قدمی کے لیے جایا کرتے تھے۔

وہ ناظم آباد نمبر تین میں رہتے تھے اور میری رہائش چورنگی کے قریب ایک نمبر میں تھی۔ کبھی لسبیلہ کے پل تک جاتے۔ کبھی سنسان سڑکوں پر ہی دیر تک گھومتے رہتے ۔ ایک بار کہنے لگے ''چلیے آج جمال احسانی کے گھر تک چلتے ہیں۔ سنا ہے وہ کچھ علیل ہیں۔'' جمال احسانی فیڈرل کیپٹل ایریا کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ خواجہ صاحب کے ساتھ شام کی مٹرگشت کرنے کے نتیجے میں مجھے معلوم ہو گیا کہ کہاں اچھے سیخ کباب ملتے ہیں اور کہاں تلی ہوئی مچھلی ملتی ہے۔

انھوں نے اپنے معمولات کو کچھ اصولوں سے اور اصولوں کو گھڑی سے وابستہ کر رکھا تھا۔

میرا کہنا تھا ٹائم ٹیبل کے حساب سے نوکری کی جاسکتی ہے ادبی کام نہیں کیے جاسکتے۔ ہنس کر کہا، کمال ہے آپ اپنے والد کا کہنا نہیں مانتے ۔ اتنا کہہ کر مجھے صبا صاحب کا شعر سنایا۔

ظلمت و نور نے بتایا ہے
رات اپنی ہے دن پرایا ہے

رات میں وہ دو تین گھنٹے ہی سوتے تھے۔ رات گئے تک اپنے کام کرتے۔ خط لکھنا اور آئے ہوئے خطوط کے جوابات دینے کے لیے انھوں نے دن مقرر کر رکھا تھا۔ لوگوں سے ملاقات کے لیے بھی دن مقرر تھا، البتہ جو خاص میل ملاقاتی آجائیں اُن کے ساتھ خوش طبعی کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ دوپہر کو دو تین گھنٹے ضرور آرام کرتے۔

یہ بات کئی لوگوں نے لکھی ہے کہ ٹیلی فون اُٹھا کر "فرمایئے" کہنا اُن ہی پر ختم ہے۔

اردو کے تمام ہی اہلِ قلم کے مکمل کوائف ایک خاص ترتیب سے موجود رہتے۔ جس میں متعلقہ ادیب کے خطوط اور اُن خطوں کے جواب کی کاپی بھی رکھی جاتی تھی۔

زبان کے بارے میں کوئی کیسا ہی سوال پوچھے، فوراً جواب حاضر ۔ اور حاضر جوابی کا تو میں نے ذکر کر ہی دیا ہے۔

تحقیقی کام کرنے والوں کے ساتھ مکمل تعاون بھی کرتے تھے اور ہمت افزائی بھی۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہا، غلام عباس اور قرۃ العین حیدر کے بارے میں اتنا مواد ہے کہ لوگ پی ایچ ڈی کر سکتے ہیں۔

آدمی کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت بھی ودیعت ہوئی تھی۔ بعض لوگوں کو پہلی ہی ملاقات پر یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ دوبارہ خود ہی نہیں ملتا تھا۔ بعض کو اتنا قریب کر لیتے کہ اُس کی زندگی سنور جاتی۔ ایک بار مجھ سے کہا۔ میں آپ دونوں بھائیوں سے اس لیے محبت کرتا ہوں کہ آپ بڑے سعادت مند ہیں۔

مشفق خواجہ ادبی جلسوں میں بہت ہی کم شریک ہوتے ۔ میرے اصرار پر وہ نہ صرف حضرت صبا اکبرآبادی کے اولین مجموعۂ غزل "اوراقِ گل" کی تقریب (۱۹۷۱) میں شریک ہوئے بلکہ اس کتاب پر تو "قومی زبان" میں کئی مضامین بھی شائع کیے۔ مرثیوں کے مجموعے "سربکف" (۱۹۸۰) اور دوسرے مجموعے "شہادت" کی تقریب میں بھی شرکت کی ۔ عام قسم کے ادبی جلسوں سے دور ہی رہتے۔ لیکن اگر کوئی باہر سے مہمان آتا تو اپنے گھر پر خاص احباب کو بلا کر گفتگو کی محفل سجا لیتے۔ ظ۔ انصاری، ڈاکٹر خلیق انجم، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر گیان چند کے ساتھ گھر کی خاص محفلوں میں جو لوگ شریک ہوئے، ان میں ایک میں بھی تھا ۔ اسی طرح بعض اکابر کے لیے وہ مجھ سے بھی کہتے ۔ جب مقتدرہ قومی زبان کا صدر دفتر کراچی میں تھا اور ڈاکٹر وحید قریشی اس کے صدر نشین ہو کر آئے تو مشفق خواجہ نے مجھ سے کہا ان کے لیے ایک نشست کرو۔ ناظم آباد کے گھر میں ڈاکٹر وحید قریشی، رضا ہمدانی، علی جواد زیدی، انتظار حسین اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے ساتھ جو خاص محفلیں ہوئیں ان کے محرک

خواجہ صاحب ہی ہے۔ اسی طرح جب مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن پاکستان تشریف لائے تو ریڈیو پاکستان کے ایک افسر صبیح محسن کے گھر پر ہونے والی نشست میں مجھے بھی لے گئے۔ بعد میں مولانا کو اپنے گھر پر بھی مدعو کیا۔ مشفق خواجہ کو علم کا پرستار اور ادب کا عاشق کہا جا سکتا ہے۔

مشفق خواجہ باہر سے آنے والے کسی مہمان کو اگر کسی بھی وجہ سے اپنے گھر پر نہ بلا سکتے تو ہوٹل میں کھانے پر ضرور لے جاتے۔ شروع میں ان کو کار چلانی نہیں آتی تھی تو ایسے ادیب یا شاعر کو بھی مدعو کر لیتے جس کے پاس گاڑی ہوتی۔

ایک طرف تو یہ عادت بلکہ اصول کہ ادبی جلسوں میں جانے سے گریز، دوسری طرف یہ حال کہ کسی اہلِ قلم کی بیماری کی خبر مل جائے تو عیادت کے لیے نہ صرف خود جاتے بلکہ اپنے تمام واقف کاروں سے بھی کہتے۔ کسی ادیب شاعر یا واقف کار کے انتقال کی خبر مل جانے پر لازماً شریک ہوتے۔ میرے والد کی رحلت پر آئے، میرے چھوٹے بھائی تاجدار عادل کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میرے اور اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کے ایک طرف لے گئے اور صبر کی تلقین کرتے کرتے خود بھی آب دیدہ ہو کر بولے، سمجھ میں نہیں آتا آپ دونوں کو کیسے تسلی دوں، آج تو مجھے بھی یہ احساس ہو رہا ہے جیسے میں ایک بار پھر یتیم ہو گیا ہوں، اتنا کہہ کر وہیں بیٹھ گئے اور ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے۔ پہلی بار میں نے اُن کو سلیم احمد کی موت پر روتے دیکھا تھا۔

بہت سے اہلِ ادب کی طرف سے شخصی دعوتوں کو قبول کر لیتے، میرے بچوں کی شادیوں میں بھی شریک ہوئے۔ ۱۹۹۸ء میں میری بڑی بیٹی کی شادی میں بھابی کے ساتھ آئے۔ نکاح کے بعد مجھے قریب بلایا اور بہت سنجیدگی کے ساتھ کہا، ''آپ ناول لکھیں — ابھی آپ لکھ سکتے ہیں۔ جب بچوں کی طرف سے ذمہ داریاں اور بڑھ جائیں گی تو وقت نہیں ملے گا۔''

ایک بار فون کیا اور پوچھا، آپ نے شیر افضل جعفری کا نام سنا ہے؟ میں ہنس دیا۔ کہنے لگے، وہ صبا صاحب سے ملنا چاہتے ہیں، میں کیمرہ لے کر آ رہا ہوں۔

روزنامہ ''جنگ'' کے مدیر محمود شام صاحب کے ساتھ اردو ادب کے ایک صاحب طرز اور ملنگ شاعر حضرت شیر افضل جعفری تشریف لائے۔ اگرچہ جعفری صاحب اور صبا صاحب کی یہ پہلی ملاقات تھی لیکن دونوں ایسے باہمی خلوص کے ساتھ ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں — ذرا دیر بعد مشفق خواجہ اپنے دو عدد کیمرے لے کر آ گئے اور بلا مبالغہ انھوں نے اس وقت تیس چالیس تصویریں اتاریں۔ ایک کیمرہ رنگین تصویروں کے لیے اور دوسرا بلیک اینڈ وائٹ کے لیے۔ یہی صورت حال علی جواد زیدی صاحب کی آمد کے وقت تھی۔ ظاہر ہے اپنے گھر پر تو وہ مہمانِ خاص کی زیادہ ہی تصاویر اتارتے۔ جب ہندوستان گئے تو وہاں حضرت مکیش اکبرآبادی، جناب مالک رام، محترمہ قرۃ العین حیدر اور اُن تمام علمی اور ادبی شخصیات جن سے ملاقات کی اُن سب سے لے کر تاج محل تک کی بے شمار تصاویر اتاری تھیں۔ اُن

میں تاج محل کی ایک تصویر تو کمال کی تھی جو مجھے دکھائی۔ بھابی آمنہ مشفق کو انھوں نے تاج محل کے سامنے ایسے بٹھایا کہ معلوم ہوتا تھا بھابی تاج محل کو چٹکی سے اٹھائے ہوئے ہیں۔ فوٹو گرافی بھی مشفق خواجہ کا ایک شوق تھا۔ اُن کے ذخیرۂ تصاویر میں بہت سے ادیبوں کی نادر و نایاب تصویریں موجود تھیں۔

جب ہندوستان گئے تو وہاں ان کی موجودگی کے دوران ہی ڈاکٹر خلیق انجم نے ''مشفق خواجہ۔ ایک مطالعہ'' کے نام سے ایک کتاب شائع کرادی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد خواجہ صاحب نے یہ کتاب مجھے بھی عنایت کی۔

ہندوستان سے انھوں نے پندرہ پندرہ بیس بیس کتابوں کے چار چھ بنڈل بذریعہ ڈاک میرے پتے پر بھیجے اور اسی طرح اپنے گھر اور قریبی عزیزوں اور دوستوں کے پتے پر کتابیں ارسال کیں۔ مشفق خواجہ کے پاس نادر و نایاب کتب کا ایک ذخیرہ ہے۔ بی بی سی ریڈیو والوں نے اپنے ایک پروگرام کو کتب خانوں سے منسوب کیا تو پاکستان میں مشفق خواجہ کے کتب خانے کا خصوصی تذکرہ کیا گیا۔

پاکستان اور ہندوستان میں جو بھی اہم کتاب شائع ہوتی، وہ مشفق خواجہ کے پاس ضرور آتی۔ کراچی کے کتب فروشوں کے پاس یہ ہدایت موجود تھی کہ جو نئی کتاب آئے اُن کو ضرور اطلاع دی جائے۔ تقریباً ہر کتب فروش کے پاس کھاتا کھلا ہوا تھا۔ باہر سے آنے والے مہمان اگر پاکستانی کتابیں خریدنے کے خواہش مند ہوتے تو مشفق خواجہ انھیں کسی بھی کتب فروش کے پاس بھیج دیتے۔ جہاں سے وہ اپنی پسندیدہ کتابیں چن کر جب قیمت پوچھتے تو کتب فروش کا جواب ہوتا، ''قیمت خواجہ صاحب نے ادا کر دی ہے۔''

کتابوں کے علاوہ بھی اُن کے پاس نادر و نایاب چیزیں موجود تھیں، مثلاً مجھے انھوں نے ایک بریف کیس دکھایا اور بتایا کہ اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ جب مولانا محمد علی جوہر پر مقدمہ چلا تھا تو وہ کراچی کے خالق دینا ہال میں اسی بریف کیس میں کچھ کاغذات لے کر آئے تھے۔

دنیا بھر سے وہ نادر و نایاب کتابوں کی مائکرو فلمیں بنوا کر منگواتے تھے۔ میرے والد کے پاس میر حسن کی مثنوی کا ایک مصور اور قلمی نسخہ تھا۔ مشفق خواجہ نے مجھ سے کہا کہ وہ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواباً عرض کیا میں لے کر آجاؤں گا۔ کہنے لگے، نہیں میں صبا صاحب سے اجازت لے کر خود دیکھنے کے لیے آؤں گا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ متواتر پندرہ بیس دن تک آتے رہے۔ اُس مثنوی میں جتنی ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویریں تھیں، ایک ایک تصویر کی پیمائش لی اور اُس مخطوطے کا تذکرہ اپنی کتاب ''جائزۂ مخطوطاتِ اردو'' میں بھی کیا۔

انھوں نے حضرت صبا اکبرآبادی کے مراثی بھی مرتب کیے ہیں۔ اس کی روداد یہ ہے کہ صبا صاحب کے مرثیوں کا پہلا مجموعہ ''سربکف'' لاہور اور کراچی کے ایک ناشر ''شیخ غلام علی اینڈ سنز'' نے شائع کیا تھا۔ دوسرا مجموعہ ہم خود شائع کرنا چاہتے تھے۔ مشورے کے لیے مشفق خواجہ کے پاس گئے، تو کہنے

لگے سب مرثیے مجھے لا دو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے پانچ، پانچ مرثیوں کے بارہ پیکٹ بنائے اور ہر پیکٹ پر ترتیب وار نمبر اور مرثیے کا پہلا مصرع لکھ کر رکھ لیے اور کہا "یہ اسی ترتیب سے شائع ہوں گے۔ سب ایک ساتھ شائع ہوں گے تو کتاب بہت ضخیم ہو جائے گی۔" میں نے کہا، پھر، بسم اللہ کیجیے۔ پہلی کتاب کا دیباچہ لکھیے۔ چناں چہ "شہادت" مشفق خواجہ نے مرتب کی۔ اس کے بعد "خونناب" اور "قرطاس الم" بھی ان ہی کی مرتب کی ہوئی ہیں۔ صبا صاحب کا کام اور کلام بے حد پسند کرتے۔ نہ صرف تمام مرثیے ان کے پاس رہے بلکہ جب "تخلیقی ادب" شائع کرنا شروع کیا تو غزلوں کے ساتھ، خصوصی طور پر آگے "یگانہ" اور "فانی" پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی اور وہ شائع کیے۔ جوش صاحب پر مضمون لکھوایا اور غالب لائبریری کے مجلے سہ ماہی "غالب" میں شائع کیا۔ سوانح اور سوانح کے ساتھ جو شخصی مضامین تھے ان سب کی فوٹو کاپی اپنے پاس رکھ لی۔ کئی شخصی مضامین مختلف رسالوں کو خود ارسال کیے۔ کسی نے اُن سے "مشورہ" کا تذکرہ کیا تو مجھ سے پوچھا، میں نے بتایا کہ جولائی ۱۹۳۶ء میں صبا صاحب نے آگرہ سے رسالہ "مشورہ" کا آگرہ نمبر شائع کیا تھا جس میں آگرہ (اکبر آباد) کی تاریخی، تجارتی، ثقافتی، اور ادبی تاریخ کو تقریباً چھ سو صفحات میں محفوظ کیا گیا ہے۔ اب مصر ہوئے کہ میں وہ نمبر مہیا کروں۔ میں نے بتایا کہ میں خود اس کی تلاش میں ہوں — جب میں اس بات کو بھول چکا تھا کہ ایک روز انھوں نے ٹیلی فون کر کے اطلاع دی کہ "مشورہ" کا وہ خاص نمبر انھوں نے حاصل کر لیا ہے اور میرے لیے ایک فوٹو کاپی بھی کرالی ہے۔ دراصل خواجہ صاحب کو سوانح اور شخصی مضامین سے خصوصی دل چسپی تھی۔ ایسی کتابیں وہ فرمائش کر کے لکھواتے اور اُن کی اشاعت میں پوری دل چسپی لیتے تھے۔

میں نے اُن کی زندگی میں ہی ایک مضمون لکھا تھا۔ اتفاق سے باتوں ہی باتوں میں خواجہ صاحب کے ہم زلف پروفیسر ذوالفقار مصطفیٰ صاحب سے ذکر کر دیا۔ تیسرے چوتھے روز میرے پاس فون آیا، دنیا جہان کی باتیں کرنے کے بعد انھوں نے کہا، بھئی میرے بارے میں کیا لکھ دیا ہے؟ میں جب اس طرح کے شخصی مضامین لکھتا ہوں تو میرے ذہن میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ اس طرح میں اُس شخصیت کے تعلق سے اپنی یادوں کو محفوظ کر دوں، یہی سبب ہے کہ میں ایک راوی یا تماشائی کے طور سے واقعات کو بیان نہیں کرتا بلکہ اُس شخصیت کے وہی پہلو میرے پیش نظر رہتے ہیں جن سے میں ذاتی طور سے واقف ہوتا ہوں، چناں چہ اُن کے اصرار پر میں وہ مضمون اُن کے پاس لے گیا۔ پہلے تو کہا سنایئے، پھر بولے، لایئے میں خود پڑھتا ہوں۔ وہ بیس پچیس صفحے کا مضمون تھا۔ بہت توجہ کے ساتھ پڑھتے رہے، صرف ایک مرتبہ چائے بنانے کے لیے باورچی خانے میں گئے اور میرے لکھے ہوئے صفحات بھی اپنے ساتھ لیتے گئے، میں نے اونچی آواز میں کہا۔ کیا میرے مضمون سے چائے بنا رہے ہیں؟ وہیں سے بولے، یادیں چائے سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ پھر میرے لیے ایک پیالی اور اپنی چائے کا خاص مگ بھر کے لائے۔

مضمون ختم کرنے کے بعد کہا۔ بہت سی باتیں درست ہونے کے باوجود لکھنے کے لیے نہیں

ہوتیں۔ جب میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ آزردہ ہوگئے ہیں تو میں نے وہیں اُس مضمون کو چاک کردیا۔ کہنے لگے، یہ آپ نے کیا کیا، دو ایک باتیں نکال دیتے۔ باقی ٹھیک تھا۔ پھر جو باتیں انھیں مناسب نہیں لگی تھیں، اُن کا ذکر کیا۔ اس کے بعد کہا، آپ نے صبا صاحب سے شعر کہنا سیکھا اور نہ مضمون لکھنا دیکھیے وہ اپنے مضامین میں شخصیت کی خوبیاں اور جس ماحول میں اس نے وقت گزارا ہے غرض وہ لکھنے کی ہر بات لکھتے ہیں لیکن تحریر کی ادبی خوبی کہیں بھی مجروح نہیں ہوتی۔

مجھے اُس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ مشفق خواجہ کے بارے میں ایک بار پھر مجھے اپنی یادوں کو آواز دینا ہوگی۔

مشتاق احمد یوسفی ہمارے زمانے کے مشہور مزاح نگار ہیں۔ میں نے چھتیس سال یونائیٹڈ بینک میں ملازمت کی ہے۔ اس بینک کے بانی، مینجنگ ڈائریکٹر اور صدر آغا حسن عابدی تھے۔ جب ۱۹۷۴ء میں بینکوں کو قومی تحویل میں لیا گیا تو یو بی ایل کا شمار ملک کے دو تین بڑے بینکوں میں ہوتا تھا۔ پہلے سویلین مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور پاکستان کے صدر ذوالفقار علی بھٹو، آغا حسن عابدی صاحب سے خوش نہیں تھے۔ آغا صاحب بہت دوراندیش بھی تھے چناں چہ انھوں نے پانچ سات برس پہلے ہی ایک بین الاقوامی بینک، بی سی سی آئی، قائم کرلیا تھا۔ جب بھٹو صاحب نے آغا صاحب کا پاسپورٹ تک ضبط کرلیا اور اُن کی جگہ آسٹریلیشیا بینک کے جنرل منیجر مشتاق احمد یوسفی صاحب کو مقرر کیا اُس وقت تک مشفق خواجہ کا یوسفی صاحب سے تعارف نہیں تھا۔ جب تین چار سال کے بعد یوسفی صاحب کو یو بی ایل سے ہٹایا گیا تو انھیں آغا صاحب کے انٹرنیشنل بینک کے لندن آفس میں رکھ لیا گیا۔ وہیں الطاف گوہر صاحب کو ''تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن'' کا انچارج بنایا گیا تھا، اور اسی تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کے تحت لندن میں ''اردو مرکز'' کے نام سے ایک ذیلی ادارہ بنا تھا جس کے روحِ رواں پاکستان ٹیلی وژن کے سابق پروڈیوسر اور پی ٹی وی کے پروگرام ''کسوٹی'' سے شہرت پانے والے معروف شاعر جناب افتخار عارف تھے۔ مشفق خواجہ کے دیرینہ مراسم ساقی فاروقی سے بھی تھے، جو عرصۂ دراز سے لندن میں مقیم تھے، پھر افتخار عارف صاحب تھے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ مشفق خواجہ سے یوسفی صاحب کے تعارف کا وسیلہ تو خامہ بگوش کے کالم ہی بنے ہوں گے مگر ذاتی ملاقات کا ذریعہ ساقی فاروقی یا افتخار عارف ہی رہے ہوں گے۔ یہ ساری تمہید اس لیے باندھی کہ ایک دن شام کو جب میں مشفق خواجہ کے گھر پہنچا تو انھوں نے دروازہ کھولتے ہی کہا، آج آپ کی ملاقات مشتاق احمد یوسفی صاحب سے کرائیں۔ کمرۂ ملاقات میں جانے سے پہلے میں نے خواجہ صاحب سے کہا، میرے تعارف میں یہ نہ بتایئے گا کہ میں بینک میں ہوں۔ خیر، میرا تعارف یوسفی صاحب سے کرایا گیا — میں خاموش بیٹھا دونوں کی باتیں سنتا رہا۔ ذرا دیر کے بعد مغرب کی اذان ہوئی۔ یوسفی صاحب نے مصلےٰ مانگا۔ مصلےٰ بچھا کے سجدے کی جگہ یوسفی صاحب نے ایک کرسی رکھی اور کرسی کی نشست پر اپنا رومال ڈالا۔ یہ سب دیکھ کر مشفق خواجہ نے کہا، اب تک آپ کرسی کو سجدہ کرتے

ہیں۔ یوسفی صاحب نے مسکرا کے بات سنی پھر فرض ادا کر کے بہت سنجیدگی سے کہا کہ وہ السر کے مریض ہیں، رکوع و سجود کے بعد ان کے معدہ میں اتنی تکلیف ہو جاتی ہے کہ کئی دن تک وہ کھانے پینے کے قابل نہیں رہتے۔ پھر یہ بھی بتایا کہ لندن میں جمعہ کی نماز ادا کرنے ایک مسجد میں گئے، ظاہر ہے بیٹھ کر پڑھنا چاہتے تھے کہ تکبیر کے فوراً بعد اُن کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک نمازی نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اُٹھا دیا۔ دو رکعت ادا کرنے کے بعد وہ دو ہفتے تک شدید تکلیف میں مبتلا رہے۔

یہ تفصیل سن کر مشفق خواجہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ ان باتوں کا علم نہیں تھا، وہ اپنا جملہ واپس لیتے ہیں۔

پھر ''سلسلہ'' قائم ہوا، جس میں ادب سے وابستہ بیوروکریٹ اور سابق بیوروکریٹ شامل ہوگئے۔ اس ''سلسلہ'' کی ایک کڑی مشفق خواجہ بھی بن گئے۔ ہر ممبر کو اپنے ساتھ ماہانہ نشست میں ایک مہمان کو لانے کی اجازت تھی، خواجہ صاحب نے مجھ سے کئی بار کہا لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا۔

مشفق خواجہ حتی الامکان تعلقات نبھانے اور انھیں قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب وہ فرسٹ ایر کے طالب علم تھے، اسی زمانے سے اُن کے مراسم استاد اختر انصاری اکبر آبادی سے تھے۔ استاد ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد منتقل ہوگئے تھے لیکن اُن سے ملنے کے لیے ہر دو ایک مہینے بعد مشفق خواجہ حیدرآباد آتے۔ اور جب کبھی استاد کراچی آتے تو خواجہ صاحب سے ملے بغیر نہیں جاتے تھے۔ جب مشفق خواجہ نے اپنا مجموعۂ کلام ''ابیات'' شائع کیا تو استاد نے ''نئی قدریں'' میں کئی مضامین لکھوا کر شائع کیے جن میں سب سے وقیع مضمون ڈاکٹر الیاس عشقی کا تھا۔

اب ایک بات اور یاد آگئی۔ اور یہ بات مجھے ہر اُس شخص کے تعلق سے یاد آتی ہے جس نے بھی مجھ سے اس سلسلے میں تھوڑا بہت تعاون کیا ہے۔ ۱۹۵۷ء سے میں نے حضرت صبا اکبر آبادی کے اس شعر پر:

چونک اُٹھا سن کے عکس کی آواز
آئنہ دیکھتا تھا آئنہ ساز

برصغیر کے تمام نام ور صاحبانِ علم و ادب کی آرا حاصل کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اسی حوالے سے ایک خط بابائے اردو کو بھی لکھا تھا۔ جس کا کوئی جواب نہیں ملا۔

جب ۱۹۵۹ء میں مشفق خواجہ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ اپنی علالت کے باعث مولوی صاحب خط کا جواب نہیں دے سکے تھے۔ میں نے کہا، اب جواب لکھوا کے بھجوا دیجیے گا۔ میری بات سن کر ہنسے اور کہا، ''ابھی لکھ کے مولوی صاحب سے دستخط کرائے دیتا ہوں، بلکہ دستخط بھی مولوی صاحب کے کیے دیتا ہوں۔'' مجھے ان کے لہجے میں اپنے لیے کچھ تمسخر سا محسوس ہوا، اس لیے بات کو ٹال گیا۔ لیکن کراچی پہنچ کر انھوں نے مجھے مولوی صاحب کا خط بھجوا دیا۔ جو ''نئی قدریں'' میں شائع

ہوا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں مجھے خیال آیا کہ مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریا بادی، علامہ نیاز فتح پوری، حضرت جوش ملیح آبادی، جناب فراق گورکھپوری، جناب فیض احمد فیض اور ڈاکٹر وزیر آغا سے لے کر جناب شان الحق حقی تک تقریباً چالیس پچاس اہم ادیبوں اور شاعروں کی آرا شائع ہو چکی ہیں۔ اس بیس بائیس سال کے عرصے میں اور بہت سے صاحبانِ علم و ادب کے قافلے میں شامل ہو کے شہرت و اعتبار کی منزل تک پہنچ چکے ہیں، اُن کی رائے سے کیوں محروم رہا جائے۔ میں نے مشفق خواجہ سے اس بارے میں بات کی تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ میری بات کی تائید کی بلکہ بہت سے مقتدر اہلِ قلم کے نام لکھوائے۔ اس موضوع سے ان کی دلچسپی کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ انجمن سے وابستگی کے زمانے میں پروفیسر شجاع احمد زیبا اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کی آرا حیدرآباد بھجوائی تھیں۔ اسی طرح ڈاکٹر وحید قریشی، علی جواد زیدی، مظفر علی سید اور ظ۔ انصاری کی رائے بھی انھی کے ذریعے حاصل ہوئی۔

ہندوستان سے ڈاکٹر تنویر علوی دوسری یا تیسری مرتبہ پاکستان تشریف لائے تو مجھے اُن کی قیام گاہ کا ٹیلی فون نمبر لکھوا کر کہا کہ ان سے شعر کی تفہیم تحریر کرنے کی بات کر لی ہے وہ لکھ دیں گے، میں ان سے رابطہ کرلوں اور جب وہ بلائیں جا کر رائے لے آؤں۔ کراچی کے دو ایک حضرات کے بارے میں جب شکایتاً میں نے کہا کہ کئی بار یاد دہانی کرا چکا ہوں، وعدہ کر لیتے ہیں کہ ہفتے عشرے میں لکھ دیں گے پھر بھول ہی جاتے ہیں، اب آپ اُن سے کہیے۔ تو مجھ سے کہا، چھوڑیے ان سے بڑے اور اہم لوگوں کی رائے آپ کے پاس موجود ہے۔

مشفق خواجہ کے ساتھ جناب حمایت علی شاعر کا بھی اصرار رہا کہ میں وہ تمام خطوط کتابی صورت میں محفوظ کردوں۔ صبا صاحب کی رحلت کے بعد میں نے اور میرے چھوٹے بھائی تاجدار نے طے کیا کہ جو بے شمار مضامین صبا صاحب کی زندگی میں اور اُن کی رحلت کے بعد مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں کیوں نہ ایک کتاب کی صورت میں یک جا کر دیے جائیں، مشورے کے لیے مشفق خواجہ کے پاس پہنچے۔ منع کر دیا۔ کہا، صبا صاحب کا اتنا کام ہے پہلے وہ شائع کرایے۔

کتاب سے بہت زیادہ عشق تھا اور سگریٹ پینے کا بہت زیادہ شوق۔ ملک کے باہر سے آنے والے بے تکلف احباب سے کسی کتاب لانے کی فرمائش کرتے یا پھر سگریٹ کی۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بے شمار ضرورت مندوں کی بہت چپ چپاتے مدد کرتے۔ اکادمی ادبیات یا دوسرے رفاہی اداروں کے ذریعے مدد کرانے میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔

مجھے یہ بات معلوم نہیں کہ خامہ بگوش کے نام سے اُن کو کالم لکھنے کا معاوضہ ملتا تھا یا نہیں۔ لیکن اپنے نام سے انھوں نے ریڈیو پاکستان کراچی کے لیے بے شمار پروگرام تحریر کیے۔ کئی سیریز کئی برس تک ''مسلمان سیاح'' کے نام سے لکھیں جو عالمی سروس سے نشر ہوئیں۔

''تخلیقی ادب'' کی اشاعت سے پہلے ایک اشاعتی ادارہ ''مکتبۂ اسلوب'' کے نام سے قائم کیا

تھا۔ اس ادارے کی جانب سے بہت سی کتابیں شائع کیں۔ لکھنے والوں کو معاوضہ بھی ادا کیا۔ مگر یہ گھاٹے کا سودا کب تک کرتے۔ ادب کے فروغ کی جتنی خواہش تھی، اس کے مقابلے میں تاجرانہ ذہنیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ چناں چہ بہت سے مسودے اشاعتی اداروں کو دے دیے، جنھوں نے سلیم احمد، علی جواد زیدی، ممتاز شیریں سے لے کر جگن ناتھ آزاد اور انور سدید تک کی کتابیں شائع کیں۔ جو کتابیں خود مشفق خواجہ نے شائع کی تھیں وہ بھی اونے پونے دام پر کتب فروشوں کو دے دیں۔

اکتوبر ۲۰۰۳ء کے آخر میں پاکستان آیا تو معلوم ہوا شدید علیل ہیں اور ناظم آباد سے کلفٹن کے فلیٹ میں منتقل ہو گئے ہیں۔ میں نے اُن کے جناب ذوالفقار مصطفیٰ سے کہا، انھوں نے بھی بتایا کہ ابھی ڈاکٹروں نے میل ملاقات پر پابندی لگا رکھی ہے لیکن آپ کے لیے انھوں نے کہا ہے کہ موبائل فون نمبر دے دیا جائے۔ میں نے ایک بار فون کیا تو بتایا گیا سو رہے ہیں، دوسری مرتبہ بھی یہی جواب ملا کہ آرام کر رہے ہیں۔ طبیعت معلوم کرنے پر کہا گیا، ٹھیک نہیں ہے، ڈاکٹروں نے آرام بتایا ہے۔

میری والدہ بھی علیل تھیں، اُن ہی کی وجہ سے میں پاکستان آیا تھا۔ دسمبر ۲۰۰۳ء کی سولھویں تاریخ کو والدہ کی دعاؤں کی چھاؤں سے نکل کر دنیا کی دھوپ میں کھڑے رہ گئے۔ مشفق خواجہ کو اخباروں کے ذریعے ہم پر گزرنے والے سانحے کی اطلاع جب پہنچی تو مجھے تعزیتی ٹیلی فون کیا، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہمارے مراسم ایسے نہیں ہیں کہ اہم باتوں سے بے خبر رکھا جائے۔ مجھے یہ اطلاع اخبار سے نہیں آپ کے خانوادے کی طرف سے ملنا چاہیے تھی۔ میں نے کہا، تم خود ایسے بیمار تھے کہ ٹیلی فون پر بات نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک روز ٹیلی فون آیا کہ وہ اپنے ناظم آباد والے گھر آگئے ہیں، اب ملاقات ہونا چاہیے۔ میں ایک شام کو پہنچ گیا۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن صورت سے اضمحلال ظاہر ہو رہا تھا۔ سگریٹ چھوٹ گیا تھا۔ کھانے میں اس حد تک احتیاط ہو رہی تھی کہ 'سوپ' پر گزارا تھا۔ مگر لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ غالب لائبریری کی طرف بھی پوری توجہ تھی۔ ادارۂ یادگارِ غالب کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں پر وہ ٹیلی وژن پر تبصرہ کرانا چاہتے تھے۔ میں نے کہا، وہ خود اگر تاجدار کو ٹیلی فون کر دیتے تو اب تک تبصرہ ہو بھی چکا ہوتا۔

میرے پاکستان میں قیام کے دوران تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ سہ ماہی ''سیپ'' میں شائع ہونے والے میرے لکھے ہوئے مضامین اُن کی نظر سے گزرے تھے۔ اختر انصاری اکبر آبادی اور کرار نوری والے مضمون کی خصوصی طور پر تعریف کی۔

کینیڈا آنے کے بعد بھی ٹیلی فون پر رابطہ رہا۔

جنوری ۲۰۰۵ء کے دوسرے ہفتے کی کسی تاریخ کو میں نے ٹیلی فون کیا اور باتوں کے علاوہ یہ

بھی کہا کہ خامہ بگوش کی دو کتابوں پر میں نے ''ڈان'' میں تبصرہ دیکھا ہے، ایک صاحب کینیڈا آنے والے ہیں یہ کتابیں اپنے دستخطوں کے ساتھ میرے گھر بھجوا دیجیے۔ انھوں نے ان دونوں کتابوں کے ساتھ ادارہ یادگارِ غالب کی طرف سے شائع ہونے والی ایک کتاب ''میرے جیون کی کچھ یادیں'' میرے کراچی کے غریب خانے پر پہنچوادی۔

محرم کی گیارہویں ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۱؍ فروری ۲۰۰۵ء کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ ۱۹؍ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہونے والے خواجہ عبدالحئی اس دنیا سے گزر گئے۔

میرا اُٹھ جانا ضروری تھا مگر
آپ کی محفل تو خالی ہو گئی
(صبا اکبرآبادی)

☆☆☆

معین الدین عقیل

مشفق خواجہ کے آخری دس دن

مشفق خواجہ سے اپنے پینتیس سالہ روابط اور ان کی نوعیت کے لحاظ سے مجھ پر ایک قرض ہے کہ جسے مجھے ادا کرنا ہے لیکن یہ کچھ آسان نہیں۔ ہمارے درمیان تعلقات کی کئی جہتیں تھیں۔ میرے لیے وہ ایک بزرگ بھی تھے، ایک دوست بھی اور ایک بھائی بھی۔ ان میں سے ہر ایک کی حیثیت اپنی علاحدہ اور خاص نوعیت کی حامل رہی۔ ان پینتیس سالوں کے یہ تعلقات کبھی اس قدر قریبی بھی رہے کہ ایک عرصے تک شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب ہماری ملاقات نہ ہوئی ہو۔ پھر کچھ میری بڑھتی ہوئی مصروفیات، کچھ ان کی مصروفیات، پھر میری ملک سے تقریباً نو سال کی غیر حاضری — اور پھر کچھ دیگر اسباب کہ روابط مستقل اور متواتر نہ رہ سکتے تھے، نہ رہے۔ انتہائی قرب کے مذکورہ عرصے میں شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جس قدر ربط و موانست ان کے ساتھ مجھے حاصل رہی، وہ اس طرح شاید کسی کو حاصل نہ تھی۔ اب ان دنوں کی تفصیلات حافظے میں یک جا کرنا چاہوں تو شاید تمام جزئیات کا مکمل احاطہ نہ ہو سکے۔ لیکن یہ قرض بہ ہرحال ادا کرنا ہے کہ جو مرحوم کے چاہنے والوں اور جاننے والوں اور ان کی شخصیت و خدمات کا مطالعہ کرنے والوں کا مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ فی الوقت ان سطور کو مرحوم کی زندگی کے محض آخری دس دنوں تک محدود رکھتا ہوں۔

جاپان میں اپنے سات سالہ قیام کے بعد اپریل ۲۰۰۰ء میں میری وطن واپسی کے بعد مشفق خواجہ سے میری ملاقاتیں، واپسی کے بعد کے مسائل اور یہاں میری روز افزوں نجی اور منصبی مصروفیات اور ذمے داریوں کے باعث تواتر اور تسلسل کے ساتھ نہ رہیں۔ زیادہ تر رابطہ ٹیلی فون پر ہوتا رہا اور کم ہی ایسا ہوتا کہ محض علیک سلیک کے لیے فون کیے گئے ہوں، دونوں ہی جانب سے ان کا ایک خاص محرک رہی حال احوال اور مزاج پرسی سے بڑھ کر کسی واقعے، شخص یا ادبی استفسار یا پیغام رسانی پر مبنی رہتا یا پھر مرحوم کی جانب سے اپنے کسی موضوعِ مطالعہ کے تعلق سے کسی ماخذ کے بارے میں یہ معلوم کرنے پر مشتمل ہوتا کہ آیا وہ میرے کتب خانے میں موجود تو نہیں؟ اگر ہے تو مرحوم اس کی مطلوبہ تفصیلات دریافت کرتے یا

تصدیق چاہتے کہ فلاں صفحے پر کیا یہ عبارت موجود ہے؟ یا وہ عبارت کیا ہے؟ یا فلاں فلاں موضوع یا رجال پر آپ کے پاس کیا مواد اور مآخذ موجود ہیں؟ یہ استفسار وہ اس لیے کرتے کہ یا تو مطلوبہ مآخذ ان کے پاس نہ ہوتے یا اگر ہوتے تو چوں کہ ان کے ذخیرے میں کتابیں بہت زیادہ ترتیب سے نہیں تھیں جس کی وجہ سے مطلوبہ ماخذ یا کتاب تک فوری رسائی اس وقت ان کے لیے ممکن نہ ہوتی یا وقت کے اس پہر، بالعموم رات گئے، ان کا کوئی کارندہ موجود نہ ہوتا کہ وہ مطلوبہ کتاب ان کو نکال کر لا دیتا۔ میرے ذخیرے میں بالعموم کتاب کی تلاش، خاصی تعداد میں ہونے کے باوجود، قدرے آسان اور ممکن ہے اس لیے میرے بعض دیگر بزرگوں، احباب اور جانے ان جانے اسکالرز کی طرح، خواجہ صاحب بھی فوری معلومات کی طلب میں بارہا ایسا کرلیا کرتے تھے۔ مجھے اس طرح یک گونہ خوشی ہی ہوتی۔ برسا برس سے، جب سے خواجہ صاحب کے ہاں کتابوں کی بہتات ان کے قابو اور ان کی دسترس سے باہر ہونے لگی تھیں، ان کا یہ معمول سا ہوگیا تھا۔ خصوصاً آخری چند مہینوں میں، جب وہ اپنے والد کے روزنامچے "یادِ ایام" کے حواشی اور تعلیقات کو آخری شکل دے رہے تھے، وہ ان کے لیے مآخذ کی جستجو اور تصدیق کے لیے مجھ سے بار بار رجوع کرتے رہے۔

ہمارے درمیان فون پر اس طرح کا رابطہ ہر دو تین دن میں ضرور ہوتا یا کبھی کبھی روز بھی اور کبھی تو دن میں کئی کئی بار بھی ہوتا۔ دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے جب یاد آتا ہے کہ ۱۸رفروری ۲۰۰۵ء کی رات فون پر ان سے آخری بار گفتگو ہوئی تھی۔ یہی آخری رات بھی تھی جو انھوں نے اپنے گھر میں گزاری تھی۔ اس سے اگلی رات ۱۹رفروری کو وہ اپنے سفرِ آخرت کے لیے اسپتال لے جائے گئے، جہاں ۲۱ر کی رات انھوں نے انتقال کیا (اور ۲۲ر کی دوپہر تدفین عمل میں آئی)۔ ۱۸رفروری کی رات انھوں نے مجھے فون کیا، "کیا آپ کے پاس Clive Dewey کی کتاب "The Settlment Literature of Pubjab" ہے؟ میں نے اس کا حوالہ کہیں سے نقل کیا ہے۔" میں نے جواب دیا کہ اس موضوع پر ایک کتاب میرے پاس موجود تو ہے لیکن مصنف یہی ہے یا کوئی اور، دیکھ کر بتاتا ہوں۔ میں نے ریسیور کان سے لگائے اس طرح جا کر متعلقہ کمرے اور متعلقہ الماری میں جلد ہی وہ کتاب نکال لی، کیوں کہ اس کی جسامت اور رنگ مجھے یاد تھا۔ کتاب ہاتھ میں لے کر دیکھی تو مصنف Dewey ہی تھا۔ میں نے کہا، جی ہاں کتاب ہے اور اسی مصنف کی ہے۔ اس پر خواجہ صاحب کہنے لگے کہ کیا اس میں اشاریہ موجود ہے؟ میں نے دیکھا اور کہا، جی نہیں، اشاریہ شامل نہیں ہے۔ کہنے لگے، "اگر اشاریہ ہوتا تو بڑی آسانی ہوتی۔ میں نے اپنے نوٹس میں لکھ رکھا ہے کہ اس میں سرکاری دستاویزات اور مطبوعات کی فہرستیں شامل ہیں۔ مجھے قانونی کتابوں میں سے اس کتاب کا نام تلاش کرنا ہے جس میں وہ قانون موجود ہو جس کے حوالے "رنگیلا رسول" کے مقدمے میں آتے ہیں۔ مجھے قانون کا حوالہ تو مل گیا ہے لیکن اس کا متن بھی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے پوچھا، "خواجہ صاحب کس لیے آپ کو اس کی ضرورت پڑ گئی؟" کہنے لگے،

''میرے والد کی ڈائری میں ایک جگہ اس کا تذکرہ آیا ہے، اس لیے میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا، ''اس وقت تو دیکھنا مشکل ہے، میں اتوار کو وقت نکال کر دیکھ لوں گا اور آپ کو بتا دوں گا۔'' افسوس، اتوار کا دن آیا لیکن مجھے اس وقت دیکھنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ طلب گار بسترِ مرگ پر پڑا تھا اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ اب اس کی واپسی وہاں سے ممکن نہیں!

کچھ ہی دیر بعد خواجہ صاحب نے دوبارہ فون کیا، ''آپ نے مجھے پنجاب پر جاپان سے ایک کتاب کی فوٹو اسٹیٹ بھجوائی تھی۔ اس میں میرے کام کی کئی باتیں ہیں لیکن کچھ مطلوبہ لوگوں کے بارے میں اس میں تلاش کرنا بہت مشکل ہے کیوں کہ اس میں آپ نے اشاریہ کے صفحات کاپی نہیں کروائے، کیا اس کتاب میں اشاریہ نہیں تھا؟'' مجھے یاد نہ آیا کہ میں نے کون سی کتاب بھیجی تھی، جس کا ذکر خواجہ صاحب کر رہے ہیں۔ ٹوکیو میں رہتے ہوئے وہاں یونی ورسٹی کے کتب خانے میں متعدد ایسی کتابیں اپنی دل چسپی کے موضوعات پر اردو اور انگریزی زبانوں میں دیکھنے میں آئیں جو کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آئی تھیں اور پھر وہاں کتابوں کی دکانوں میں، جہاں مغربی زبانوں کی کتابیں فروخت کے لیے آتی تھیں، تازہ ترین کتابیں امریکا، برطانیہ اور بھارت سے آتی رہتی تھیں۔ ایسی اہم کتابیں جو یا تو میں خرید لیتا تھا یا یونی ورسٹی کے کتب خانے سے لے کر فوٹو اسٹیٹ کر لیتا تھا اور چوں کہ یونی ورسٹی کے اساتذہ کو فوٹو اسٹیٹ کی ہر طرح کی سہولت مفت میسر تھی اس لیے میں نے خاصی بڑی تعداد میں کتابوں کے نہ صرف اپنے لیے عکس بنوائے بلکہ بعض کی مزید نقلیں تیار کر کے اپنے خاص دوستوں کو ان کی دل چسپی اور ضرورت کے مطابق وہاں سے تحفتاً بھیجتا رہتا تھا۔ ایسی کچھ کتابیں میں نے خواجہ صاحب کو بھی بھیجی تھیں۔ اس وقت یاد نہ آیا کہ خواجہ صاحب کس کتاب کا ذکر کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کتاب پنجاب کے مذہب اور سیاست پر ہے اور انگریزی میں ہے۔ اس میں ''رنگیلا رسول'' کے ردِعمل میں ہونے والے واقعات کا ذکر بھی ہے۔ پھر انھوں نے کتاب دیکھ کر نام بتایا کہ "Relegion and Politics in the Punjab" ہے۔ میں نے کہا، ایسا بھی نہیں کہ کتاب میں اشاریہ ہو اور میں اس کا عکس نہ بناؤں۔ میں نے اسی وقت متعلقہ الماری کے پاس جا کر دیکھا، تلاش کیا تو کتاب جلد ہی مل گئی۔ میں نے دیکھا تو خود میرے پاس کتاب اصل نہیں، بلکہ اس کا عکس تھا۔ آخر میں دیکھا تو واقعی اس میں اشاریہ نہیں تھا۔ پھر میں نے ابتدائی اوراق کو دیکھا کہ فہرست سے پتا چلے کہ اس میں اشاریہ تھا یا نہیں، تو پتا چلا وہ عکس مطبوعہ کتاب کا نہیں بلکہ پی ایچ ڈی کے ایک مقالے کی ٹائپ شدہ نقل پر مبنی تھا۔ اس لیے اس میں اشاریہ شامل نہیں تھا۔ میں نے خواجہ صاحب کو بتایا تو انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اشاریہ ہوتا تو مطلوبہ معلومات تلاش کرنا آسان ہو جاتا۔ اب سارے اوراق دیکھنے پڑیں گے۔ کتاب بہت عمدہ ہے۔ اس کے بعد گفتگو ختم ہو گئی۔ گفتگو کے اختتام کے ساتھ ہی وہ آواز بھی بند ہو گئی جو میں نے پھر کبھی نہ سنی۔ بس اس کے چار دن بعد انھیں دیکھا تو وہ خاموش اور ساکت تھے۔ آنکھیں بند، رنگ زرد اور چہرہ سپاٹ، کفن میں لپٹے اپنی ہی

قبر کے کنارے، جب ان کا آخری دیدار ہو رہا تھا۔

فون پر ان سے آخری گفتگو اور پھر آخری دیدار، خواجہ صاحب کے تعلق سے میری سماعت اور بصارت کے وہ آخری تجربے ہیں، جو میرے حافظے اور احساس سے شاید کبھی محو نہ ہو سکیں۔ وہ منظر اور وہ ماحول بڑا رقت انگیز تھا۔ ضبط اور برداشت کا کرب ہر ایک کے چہرے سے عیاں تھا۔ اس وقت میرے قریب کون کون تھا، کسی کا چہرہ نظروں میں نہیں۔ اورنگ زیب عالم گیر اس لیے نظروں میں ہیں کہ وہ اس خبر کو سن کر تڑپ کر لاہور سے پہنچے تھے اور نماز ظہر اور نماز جنازہ میں میرے قریب تھے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کو کہیں قریب ہی دیکھا تھا، وہ اور ان کا جسم پہلی بار مجھے کچھ خمیدہ نظر آیا۔ جو اگرچہ ضعف و کم زوری کے باعث بھی تھا لیکن اس وقت دکھ اور الم کے بوجھ سے جھکا جھکا نظر آ رہا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا، چالیس پینتالیس سال کی رفاقت اور ایک طویل عرصے تک صبح و شام کا ساتھ، بے حد قریبی روابط اور رفاقت — یہ اثر تو ہونا تھا ان پر۔ میرے ساتھ اظہر الحق حقی کھڑے تھے، جو خواجہ صاحب کے ساتھ اپنا کوئی ادبی اور علمی حوالہ نہ ہونے کے باوجود، مجھ سے متعلق رہنے، تدریس میں ہم پیشہ ہونے کے باعث، مجھ سے ملنے کے لیے روز ہی غالب لائبریری آتے رہتے اور خواجہ صاحب سے متعارف ہونے کے بعد خواجہ صاحب کے اس حد تک قریب آ گئے تھے کہ ہم تینوں نے باہم بہت خوش گوار وقت ساتھ ساتھ گزارا اور سفر ساتھ اختیار کیے۔ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہنے والا شخص، خواجہ صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے اپنے لمحات کا ذکر کر کر کے اپنی افسردگی اور اپنے دکھ کو چھپا نہ پا رہا تھا۔

وہاں سے واپسی میں میرے ہمراہ ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر اور اظہر حقی تھے، گفتگو ان سے ہو رہی تھی لیکن میرے ذہن میں ڈاکٹر اقبال علی خان کے کہے ہوئے، الفاظ گونج رہے تھے اور اب تک، جب بھی خواجہ صاحب کی رحلت کا ذکر آتا ہے، ان کی یاد آتی ہے تو پھر گونجنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال علی خان، مشفق خواجہ کے معالج تھے۔ میرے ایک ہم زلف ڈاکٹر سید جعفر علی ہاشمی ان سے خواجہ صاحب کے تعارف کا وسیلہ بنے تھے۔ ڈاکٹر ہاشمی کراچی میونسپل کارپوریشن میں چیف میڈیکل آفیسر تھے اور کارپوریشن کے تمام اسپتال اور ان سے منسلک ڈاکٹر ان کے دائرۂ اثر میں آتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال علی خاں ان کے دیرینہ دوست اور رفیقِ کار تھے۔ خواجہ صاحب کو ڈاکٹر ہاشمی نے ایک دن مجبور کیا کہ وہ اپنا طبی معائنہ کرائیں۔ یہ کوئی پچیس سال قبل کی بات ہے۔ معائنہ ہوا تو معلوم ہوا خواجہ صاحب ذیابیطس میں نہ صرف مبتلا ہیں بلکہ کافی عرصے سے اس کا شکار ہیں۔ معائنے کے وقت میں خواجہ صاحب کے ساتھ ہی تھا۔ نتیجہ اسی وقت معلوم ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس ناگہانی اطلاع سے خواجہ صاحب کے چہرے پر فکرمندی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس کے بعد سے وہ اپنی صحت کی طرف سے بہت محتاط رہنے لگے تھے اور غذا میں حد درجہ احتیاط برتنے لگے تھے۔ کھانے کے معاملے میں ویسے وہ بہت خوش ذوق، خوش خوراک اور انواع و اقسام کے کھانے پسند کرتے تھے۔ گوشت انھیں بہت مرغوب تھا اور کباب بہت شوق سے کھاتے تھے۔ آموں کے بھی

رسیا تھے اور خود اعتراف کرتے تھے کہ کلو دو کلو آم ایک نشست میں کھانا ان کے لیے غیر معمولی نہ تھا۔ لیکن اب انھیں جس قدر محتاط ہوتے دیکھا، ایسا کم ہی کسی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کھانوں کے معاملے میں ایسا خوش ذوق اور خوش خوراک شخص آخری برسوں میں ایسے بے رونق اور بے مزہ کھانوں پر گزارا کرنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔

ڈاکٹر اقبال علی خاں کو، اپنے مشغلۂ طب کے ساتھ ساتھ، تصوف اور معاملات روحانی کے مطالعے کا بڑا شغف ہے اور وہ جامعہ عثمانیہ میں اسلامیات کے پروفیسر اور وہاں کے مشہور عالم ومفسر اور صوفی مولانا عبدالقدیر صدیقی حسرت سے بیعت ہیں۔ خواجہ صاحب کے انتقال کی اطلاع پر انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ خواجہ صاحب اکثر انھیں فون کرتے اور ان سے علاج معالجے کے ساتھ ساتھ معاملات روحانی اور تصوف کے موضوعات پر بھی گفتگو کیا کرتے تھے۔ انتقال سے چند ہی دن پہلے انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تھا، "ڈاکٹر صاحب مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟" ڈاکٹر اقبال علی خاں سے یہ بات سن کر میں سناٹے میں آگیا تھا۔ تدفین سے واپسی کے بعد بار بار مجھے خواجہ صاحب کا یہ جملہ یاد آتا رہا اور اب بھی چونکاتا رہتا ہے۔ انسان کو وقت پر شاید احساس ہونے لگتا ہے کہ اب اس کی روانگی کا وقت قریب آگیا ہے۔

اپنے انتقال سے صرف چار دن قبل، ۱۷ رفروری کو خواجہ صاحب نے "ادارۂ یادگار غالب" اور غالب لائبریری کی مجلس منتظمہ کا ایک انتظامی اور ہنگامی نوعیت کا اجلاس منعقد کیا تھا۔ غالب لائبریری سے اپنی وابستگی اور ذمے دارانہ حیثیت سنبھالنے کے بعد، جس کا دور مرزا ظفر الحسن، بانی و معتمد عمومی ادارۂ یادگار غالب کے انتقال ۱۹۸۴ء کے بعد شروع ہوتا ہے، یہ اپنی نوعیت کا منفرد اور پہلا اجلاس تھا۔ یہ ان کے مزاج میں نہ تھا کہ وہ ایسا کوئی اجلاس خود بلائیں اور اس میں شرکت بھی کریں۔ بیگم آمنہ مجید ملک، جو فیض احمد فیض کے بعد اس ادارے کی صدارت پر فائز تھیں، جب تک حیات رہیں ادارے کی مجلس انتظامیہ کے اجلاس جو بہت طول وطویل عرصے کے بعد کہیں ان کے گھر پر منعقد ہوتے تھے، بلکہ برسوں سے یہ سلسلہ بھی منقطع ہو چکا تھا، خواجہ صاحب ان میں بھی بمشکل شریک ہوتے تھے۔ رسمی فیصلے کبھی مجلس انتظامیہ کے اجلاس میں کیے تو جاتے لیکن مرزا صاحب کے انتقال کے بعد دراصل خواجہ صاحب ہی تنہا ادارے اور غالب لائبریری کے معاملات سنبھالے ہوئے تھے۔ بیگم مجید ملک کے انتقال کے بعد خواجہ صاحب نے بہت سوچ بچار کے بعد ان کی جگہ فاطمہ ثریا بجیا کو صدر منتخب کرنے کا ارادہ کیا اور اس ضمن میں متعدد دوستوں سے بھی مشورہ کیا۔ سب ہی نے خواجہ صاحب کے اس انتخاب کو متعدد وجوہات کے باعث پسند کیا۔ چناں چہ بجیا کو صدر منتخب کرلیا گیا۔ اب اس فیصلے کے بعد ضروری ہوگیا تھا کہ بجیا سے مجلس انتظامیہ کے اراکین کے تعارف اور ادارے کے انتظامات اور معاملات طے کرنے کے لیے مجلس انتظامیہ کا ایک اجلاس بلایا جائے۔ اس طرح ۱۷ رفروری کو غالب لائبریری میں اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں ایک بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ یہ غالب لائبریری کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ اس کی مجلس انتظامیہ کے

اجلاس میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ پہلی مرتبہ کسی اجلاس میں، میں نے خواجہ صاحب کو اس حد تک فعال ہوتے، کارروائی کا اہتمام کرتے، گفتگو کا آغاز کرتے بلکہ گفتگو کو آگے بڑھاتے، غرض ساری کارروائی انجام دیتے دیکھا۔ یہ ساری باتیں غیر معمولی تھیں۔ اب یہ ساری باتیں یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے یہ اجلاس کسی پوشیدہ احساس کے بغیر منعقد نہیں ہوا تھا۔ خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ ان کی زندگی ہی میں لائبریری کے بارے میں کوئی اطمینان بخش فیصلہ اور انتظام ہوجائے اور اس کا مستقبل محفوظ ہوجائے۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے اور جب سے میں جاپان سے وطن واپس آیا تھا، بہ تکرار کہنے لگے تھے کہ "غالب لائبریری کو دیکھنا ہے۔ غالب لائبریری کے لیے وقت نکالیے۔ جتنا آپ اسے جانتے اور سمجھتے ہیں، کوئی اور نہیں سمجھتا۔ آپ اس کا حصہ رہے ہیں، آپ اس کو سنبھالیے —" بدقسمتی سے وطن واپسی کے بعد سے، بلکہ ۱۹۸۶ء میں نیپلز کی جامعہ علوم شرقیہ سے منسلک ہوکر جانے اور پھر وہاں سے واپسی کے بعد ۱۹۹۳ء میں جاپان چلے جانے اور اس طرح کل ۹؍سال باہر گزارنے کی وجہ سے اور پھر آنے جانے کے آس پاس کے وقتوں میں اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث میں غالب لائبریری کو مناسب وقت نہیں دے سکا تھا۔ اب خواجہ صاحب کا یہ اصرار میرے لیے شرمندگی کا سبب بن رہا تھا۔ کہاں وہ وقت تھا کہ برسا برس تک روز غالب لائبریری جاتا، مرزا ظفر الحسن مرحوم کے ساتھ شریک کار رہتا، لائبریری کے تمام علمی اور کتاب داری کے معاملات انجام دیتا اور کہاں یہ وقت کہ خواجہ صاحب کو وہ وقت یاد دلانا پڑ رہا تھا۔

اُس زمانے میں خواجہ صاحب بھی بالعموم ہر شام دن بھر اپنے کاموں سے تھک تھکا کر، تازہ ہوا کھانے، پیدل چلنے کی ضرورت پوری کرنے، جو ذیابیطس لاحق ہونے کے انکشاف کے بعد انھوں نے اپنے لیے لازم کرلی تھی، لائبریری آجایا کرتے تھے۔ وہ آتے تو پھر مرزا صاحب اور میں اپنے اپنے کام ختم کرکے سیڑھیوں کے بالائی سرے پر دروازے کے عین مقابل کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے اور پرلطف وقت گزارتے۔ مگر افسوس مرزا صاحب کے انتقال کے بعد یہ صحبتیں ختم ہوگئیں، بلکہ لائبریری ہی ویران ہو کر رہ گئی۔ ورنہ اس زمانے میں اسے شہر کے ایک بارونق ادبی و ثقافتی مرکز کی سی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ مرزا صاحب کے بعد جیسے تیسے خواجہ صاحب نے اسے سنبھالے رکھا اور تن تنہا سارے انتظامی امور، علمی امور انجام دینے شروع کیے اور بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ لیکن اب لگا کہ انھیں احساس ہوگیا تھا کہ وہ جلد ہی زندگی کی بساط ہار رہے ہیں، انھیں لائبریری کے لیے کچھ ایسا انتظام کرنا ہے جو اسے قائم بھی رکھ سکے اور اسے حیاتِ تازہ بھی دے سکے۔ اس اجلاس کے بعد افسوس خواجہ صاحب کو اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ وہ اپنے فیصلوں کو عملی صورت اختیار کرتا ہوا دیکھ سکتے۔ وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔

ایک اور موقعے پر مجھے لگا کہ خواجہ صاحب اپنی زندگی سے بہت پرامید نہ رہے تھے۔ ہوا

یوں کہ اپنے انتقال سے محض دس دن قبل ۱۰ ارفروری کو ان کے ایک نوجوان جاپانی نیاز مند اور میرے ایک دیرینہ دوست سویامانے جو اوساکا یونی ورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں اردو کے استاد، مترجم اور محقق ہیں، کراچی آئے۔ وہ جب بھی کراچی آتے خواجہ صاحب سے ضرور ملتے اور معیت میری اختیار کرتے۔ اس بار خواجہ صاحب سے ان کی یہ آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ کافی دیر ہم دونوں خواجہ صاحب کے ساتھ رہے اور متعدد موضوعات پر پُرلطف اور معلوماتی گفتگو رہی۔ یامانے صاحب بھی بہت مجلسی اور خوش گفتار آدمی ہیں، چناں چہ محفل سارا وقت زعفران زار رہی۔ دورانِ گفتگو خواجہ صاحب نے جاپان میں میرے پیش رو ــــ کا ذکر چھیڑ دیا۔ یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا کہ جب بھی جاپان میں پاکستان سے جانے والے اردو اساتذہ کا ذکر آتا خواجہ صاحب اس شخص کی بداخلاقیوں اور دست درازیوں کا ذکر ضرور چھیڑ دیتے اور مزید تفصیلات کریدتے رہتے۔ یا اگر محفل میں اُن جان لوگ بھی موجود ہوں تو ان سے اُن صاحب کا اور ان کی مذکورہ حرکتوں کا تعارف مزے لے لے کر کراتے۔ ان کے جاپانی نیاز مندوں نے انھیں ان صاحب کے بارے میں جو کچھ سنایا تھا، وہ اس پر بہ ظاہر تو لطف سا لیتے لیکن پھر تاسف کا اظہار بھی مختلف پہلوؤں سے کرتے جاتے۔ اس شخص سے انھیں اس لیے بھی چڑ سی ہوگئی تھی کہ اس نے ان کے ایک مقالے سے اسی موضوع پر اپنے مقالے میں اعلانیہ سرقہ کرلیا تھا، جس پر خواجہ صاحب نے شدید احتجاج بھی کیا اور ہمیشہ اپنی برہمی ظاہر کرتے رہتے تھے۔ اس برہمی ہی کا شاید یہ ایک انداز تھا کہ وہ موقع ملتے ہی اس شخص کی اس علمی بددیانتی اور جاپان میں اس کی بدچلنیوں کا ذکر ضرور چھیڑ دیتے۔ چناں چہ اس ملاقات میں بھی اس شخص کا اور اس کے کرتوتوں کا ذکر رہا۔ اس ضمن میں یامانے صاحب نے ایک اور انکشاف، جو میرے لیے نیا نہ تھا، خواجہ صاحب کے سامنے یہ کیا کہ موصوف نے ٹیکس کی مد میں جاپانی حکومت کے بقایاجات بھی آخر میں ادا نہیں کیے اور چپ چاپ واپس آگئے۔

جب محفل برخاست ہونے لگی تو خواجہ صاحب نے یامانے صاحب کو رخصتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا، ''آپ ہر بار آتے ہیں، یہ آپ کی محبت ہے اور آپ تحفوں سے بھی نوازتے ہیں، اب معلوم نہیں آپ سے پھر ملاقات کب ہو، ہوتی بھی ہے یا نہیں۔'' معلوم نہیں یامانے صاحب نے اس جملے کا کیا اثر لیا ہو یا انھوں نے اس کی معنویت پر غور بھی کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن میں بہت دل گرفتہ ہوا۔ جب خواجہ صاحب کا انتقال ہوا اور اخبارات اور ٹی وی سے خبریں نشر ہوئیں تو جاپان میں بھی اسی دن اردو والوں میں اطلاع عام ہوگئی۔ کیوں کہ وہ لوگ بالعموم روز ہی انٹرنیٹ پر اردو اور انگریزی اخبار پڑھتے ہیں۔ تدفین کے دوسرے دن ۲۳ ر فروری کی صبح یامانے صاحب نے اوساکا سے مجھے فون کیا اور تقریباً روتے روتے بہ مشکل کہہ سکے، ''خواجہ صاحب بھی چلے گئے۔'' یہ ''بھی'' کا لفظ انھوں نے اس تسلسل میں استعمال کیا تھا کہ کچھ ہی دن قبل جاپان میں اردو کے ایک محسن پروفیسر سوزوکی تاکیشی کا انتقال ہوا تھا۔ اسی دن فون کرکے یامانے صاحب نے مجھے اطلاع دیتے ہوئے بھرائی ہوئی اور گلوگیر آواز میں مجھ سے کہا

تھا کہ "آج سوزوکی صاحب کا انتقال ہوگیا، وہ چلے گئے، ہم کو چھوڑ کر چلے گئے۔" اگرچہ یامانے صاحب ان کے شاگرد نہیں تھے لیکن اس بنیاد پر کہ سوزوکی صاحب جاپان میں "بابائے اردو" سمجھے جاتے تھے اور یامانے صاحب کو ان سے اور ہر اردو والے سے بہت محبت اور عقیدت ہے۔ سوزوکی صاحب کے دکھ میں ہم دونوں برابر کے شریک تھے۔ یامانے صاحب نے ان کی رحلت کا بڑا گہرا اثر لیا تھا اور مجھ سے اولاً ٹیلی فون پر اور پھر برقی رقعوں (ای میل) کے ذریعے کئی دن تک متواتر اپنے جذبات الم بیان کرتے رہے، بلکہ اس المیے پر انھوں نے دو مختصر اردو نظمیں بھی خود تخلیق کرکے بھیجیں۔ اب خواجہ صاحب کے انتقال پر بھی وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور فون پر وقفوں وقفوں سے بہ مشکل چند الفاظ کہہ پائے اور پھر بات نہ کرسکے اور فون بند کردیا۔ اس موقعے پر ان سے کہے ہوئے خواجہ صاحب کے الفاظ کہ "اب معلوم نہیں آپ سے پھر ملاقات کب ہو، ہوتی بھی ہے یا نہیں۔" دیر تک میرے ذہن میں گونجتے رہے۔ رہے نام اللہ کا۔

یہ دکھ بڑھ جاتا ہے جب خیال آتا ہے کہ کیا شان دار انسان، وجیہہ و شکیل، خوش پوشاک، بے حد شائستہ، علمی اور ادبی معلومات کا خزینہ، موضوع، عہد اور علاقے کی قید نہیں، ہر طرح کی معلومات ازبر، بذلہ سنج، طنز و مزاح اور تحقیق میں یکتا، مخلص و ہم درد، لیکن اُس پر یہ وقت بھی آیا کہ آخری وقت میں کوئی غم گسار اس کے ساتھ نہیں۔ بیوی ہے لیکن دور ایک گھر میں، خود لاچار و مجبور اور معذور اور اپنی ایک ایسی ہی معذور اور بیمار بہن کے ساتھ۔ ایسے لمحات میں کہ کوئی پرسان حال اور مددگار قریب نہیں، اس قدر کم زور و ناتواں کہ خود سیڑھیاں اتر نہ سکے اور گھر میں کوئی ایسا فرد نہیں کہ سیڑھیاں اترنے میں مدد کرسکے، اسپتال لے جاسکے۔ وہ خود گھسٹتے گھسٹتے سیڑھیاں اترتا ہے اور اس طرح کہ پشت اور کہنیاں مسلسل رگڑ سے خون آلود ہوجائیں اور پھر گھر کے دروازے پر نڈھال بیٹھا رہتا ہے کہ کسی سواری کا انتظام ہو اور اسے اسپتال لے جایا جاسکے۔ بالآخر اسپتال پہنچایا جاتا ہے تو اس قابل نہیں کہ بات کرسکے۔ سانس اکھڑ چکی ہے، ایسے میں دل کا دورہ پڑتا ہے، مصنوعی تنفس کی مشین لگا دی جاتی ہے، لیکن اس تنفس سے کیا ہوسکتا ہے، دل نے حرکت سے بھی انکار کردیا۔ ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کردی۔ مشین ہٹائی نہیں جاتی کہ پھر فوری تدفین لازم ہوجاتی۔ چناں چہ مصنوعی تنفس جاری رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ محض انتظار اعزا اور اطمینان قلب کی خاطر عارضی انتظام تھا، خود اس زندگی کی طرح۔ رہے نام اللہ کا۔

☆☆☆

شاہ محی الحق فاروقی

مشفق خواجہ صاحب اور میں

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۲ء تک میرا قیام مسلسل کراچی میں رہا اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس پورے عرصے میں مشفق خواجہ صاحب بھی کراچی میں اپنی تعلیم مکمل کر کے انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے اور علمی و ادبی کام کرتے رہے۔ اس پورے عرصے میں خواجہ صاحب سے ملنا تو درکنار میں نے شاید ان کا نام بھی نہیں سنا تھا جس کا بڑا سبب غالباً میری کم علمی اور ایک سرکاری دفتر میں کچھ دنوں تک ادنیٰ اور پھر کچھ دنوں تک اوسط درجے کی ملازمت تھی۔

سرکاری دفتر کے ایک کلرک کا کسی علمی ادارے کے ایک محقق اور مصنف سے رابطہ کیوں اور کیسے ہوتا۔ چناں چہ پندرہ سال کے اس پورے عرصے میں کراچی کے پڑھے لکھے لوگوں میں سے میرے تعلقات صرف محترم ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب سے تھے جو میرے ایک بزرگ دوست کی حیثیت رکھتے تھے۔ تعجب ہے کہ ان کے ذریعے بھی میں مشفق خواجہ صاحب سے متعارف نہیں ہوا یہاں تک کہ پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوگیا۔ چناں چہ مئی ۱۹۶۱ء میں خواجہ صاحب کو جانے بغیر میں بھی اسلام آباد تبادلے کے حوالے سے راول پنڈی چلا گیا۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں اسلامی تحقیقاتی کونسل کے قیام پر میں اس کا پہلا سیکریٹری مقرر ہوا۔ کونسل کا دفتر لاہور میں قائم کیا گیا تھا، چناں چہ میرا تبادلہ بھی لاہور ہوگیا جہاں دوسال رہنے کے بعد ۱۹۶۴ء میں دوبارہ میرا تبادلہ ہوگیا اور میں راول پنڈی اور پھر اسلام آباد آگیا۔

اس ساری تفصیل کے لکھنے سے میرا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ عشرہ ۱۹۷۰ء کی ابتدا تک میں خواجہ صاحب سے ناواقف رہا اور غالباً اور بہت دنوں تک ناواقف ہی رہتا اگر ۱۹۷۰ء کے عشرے کی ابتدا میں مجھے روزنامہ ''جسارت'' کراچی کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن میں ''اندیشۂ شہر'' کے عنوان سے ایک پہلو دار اور خاردار کالم کسی ''غریب شہر'' کے نام سے پڑھنے کا اتفاق نہ ہو جاتا اور جب ایک بار یہ کالم پڑھ لیا تو پھر تو اس کی چاٹ پڑ گئی اور ہر ہفتے غریب شہر کا کالم پڑھنا میری مجبوری بن گیا۔ بہت دنوں

تک مجھے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ غریب شہر کون تھا۔ غریب شہر کی تلمیح اس جانب اشارہ کرتی تھی کہ یہ کوئی غیر کراچوی شخصیت ہوگی۔

بیاو دید گر اینجا بود سخن دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

آخر اتفاق سے راول پنڈی میں مقیم ایک صحافی دوست (احسان کلیمی) کے یہاں کئی بار اور خصوصاً ناشتے پر روزنامہ ''جسارت'' کراچی کے مدیر صلاح الدین صاحب مرحوم سے میری ملاقات ہوتی رہی۔ تب یہ راز کھلا کہ غریب شہر کوئی مشفق خواجہ صاحب ہیں جن کا شمار کراچی کی اعلیٰ علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ اس طرح خواجہ صاحب سے میرا غائبانہ اور عقیدت مندانہ تعلق مزید آٹھ نو سال تک رہا۔ اس اثنا میں روزنامہ ''جسارت'' سے صلاح الدین صاحب کا تعلق ختم ہوگیا جسے بنیاد بنا کر خواجہ صاحب نے ''جسارت'' میں لکھنا بند کردیا اور غالباً انھیں دنوں جسارت کا ادبی صفحہ بھی بند ہوگیا۔ اس طرح خواجہ صاحب پھر میرے لیے غریب شہر یا اجنبی ہی رہ گئے۔

جنوری ۱۹۸۱ء میں ایک بار پھر میں تبدیل ہوکر کراچی آگیا۔ کچھ دنوں کے بعد ''تکبیر'' میں جو صلاح الدین صاحب کا اپنا رسالہ تھا خواجہ صاحب نے خامہ بگوش کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ شاید اس کے بعد خواجہ صاحب سے میری ملاقات ہوجاتی لیکن اواخر ۱۹۸۱ء میں سڑک کے ایک حادثے میں، میں شدید زخمی ہوگیا اور اس طرح میری نقل وحرکت کافی محدود ہوگئی۔ وقت گزرتا رہا۔ ''تکبیر'' وغیرہ میں، میں خواجہ صاحب کے کالم پڑھتا رہا لیکن خواہش کے باوجود ان سے ملنا نہ ہوسکا۔

مئی ۱۹۹۱ء میں میرے بھانجے شاہ عبدالسلام نے جو لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ عربی میں لکچرر تھے، اپنی ایک تالیف ''تاریخ اودھ المعروف بہ شاہیۂ نیشاپوریہ'' کی دو تین جلدیں مجھے بھیجیں جن میں سے ایک مشفق خواجہ صاحب کے نام تھی۔ انھوں نے غالباً خواجہ صاحب کا پتا بھی لکھ دیا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میرے مکان سے خواجہ صاحب کے مکان کا فاصلہ مشکل سے ایک میل تھا۔

میں نے خواجہ صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ جواب میں ایک بہت دل کش آواز سننے میں آئی ''فرمایئے''۔ میں نے شاہ عبدالسلام سے اپنا رشتہ بتاتے ہوئے کہا کہ معلوم نہیں آپ ان سے واقف ہیں یا نہیں، بہ ہر حال انھوں نے آپ کے لیے ایک کتاب بھیجی ہے جو مجھے آپ تک پہنچانی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ میں شاہ عبدالسلام سے خوب واقف ہوں۔ اگر آپ اتوار کو دس بجے سے دو بجے دن تک کسی وقت آجائیں تو کافی لوگوں سے آپ کی ملاقات ہوجائے گی ورنہ آپ جب چاہیں آجائیں۔'' میں نے اپنے گھر کا پتا بتاتے ہوئے پوچھا، ''ابھی آجاؤں؟'' انھوں نے کہا، ''ابھی آجایئے۔'' میں نے اس وقت جانے کا فیصلہ بطور خاص اس لیے کیا تھا کہ میں بھیڑ بھکڑ سے بچ کر یہ چاہتا تھا کہ کم از کم پہلی ملاقات علاحدگی میں ہوجائے۔ چناں چہ تھوڑی دیر کے بعد میں خواجہ صاحب کے یہاں پہنچ گیا۔ گھنٹی بجائی تو

بالائی منزل سے خواجہ صاحب نے دروازہ کھول کر آواز دی، ''تشریف لایئے۔'' میں اوپر گیا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم کیا تھا۔ تین طرف دس بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کے لیے صوفے نما کرسیاں لگی ہوئی تھیں بیچ میں ایک بڑی سی میز جس پر ایک طرف چائے اور بسکٹ رکھنے کے لیے تھوڑی سی جگہ خالی تھی ورنہ نہ صرف وہ میز بلکہ دیواروں میں ریک حتیٰ کہ جو جگہ بھی خالی نظر آتی تھی، وہ کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔

خواجہ صاحب نے میرے لیے ملازم سے چائے منگوائی اور خود اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے جہاں سے دومنٹ کے بعد ایک موٹا سا البم ہاتھ میں لے کر آئے۔ ایک لمحے میں انھوں نے البم میں لگی ہوئی ایک تصویر میری طرف بڑھا کر کہا، ''دیکھیے، آپ ان میں سے کسی کو پہچانتے ہیں؟'' میں نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا، ''بارہ برس پہلے میں نے ان صاحب کو دیکھا تھا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ شاہ عبدالسلام ہیں۔'' تب خواجہ صاحب نے بتایا کہ وہ کچھ دنوں پہلے لکھنؤ گئے تھے جہاں اس شہر کے تمام قابلِ ذکر ادیبوں اور اہلِ علم حضرات سے ان کی ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے اپنے کیمرے سے خود ان تمام لوگوں کی تصویریں کھینچی تھیں۔ شاہ عبدالسلام بھی ان میں شامل تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد خواجہ صاحب نے اپنی بغل میں رکھے کیمرے سے میری تصویر اتار لی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا، ''اگر آپ مجھے پہلے سے اطلاع کر دیتے تو میں اس اجاڑ صورت میں نہ آتا۔'' وہ ہنسنے لگے اور مجھے بتایا کہ کتابیں، مسودے اور مخطوطے جمع کرنے کے علاوہ ان کا ایک شوق تصویریں اکٹھا کرنا بھی ہے۔ آٹھ دس کمروں پر مشتمل دوڈھائی منزلہ مکان جس میں ہر طرف کتاب ہی کتاب۔ نیچے کی منزل تو بطورِ خاص کتب خانہ نہیں بلکہ کتاب گھر۔ ہر طرف ریک اور الماریاں کھڑی تھیں جن میں آمنے سامنے کتابیں لگی ہوئی تھیں، بیچ میں چلنے کے لیے بس اتنی جگہ خالی تھی کہ ایک اوسط قد وقامت کا دبلا پتلا شخص گزر سکتا تھا۔

اس ملاقات کے بعد بھی میں کبھی کبھار خواجہ صاحب کے یہاں جاتا رہا حتیٰ کہ جون ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہوگیا تو پھر تو غالباً کوئی اتوار ناغہ نہیں ہوا۔ ہر ہفتے کچھ نئے لوگوں کی زیارت ہوجاتی۔ کراچی کے چند مقامی ادیبوں کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی حتیٰ کہ ہندوستان انگلستان، امریکا اور کینیڈا سے بھی جو ادیب یا ادب دوست آتا وہ خواجہ صاحب کے یہاں اپنی حاضری ضرور لگا جاتا۔ ان ملاقاتوں میں خواجہ صاحب نے میرے بارے میں تمام معلومات حاصل کرلیں اور انھیں معلوم ہوگیا کہ مجھے بھی لکھنے لکھانے کا شوق ہے جو دفتری مصروفیات کے سبب بڑی حد تک دبا رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد فرصت ملی تو کچھ نئی چیزیں لکھنے کے علاوہ اپنے پرانے مضامین کا ایک مجموعہ ''کھٹے میٹھے اناڑ'' کے نام سے جولائی ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔

میں نے اپنے ایک مجموعے کی ایک جلد خواجہ صاحب کو پیش کی تو انھوں نے مسرت کا اظہار

کیا اور بغیر میری جانب سے کسی درخواست کے کہا کہ میں اس پر تبصرہ کروں گا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ۱۶ فروری ۱۹۹۰ء کے "تکبیر" میں انھوں نے "چند نئے خامہ خراب" کے عنوان سے تین کتابوں پر تبصرہ کیا جن میں سے ایک میری کتاب تھی۔ میں اپنے مجموعے سے متعلق اس تبصرے کا حصہ نقل کر رہا ہوں:" —— دو نوجوانوں کے تذکرے کے بعد اچھا نہیں لگتا کہ ایک بزرگ کا ذکر خیر کیا جائے، لیکن یہ بزرگ بھی اس اعتبار سے "نئے" ہیں کہ انھیں زندگی میں پہلی بار صاحب کتاب بننے کا اتفاق ہوا ہے۔ لکھ تو وہ ایک عرصے سے رہے ہیں لیکن شہرت کو رسوائی سمجھ کر انھوں نے ہمیشہ اپنے نام اور کام کو چھپائے رکھا اور اگر کبھی اپنے مضامین چھپوائے بھی تو ایسے رسالوں میں جو نقش و نگار طاق نسیاں بن چکے ہیں۔ ان بزرگوار کا نام نامی 'شاہ محی الحق فاروقی' ہے۔ خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں جس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک زمانے میں وہ وفاقی حکومت کے ادارے اسلامی نظریاتی کونسل کے سیکریٹری تھے (مگر اب تو اس ادارے کا صدر ہونے کے لیے بھی پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں ہے)۔ ان کی زندگی محنت اور جدوجہد کی عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے ایک کلرک کی حیثیت سے سرکاری ملازمت کا آغاز کیا اور جائنٹ سکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آج کل وہ آپ بیتی لکھ رہے ہیں۔ چوں کہ ان کی ملازمت کا سارا زمانہ sir کہنے یا سننے میں گزرا ہے اس لیے آپ بیتی کا نام "sir گزشت" رکھا ہے۔

فاروقی صاحب کو طنز و مزاح سے خاص مناسبت ہے۔ کسی زمانے میں مجید لاہوری کے "نمکدان" اور بعض دوسرے رسالوں میں ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ بعد میں انھوں نے مضامین چھپوائے نہیں، لکھتے باقاعدگی سے رہے لیکن دو چار قریبی دوستوں کو سنا کر یا پڑھوا کر یہ سمجھتے رہے کہ ان مضامین کے لکھنے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہوگیا۔ اب انھیں قریبی دوستوں کے اصرار پر ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ "کھٹے میٹھے انار" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کتاب کا نام ایسا ہے جیسے یہ محکمۂ زراعت کی طرف سے شائع کی گئی ہو۔ لیکن نام میں کیا رکھا ہے۔ خود مصنف کا نام بھی تو ایسا ہے کہ اگر طنز و مزاح کی بجائے مسائل تصوف کی کسی کتاب پر چھپے تو زیادہ اچھا لگے۔

اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں انھیں پڑھ کر پہلا خیال ذہن میں یہ آتا ہے کہ مصنف کا ادبیات کا مطالعہ خاصا وسیع ہے اور ادبی مذاق نہایت مہذب ہے۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے اکثر جگہ یہ گمان گزرتا ہے جیسے ہم رشید احمد صدیقی کو پڑھ رہے ہیں۔ وہی شائستہ انداز بیان، وہی شستہ مزاح، وہی دل نشین طنز —— لیکن جہاں تک 'موضوعات سخن' کا تعلق ہے وہ رشید احمد صدیقی سے بالکل مختلف ہیں۔ فاروقی صاحب کی زندگی کچھ اس طرح گزری ہے کہ انھیں معاشرے کے بہت سے طبقوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس کا اندازہ ان درجنوں متنوع کرداروں سے کیا جاسکتا ہے جو اس کتاب میں نظر آتے ہیں، مثلاً پہلا مضمون ہی ان سیاسی کارکنوں کے بارے میں ہے جو جلسوں کا انتظام کرنے سے لے کر نعرے لگانے تک کے سارے کام کرتے ہیں اور لیڈروں کو لیڈر بناتے ہیں۔ مگر خود وہی کچھ رہتے

ہیں جو پہلے دن تھے۔ اور بالآخر گم نامی کی موت مرجاتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے ہمارے ملک میں مروج نظامِ سیاست اور سیاست دانوں کے بارے میں اپنے شگفتہ انداز بیان میں جو حقائق پیش کیے ہیں وہ بظاہر تو خاصے خندہ آور ہیں لیکن دراصل ایک ایسے المیے کی نشان دہی کرتے ہیں جس نے ہماری سیاست کو خود غرضی کا کاروبار بنا رکھا ہے۔

ایک مضمون اعلیٰ سرکاری افسروں کے بارے میں بھی ہے۔ مضمون نہیں اسے ڈراما کہنا چاہیے۔ ایک بہت اہم سرکاری میٹنگ ہورہی ہے، ایجنڈے پر گفتگو کی نوبت ہی نہیں آتی اور سارا وقت فوٹو گرافروں کے انتظار میں گزرجاتا ہے۔ عالمِ انتظار میں شرکا آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں اسے پڑھ کر ہنسی تو آتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ خوف بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ جس ملک کو چلانے والے ایسے ہوں اس ملک کا انجام کیا ہوگا۔

یہ کتاب ہر اس شخص کو پڑھنی چاہیے جو ہنسنے کے ساتھ رونے کے لیے بھی آمادہ ہو۔''

میں نے یہ تبصرہ پڑھا تو بڑی دیر تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ یہ اظہارِ حقیقت ہے یا خواجہ صاحب نے اپنے رنگ میں شگوفے کھلائے ہیں۔ ملاقات ہونے پر میں نے ان کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ محبت آمیز لہجے میں ان سے شکوہ بھی کیا کہ ضرورت سے زیادہ یہ تعریف جس میں رشید احمد صدیقی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے کہیں اس لیے تو نہیں کی گئی ہے کہ ''ایاز قدرِ خود شناس'' لیکن خواجہ صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ ''نہیں، میں نے اس تبصرے میں کوئی بات خلافِ حقیقت نہیں کہی ہے، بلکہ اپنی بچی تلی رائے بیان کردی ہے۔ میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ان کے تبصرے کو اظہارِ حقیقت سمجھ کر ہنسی خوشی قبول کرلوں۔ اب میری رائے کی تائید یا تردید تو وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھوں نے میری کتاب ''کھٹے میٹھے انار'' کے علاوہ خواجہ صاحب کا تبصرہ بھی پڑھا ہو جس کی عکسی نقل ۱۶ر فروری ۱۹۹۵ء کے ''تکبیر'' سے وحید الرحمٰن خان نے اپنی کتاب ''خامہ بگوش۔ ایک مطالعہ'' کے صفحہ ۴۔۱۹۳ پر شامل کی ہے۔

اس تبصرے کی اشاعت سے کچھ پہلے سے خواجہ صاحب کے یہاں اتوار کے اتوار میرا حاضری دینا میرا ایک معمول بن چکا تھا، جہاں گیارہ سے دو بجے تک بیٹھنا اور تقریباً ہر ہفتے چند مخصوص لوگوں کے علاوہ ایک دو نئی شخصیات سے ملنے کا موقع ملتا رہا۔ ان سب لوگوں کا تعلق لکھنے پڑھنے کی دنیا سے ہوتا تھا۔ ان میں بہت سے لوگ خواجہ صاحب کو اپنی کوئی نئی کتاب بھی پیش کرتے تھے۔ بعض کتابوں کے بارے میں خواجہ صاحب کہتے کہ میں نے اس پر تبصرہ فلاں رسالے میں پڑھا تھا اور اسی وقت اس کی ایک جلد خرید کر میں نے اپنے کتب خانے میں داخل کرلی تھی۔ بہر حال آپ کا شکریہ، میں اسے کسی صحیح شوقین کو پیش کردوں گا۔

خواجہ صاحب کے یہاں میں تقریباً پانچ چھ سو اتواروں کو حاضر ہوا اور غالباً صرف دو بار ایسا ہوا کہ کسی بہت اہم مصروفیت کی وجہ سے وہ اپنے گھر پر نہیں ملے۔ ایک بار وہ باہر سے آئے ہوئے کسی

مہمان کوٹھٹے میں مکلی کا قبرستان دکھانے لے گئے تھے اور ایک بار غالباً کسی صاحب کو کھانے پر لے کر اپنے بھائی کے یہاں کلفٹن گئے تھے۔ اس دن جو بھی اوپر آنے سے پہلے سن لیتا کہ خواجہ صاحب گھر پر نہیں ہیں وہ عموماً الٹے پیروں سے واپس ہو جاتا۔ لیکن خواجہ صاحب نے اپنی طرف سے ہر طرح کا انتظام کر رکھا تھا یعنی میزبانی کے فرائض انجام دینے کے لیے چائے بسکٹ کے ساتھ ذوالفقار مصطفیٰ صاحب موجود تھے جو خواجہ صاحب کے ہم زلف ہیں اور اسی رعایت سے خواجہ صاحب انھیں ''ہم زلف کار مصطفیٰ'' کہتے تھے۔ مصطفیٰ صاحب گورنمنٹ ٹیچرس ٹریننگ کالج کے سابق پرنسپل تھے۔ میں یہ جاننے کے باوجود کہ خواجہ صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں اوپر جاکر مصطفیٰ صاحب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک دو حضرات اور بھی آ گئے اور اپنی عادت کے مطابق دو بجے تک بیٹھ کر مصطفیٰ صاحب سے گپیں لڑا کر واپس ہو گیا۔

اس اثنا میں سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ (۱۹۹۲ء) کے بعد میرا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں اور خاص طور سے انگریزی سے اردو میں کتابوں کے ترجمے کرنے میں گزرتا رہا جس کا علم خواجہ صاحب کو بھی ہوتا رہتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پہلا قابلِ ذکر ترجمہ میں نے جسٹس ایم آر کیانی مرحوم کی کتاب A Judge May Laugh and Even Cry کا کیا جو ''ایک جج ہنس بھی سکتا ہے، شاید'' کے نام سے ۱۹۹۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے بعد جناب ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری کی فرمائش پر میں نے Training Guide for Islamic Workers کا ترجمہ کیا جسے ''رہنمائے تربیت (کارکنان دعوت و تبلیغ کے لیے لائحۂ عمل)'' کے نام سے ادارۂ فکرِ اسلامی، اسلام آباد نے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا۔ پھر ہندوستان کے ایک سابق سینئر مسلمان افسر موسیٰ رضا کی کتاب The Nawabs and Nightingds کا ''بلبلیں نواب کی'' کے نام سے ترجمہ کیا جو فضلی سنز کراچی سے شائع ہوا۔

اس دوران میں پر خواجہ صاحب نے بھی مجھے کچھ کام تفویض کیے۔ ایک کام تو ایک ترجمے پر نظرِ ثانی کا تھا۔ علی نواز میمن کی The Islamic Nation - States and Future of Muslims in New World Order کا ترجمہ انجمن ترقی اردو نے جناب صفوت قدوائی سے کرایا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس پر نظرِ ثانی کا کام مجھ سے لیا، یہ کتاب ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ ایک پوری کتاب Aspects of Ghalib کا ترجمہ خواجہ صاحب نے مجھ سے کروایا۔ یہ کتاب پانچ اہلِ علم حضرات کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کا ترجمہ میں نے ''جہات غالب'' کے نام سے کیا جسے خواجہ صاحب نے ادارۂ یادگارِ غالب کے زیرِ اہتمام شائع کیا۔

اس کتاب میں جگہ جگہ فارسی اشعار دیے گئے ہیں۔ میں نے فارسی زبان سے اپنی کم علمی کا عذر کر کے اس کتاب کا ترجمہ کرنے سے معذرت چاہی لیکن خواجہ صاحب کا اصرار میری معذرت پر غالب آیا۔ چناں چہ میں نے کچھ تو اصل کتاب میں انگریزی ترجمے کے حوالے سے اور کچھ اپنے معزز دوست اور بزرگ جناب محب عارفی کی نگرانی میں ترجمے کا کام مکمل کر لیا۔ ''جہات غالب'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔

یہ سب کتابیں ایک طرف لیکن جس ایک دلچسپ کتاب کے بغیر خواجہ صاحب سے میرے تعلقات کی داستان نامکمل رہ جائے گی وہ Autobiography of Lutfullah An Indian's Perceptions of the West ہے۔ انگریزی زبان میں یہ خودنوشت گجرات (ہندوستان) کے لطف اللہ نامی ایک صاحب نے لکھی تھی ۔ یہ انگریزی زبان میں کسی ہندوستانی کی غالباً سب سے پہلی اور بہترین خودنوشت ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۵۷ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی اور دوبارہ ایس اے آئی ترمذی ، وزٹنگ سائنٹسٹ، کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ دہلی کے تنقیدی اور فاضلانہ تعارف اور اشاریے کے ساتھ ۱۹۸۵ء میں انٹرنیشنل رائٹرس ایمپوریم دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ کتاب انتہائی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ مشفق خواجہ صاحب نے یہ کتاب ترجمے کے لیے مجھے دی۔ میں نے ترجمہ شروع کیا اور ابھی تین چار باب کا ترجمہ کر پایا تھا کہ ایک روز محترم اسلم فرخی صاحب سے میں نے اس کام کا تذکرہ کیا۔ دو تین دن کے بعد اسلم صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں نے تمھارے ترجمے کا ذکر اپنے بیٹے آصف فرخی سے کیا تو اس نے بتایا کہ اس کا ترجمہ تو ڈاکٹر مبارک علی صاحب کر چکے ہیں اور کتاب غالباً پریس میں ہے۔ میں نے خواجہ صاحب کو بتایا تو انھوں نے کہا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک ایک کتاب کے دو دو تین تین ترجمے بھی ہوئے ہیں لہٰذا آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ اور ابھی غالباً سات آٹھ ابواب کا ترجمہ کیا تھا کہ مبارک علی صاحب کا ترجمہ ۱۹۹۴ء میں دکانوں پر آ گیا۔ خواجہ صاحب کو علم ہوا تو انھوں نے مجھے بتایا اور کہا کہ اس کی ایک جلد آپ بھی خرید لیں۔ میں نے کہا کہ خریدنے سے مراد اگر یہ ہے کہ میں اسے پڑھ لوں تو میں اسے اس وقت تک نہیں پڑھوں گا جب تک میں خود اپنا ترجمہ مکمل نہ کرلوں۔ اس سے پہلے مبارک علی صاحب کا ترجمہ پڑھنے کو میں علمی بددیانتی سمجھتا ہوں۔ خواجہ صاحب نے مجھ سے اتفاق کیا اور جب میں نے اپنا ترجمہ مکمل کر کے انھیں دیا تو انھوں نے بتایا کہ ان کا ارادہ ہے کہ وہ اسے ادارۂ یادگار غالب سے شائع کرائیں گے۔ جب اس کتاب کی کمپوزنگ مکمل ہوگئی تو خواجہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں نے مسودہ پورا پڑھ لیا ہے۔ ترجمہ ہر لحاظ سے عمدہ اور مکمل ہے لیکن میرے نزدیک اس میں ایک کمی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں یعنی ڈیڑھ سو سال سے پہلے شائع ہوئی تھی۔ اس میں گجرات، بمبئی، سندھ اور پنجاب کا جگہ جگہ ذکر ہے۔ اب بہت سے مقامات کے نام بدل گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات پر بھی کہیں کہیں تفصیلی نوٹ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کام میں خود کروں گا۔ چناں چہ انھوں نے انگریزی اور اردو کی مختلف کتابیں یک جا کیں اور یہ صبر آزما کام شروع کیا۔

اس کے بعد انھوں نے ہفت روزہ ''تکبیر'' میں ڈاکٹر مبارک علی کے ترجمے پر نہ صرف تبصرہ کیا بلکہ اس پر خاصی گرفت کی۔

اس درمیان میں خواجہ صاحب کی صحت خراب رہنے لگی جس کا اظہار وہ عموماً نہیں کرتے تھے لیکن انھیں جاننے والے جان گئے تھے کہ بظاہر تندرست نظر آنے والے خواجہ صاحب کا اب چل چلاؤ

ہے۔ تقریباً ہر دو تین ہفتے کے بعد میں انھیں لطف اللہ کی سرگزشت کے بارے میں یاد دلاتا رہا اور وہ مجھے یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے کہ میں پوری طرح اس کام میں مشغول ہوں بلکہ اس درمیان میں اگر وہ اس موضوع سے متعلق کوئی نئی کتاب یا نیا مضمون تلاش کر لیتے تو مجھے اس کے بارے میں بھی بتلاتے اور اطمینان دلاتے کہ سارا مواد مکمل ہے بس اب اسے ضبطِ تحریر میں لانا باقی ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ ایک دو مہینے میں مکمل ہو جائے گا لیکن بات وہی ہے کہ ''میں نے اپنے ارادوں کے فسخ ہو جانے کی وجہ سے اپنے رب کو پہچانا۔'' خواجہ صاحب گزر گئے اور لطف اللہ کی سرگزشت کا ترجمہ کمپوز شدہ موجود ہے لیکن اب اس پر تشریحی نوٹ اور حواشی کون لکھے۔ خوش قسمت تھے ''یگانہ'' اور بدقسمت تھے لطف اللہ جو بیگانے رہ گئے۔

خواجہ صاحب کی تین چار گھنٹوں کی ہفتہ وار نشست بڑی معلومات افزا اور دلچسپ ہوتی تھی ان لوگوں نے اپنے مضامین میں لکھ کر شائع کروا دیے ہیں جو خواجہ صاحب کی محفلوں کے مستقل شرکاء میں سے تھے۔ گو کہ اب بھی بہت کچھ لکھنے کو رہ گیا ہے۔ دراصل اس محفل کے بیش تر شرکا خود بھی اس بات کے اہل ہیں کہ ان پر مستقل مضامین لکھے جائیں اور مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ لکھتے رہیں گے۔

اس وقت مجھے ایک صاحب یاد آ رہے ہیں جن کا ذکر کر کے میں فی الحال اپنے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ اس سے آپ کو خواجہ صاحب کے کردار کی عظمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک صاحب خواجہ صاحب کی نشست میں غالباً مجھ سے پہلے سے حاضری دیا کرتے تھے۔ وہ محفل کے ایک کونے والی نشست پر خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ میں نے کئی کئی مہینے ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ سنا۔ لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کی رائے زنی کرتے۔ میں نے ایک روز خواجہ صاحب سے کہا کہ حکومتیں آپ کی جیسی محفلوں پر کڑی نظر رکھتی ہیں اور ان کی رپورٹنگ کے لیے جاسوس مقرر کرتی ہیں۔ اسی لیے کہا گیا کہ ''دیوار ہم گوش دارد'' اور آپ کے یہ مہربان تو اپنی کم گوئی کی وجہ سے واقعی دیوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہیں ان کا تعلق خفیہ کے کسی محکمے سے تو نہیں ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ کھل کر راز کی باتیں کیجیے، یہ بے ضرر انسان ہیں۔

ایک روز محفل کے آغاز کے وقت ابھی وہی ایک حضرات تشریف لائے تھے کہ نیچے سے گھنٹی بجی۔ مجلس کے منتظم ناصر صاحب یا صوفی صاحب نے دروازہ کھول کر اوپر سے دیکھا اور پھر دروازہ بند کر کے واپس آئے اور خواجہ صاحب سے کچھ سرگوشی کی۔ خواجہ صاحب تیزی سے اٹھ کر دروازے پر گئے اور وہیں سے انھوں نے نیچے کھڑے صاحب کو لتاڑنا شروع کیا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ نیچے کھڑے ہوئے صاحب معذرت خواہانہ انداز میں اوپر آنے کی اجازت مانگ رہے ہیں لیکن خواجہ صاحب مسلسل انکار کرتے رہے کہ جب میں نے آپ کو سختی کے ساتھ منع کر دیا ہے کہ آپ میرے یہاں نہ آیئے تو پھر آپ کیوں بار بار مجھے تنگ کرتے ہیں۔ اور پھر خاصا ڈانٹنے ڈپٹنے کے بعد خواجہ صاحب دروازہ بند کر کے

واپس آگئے۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ناصر نے غالباً بے مانگے انھیں ایک گلاس پانی پیش کیا جب کچھ دیر بعد خواجہ صاحب پرسکون ہوئے تو میں نے ان سے اس غیر معمولی سلوک کا سبب پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک میں اس شخص کو نہیں جانتا تھا تو ہر شخص کی طرح اسے بھی میں اپنے یہاں خوش آمدید کہتا تھا لیکن بہت دنوں کے بعد اس کے کرتوت مجھ پر کھلنے لگے۔ ایک روز یہ اپنی والدہ کے مکان کے کاغذات ان کی تحویل سے چرا کر میرے پاس لے آیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اس مکان کو فروخت کرا کے اس کی قیمت اسے دلوا دوں۔ میں نے سمجھا بجھا کر کاغذات اس سے لے لیے اور ان کی والدہ کو واپس کروا دیے۔ پھر ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اپنی والدہ کو ننگی ننگی گالیاں دیں اور ان پر ہاتھ اٹھایا، اگلے ہی ہفتے جب یہ شخص آیا تو میں نے اس سے "ما بخیر و شما بسلامت" کہہ کر اسے اپنے یہاں آنے سے منع کیا اور کہا کہ میں ایسے کسی شخص کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا جو اپنی ماں کی عزت نہ کرتا ہو۔ ایک دو ہفتے کے بعد یہ غالباً ایک یا دو بار پھر یہاں آیا اور میں نے اسے الٹے پیروں واپس کیا۔ آج جو کچھ ہوا آپ لوگوں کے سامنے ہوا۔ اب ان شاء اللہ یہ کبھی نہیں آئے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ خواجہ صاحب کے اس نالائق معتقد نے ذرا عجلت سے کام لیا۔ دراصل ان دنوں شرفا خود تو اپنی ماں کا بے حد و حساب احترام کرتے ہی تھے وہ ایسے کسی شخص کو دیکھنا بھی برداشت نہیں کرتے تھے جو اپنی ماں کی شان میں ہلکی سی گستاخی بھی کرے۔ صحیح معنوں میں یہ وہ دن تھے جب لوگ ماں سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار سال میں تین سو پینسٹھ دن کیا کرتے تھے۔ اس وقت غالباً اس شخص کو اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ "بہت نزدیک ہے وہ دن" جب ماں کا احترام سال میں صرف ایک دن یعنی "یومِ مادر" کو کیا جائے گا اور پھر جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔

☆☆☆

ڈاکٹر تحسین فراقی

اِک مدت تک یاد رہیں گی باتیں مشفق خواجہ کی

یہ بائیس فروری کی نہایت سرد صبح تھی۔ تہران میں ایک ہفتہ پہلے مسلسل چودہ دن تک شدید برف باری کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے چھ درجے نیچے تھا۔ میں اپنے منتشر خانوادے کے ساتھ خیابانِ خالد اسلامبولی کے ایک فلیٹ میں پچھلے ڈھائی ہفتوں سے مقیم تھا۔ نیا مکان ابھی نہیں ملا تھا۔ بائیس فروری کو اس زمہریری صبح کے سناٹے کو ٹیلی فون کی سامعت شکن، تیز گھنٹی نے توڑا۔ یااللہ خیر۔ لاہور سے میرا بیٹا عمر فاروق مجھے اطلاع دے رہا تھا، ''ابھی ابھی روزنامہ 'جنگ' میں پڑھا ہے، مشفق خواجہ انتقال کر گئے۔'' میں ایسی وحشت انگیز خبر کے لیے تیار نہ تھا۔ ابھی آٹھ نو دن پہلے ان سے فون پر تفصیلی بات چیت ہوئی تھی۔ آواز میں مسرت کا وہی لہرا تھا، بہجت اور توانائی تھی اور اب یہ خبر۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ بائیس فروری کا یہ دن نہایت کرب اور یادوں کے ایک نا مختتم ہجوم کے ساتھ گزرا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور بعد ازاں مبین مرزا نے اس الم انگیز خبر کی تصدیق کر دی۔ لیجیے خواجہ صاحب بھی رخصت ہوئے۔ خواجہ صاحب رخصت نہیں ہوئے، ایک کاروان، علم و فضیلت کا ایک دبستان، عدم کے پاتال میں اتر گیا۔ دل نے کہا، ایسا پہلی دفعہ نہیں ہوا۔ بقا صرف ایک ذات کو حاصل ہے۔ میں نے سوچا جوں جوں آدمی کی عمر بڑھتی ہے وہ تنہا تر ہوتا جاتا ہے، پرانے دوست احباب رخصت ہوتے جاتے ہیں، نئی دوستیاں ممکن نہیں ہوتیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے کرب کے عالم میں کہا تھا:

اتنا جیے کہ جاننے والے گزر گئے

ایک ایک کر کے یادوں کی پرانی بیاض کے ورق الٹنے لگے۔ خواجہ صاحب کے نام اور ان کی بعض تحریروں سے تو میں ایک مدت سے آشنا تھا۔ پہلی ملاقات ۱۹۷۹ء میں ہوئی تھی جب طارق عزیز اور میں اپنے اپنے پی ایچ ڈی کے موضوعات کے لوازمے کی تلاش میں عازمِ کراچی ہوئے تھے۔ اُن دنوں میں نے روزنامہ ''جسارت'' میں ''گویا دبستاں کھل گیا'' کے زیرِ عنوان ادبی کالم نگاری کا آغاز کیا تھا جو لاہور کی ہنگامہ خیز ادبی فضا کا حصہ تھا۔ فون پر اپنے کراچی آنے کی اطلاع دی۔ کس خوش دلی اور کمال

مسرت سے انھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا تھا اور پھر طارق عزیز اور میں تھے اور خواجہ خواجگان سے ملاقاتیں۔ پہلی ملاقات کا نقشہ اب تک ذہن میں ہے۔ عمر چوالیس سال کے قریب تھی۔ رنگ سرخ و سفید، چہرے کے خدوخال پُرکشش، صحت قابلِ رشک، جامہ زیبی اور خوش گفتاری اس پر مستزاد۔ میل جول بڑھا تو اندازہ ہوا کہ ان کی علمی دلچسپیوں کا میدان کتنا وسیع تھا۔ کلاسیکی ادب میں پیرے ہوئے۔ تاریخ ادب پر بڑی گہری نظر، اردو اور فارسی تذکرے انگلیوں کی پوروں پر، تاریخ ادب کی گم شدہ کڑیوں سے حیرت انگیز آگہی، پاک و ہند میں چھپنے والی ہر قابلِ ذکر کتاب ان کی بے مثل لائبریری کی زینت۔ معاصرین کی ادبی و علمی کاوشوں ہی سے نہیں، ان کے نظریات، تصورات اور ''حرکات و سکنات'' سے بھی آگہی، دنیا بھر کی مشہور خودنوشت سوانح عمریوں کا علم، قدیم رسائل و جرائد کے بے شمار مشمولات سے کثیر واقفیت، برعظیم کے تاریخی آثار اور قلمی مخطوطوں کا گہرا علم، عمدہ شعری ذوق۔ مختصر یہ کہ بہ یک وقت کلاسیکی اور جدید ادب سے اس قدر گہرا انسلاک، دیکھنے سننے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ ان سب پر مستزاد ان کے بیان کا سلیقہ۔ بس، وہ کہیں اور سنا کرے کوئی کا مضمون تھا۔ خوش مذاقی اور ظرافت سے بہرۂ وافر ملا تھا۔ ایک ہی شخصیت میں خشک تحقیقی مباحث کی جانب گہرا میلان اور طنز و مزاح کے وفور کا اجتماع ہمارے معاصر ادبی منظرنامے کا نادر واقعہ تھا۔

اس مختصر قیام کراچی میں کراچی کے کتنے ہی علمی ادارے دیکھے، علمی و ادبی شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ غالب لائبریری کا نادر ذخیرۂ رسائل دیکھا۔ مرزا ظفر الحسن، ڈاکٹر معین الدین عقیل، یوسفی صاحب، شان الحق حقی، عالی صاحب، ڈاکٹر جمیل جالبی، خواجہ حمید الدین شاہد، تابش دہلوی، جناب لطف اللہ خاں وغیرہ سے ملاقاتیں خواجہ صاحب ہی کے توسط سے ممکن ہوئیں۔ اس کے بعد کئی بار کراچی جانا ہوا۔ سوائے دو ایک موقعوں کے ہر بار خواجہ صاحب ہی کے یہاں ٹھہرا اور ان کی باتوں اور ان کی بے نظیر لائبریری سے فیض یاب ہوا۔ ان کے ہمراہ متعدد قابلِ ذکر تاریخی آثار کی سیر کی۔ وسیع و عریض ہالے جی جھیل دیکھی۔ چوکھنڈی کا مشہور عالم قبرستان دیکھا۔ ٹھٹھہ کی سیر کی۔ مکلی کے قبرستان، شاہجہانی مسجد اور دیگر متعدد آثار کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ایسے موقعوں پر خواجہ صاحب اپنی وسیع تاریخی معلومات سے بھی فیض یاب کرتے رہتے اور مزاح کی پھلجھڑیاں بھی چھوڑتے رہتے۔ خواجہ صاحب کا تعلق برعظیم کے علم دوست اور معارف آگاہ خانوادے سے تھا۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید اسلام اور اسلامی قدروں سے گہری وابستگی رکھنے والے دانش ور اور اقبال کے صحبت نشینوں میں سے تھے۔ اپنے سارے لبرل ازم کے باوجود مشفق خواجہ اسلامی اقدار کے گہرے احترام اور پاکستان سے غیر معمولی محبت کے امین اور بہرہ دار تھے۔ بیک وقت بڑے بڑے آزاد خیالوں، سیکولر دانش وروں اور اسلام دوست اہلِ فکر و نظر سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کی رگوں میں دوڑنے والا لہو ہمیشہ اسلام اور پاکستان کی صداقت، حقانیت اور ناگزیریت کی گواہی دیتا رہا۔

ایم اے او کالج کے شعبۂ اردو میں آٹھ برس رہنے کے بعد میں جب ۱۹۸۴ء میں یونی ورسٹی

اورینٹل کالج سے وابستہ ہوا تو بہت خوش ہوئے۔ ان کے علمی مشورے ہمیشہ میرے شاملِ حال رہے۔ میں اگر یہ کہوں کہ تحقیقی امور کی طرف میرے میلان کے سب سے بڑے محرک مشفق خواجہ تھے تو غلط نہ ہوگا۔ میری بہت سی تحریریں خواجہ صاحب ہی کے ایما اور تحریک کی مرہونِ منت ہیں۔ میں خواجہ صاحب کو وقتاً فوقتاً تحقیقی لوازمے کی ترسیل کی تکلیف دیتا رہتا تھا۔ میری نگرانی میں ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی کرنے والے طلبہ و طالبات اکثر میرے ایما پر خواجہ صاحب سے رابطہ کر کے ان سے علمی استمداد کرتے رہتے تھے اور یہ معاملہ صرف میرے طلبہ و طالبات تک ہی محدود نہ تھا۔ جس طرح ماضی کے صوفیۂ کرام مرجعِ خلائق بنے رہتے تھے اور ان کا فیض، فیضِ جاریہ تھا، علمی و تحقیقی امور میں خواجہ صاحب اسی طرح مرجعِ علم و تحقیق تھے۔ پورے برعظیم کے نوجوان محقق اور نئے لکھنے والے ان سے رہ نمائی حاصل کرتے رہتے تھے اور خواجہ صاحب اپنے بے مثل ذخیرۂ کتب و رسائل سے متعلقہ لوازمہ سائلوں کو بھجواتے رہتے تھے۔ ان کے فیض سے اردو کے متعدد محقق اعلیٰ تحقیقی ڈگریاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ خواجہ صاحب کی شخصیت کو تنہا اسی ایک پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا بے لوث علمی تعاون، تعریف و توصیف کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے خواجہ صاحب کے تایا زاد، مشہور عالم اور محقق، ڈاکٹر کرنل خواجہ عبدالرشید مرحوم پر ایم اے اردو کا مقالہ لکھوانے کا ارادہ کیا تو خواجہ صاحب نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ اس موضوع پر میری نگرانی میں کام کرنے والی طالبہ عزیزہ عصمت بتول سے بھرپور تعاون فرمایا۔ یہ ۱۹۸۵ء کی بات ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر میں یہاں محترمہ عصمت بتول کے نام ان کے مکتوبِ گرامی کا ایک حصہ نقل کروں جس سے خواجہ صاحب کے عظیم خانوادے کے حالات سے کسی قدر آگہی حاصل ہوتی ہے۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۸۵ء کے مکتوب میں فرماتے ہیں:

> ہمارا خاندان کشمیر سے تعلق رکھتا ہے اور ''وائیں'' کہلاتا ہے۔ ہم لوگ نومسلم ہیں۔ جدِ امجد کا نام جمال وائیں تھا۔ ان کے بیٹے کمال وائیں تھے۔ یہ زعفران کے تاجر تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کشمیر سے لاہور کب منتقل ہوئے۔ کمال وائیں کے بیٹے میاں بوٹا تھے۔ وہ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں لاہور کے خاصے متمول ٹھیکے دار تھے۔ انھوں نے بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ میاں بوٹا کے سات بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام خواجہ کریم بخش تھا۔ ان کا انتقال اکتوبر ۱۹۴۸ء میں بہ عمر ۸۵ برس ہوا۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ کی ہے۔ یہ حکومتِ پنجاب کے محکمہ محاسبی میں بطور محاسب (اکاؤنٹنٹ) ملازم تھے۔ ان کی تین بیٹے تھے، خواجہ عبدالمجید، خواجہ عبدالحمید، خواجہ عبدالوحید۔ اول الذکر مشہور لغت ''جامع اللغات'' کے مؤلف ہیں۔ خواجہ عبدالحمید الیکٹریکل انجینئر تھے۔ خواجہ عبدالرشید

انھیں کے بڑے بیٹے ہیں۔ خواجہ عبدالوحید میرے والد ہیں۔ خاندان کے تفصیلی حالات آپ اوبستان صوفیہ لاہور کی پرنسپل فقیہ طوری سے معلوم کرلیجیے، یہ خواجہ عبدالمجید کی صاحب زادی ہیں۔ محمد دین فوق کی ''تاریخِ اقوامِ کشمیر'' کی تیسری جلد میں ہمارے خاندانی حالات موجود ہیں۔

کرنل رشید کا علامہ اقبال سے کوئی براہِ راست تعلق نہ تھا۔ ان کے والد کے فرسٹ کزن اور حقیقی ماموں خواجہ فیروز الدین تھے۔ یہ علامہ اقبال کے ہم زلف تھے، علامہ کی پہلی بیوی کے تعلق سے۔ مشہور موسیقار خواجہ خورشید انور خواجہ فیروز الدین کے بیٹے ہیں۔

غور فرمائیے کیسے کیسے اہم، صاحب نظر اور روشن فکر لوگ خواجہ صاحب کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ خواجہ کریم بخش، احمد دین، الف دین، خواجہ عبدالمجید، کرنل خواجہ عبدالرشید اور خود مشفق خواجہ کے والد خواجہ عبدالوحید۔ خواجہ کریم بخش کے نام سے لاہور کا کریمی پریس کس صاحب علم کے حافظے میں محفوظ نہ ہوگا جس نے علاوہ اور علمی کتابوں کے علامہ اقبال کے بعض شعری مجموعے شائع کیے۔ ''بانگِ درا'' اور ''پیامِ مشرق'' کے پہلے ایڈیشن اسی مطبع سے شائع ہوئے (میری ذاتی لائبریری میں موجود ہیں)۔ یہ کریمی پریس پرانی کوتوالی کے نزد واقع تھا اور اس کے مالک خواجہ کریم بخش کے بھائی خواجہ امیر بخش تھے۔ خواجہ احمد دین نے ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال پر پہلی باضابطہ کتاب لکھی جو چھپی ضرور مگر شائع نہ ہوگی۔ بعد ازاں یہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ پہلے تلف شدہ ایڈیشن کے ایک بچ جانے والے نسخے اور ۱۹۲۶ء کے مطبوعہ نسخے کو بنیاد بنا کر مشفق خواجہ صاحب نے یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں شائع کی۔ یہ وہی احمد دین ہیں جن کی ''سرگزشتِ الفاظ'' آج بھی اردو کے لسانی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور جنھوں نے اورنگ زیب عالم گیر کے دفاع میں پہلی اردو کتاب ''ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب'' لکھی جو ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے سات برس بعد شبلی نے ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' شائع کی۔ شبلی کی کتاب پر احمد دین کی کتاب کا فیضان اتنا واضح ہے کہ مرحوم کرنل عبدالرشید کہا کرتے تھے کہ شبلی سرقے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تاہم مشفق خواجہ صاحب نے شبلی کی کتاب پر احمد دین کی کتاب کے فیضان کا اعتراف نسبتاً دھیمے لہجے میں کیا ہے۔ رہے الف دین تو یہ وہ بزرگ تھے جن کی ''مثنوی معارف اسلام'' کو پڑھ کر اکبر الہ آبادی نے انھیں وفات سے ایک برس قبل ایک تعریفی مکتوب لکھا تھا جسے الف دین نے اپنی مثنوی کا دیباچہ بنالیا تھا۔ اکبر نے اس مثنوی کے بارے میں ایک دلچسپ شعر بھی کہا تھا:

الف دین نے خوب لکھی کتاب کہ بے دین نے پائی راہِ صواب

لغت کے میدان میں خواجہ عبدالمجید کی چار جلدی دائرۃ المعارفی نوعیت کا فرہنگ ''جامع اللغات'' آج بھی بہت حد تک حوالے کی چیز ہے۔ کرنل خواجہ عبدالرشید سے مجھے نیازمندی حاصل رہی ہے۔ کیا صاحب نظر بزرگ تھے۔ اردو، انگریزی اور فارسی زبان و ادب پر غیر معمولی دسترس تھی۔ اس کے

علاوہ مذہبیات، آثارِ قدیمہ، موسیقی، مصوری اور خطاطی سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ قرآن کا مطالعہ بڑی عمیق نظر سے کرتے رہے۔ اردو، انگریزی اور فارسی میں ان کی تصانیف اہلِ علم سے خراجِ توصیف وصول کر چکی ہیں۔

خواجہ صاحب کے والد خواجہ عبدالوحید بھی ممتاز صاحب علم تھے۔ اسلامیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ مدت تک ''اسلام'' اور بعد ازاں ''الاسلام'' کے ایڈیٹر رہے۔ ''جدید علوم اسلامی تناظر میں'' کے موضوع پر انگریزی میں عمدہ کتاب لکھی۔ اقبال پر انگریزی میں ایک مفصل کتابیات مرتب کی۔ اقبال پر اپنی یادداشتیں شائع کیں۔ ان کی ڈائری ''اردو ڈائجسٹ'' کے مئی ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ وفات سے پہلے مشفق خواجہ صاحب اسی ڈائری پر اپنے حواشی مکمل کر چکے تھے جو عنقریب شائع ہوگی۔ خواجہ عبدالوحید کی اپنے عہد کے ممتاز ادبا سے خط و کتابت رہی۔ اقبال، ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریا بادی اور سید سلیمان ندوی جیسے مشاہیر کے خطوط خواجہ صاحب کی نادر لائبریری میں محفوظ ہیں، علاوہ بیسیوں دیگر اہم لکھنے والوں کے مکاتیب کے جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

مرحوم مشفق خواجہ نے اپنے اجداد کے علی الرغم نہ تو محابی کی نہ زعفران کی تجارت مگر ان کی تحریروں میں محابی اور زعفرانیت کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اپنے کالموں میں معاصر ادب کا جیسا کڑا احتساب انھوں نے کیا اور ساتھ ہی ساتھ انھی تحریروں میں ظرافت کے جیسے زعفرانی پھول انھوں نے کھلائے اس کی مثال نایاب کی حد میں داخل ہے۔ میں خواجہ صاحب اور ان کے خاندان کے بارے میں سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ نادرہ کاری اور نادرہ فکری ان کے خمیر میں شامل تھی۔ خواجہ صاحب کے علمی کاموں کی فہرست پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مختصر نظر آتی ہے مگر ان کے موضوعات پر نگاہ کرتا ہوں تو ان کی تازہ کاری، تکمیلیت پسندی اور معیار بندی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب سے خواجہ صاحب کو بڑی دل چسپی تھی۔ اس میں جہاں ان کے ذاتی میلان کو دخل ہے وہاں مولوی عبدالحق کی پانچ برس کی صحبت نشینی کو بھی دخل رہا ہوگا۔ ایک زمانے میں خواجہ صاحب نے ''پرانے شاعر، نیا کلام'' کا سلسلۂ مضامین سہ ماہی ''غالب'' کراچی میں آغاز کیا تھا۔ یہ مضامین ان کلاسیکی شعرا پر تھے جو اردو کے نقادوں اور مورخینِ ادب کی نگاہ سے اوجھل تھے۔ پروانہ، ولی اللہ محبؔ اور خواجہ بیاںؔ وغیرہ پر لکھ کر دراصل انھوں نے تاریخ ادب کی گم شدہ مگر اہم کڑیوں کو دریافت کرنے کا فرض انجام دیا۔ ''تحقیق نامہ'' میں انھوں نے کس قدر درست کہا تھا کہ وہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہیں۔ یعنی وہ عموماً ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جن پر کام نہ ہوا ہو۔ قزلباش خاں امیدؔ، قدرت اللہ قدرتؔ، گلشن مشتاقؔ اور مرزا جعفر علی حسرتؔ جیسے مضامین اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ان کے تحقیقی کام کا تصور کریں تو ہر جگہ ان کی غیر معمولی ریاضت اور ساتھ ہی ساتھ وسعتِ نگاہ

کا احساس ہوتا ہے۔ سعادت خان ناصر کے تذکرۂ ''خوش معرکۂ زیبا'' سے آگے بڑھیے جس کی پہلی جلد اس وقت شائع ہوئی جب خواجہ صاحب کی عمر پینتیس برس تھی اور ''جائزۂ مخطوطات اردو'' جلد اول تک پہنچیے اور وہاں سے ''غالب اور صفیر بلگرامی'' تک نگاہ دوڑاتے ہوئے ''تحقیق نامہ'' اور ''کلیات یگانہ'' کی تدوین تک آجایئے، ہر جگہ خواجہ صاحب کی محنت اور تلاش و تازگی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پیش قدمی کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ''جائزۂ مخطوطات اردو'' محض پاکستان میں موجود اور مخطوطات کی فہرست بندی تک محدود نہیں، اس سے کہیں آگے کی چیز ہے اور نام نہاد فہرست ساز محققوں کی پیٹھ پر ایک زبردست تازیانے کا حکم رکھتی ہے، مثلاً خواجہ صاحب نے اس کتاب میں کسی خاص مخطوطے کے بارے میں لکھا ہے تو اس کی اہمیت کو بھی خوبی سے اجاگر کیا ہے اور اس کے جس قدر نسخوں کا علم ہوسکا ہے ان کی نشان دہی کردی ہے۔ علاوہ ازیں بعض مخطوطات کے باب میں اور ان کے مصنفین کے ضمن میں تحقیقی مسائل سے بھی اعتنا کیا ہے۔ اگر مخطوطہ کسی ذاتی کتب خانے میں ہے تو کتب خانے کے مالک کا پتا بھی درج کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ گویا خواجہ صاحب کا یہ کام محض وضاحتی فہرست تک محدود نہیں رہا بلکہ سوانحی و کتابیاتی جائزے کی شکل اختیار کرگیا ہے۔

وفات سے دو برس پہلے اور اب تک کا ان کا آخری کارنامہ ''کلیات یگانہ'' کی تدوین ہے۔ یہ تدوین جہاں یگانہ شناسی کے باب میں ایک نئے عہد کا دیباچہ ثابت ہوگی وہیں میرے خیال میں ہماری معاصر اردو غزل کو بھی ایک نئی کروٹ دے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یگانہ کا کلام ایک مدت سے نایاب کے حدود میں داخل تھا۔ خواجہ صاحب نے نہ صرف ان تمام نایاب مجموعوں کی اشاعت کا اہتمام کیا بلکہ یگانہ کے کم و بیش مطبوعہ کلام کے برابر مقدار کا کلام اس کی بیاضوں سے ڈھونڈ نکالا اور یوں ساڑھے نو سو صفحات کی کلیات مرتب کرکے شائع کردی۔ خواجہ صاحب نے یگانہ کی بعض اخلاق سوز اور ناگفتنی چیزیں حذف بھی کی ہیں۔ یہ امر تدوین کے اصول کے منافی ہے یا نہیں، بہت کچھ قابلِ بحث ہے، تاہم ایک محقق کے نقطۂ نگاہ سے یہ امر ایک کمی کا آئینہ دار ضرور ہے۔ مراد یہ ہے کہ یگانہ کے کامل متن تک پہنچنے کے لیے ایک درجے میں محقق کو اس کے پہلے ایڈیشنوں کی ضرورت بہ ہر حال رہے گی۔ تاہم بحیثیت مجموعی ''کلیات یگانہ'' تدوینِ متن کے بے نظیر نمونے کے طور پر مدت تک پیش کی جاتی رہے گی:

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

اس عہدِ مقدار پرست میں تخلیق، تنقید اور تحقیق کی ت تک سے ناواقف لوگ خواجہ صاحب کی تصانیف و تالیفات کی عددی کمی کی دہائی دیتے ہیں مگر خواجہ صاحب کا علمی سرمایہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کی ایک زندہ برہان ہے۔ خواجہ صاحب نے کتابی شکل دینے سے پہلے اپنی ہر تصنیف کو نظرِ ثانی و ثالث سے گزارا ہے۔ اپنے کالموں تک پر نظرِ ثانی کی۔ مجھے کالموں کا پہلا مجموعہ بھیجتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا کہ ان کالموں پر اس قدر قلم لگایا گیا ہے گویا انھیں ازسرِ نو لکھا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کی تکمیلیت

پسندی ان کے بہت سے علمی منصوبوں کا سنگِ راہ ضرور بنی، مثلاً ''جائزۂ مخطوطاتِ اردو'' کا اصل منصوبہ چھ سات ضخیم مجلدات کا تھا مگر صرف ایک ہی جلد شائع ہو سکی۔ ان کی ۱۹۸۰ء کی ایک تحریر سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس سلسلے کی دوسری جلد پر نظرِ ثانی کر رہے تھے۔ کرنل خواجہ عبدالرشید کے نام اپنے ۲۲/ مارچ ۱۹۸۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> میں آج کل ''جائزۂ مخطوطات'' کی دوسری جلد کی نظرِ ثانی کر رہا ہوں۔ اس کی طباعت یکم جولائی سے شروع ہوگی۔

اس سے چار سال قبل ۲/ جنوری ۱۹۷۶ء کو کرنل صاحب ہی کے نام خط میں ''جائزۂ مخطوطات'' ہی کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> یہ کام بہت بڑا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ پاکستان میں تین ہزار کے قریب اردو مخطوطات ہیں۔ پہلی جلد میں صرف دو سو مخطوطات پر حواشی ہیں، دوسری جلد میں کم و بیش پانچ سو مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔۔۔۔۔ میں ہمہ تن اسی کام میں مصروف ہوں۔ ملازمت چھوڑنے کا سبب دراصل یہی کام تھا۔ دعا کیجیے کہ میں اسے بہ حسن و خوبی مکمل کر سکوں۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ میرے نام ۲۵/ اگست ۱۹۸۶ء کے ایک خط میں بھی ''جائزۂ مخطوطاتِ اردو'' کی دوسری جلد پر نظرِ ثانی کا ذکر کیا ہے:

> جی ہاں! ''جائزۂ مخطوطات'' کی دوسری جلد مقتدرہ سے چھپے گی۔ اردو بورڈ تو سائنس بورڈ بن گیا، لہٰذا اس کے غیر سائنسی منصوبے مقتدرہ نے لے لیے۔ دوسری جلد پر نظرِ ثانی کا کام جاری ہے تاکہ نئے سال سے طباعت شروع ہو سکے۔

ڈاکٹر وحید قریشی راوی ہیں کہ ''جائزۂ مخطوطات'' کی دوسری جلد ایک مدت تک نظرِ ثانی و ثالث کے مراحل سے گزر کر جب مقتدرہ کے سپرد ہوئی تو اس کے کچھ عرصے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی ان کی جگہ مقتدرہ کے چیئرمین ہو گئے۔ جالبی صاحب نے جلد ہی ''قومی انگریزی اردو لغت'' کا ڈول ڈال دیا۔ چناں چہ خواجہ صاحب کی دوسری جلد پس منظر میں چلی گئی۔ بعد میں خواجہ صاحب نے اسے واپس لے لیا۔ روایت ہے کہ وفات سے پہلے دوسری جلد پر نظرِ ثانی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وفات سے قبل خواجہ صاحب اپنے والد مرحوم کی ڈائری پر حواشی مکمل کر چکے تھے نیز واجد علی شاہ کے چھوٹے بھائی مرزا سلیمان قدر کے روزنامچے ''فرمانِ سلیمانی'' پر بھی نظرِ ثانی اور حواشی کا کام مکمل کر چکے تھے۔ یہ دونوں کتابیں اب کراچی یونی ورسٹی کا شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ شائع کرے گا۔

خواجہ صاحب کا ایک اور ناقابلِ فراموش کارنامہ ''تخلیقی ادب'' کا اجرا تھا۔ خواجہ صاحب کا محقق ہونا مسلّم مگر ان کی شخصیت میں، ان کے باطن میں ایک تخلیق کار کا دل دھڑکتا تھا۔ انھوں نے اپنے

ادبی کیریئر کا آغاز شاعری سے کیا تھا اور وہ تخلیقی ادب کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ شعر و ادب کا بڑا لطیف ذوق رکھتے تھے۔ چناں چہ ۱۹۸۰ء میں انھوں نے بیک وقت "تخلیقی ادب" کے دو شمارے شائع کیے۔ یہ شمارے کیا تھے آفت کے پرکالے تھے۔ ان پرچوں نے پورے برعظیم کی ادبی دنیا میں ارتعاش پیدا کیا۔ خواجہ صاحب کے تعلقات پاک و ہند کے تمام بڑے لکھنے والوں سے تھے۔ ان سے ان کی غیر مطبوعہ تحریریں حاصل کیں۔ اردو ادب کے دس سال (۱۹۷۰ء۔ ۱۹۷۹ء) کے زیر عنوان ناول، افسانے، ڈرامے، سفرنامے، انشائیے، خاکے، طنز و مزاح، نظم، غزل، تنقید اور اسلامی ادب پر معروف و ممتاز لکھنے والوں سے مقالات لکھوائے اور انھیں "تخلیقی ادب" کے دوسرے شمارے میں شائع کیا۔ یہ دوسرا شمارہ خاص طور پر ہنگامہ خیز ثابت ہوا اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ میرا مقالہ "اردو تنقید کے دس سال"۔ اگر میں یہ کہوں کہ اردو دنیا میں میری تنقید نگاری کا یہ پہلا بھرپور تعارف تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اس دوسرے شمارے میں مرزا یاس یگانہ چنگیزی پر بھی ایک ناقابلِ فراموش گوشہ قائم کیا گیا تھا۔ تقریباً دو سو صفحات کا یہ گوشہ یگانہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے آج بھی ناگزیر ہے۔ ضمناً یاد آیا کہ اس کے کچھ عرصے بعد خواجہ صاحب نے سہ ماہی "اردو" کراچی کے ایک شمارے (اپریل تا دسمبر ۹۳ء) کا بڑا حصہ یگانہ کے غیر مدوّن مضامین کے لیے وقف کیا۔ خواجہ صاحب نے "تخلیقی ادب" کے کل پانچ شمارے شائع کیے۔ پانچ شمارے کیا تھے، پانچ فرزند تھے جنھیں اپنا خونِ جگر پلایا۔ اپنے مطالب اور پیش کش کے اعتبار سے ناقابلِ فراموش!! اور پھر کراچی کے حالات اور خواجہ صاحب کی دیگر علمی مصروفیات کے باعث یہ پرچہ بند ہوگیا۔ ادبی حلقوں میں یہ پرچہ مدت تک یادگار رہے گا۔ "تخلیقی ادب" سے بچتا بچاتا تو کیا تھا جیسا کہ خواجہ صاحب کے بعض خطوط سے ظاہر ہے مگر حیران کن بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب لکھنے والوں کو کم ہی سہی مگر معاوضہ بھی بہ ذریعہ چیک ادا کیا کرتے تھے۔ اب ایسے پراگندہ طبع لوگ کہاں ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ "تخلیقی ادب" کی کتابت لکھنؤ میں ہوتی تھی۔ پروف لاہور میں محمد عالم مختار حق پڑھتے تھے۔ پرنٹنگ کراچی میں ہوتی تھی۔ یگانہ کے ذکر پر یاد آیا کہ خواجہ صاحب کی مرتبہ "کلیاتِ یگانہ" کا ٹائٹل دیکھیے، کہیں خواجہ صاحب کا نام بطور مرتب نہیں، اندر کے ٹائٹل کو دیکھ جائیے، وہاں بھی مضمون واحد ہے، ہاں اندر کے ٹائٹل کی دوسری جانب جہاں پرنٹ لائن ہے وہاں سب سے نیچے دائیں طرف لکھا ملے گا مرتب: مشفق خواجہ۔ اپنی ذات کی اہمیت کے کامل شعور کے باوجود اپنی ذات کی ایسی نفی ہمارے معاصر اردو منظرنامے میں نایاب بلکہ معدوم ہے۔ کیسا کیسا بڑھاوا اپنے خردوں کو دیتے تھے۔ متعدد علمی کام جو بہ سہولت خود کر سکتے تھے اپنے نیاز مندوں سے کرواتے تھے تاکہ نیاز مندوں کے لیے تعارف اور ترقی کے راستے کھلیں۔ خواجہ صاحب کی اس ادا پر اقبال کا ایک مصرع یاد آئے بغیر نہیں رہ سکتا:

خالی از خویش شدن صورتِ مینائش بود

دوستوں کے دوست تھے۔ ان کے لیے ایسا ایثار کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ محسنوں

کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں پاکستانی مطبوعات کا شعبہ انھیں کے ایما پر قائم ہوا۔ انجمن ترقی اردو دہلی میں ایسا ہی شعبہ ابن انشا کے نام پر قائم کرایا۔ دوستوں اور نیاز مندوں کی کتابیں اپنے خرچ پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، رضا لائبریری رامپور، انجمن ترقی اردو ہند اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کو بھجواتے تھے۔ ساری زندگی حقائق علم کی تلاش اور ترویج میں گزار دی۔ ہاتھ ہمیشہ اُوپر کا رہا۔ علم اور تحقیق بانٹتے رہے۔ اب ایسا قاسم علم کہاں ملے گا؟

کسی گوشے کونے میں علم و اخلاص کی نمود دیکھتے تو اس کی تحسین کرتے۔ ۲۰۰۲ء میں اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو کے اساتذہ نے شعبے کے زیرِ اہتمام ایک تحقیقی و تنقیدی پرچہ نکالنے کا قصد کیا۔ خواجہ صاحب کو پتا چلا تو بہت خوش ہوئے۔ پرچے کا نام "بازیافت" رکھا گیا تھا۔ نام ان کے لیے مزید موجبِ مسرت ہوا۔ پہلا پرچہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی ادارت میں نکلا۔ بعد کے تین شمارے میری ادارت میں شائع ہوئے۔ پرچوں کو بہت سراہا خصوصاً اس کے تحقیقی مشمولات کی بہت تعریف کی۔ یہ مشورہ بھی دیا کہ پرچہ ہندوستان کے علمی مراکز تک پہنچنا چاہیے۔ مجلس مشاورت کی رکنیت بڑی مشکل سے قبول کی۔ "بازیافت" کے چوتھے شمارے میں جب ان کی مرتبہ "کلیاتِ یگانہ" پر ایک تفصیلی ریویو شائع ہوا تو اس پر کسی خوشی کا اظہار نہ کیا۔ کہا تو یہ کہا کہ نہ چھپتا تو بہتر تھا، کہنے والے کہیں گے کہ دوست نوازی کی گئی ہے۔ ایک خط میں مجھے مدتوں پہلے لکھا تھا کہ "مشفق خواجہ ایک مطالعہ" (مرتبہ خلیق انجم) پچھلے پانچ برس سے پاس ہے، کھول کر بھی نہیں دیکھی۔"

میرا احساس ہے کہ مشفق خواجہ جس قد کاٹھ کے ادیب تھے، اس قدر ان کی پذیرائی نہ ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خواجہ صاحب کی بے مثل علمی، تحقیقی اور تخلیقی خدمات کے اعتراف میں ان کے جیتِ حیات ان کے حضور کوئی ڈھنگ کا ارمغانِ علمی پیش کیا جاتا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ میں نے اور میرے دوستوں نے بھی ایک ابتدائی خاکہ تیار کیا مگر افسوس ہم بوجوہ اس سلسلے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اگر خواجہ صاحب کو اس تجویز کا علم ہوتا تو وہ نہایت سختی سے اس کی مخالفت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ اسلام آباد کے ایک علمی و ادبی سوجھ بوجھ رکھنے والے نوجوان راشد حمید نے ۲۰۰۲ء میں ان کے اسلام آباد آنے پر (افسوس یہ خواجہ صاحب کا اسلام آباد کا آخری پھیرا تھا) مجھ سے کہا کہ میں خواجہ صاحب سے نوائے وقت کے ادبی صفحے میں انٹرویو کے لیے ان کی سفارش کروں۔ مجھے خوش گمانی تھی کہ خواجہ صاحب میرا کہا نہیں ٹالیں گے مگر انھوں نے انٹرویو دینے سے صاف معذرت کی۔ اس دورِ اشتہار سرشت میں ایسی بے نفسی اب کہاں ہے؟

خواجہ صاحب مسلم تاریخی آثار، قدیم و کہنہ بُرج و بارو، پرانے مخطوطات اور نمایاں علمی مراکز اور کتاب خانے دیکھنے کو ہمیشہ بے چین رہتے۔ لاہور آتے تو ممتاز عالم اور مخطوطہ شناس خلیل الرحمن داؤدی سے ضرور ملاقات کی سبیل نکالتے۔ اس موقعے پر نایاب قلمی نسخوں پر باتیں چلتیں۔ کئی علمی نکتے آشکار

ہوتے۔ قیسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ داؤدی صاحب کے حافظے کے کمال اور آثار و انساب پر ان کی گہری نظر کے بڑے معترف تھے۔ ایک دفعہ لاہور آئے تو پروفیسر مرزا محمد منور سے ان کے گھر پر ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں ساتھ تھا۔ مرزا محمد منور کی خوش گفتاری اور نکتہ طرازی سے بہت متاثر ہوئے۔ واپسی پر کہنے لگے یہ شخص جلال الدین اکبر کے زمانے میں ہوتا تو اس کے نورتنوں میں شامل ہوتا۔ میرزا ادیب سے بھی نہایت محبت اور اخلاص سے ملتے تھے۔ پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد اسلم سے بڑی محبت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ ایک دفعہ لاہور آئے تو ان کی معیت میں لاہور کے تاریخی آثار کی خوب سیر کی۔ ملا بدخشی، حضرت میاں میر، شرف النساء اور حضرت الشیاںؒ کے مقبرے پر خاصا وقت گزارا۔ جی ٹی روڈ کے کنارے آباد مزار دائی انگہ کی زیارت کی۔ پروفیسر اسلم مرحوم کے علم تاریخ و انساب کے بڑے معترف تھے مگر ساتھ ہی کہا کرتے تھے کہ پروفیسر صاحب موزوں طبع نہیں۔ لاہور میوزیم کے ڈاکٹر انجم رحمانی سے بھی رشتۂ اخلاص تھا۔ بعض ممتاز و معروف ادبا و شعرا (قدیم و جدید) کی نجی زندگیوں کے بارے میں حیران کن معلومات رکھتے تھے۔ خواجہ صاحب ایک ممتاز علمی خانوادے کے رکن رکین تھے۔ متعدد اہلِ علم کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ کتاب سے غیر معمولی وابستگی نے بھی ان پر علم و دانش کے در وا کردیے تھے۔ زیادہ تر گوشہ نشینی کی زندگی گزاری مگر کبھی کبھی مجلس آرائی کی سبیل بھی نکالتے۔ مخصوص دوستوں کی محفل میں ہوتے تو کھل اٹھتے۔ طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے، نکتے اٹھاتے۔ کتابوں کی باتیں ہوتیں۔ لاہور آتے تو وحید قریشی صاحب کے دفتر میں محفلیں جمتیں اکرام چغتائی، جعفر بلوچ، صدیق جاوید، انور سدید، خواجہ محمد زکریا، مظفر علی سید، رفیع الدین ہاشمی، شاہد حمید اور متعدد دیگر ادیبوں کی پالیاں جمتیں۔ کچھ لوگ جارہے ہیں، کچھ آرہے ہیں، خرد و بزرگ کی کوئی قید نہیں۔ دور مسلسل چل رہا ہے۔ علم و آگہی اور تفریح و تفنن کے موتی رولے جارہے ہیں۔ رات کی محفلیں اس پر مستزاد۔ اپنے آپ کو کسی خود ساختہ چار دیواری میں بند نہیں کیا تھا۔ ہر طبقۂ خیال کے ادبا و شعرا سے ان کا میل جول تھا مگر ان کے اندر کا مرکزِ ثقل کاملاً اعلیٰ اقدارِ حیات سے عبارت اور مربوط تھا۔ زندگی کے آخری برسوں میں بیدل عظیم آبادی کی طرف بھی میلان ہوگیا تھا۔ چناں چہ اپنے گھر میں درسِ بیدل کا سلسلہ شروع کیا۔ افسوس زیادہ دیر نہ چل سکا۔ پروفیسر لطیف اللہ درس دیتے تھے۔ اللہ انھیں تادیر سلامت رکھے۔

ایک مدت سے پاکستان کے ایک ممتاز نجی کتب خانے جھنڈیر لائبریری کو دیکھنے کے متمنی تھے۔ میلسی سے تیس بتیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع موضع جھنڈیر میں سردار مسعود اور محمود برادران نے ایک بے مثل لائبریری قائم کر رکھی ہے جس میں کتب و نادر مخطوطات کا قابل قدر ذخیرہ ہے۔ بالآخر چند دوست ۲۰۰۰ء میں لاہور سے اس نادر مرکزِ علمی کو دیکھنے کے لیے وہاں پہنچے۔ خواجہ صاحب کراچی سے تشریف لائے۔ تین دن قیام رہا۔ جھنڈیر کی سخت گرمی کے باوجود خواجہ صاحب کی صحبت میں، کتب و مخطوطات کی معیت میں اور سردار برادران کے اخلاص کے سائبان تلے بڑا اچھا وقت گزرا۔ رات کو پلکھن کے درخت کے وسیع سایے سے ذرا

ہٹ کر کرسیاں ڈال دی جاتیں اور دنیا جہان کی باتیں ہوتیں۔ جعفر بلوچ کے قہقہے گونجتے۔ اب وہ یادگار گزرے لمحے کہاں سے لاؤں۔ پلکھن کے درخت کا ذکر یا "کارِ جہاں دراز ہے" میں پڑھا تھا یا پھر حضرت خواجہ کی معیت میں جھنڈیر میں اسے دیکھا اور کئی روز دیکھا۔ اس کی وسیع پھیلی ہوئی مہرباں شاخیں، دراز بازوؤں کی طرح حافظے کے گوشوں میں اب تک قوس طراز ہیں۔ اے خواجۂ من!

نہ در برابرِ چشمی، نہ غائب از نظری

جب لاہور آتے تو اپنے قیام کے دوران اورینٹل کالج کے شعبۂ اردو میں بھی ایک آدھ دفعہ آتے۔ بالعموم شعبے کے چند اساتذہ اور کبھی کبھار بعض اعلیٰ کلاسوں کے طلبہ سے بھی ملتے۔ ایم فل، پی ایچ ڈی، کے معنی خیز موضوعات سجھاتے۔ ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ اٹھارھویں صدی کی اردو شاعری کی فرہنگ، شاہ حاتم اور ان کے معاصر، بچھمی نرائن شفیق (صاحب تخلص بھی کرتے تھے) اور مخمور اکبر آبادی وغیرہ موضوعات پر پی ایچ ڈی کروائیں۔ "انیسویں صدی کے اردو گلدستے" موضوع بھی انھی کا تجویز کردہ تھا جس پر رفاقت علی شاہد نے پی ایچ ڈی کا مقالہ میری نگرانی میں تحریر کیا۔

تحقیق کی انتہائی مرتکز دنیا سے ہٹ کر خواجہ صاحب نے کالم نگاری بھی کی اور خوب کی۔ خامہ بگوش کا نقاب اوڑھا مگر صورت حال یہ تھی کہ: صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو۔ کالموں میں مزاح کی لطافت کے دوش بدوش طنز کی کاٹ بھی بے پناہ ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب کی کالم نگاری ہمارے عہد میں اپنی منفرد شان رکھتی ہے۔ معاصر کالم نگاروں میں مجھے ایک بھی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس کی نگاہ جدید و قدیم پر ایسی گہری اور تہ رس تھی۔ خواجہ صاحب کی وسعتِ مطالعہ اور تحقیقی امور پر ان کی عمیق نظر مزاح اور طنز کی لطیف چاشنی سے آمیز ہو کر اپنا جلوہ دکھاتی ہے تو ہوش مند قاری بے اختیار سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فنی فنی میں معاصر اردو ادب کا ایسا کڑا احتساب شاید ہی کسی دوسرے شخص نے کیا ہوگا جیسا خواجہ صاحب نے ہمارے عہد میں کیا۔ ایسا کام مصلحت اور منافقت سے دور رہ کر ہی ممکن تھا۔ یہ کالم جہاں ایک طرف مزاح و ظرافت کا زعفران زار سجاتے ہیں وہیں لکھنے والے کے گہرے شعور نقد اور تحقیقی ژرف نگاہی کا آئینہ بھی بنتے ہیں۔ ان کالموں میں مزاح کا جو حربہ کثرت سے استعمال ہوا ہے اسے آپ تقلیبی حربہ کہہ لیجیے۔ یعنی بہ ظاہر تعریف و توصیف سے شروع ہونے والی تحریر اچانک ایک تیکھا موڑ مڑتی ہے اور پوری سابقہ صورت حال کی تقلیب کر کے ہنسی کو تحریک دیتی ہے۔ صرف تین مختصر اقتباسات دیکھیے:

۱) "شب خون" رسالہ نہیں ایک تحریک ہے جو اردو ادب میں نئے خیالات و رجحانات کی آبیاری کر رہی ہے جس طرح زلزلے اور سیلاب جیسی آفات ارضی کے متاثرین بے شمار ہوتے ہیں اسی طرح "شب خون" سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بھی شمار سے باہر ہے۔

("شاعری پر شب خون"، مشمولہ "سخن ہائے ناگفتنی" ص۔ ۱۷)

۲) سحر انصاری کو خدا نے جو مقبولیت بخشی ہے وہ کم ادیبوں کے حصے میں آئی ہے۔ وہ نوجوانوں ہی میں نہیں، بزرگوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ استاد لاغر مراد آبادی نے وصیت کر رکھی ہے کہ ان کی نمازِ جنازہ سحر انصاری سے پڑھوائی جائے۔“

ایضاً، ص۔۳۸

ہم ظفر اقبال کے ایثار کی قدر کرتے ہوئے انھیں مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ وہ دوسروں کی شاعری کو بلا تکلف نذرِ آتش کر دیں لیکن اپنی شاعری کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں کیوں کہ جیسی اعلیٰ درجے کی شاعری انھوں نے اب تک کی ہے، ویسی کوئی دوسرا تو کیا، وہ خود بھی نہیں کر سکتے...... شاعری کو نذرِ آتش کرنے یا ضائع کرنے سے ہمیں یوں بھی اتفاق نہیں ہے کہ جو کام آنے والے زمانے کو کرنا ہے اسے ہم کیوں انجام دیں۔ ہر کام اپنے وقت پر اور مناسب ہاتھوں سے انجام پانا چاہیے۔

”سخن در سخن“، ص ۳۰۔۳۱

یہ بات معلوم ہے کہ خواجہ صاحب کے کالم پورے برِعظیم میں مقبول ہوئے اور اس درجہ کہ ہندوستان میں یہ پانچ چھ جگہ نقل ہوتے تھے۔ ان کے جملوں کے جملے زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ مقبولیت کی اس انتہا پر پہنچ کر خواجہ صاحب نے ایک سہانی صبح کالم نویسی ترک کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر آخر تک اپنے اس فیصلے پر قائم رہے۔ میں نے ایک دفعہ اس فیصلے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یہ ترک دو وجوہ کی بنا پر تھا: ایک تو یہ کہ مجھے اپنے اصل علمی و تحقیقی کام کے لیے وقت نہیں مل رہا تھا، دوسرے یہ کہ جب ان کالموں کو کتابی شکل دینے کے لیے میں نے دوبارہ دیکھنا شروع کیا تو جا بہ جا اسلوب و مضامین کی تکرار نظر آئی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ میں خود کو دہرانے لگا ہوں، لہٰذا اس کام کو ترک کر دینا لازم ٹھہرا۔ معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب کے اندر کا محتسب صرف اپنے عہد کے ادب ہی کا احتساب نہیں کرتا تھا، اپنا محتسب بھی تھا! خواجہ صاحب نے خود تو اپنے ایک شعر میں کہا تھا:

مثالِ عکسِ گنجِ ذات سے باہر رہا ہوں میں
کہ آپ اپنے مقابل آئنہ بن کر رہا ہوں

شعر کا ذکر آیا تو خواجہ صاحب کے اکلوتے شعری مجموعے ”ابیات“ کا احوال بھی بے محل نہ ہوگا: یہ مجموعہ ایک ہی دفعہ شائع ہوا تھا ۱۹۷۸ء میں۔ خواجہ صاحب نے میرے نام اپنے بعض مکتوبات میں اپنے دو چار شعر ضرور درج کیے ہیں مگر وہ اپنی شاعری کا ”گرہ شاذ ہی اپنی تحریروں یا گفتگو میں کرتے تھے، حالاں کہ میرے نزدیک یہ ان کی باطنی دنیا کی صادق ترین مظہر ہے۔ یہ اندر سے ٹوٹے ہوئے شخص

کا نوحۂ غم ہے۔ محبت کا نرم اور لطیف لہجہ، گداز، ربودگی، یاد آفرینی، آئینہ، حیرت، آئینہ در آئینہ اور چراغ اس شاعری کے عناصرِ ترکیبی تھے۔ افسوس ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری کو نقادوں یا جائزہ نگاروں نے تو کیا خود خواجہ صاحب نے بھی لائقِ توجہ نہ سمجھا، حالاں کہ اس شعری مجموعے کی بعض غزلیں اور کئی شعر دامنِ دل کھینچتے ہیں۔ خواجہ صاحب کو مضمون بنانے کا فن آتا تھا۔ ان کی بعض غزلیں ایک طرح کی case-history ہیں:

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مُڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا
وقت کتنا رہا ہے خانوں کی راتوں کی طرح
رہے گردش میں یہ دن رات کے ساغر کیا کیا
رہ گزر دل کی نہ پل بھر کو بھی سنسان ہوئی
قافلے غم کے گزرتے رہے اکثر کیا کیا

اے مشفقِ من اس حال میں تم کس طرح بسر فرماؤ گے
انجان بنے چپ بیٹھو گے اور جان کے دھوکے کھاؤ گے
ان دیدہ و دل کی راہوں پر تم کس کی تلاش میں پھرتے ہو
جو کھونا تھا سو کھو بیٹھے کیا ڈھونڈو گے کیا پاؤ گے
تم خلوتِ غم سے نکلو تو اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں
اک بار جو اُن کو دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے

اسی بحر میں خواجہ صاحب کی ایک اور غزل بھی ہمارے محسوسات کو مرتعش کرتی ہے اور ہمارے اندر گہری اداسی کی لکیر سی چھوڑ جاتی ہے:

کیوں خلوتِ غم میں رہتے ہو، کیوں گوشہ نشیں بے کار ہوئے
آخر تمھیں صدمہ کیا پہنچا کیا سوچ کے خود آزار ہوئے
کیوں صاف کشادہ رستوں پر تم ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہو
کیوں تیرہ و تار سی گلیوں میں تم آن کے خوش رفتار ہوئے
کیوں ایسے سفر پر نکلے ہو منزل نہیں جس کی کوئی بھی
کیوں ایسی راہ پہ چلتے ہو سایے بھی جہاں دیوار ہوئے
کیوں ترکِ علائق کو تم نے سمجھا ہے علاجِ غم آخر!
دیکھو تو ولی صوفی بھی یہاں کس ٹھاٹ کے دنیا دار ہوئے

اس کلبۂ احزاں سے ہرگز ابھرے گا نہ سورج کوئی بھی
کب خاک ستارہ بار ہوئی، کب سایے سحر آثار ہوئے
اُس کوچے کی راہ تو سمجھاؤ جس کوچے میں جانا مشکل ہے
اُس شخص کا نام تو بتلاؤ تم جس کے لیے بیمار ہوئے

اس غزل کا سارا لطف ہی اس کے عدم تشخص میں ہے۔ کیسا دل گداز لہجہ ہے اس پوری غزل کا۔ تو کیا خواجہ صاحب کی ساری مزاج آفرینی اور ظرافت کاری ان کے گہرے دکھ، ان کی شکستہ محبت کا پردہ تھی؟ بہ ظاہر ایسا ہی لگتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ ان کی شخصیت کی بافتوں میں زخم اور ظرافت دونوں کی مساوی جگہ تھی۔ یہ گوشت اور پوست کا معاملہ تھا۔ یہ باہم شیر و شکر ہو گئے تھے اور اسی سے ان کے ہاں زندگی کرنے کا سلیقہ پیدا ہوا تھا۔ اگر ظرافت ان کی شخصیت میں کوئی اوپر سے ڈالی ہوئی چیز ہوتی، محض نقاب ہوتی تو یہ ان کی تحریر اور گفتگو میں اس قدر بے ساختہ پن کے ساتھ کبھی ظہور نہ کرسکتی۔ انھیں یادِ یار مہرباں آتی رہی اور زندگی کرنے اور گرم سفر رہنے پر مہمیز بھی کرتی رہی۔ خواجہ صاحب کو غم کی اس نعمت پر کیا کیا ناز تھے:

ہر شخص سزاوار نہیں دولتِ غم کا
ہر شخص کو ملتا نہیں یہ منصبِ عالی

رہتا آنکھوں میں کہاں شام و سحر ایک ہی شخص
زندگی بن نہ گیا ہوتا اگر ایک ہی شخص
ہنسنے والے تو ہزاروں تھے مگر ہم کو ملا
رونقِ انجمن دیدۂ تر ایک ہی شخص

خود خواجہ صاحب اپنی شگفتگیِ طبع کو اپنے غم کا پردہ ہی کہتے تھے۔ میرے نام اپنے ۹ر جولائی ۱۹۸۰ء کے خط میں بغیر کسی لگی لپٹی کے لکھتے ہیں:

رہی شگفتگیِ طبع تو یہ غم کا پردہ ہے۔ اس غم کا احوال آپ کو "ابیات" کے مطالعے سے معلوم ہوگا۔

خیر، ان کے بعض قریب ترین معاصرین کو معلوم ہو تو ہو، ہمارے سامنے تو بہ ہر حال ایک سوال ہے جو صدائے بازگشت کی صورت میں ذہن کے گنبد میں ارتعاش پیدا کرتا ہے اور کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک پیہم سوال:

اس شخص کا نام تو بتلاؤ تم جس کے لیے بیمار ہوئے؟
اس شخص کا نام تو بتلاؤ تم جس کے لیے بیمار ہوئے؟؟

اس شخص کا نام..... تم جس کے لیے ..... بیمار ہوئے؟؟؟

مگر یہ سوال تو اب حشر تک مؤخر ہوگیا۔ وہاں ملاقات ہوئی تو ان سے پوچھیں گے ضرور: اس شخص کا نام تو..... ممکن ہے جواب ملے تو یہ کہ:

ہزار حشر میں پرسش ہوئی مگر ہم نے
نہ دل کا زخم دکھایا نہ ان کا نام لیا

''ابیات'' میں سامانِ اشک و آہ تو ہے مگر یہ سارا کاروبارِ شوق ''دھیمے سروں'' میں جادو جگاتا ہے۔ ہمسایے کی نیند خراب نہیں کرتا۔ نالہ محض ایک آدھ۔ بعض جگہ سادگی میں تہ داری اس خوبی سے آمیز کی ہے کہ سہلِ ممتنع کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے:

تم جو پوچھو کہ تمنا کیا ہے	میں یہ سوچوں مجھے کہنا کیا ہے
اس طرح کیسے کٹیں گی راتیں	غمِ دل تیرا ارادہ کیا ہے
تجھے دیکھیں کہ بہائیں آنسو	اپنی آنکھیں ہیں کسی کا کیا ہے

کہیں کہیں تو وہی یگانہ کا سا لہجہ ہے:

شہر بستے ہیں خیالوں میں مرے
مجھے تنہائی نے سمجھا کیا ہے!

کاش خواجہ صاحب ایسے شعر کہتے اور کثرت سے کہتے۔ افسوس انھوں نے اپنے اندر کے فطری شاعر کا گلا گھونٹ ڈالا۔ شاعری ان کی محبوبہ تھی، تحقیق منکوحہ۔ ازدواجِ ثانی ظرافت سے کیا۔ دونوں سے نبھی اور خوب نبھی مگر شاعری..... اے وائے شاعری

میں اک نالہ ایسا کیا کل چمن میں
کہ شعلہ سا برگِ درختاں سے گزرا
(مصحفی)

اور پھر اس کے بعد اک لمبی چپ!

کرنل خواجہ عبدالرشید کے نام خواجہ صاحب کے خط مورخہ ۲۶۔۹۔۷۸ء سے کچھ مزید باتیں معلوم ہوتی ہیں:

> یہ جان کر بڑی (مسرت / حیرت) ہوئی کہ آپ نے میری غزلوں کو موسیقی کے روپ میں ڈھالا ہے۔ میں ریڈیو کے کسی دوست سے اس معاملے میں بات کروں گا۔ میری غزلیں ریڈیو سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ایک غزل ص ۱۷ تو خاصی مقبول ہوئی ہے۔ اسے کئی فن کاروں نے گایا ہے۔ بلقیس خانم نے اسے بھوپالی میں گایا ہے۔ میں نے ریڈیو والوں سے کہا ہے کہ وہ ان غزلوں کو ٹیپ

کرادیں۔ یہ میں آپ کو بھی بھیجوں گا۔

"ابیات" کے ص ۱۷ کی نشان دادہ غزل کے چند شعر درج کر کے آگے بڑھتے ہیں:

یہ کوئی دل تو نہیں ہے کہ ٹھہر جائے گا
وقت اک خواب رواں ہے سو گزر جائے گا
دل شفق رنگ ہوا ڈوبتے سورج کی طرح
رات آئے گی تو ہر خواب بکھر جائے گا
شدتِ غم سے ملا زیست کو مفہوم نیا
ہم سمجھتے تھے کہ دل جینے سے بھر جائے گا
چند لمحوں کی رفاقت ہی غنیمت ہے کہ پھر
چند لمحوں میں یہ شیرازہ بکھر جائے گا

صفحہ ۵۶ پر ایک اور غزل بڑی کیفیت کی ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ حالی ہے مگر اس کے مطالعے میں خواجہ صاحب "اے مشفقِ من" کے ساتھ بے خیالی میں "سلمہ اللہ وتعالیٰ" باندھ گئے۔ شاید سودا کا شعر پیشِ نظر رہا ہوگا مگر وہاں "سلمہ اللہ تعالیٰ" صحیح بندھا ہے:

میں دشمنِ جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا
سو حضرتِ دل سلمہ اللہ تعالیٰ

یہ حضرتِ دل سلمہ اللہ تعالیٰ، خواجہ صاحب کی جان کو بھی لاگو تھے۔ زندگی کے آخری تین برسوں میں انھیں بہت خراب کیا مگر اس سے بھی کئی برس پہلے ذیابیطس نے انھیں بے حال رکھا۔ معالجوں کی تشخیص تھی کہ ذیابیطس نے گردوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ طبی معائنے سے پتا چلا کہ گردے صرف پچیس فی صد کام کر رہے ہیں۔ ذیابیطس کا مرض موروثی تھا۔ گردوں کے سوئے عمل کے باعث تیزابیت خون میں شامل ہونے لگی تھی اور پاؤں اور جسم کے باقی حصوں میں ورم آنے لگا تھا۔ یہی کیفیت وفات سے کچھ عرصہ قبل ان کے والد ماجد کی ہوگئی تھی۔ خواجہ صاحب نے کرنل خواجہ عبدالرشید کے نام اپنے والد کے مرض کا حال ۹/ اکتوبر ۱۹۷۹ء کے خط میں یوں بیان کیا:

> ابا جی کی اصل بیماری یہ ہے کہ ان کے گردوں نے کام بند کر دیا ہے۔ پیشاب کی تیزابیت خون میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے ان پر بے ہوشی کے دورے بھی پڑتے تھے۔

خواجہ صاحب میٹھی چیزوں سے حد درجہ اجتناب کرتے تھے مگر اس احتیاط کے باوجود شوگر اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ ستمبر ۱۹۹۷ء میں مرض بہت بڑھ گیا تھا۔ ساتھ ہی ران میں ایک مہلک پھوڑا نکل آیا تھا۔ سات آٹھ دن اسپتال میں رہے۔ عملِ جراحی سے گزارے گئے۔ اسپتال سے فارغ ہو کر بالآخر گھر

آگئے۔ اب اوقاتِ کار میں کمی اور لمحاتِ آرام میں اضافہ کردیا تھا۔ مگر مرض میں خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا۔ ۱۱ر نومبر ۲۰۰۲ء کو شدید حملہ قلب سے دوچار ہوئے اور جناح اسپتال داخل کیے گئے۔ اللہ کے کرم سے اطبا نے بروقت طبی امداد مہیا کی۔ دیر تک علاج معالجہ ہوتا رہا۔ حیاتِ تازہ ملی۔ بس اس کے بعد دو سال اور دو ڈھائی ماہ زندہ رہے۔ زندگی معمول پر آگئی تھی۔ سگریٹ نوشی جو بلانوشی کی حد کو پہنچی ہوئی تھی، ترک کردی تھی۔ کہا کرتے تھے، اب صحت بہت اچھی ہوگئی ہے مگر فرشتۂ اجل گھات میں لگا تھا۔ اس دوران میں اپنے کچھ علمی کاموں کی تکمیل میں بڑی عجلت کی۔ اپنے والدِ مکرم کی ڈائری پر حواشی لکھ کر اسے مکمل کیا۔ ''جائزۂ مخطوطات'' جلد دوم پر نظرِ ثانی کا کام اختتام کو پہنچایا۔ مرزا سلیمان قدر کے روزنامچے ''فرمانِ سلیمانی'' کی تکمیل کی۔ مزید کیا کچھ مکمل ہوسکا، کچھ علم نہیں۔ آخری زمانے میں یہ مصرع اکثر پڑھا کرتے تھے: ''کارِ دنیا کسے تمام نکرد''۔ خواجہ صاحب کا سنِ ولادت ۱۹ر اکتوبر ۱۹۳۵ء تھا۔ وفات ۲۱ر فروری ۲۰۰۵ء کو شدید دورۂ قلب کے نتیجے میں ہوئی۔ انہتر برس دو ماہ اور دو دن عمر پائی۔ وفات سے قبل عالمِ بے ہوشی میں تھے:

زدیدہ رفتہ حریفاں ہنوز در گوشند

خواجہ صاحب کا کتب خانہ پاکستان کے شخصی کتب خانوں میں اپنی مثال آپ تھا۔ قدیم و جدید کتب کے علاوہ نادر رسائل و جرائد کا ایک بڑا ذخیرہ اس کی زینت تھا۔ علاوہ ازیں متعدد اکابر کی شخصی لائبریریاں اور ان کے پرسنل پیپر خواجہ صاحب کو ہدیۃً مل چکے تھے۔ مولوی عبدالحق، شوکت سبزواری، یوسف بخاری دہلوی، مرزا اظہر علی برلاس اور غالباً ڈاکٹر ریاض الحسن وغیرہ کے ذاتی نوادرات از قسم ڈائریاں وغیرہ خواجہ صاحب کی تحویل میں تھیں۔ خواجہ صاحب اپنی زندگی میں ایک ٹرسٹ بنانا چاہتے تھے مگر پھر نہ معلوم کیا قصہ ہوا کہ یہ ارادہ فعل میں نہ آسکا۔ سرِ دست ان کا کتب خانہ مختوم ہے۔ بیگم مشفق خواجہ سے مبین مرزا اور ڈاکٹر طاہر مسعود کی معیت میں ۱۴ر جولائی کو جو ملاقات ہوئی اس سے پتا چلا کہ کتب و رسائل کی فہرست بنائی جارہی ہے۔ محترمہ جیلانی بانو کے شوہر انور معظم کے توسط سے یہ کتب و رسائل یونیسکو خرید کر کے کراچی یونی ورسٹی لائبریری کو ہدیہ کرے گی۔ لیکن اصل ذخیرہ تو قلمی مخطوطات کے عکوس، مشاہیر کے ہزاروں خطوط، نوادرات اور پرسنل پیپرز کا ہے جنھیں بہ ہر طور درجہ بند ہو کر محفوظ ہونا چاہیے۔ کاش خواجہ صاحب کے گھر کو ''مشفق خواجہ لائبریری'' کی صورت دے دی جائے۔ اس سے مرحوم کی روح کو بڑی تسکین ہوگی۔ اس ضمن میں مقتدرہ قومی زبان یا اکادمی ادبیات کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

خواجہ صاحب میرے ان کرم فرماؤں میں تھے جن سے میری سب سے زیادہ خط کتابت رہی۔ میرے نام مرحوم کے خطوط کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے۔ یہ مراسلت ۱۹۷۹ء سے لے کر دسمبر ۲۰۰۴ء تک رہی۔ میں اس دوران میں بعض اوقات ان کے خطوں کے جواب دینے میں کوتاہی کرتا رہا جس کا بے حد افسوس ہے مگر یہ سلسلہ ٹوٹا کبھی نہیں۔ ان کی رحلت کے بعد جب اپنے ذخیرۂ مکاتیب کو کھنگالا تو حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوا کہ ان کا ۱۹۷۹ء کا کوئی خط محفوظ نہیں یا اگر کہیں ہے تو کاغذات

کے انبار میں گم ہے۔ دستیاب خطوں میں پہلا خط ۹؍ جولائی ۱۹۸۰ء کا ہے اور آخری گرامی نامہ ۲۶؍ دسمبر ۲۰۰۴ء کا۔ میں نے ان خطوط میں سے سرِدست نوے خطوں کا انتخاب کیا ہے اور ان پر ضروری حواشی لکھ کر قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔ یہ خط جہاں ایک طرف اعلیٰ ادبی محاسن کے حامل ہونے کے باعث اردو کے مکتوباتی ادب میں ایک مستقل اضافہ ہیں، وہیں ان میں خواجہ صاحب کی شخصیت و کردار کے بھی متعدد پہلو جھلکتے ہیں۔ ان کی باغ و بہار شخصیت جگہ جگہ ان خطوں میں ظہور کرتی ہے۔ ان خطوط میں بے ساختہ اور فطری مزاح کے نمونے بھی ہیں، کاٹ دار طنز کی جھلکیاں بھی ہیں، معاصرین کے دلچسپ احوال بھی ہیں اور بعض جگہ ان کی مجلسی زندگی کے بارے میں عمدہ معلومات بھی ملتی ہیں۔ اپنے خطوں میں جہاں خواجہ صاحب کھلتے ہیں، اپنی ذات کو بھی بے نقاب کرتے ہیں، کہیں کہیں ان کے مشاہدات مع جزئیات نہایت بہجت افزا ہیں۔ آخری برسوں کی علالت سے ان کا متاثر ہونا فطری تھا، چناں چہ ایک دو جگہ ان خطوں میں اپنے گھر کو ''ظلمت کدہ'' اور ''کلبہ احزاں'' بھی لکھتے ہیں۔ اپنی شاعری میں تو اس کا اظہار بہت پہلے کر چکے تھے:

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گیا

خواجہ صاحب کی ساری زندگی قلم و قرطاس سے جڑی ہوئی تھی۔ ان کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ ابھی مدوّن ہونا ہے۔ ان کی روشن اور زندہ نثر کے گواہ ان کے کالموں کے تین مجموعے ہی نہیں، ''تخلیقی ادب'' (۵) میں شائع ہونے والا ''رسالہ در معرفت ابن انشا'' اور ان جیسی کئی تحریریں ہیں۔ مجی محمد احسن خاں نے اطلاع دی ہے کہ مجلّہ سات رنگ میں ''کتابوں کی باتیں'' کے زیرِ عنوان خواجہ صاحب کے کئی ریویو آرٹیکل اس قابل ہیں کہ دوبارہ شائع ہوں۔ انھوں نے ایسی تین تحریروں کی نشان دہی کی ہے جن میں سے دو ''سات رنگ'' میں اور ایک ''فنون'' میں شائع ہوئی۔ اردو لغت (کراچی) اور نصابات پر اگست ۶۱ء اور جنوری ۶۲ء کے شماروں میں ان کے مضامین شائع ہوئے اور عندلیب شادانی کی ''تحقیق کی روشنی میں'' پر فنون کے ۶۵ء کے کسی شمارے میں ان کا مقالہ شائع ہوا۔ علاوہ ازیں برِعظیم کے تمام اہم ادبا سے ان کی مراسلت تھی۔ یہ مراسلت بہ ہر طور محفوظ ہونی چاہیے۔ رہا ان خطوط کے شائع ہونے کی اجازت کا سوال تو خواجہ صاحب اس کا فیصلہ اپنی زندگی میں کر گئے تھے۔ جعفر بلوچ کے نام ۱۴؍ نومبر ۲۰۰۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> مشفق خواجہ خط کی اشاعت سے نہیں ڈرتا — لیکن خط کی اشاعت کے لیے کاتب کی اجازت ضروری ہے۔ ہاں اس کے انتقال کے بعد مکتوب الیہ کی اجازت درکار ہوگی۔

تو گویا وفات سے تین سوا تین ماہ قبل انھیں اپنی رحلت کا احساس ہو گیا تھا۔ وجدان کہتا ہے کہ ہاں۔ اب کے تہران سے لوٹتے ہوئے ایک دن کے لیے کراچی میں رک گیا تھا۔ دل کا حکم تھا:

قفا نبک من ذکری حبیبٍ و منزلٍ ۔ کراچی مشفق خواجہ کے بغیر سونا تھا۔ دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں۔ ۱۴ر جولائی کی جھلسا دینے والی حبس زدہ دوپہر میں طاہر مسعود اور مبین مرزا کے ہمراہ میرا رخ سوسائٹی کے قبرستان کی جانب تھا۔ اونچی دیواروں سے گھرے اس قبرستان کی خاندانی ہزواڑ میں سرسبز اور گھنے درختوں کے سائے تلے اپنے والد کی پائنتی میں خواجہ عبدالحئی (مشفق خواجہ) محوِ خواب تھے۔ میں نے بے اختیار قبر کے تعویذ کو بوسہ دیا۔ چشمِ تصور نے پہلے تو انھیں معمول کے خوب صورت اور عمدہ لباس میں، جو اُن پر خوب جچتا تھا، جیتے جاگتے دیکھا۔ پھر معاً بعد سفید براق ملبوس میں ساکت و صامت۔ جب خواجہ صاحب ۲۱ر فروری کو رخصت ہوئے تھے، میں ملک سے باہر تھا۔ ان کی آخری رسوم میں شرکت سے محروم رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وقتِ رخصت وہ کیسے لگ رہے تھے۔ اب چشمِ خیال نے انھیں اس عالم میں دیکھا تو یگانہ کا یہ شعر میرے لیے حقیقت کا ہم زاد اور ہم راز بن گیا:

جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جوبن
دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا

الوداع، الوداع! اے اردو ادب کے شجرِ سایہ دار الوداع!

کیا ملک کی کسی دانش گاہ کو توفیق ہوگی کہ وہ اردو ادب کے اس رجلِ رشید کے نام پر کوئی مسند قائم کرے؟

☆☆☆

محمد حمزہ فاروقی

مشفق خواجہ

۱۹۷۲ء میں جب مشفق خواجہ سے دوستی کا آغاز ہوا تو ان سے ملنے کے دو ٹھکانے تھے، ایک انجمن ترقیِ اُردو کا دفتر اور دوسرا گلڈ انجمن کتاب گھر واقع وکٹوریا روڈ۔ انجمن میں خواجہ صاحب بے تکلف دوستوں سے محفل آرائی کے باوجود علمی اور ادبی کاموں میں رخنہ نہ آنے دیتے۔ ابھی کسی کتاب کی حروف چینی ہو رہی تھی، اس دوران میں کسی دوست یا ساتھی پر فقرہ چست کیا جاتا، انجمن کے مسائل حل کیے جاتے اور لوگوں کے ذاتی مسائل پر ''فقرہ زنی'' کی جاتی۔ غرض ذاتی دوستی اور انجمن کے روزمرہ کے کاموں کا امتزاج جاری رہتا۔

شام کو جب آپ گلڈ انجمن کتاب گھر تشریف لاتے تو بدلے ہوئے روپ میں ہوتے۔ شہر بھر کے ادیب، شعرا اور تماش بین ایلفی پر آوارہ گردی کے بعد یہاں ستانے آتے۔ پیرزادہ عاشق کیرانوی جو کتابوں کی فروخت کے نگران تھے، آنے والوں کا سواگت اپنی تازہ غزل یا نظم سے کرتے۔ چناں چہ یہاں کتابیں کم اور شاعری زیادہ مقبول و مروج تھی۔ گلڈ انجمن کتاب گھر جو علم سے زیادہ رائٹرز گلڈ کی نمود و نمائش کا سامان تھا، چند برسوں میں اپنی بہار جاں فزا دکھا کر کھلا گیا۔

نومبر ۱۹۷۲ء میں، میں جب ''صاحب کار'' ہوا تو خواجہ صاحب سے ملنے کا ارمان اور ملاقات کے لیے ''سازو سامان'' پہلے سے زیادہ تھا۔ اب اپنے ''زور قدم'' پر بھروسا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ڈرائیونگ میں نومشقی کا زمانہ تھا، جذبہ شدید اور تجربہ مفقود تھا۔ اس عالم میں خواجہ صاحب نے مشورہ دیا کہ اگر عافیت چاہتے ہو تو کسی بس یا ٹرک کے عقب میں کار چلایا کرو تاکہ بپھرے ہوئے ٹریفک میں راستہ تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جاؤ۔ اس پر عمل کرنا چاہا تو احساس ہوا کہ یہ طریقہ عدم آباد پہنچنے کا شارٹ کٹ تو ہوسکتا تھا، منزل تک رسائی ممکن نہ تھی۔ چناں چہ خواجہ صاحب کے اصرار کے باوجود میں نے بسوں اور ٹرکوں کی ''اندھی تقلید'' سے گریز کیا۔ جس دور میں خواجہ صاحب ڈرائیونگ کرتے تھے، اس وقت ڈرائیور حضرات گلوں میں شکار کے شوق کی تکمیل کیا کرتے تھے۔ جنگل کے قانون کا نفاذ کراچی کی سڑکوں پر نہ تھا۔

اسی زمانے میں، میں اور خواجہ صاحب کلفٹن کی سیر کو نکلے۔ آبادی کم تھی، سڑک بھی دو رویہ نہ تھی اور سڑک کے دونوں طرف ڈرگ مافیا اور بلڈنگ مافیا کا راج نہ تھا۔ خالی قطعات پر سیم زدہ پانی رہتا تھا۔ شام کے وقت اور خوش گوار موسم نے کار کی رفتار تیز کرنے پر مجبور کیا اور غلط طریقے سے اگلی کار سے آگے نکل گیا۔ دوسری کار کے ڈرائیور نے بڑی مشکل سے خود کو ٹکرانے سے بچایا۔ خواجہ صاحب نے مجھے غلطی کا احساس دلایا اور فرمایا کہ کار روک کر دوسری کار کے ڈرائیور سے معافی طلب کروں۔ ان صاحب نے بھی کار روکی۔ اس وقت ان کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ میں نے جب غلطی کے اعتراف کے بعد معافی طلب کی تو ان کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ مجھے تو یوں لگا جیسے کھولتی ہنڈیا کا ڈھکن ہٹ گیا اور بھاپ نکل گئی۔ کار ملتے ہی ہماری اکثر شامیں کلفٹن کے ساحل پر بسر ہونے لگیں۔ خواجہ صاحب کو غروب آفتاب کا منظر بہت پسند تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ شاعرانہ موڈ میں آجاتے اور پھر ان کی گل افشانی گفتار کا عالم ہی جدا ہوتا۔

خواجہ صاحب کے اس دور کے دوستوں میں طفیل احمد جمالی اور عباس احمد عباسی نمایاں تھے۔ جمالی نے ایک ہفت روزہ جاری کیا تو خواجہ صاحب نے ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کی لیکن جمالی کی طبیعت کا لاابالی پن اور زندگی کا بوہیمین انداز رسالے کو باقاعدہ نہ رکھ سکا اور چند اشاعتوں کے بعد وہ بند ہو گیا۔ ان دونوں کی دوستی کا آغاز روزنامہ "انجام" سے ہوا تھا، جس میں جمالی "بت شکن" کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب بھی اس اخبار میں منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔

مشفق خواجہ نے کراچی یونی ورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا تھا۔ یونی ورسٹی میں ان کے استاد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی اور ڈاکٹر سید شاہ علی تھے۔ ان دو "سیدین" اور طلبہ کے سامنے ڈاکٹر ابواللیث اپنی علمیت کا ڈھنڈورا پیٹتے اور خوب لاف زنی کرتے۔ اپنی شخصیت کو بلند و بالا ظاہر کرنے کے لیے دوسروں کی بت شکنی بھی لازم تھی۔ انھوں نے بڑی محنت سے جھوٹی سچی کہانیوں کی مدد سے اپنی شخصیت کے گرد "مینار عام" تعمیر کیا۔ خواجہ صاحب نے اخبار "انجام" میں ان کے علم و فضل کا پول کھولنا شروع کیا۔ اس ضمن میں نصابی کتب میں ان کی دراز دستی اور زر اندوزی کے لیے ان کے ہتھکنڈے عیاں کر دیے۔ ڈاکٹر صاحب کی عظمت کے مینار میں شگاف پڑنے لگے۔

مشفق خواجہ نے شعبۂ اُردو میں ڈاکٹر ابواللیث کے مقابلے میں ڈاکٹر سید شاہ علی کو آگے بڑھایا۔ ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی اشاعت کا بندوبست کیا لیکن شاہ علی صاحب ان بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے بچپن اور جوانی میں حاصل شدہ علم کی حفاظت کی تھی اور اسے "آلودگیوں" سے پاک رکھا تھا۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب نے شاہ علی صاحب کو کسی علمی مقالے کی تدوین کے لیے آمادہ کرنا

چاہا۔ دورانِ گفتگو آپ نے آزاد بلگرامی کی فارسی شاعری اور علمی خدمات کا ذکر کیا۔ شاہ علی صاحب نے پوچھا کہ کیا مولانا ابوالکلام آزاد فارسی میں شاعری کرتے تھے؟ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ "ڈاکٹر صاحب آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، تاریخ ادب میں آپ کا نام زندہ رکھنے کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ میرے استاد تھے۔" خواجہ صاحب غلام علی آزاد بلگرامی کا ذکر کر رہے تھے۔

آپ دوستوں کے دوست تھے۔ انھوں نے اپنے رفقا کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد پس ماندگان کی دامے درمے ہر طرح سے مدد کی۔ طفیل احمد جمالی، مرزا علی اظہر، ڈاکٹر ریاض الحسن، سید یوسف بخاری اور نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی میں اور اُن کے لواحقین کو خواجہ صاحب کی ذات سے فیض پہنچا ہوگا۔ فیض رسانی ہمیشہ چھپا کر کرتے تھے۔

علم و ادب کی ترویج و اشاعت میں وہ بہ قدرِ استطاعت حصہ لیتے۔ کسی میں جوہر قابل پاتے تو اسے متعلقہ موضوع کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں بخل نہ برتتے۔ اگر ممکن ہوتا تو اس شخص کی تصنیف کی اشاعت میں مدد کرتے۔ اس طرح نہ جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف ان کے تعاون سے منظرِ عام پر آئیں۔ ۱۹۷۲ء میں، میں "سفرنامۂ اقبال" کی اشاعت کے لیے سرگرداں تھا اور دو علمی اداروں "اقبال اکادمی" اور "بزمِ اقبال" لاہور کی اشاعت پر آمادگی کے باوجود اُن کی سست روی سے بیزار ہو چکا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس مرحلے پر میری مدد کی اور یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں ان کے قائم کردہ ادارے "مکتبۂ معیار" نے شائع کی۔ بعد میں انھوں نے میرے تین سفرنامے بھی شائع کیے۔

۱۹۷۳ء میں خواجہ صاحب نے انجمن ترقی اُردو کی ملازمت ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ عباس احمد عباسی جو خود بھی انجمن کے اعلیٰ عہدہ دار تھے، خواجہ صاحب سے ملنے آئے اور ان کا ارادہ جاننے کے بعد فرمایا کہ کیا انجمن کا جہاز ڈوب رہا تھا جو چوہے سمندر میں چھلانگ لگانے لگے؟ خواجہ صاحب درحقیقت انجمن میں رہتے ہوئے حسبِ منشا علمی خدمت انجام دینے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے انجمن کی ملازمت کے آخری دن اپنے فرائض سید شبر علی کاظمی کے سپرد کیے اور شام کو میرے ساتھ کلفٹن روانہ ہو گئے۔

ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد انھوں نے دیگر علمی کاموں کے علاوہ کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ پہلے "مکتبۂ معیار" پھر "عصری مطبوعات" اور آخر میں "مکتبۂ اسلوب" کے ذریعے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تصانیف کو شائع کیا۔ اسی ادارے کے تحت انھوں نے "تخلیقی ادب" کے چند ضخیم شمارے شائع کیے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک چل نہ سکا۔ کراچی کے علم سوز ماحول میں محدود وسائل کے ساتھ طویل عرصے تک اشاعت کتب کا کاروبار ممکن نہیں۔

خواجہ صاحب سے برصغیر ہندو پاک کی بہت سی علمی اور ادبی شخصیات ملنے آتیں۔ ڈاکٹر محمد حسن، محمد عبداللہ قریشی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور خلیق احمد نظامی سے میں خواجہ صاحب کے توسط سے ملا۔ ان میں سے بعض اصحاب کے ساتھ علمی مجالس میں شرکت کی اور

بعض کے ساتھ پکنک منائی۔ ہماری جولان گاہ کراچی کا ساحل یا کلری جھیل یا ٹھٹھہ میں مکلی کا قبرستان ہوتا۔ یہ قبرستان ہمارے لیے تفریح گاہ تھا۔

۱۹۷۳ء میں، میں نے ایک معمولی سا کیمرا خریدا اور فوٹوگرافی کا آغاز کیا۔ میرا یہ شوق خواجہ صاحب کی اکساہٹ کا موجب بنا اور انھوں نے بھی تصویر کشی شروع کردی۔ فرق یہ تھا کہ انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کو تختۂ مشق بنایا اور میری نظر تاریخی عمارات اور قدرتی نظاروں تک محدود رہی۔

تفریحی مقامات کی سیر میں کبھی کبھی ڈاکٹر معین الدین عقیل، اظہر الحق حقی اور ذوالفقار مصطفےٰ شریک ہوتے۔ ہم زلف ہونے کے ناتے ذوالفقار مصطفےٰ صاحب کا نام تصرف کا سزاوار ہوا اور وہ خواجہ صاحب کے نزدیک ''ہم زلف کار مصطفےٰ'' قرار پائے۔

۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر محمد حسن بھارت سے اور نظیر صدیقی اسلام آباد سے نازل ہوئے۔ ہم لوگوں نے ساحلِ سمندر کے نزدیک پکنک کا پروگرام بنایا۔ ''ہم زلف کار مصطفےٰ'' بھی پانچوں سواروں میں شامل ہوگئے۔ اتفاق یہ تھا کہ نظیر صدیقی اپنی بیگم سے چھپ کر تفریح کے لیے گئے اور خواجہ صاحب کی ''تفریح'' کا سامان بن گئے۔ سفر کے دوران آپ پر فقروں کا نزول ہوتا رہا اور نظیر صدیقی کسمسا کر رہ جاتے۔ اس روز ہم لوگ منوڑا اور ہاکس بے گئے تھے۔

خواجہ صاحب فقرہ چست کرنے میں بے مثال تھے۔ ان کے انجمن کے دور کے ایک دوست جن کا تعلق کراچی یونی ورسٹی کی انتظامیہ سے تھا، خواجہ صاحب سے ملنے آئے۔ اس وقت کراچی یونی ورسٹی کی عمارت انجمن کے نزدیک واقع تھی۔ یہ صاحب جن کی پیدائش غالباً قحط کے دوران ہوئی تھی، دعوتیں اڑانے کے شوقین تھے۔ یہ دوپہر کو اس وقت خواجہ صاحب کو شرفِ ملاقات بخشتے جب آپ ''کیفے الشیراز'' کے تکّے، کبابوں سے نبرد آزما ہوتے۔ خواجہ صاحب رسماً شرکتِ طعام کی دعوت دیتے وہ عملاً اس کھانے میں ''شریک غالب'' ہوجاتے۔ یہ سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ ایک روز کھانے کے بعد خواجہ صاحب کے ایک دوست تشریف لائے۔ آپ نے ان صاحب کا تعارف نووارد دوست سے ان الفاظ میں کرایا، ''ان سے ملیے، یہ میرے بہت مخلص دوست ہیں۔ مجھے ان سے اس قدر پیار ہے کہ لوگ مجھے خواجہ سگ پرست قرار دیتے ہیں۔''

خواجہ صاحب مولوی عبدالحق کے بہت مداح تھے۔ مولوی صاحب کی زندگی کے آخری چند برسوں میں خواجہ صاحب نے جو فیض اٹھایا وہ عمر بھر ان کے کام آیا۔ بابائے اردو کی علم سے وابستگی کا عالم یہ تھا کہ گھنٹوں خواجہ صاحب کو اُردو لغت املا کرایا کرتے۔ مولوی صاحب کھڑے ہو کر متن لکھواتے۔ خواجہ صاحب بیٹھے بیٹھے تھک جاتے لیکن مولوی صاحب کے پائے ثبات میں لغزش نہ آتی، حالاں کہ اس لغت کے مولوی صاحب کی زندگی میں چھپنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مولوی صاحب اور انجمن سے خواجہ صاحب کا تعلق ۱۹۵۶ء میں استوار ہوا تھا۔ انھوں نے آخری دم تک مولوی صاحب کا ساتھ نبھایا۔ خواجہ

صاحب کو تحقیق کی طرف مائل کرنے میں مولوی صاحب کا ہاتھ تھا۔

ستر کی دہائی میں ناظم آباد میں غالب لائبریری قائم ہوئی تو خواجہ صاحب نے ادارۂ یادگارِ غالب کے ناظم مرزا ظفر الحسن سے بھرپور تعاون کیا اور اسے علمی اور ادبی مرکز بنایا۔ اس تعاون کا ایک نمونہ تو یہ تھا کہ سرِ شام جب یہ دونوں حضرات ملتے تو دیر تک ان میں طنزیہ و مزاحیہ فقروں کا تبادلہ ہوتا اور سامعین کو بٹیروں کی پالی کا مزہ یاد آتا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ ادارۂ یادگارِ غالب کا سہ ماہی مجلہ ''غالب'' سے آپ قلمی تعاون کرتے۔ لائبریری میں بہت سی علمی اور ادبی شخصیات کو مدعو کیا جاتا اور ان کو مختلف موضوعات پر تقریروں کی دعوت دی جاتی۔

یہیں خواجہ صاحب نے مجھے صہبا لکھنوی سے یہ کہہ کر متعارف کرایا کہ ''صہبا چوں پیر شود پیشہ کند دلالی!'' یہ نہ پوچھیے کہ اس تعارف کے بعد صہبا صاحب کی کیا حالت تھی۔ بعد میں آپ خواجہ صاحب کی شکل دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے۔ خواجہ صاحب کو بھی انھیں چھیڑنے میں مزہ آتا۔

خواجہ صاحب نے آپ کے متعلق ''تکبیر'' کے ایک کالم میں لکھا کہ آپ ہمیشہ ''افکار پریشاں'' میں مبتلا رہتے تھے، یعنی ''افکار'' کی اشاعت اور اس کے ذریعے زر افشانی کی توقعات آپ کو پریشان رکھتی تھیں۔ آپ نے برطانیہ اور امریکا میں رہنے والے اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو متوجہ کیا کہ وہ اپنے ''ادب عالیہ'' کو کیڑوں کا رزق نہ بننے دیں بلکہ اسے ''افکار'' میں محفوظ کردیں۔ مثل مشہور ہے کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ لیکن صہبا صاحب کے حق میں یہ روایتی بٹیر تھی جوان کے ہاتھ لگی۔

صہبا صاحب کا ان ادیبوں اور شاعروں پر روغنِ قاز ملنا رائگاں نہ گیا۔ آپ آئے دن برطانیہ اور امریکا کے دورے کرنے اور ان حضرات کی میزبانی کے مزے لوٹنے لگے۔ اس میں خیر کا پہلو یہ تھا کہ ان حضرات کے ''زرِ تعاون'' سے ''افکار'' کئی برس زندہ رہا۔

ستر کی دہائی میں خواجہ صاحب روزنامہ ''جسارت'' میں مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ وہ دور اخبارات میں ادبی مزاح نگاری کا دور تھا۔ ابن انشا، طفیل احمد جمالی، ابراہیم جلیس اور مشفق خواجہ کی تخلیقات اخباروں میں چھپتیں اور قارئین کے دلوں میں مسرت و انبساط کی لہریں اٹھتیں۔ خواجہ صاحب نے اس دور میں مزاح نگاری میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ ابتدا میں آپ سیاسی موضوعات پر لکھتے رہے لیکن بعد میں رفتہ رفتہ سیاسی موضوع ترک کردیا اور ادبی موضوعات کو اپنا لیا۔ ان کے ادبی کالموں کا انتخاب تو شائع ہوچکا ہے لیکن کسی نے سیاسی کالموں کی طرف توجہ نہیں کی حالاں کہ ان کالموں کی مدد سے اس دور کی سیاسی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

ستر کی دہائی میں جوش ملیح آبادی کی تصنیف ''یادوں کی برات'' پر آپ نے یادگار کالم تحریر کیے۔ جوش نے خوب صورت اندازِ بیان اور بے باکانہ اظہار سے آپ بیتی مرتب کی۔ ایک خاص حلقے میں وہ کتاب بہت مقبول ہوئی لیکن جوش کی ''ساحری'' کے حق میں خواجہ صاحب کے کالم عصائے موسوی

ثابت ہوئے اور جوش صاحب کی تضاد بیانی، عریاں نگاری اور کردار کی پستی کو نمایاں کرنے میں ان کالموں کا بڑا ہاتھ تھا۔

ستمبر ۱۹۷۷ء میں، میں جب اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گیا تو اُن سے ملنے کے مواقع ختم ہو گئے لیکن خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے خطوط بذلہ سنجی، ظرافت اور ادبیت کے شاہ کار تھے۔ ہمارے درمیان علمی تعاون جاری رہا۔ خواجہ صاحب اس زمانے میں ریڈیو پاکستان سے اُردو کے سفر ناموں کے بارے میں فیچر نشر کرتے تھے۔ سفر ناموں سے بے پناہ دل چسپی کے باوجود خود سفر سے گریزاں رہتے اور اسے حتی الامکان ٹالتے رہتے۔

SOAS لائبریری میں انیسویں صدی کا تبت کا سفر نامہ ملا جسے کسی فرانسیسی مستشرق نے اُردو متن اور فرانسیسی مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ خواجہ صاحب کی دل چسپی کے پیشِ نظر میں نے اس کتاب کی فوٹو اسٹیٹ کاپی انھیں بھجوا دی۔ انھیں اُردو کے ایک قدیم دیوان کی ضرورت تھی۔ اس دیوان کا قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری میں محفوظ تھا۔ میں نے لائبریری سے خط کتابت کے بعد دیوان کو فلم کے ذریعے مختلف صفحوں پر منتقل کروا کے خواجہ صاحب کو بھجوا دیا۔

جولائی ۱۹۷۹ء میں گرمی کی چھٹیوں میں کراچی آنا ہوا تو خواجہ صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان دنوں ڈاکٹر وحید قریشی لاہور سے آئے ہوئے تھے اور خواجہ صاحب کے مہمان تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ہم میں فوٹو گرافی کا شوق مشترک تھا۔ فرق یہ تھا کہ میں اور خواجہ صاحب مبتدی تھے تو ڈاکٹر صاحب اس فن کے منتہی تھے۔ ہمارے شوق کی تکمیل کلفٹن کے ساحل پر ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب تصویر کشی کے دوران اپنی بچی کو نہ بھولے اور انھوں نے اس کے لیے سیپیوں کی آرائشی اشیا بھی وہاں سے خریدیں۔

میں اکتوبر ۱۹۸۱ء میں مستقلاً کراچی آیا تو پھر ساحلِ سمندر آباد ہونے لگا اور باتوں کے دیے روشن ہونے لگے۔ میں ان سے فون پر وقت طے کر لیتا اور پھر مقررہ جگہ پر ہم مل لیتے۔ ۱۹۸۲ء میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر مختار الدین احمد سے مجھے ملایا۔ آپ بین الاقوامی شہرت کے عربی کے عالم تھے۔ اس کے علاوہ علوم دینی پر بھی گہری نظر تھی۔ آپ علی گڑھ یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اُردن میں علمی مجالس میں شرکت کے بعد کراچی تشریف لائے تھے۔ نہایت شریف، وضع دار اور ملنسار بزرگ اور ہند اسلامی تہذیب کا عمدہ نمونہ تھے۔ ان کے ساتھ ہم لوگ ٹھٹھہ کے تفریحی دورے پر بھی گئے تھے۔

خواجہ صاحب اب ادبی کالم نگاری سے اس قدر محظوظ ہونے لگے تھے کہ وہ ان کا مستقل پیشہ اور پہچان بنی اور سچ پوچھیے تو اپنے دل فریب اندازِ بیان اور کاٹ دار جملوں سے ان کالموں نے ادبی دنیا میں ''تھرتھلی'' مچا دی تھی۔ وہ کالموں کا چرچا سن کر خوش ہوتے لیکن انھیں کھلم کھلا اپناتے نہ تھے۔ انھوں نے ''جسارت'' میں میرا ایک خط چھپوایا جس میں ''خامہ بگوش'' ہونے کا اعتراف مجھ سے کرایا لیکن اہلِ نظر

پہچان گئے کہ اس پردے میں خواجہ صاحب ہی خامہ فرسائی کرتے تھے۔

کچھ عرصے بعد ہم دونوں نے مولانا کوثر نیازی کے بارے میں مشترکہ کالم لکھا۔ مولانا نے خاکوں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا جس میں ممدوح شخصیات کے ضمن میں اپنے دورِ وزارت اور دعوتوں کا ذکر کیا تھا، حالاں کہ بات فقط اتنی تھی کہ سرکار دربار میں ''اطلاعات'' پہنچانے کے صلے میں مولانا ''وزیرِ اطلاعات'' بن بیٹھے۔ وزیر بن کر انھوں نے جو گل کھلائے لوگ اسے بھولے نہ تھے۔ میں نے مزاحیہ انداز سے ان خاکوں پر جو کچھ لکھا اسے تو خواجہ صاحب نے خط کا روپ دیا اور رہی سہی کسر بقیہ تحریر میں پوری کردی۔ مولانا کوثر نیازی عرصے تک اس کالم کی چبھن محسوس کرتے رہے۔ ایک رسالے میں انھوں نے اس کا جواب بھی لکھا، پر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

جون ایلیا کا جب دیوان شائع ہوا تو ہمیں ان کی شاعری اور مقدمے میں دل چسپی کا مواد نظر آیا۔ خواجہ صاحب نے جب کالم تیار کرلیا تو اس کی بھنک جون ایلیا کے کان میں پڑی۔ وہ خواجہ صاحب سے ملنے آئے اور بطورِ خاص التماس کیا کہ وہ کالم چھپنے نہ پائے۔ چناں چہ وہ مزے دار کالم شرمندۂ اشاعت نہ ہوسکا۔

مجھ سے بعض کالموں کا ذکر آپ نے اشاعت سے قبل بھی کیا تھا لیکن بیش تر کالم ''تکبیر'' میں چھپنے کے بعد موضوعِ گفتگو بنتے۔ اس زمانے میں تو میں ان کالموں کا مداح تھا لیکن بعد میں احساس ہوا کہ اس ذریعے سے آپ ادب کی بدخدمتی انجام دے رہے تھے۔ وقتی طور پر تو کسی تصنیف یا صاحبِ تصنیف کے مضحکہ خیز یا کم زور پہلوؤں کی نشان دہی مزہ دے جاتی لیکن اس کی خوبیاں نظر سے اوجھل ہوجاتیں، مثلاً قدرت اللہ شہاب یا اشفاق احمد کے متعلق خواجہ صاحب کے کالم بلاجواز تھے۔

آپ اگر کسی کالم میں مصنف کی توصیف بھی کرتے تو وہ اس قدر خفی اور طنز و مزاح کے انبار تلے دبی ہوتی کہ وہ بے اثر ہوجاتی۔

وقتی یا ہنگامی موضوع پر آپ کی تحریریں دوستوں کی داد و تحسین تو سمیٹ لیتیں لیکن دیرپا اثر نہ چھوڑتیں۔ خود خواجہ صاحب کو بھی احساس ہوا کہ ان باتوں میں الجھ کر وہ علم اور تحقیق کی طرف توجہ نہیں دے پاتے، چناں چہ آپ نے کچھ عرصے بعد ادبی کالم نگاری کا سلسلہ ترک کردیا۔

میرے اور خواجہ صاحب کے تعلقات ۱۹۹۱ء تک استوار رہے، پھر ایک واقعے کی بنا پر یہ ختم ہوگئے۔ دسمبر ۲۰۰۳ء میں اکرام چغتائی مجھ سے لندن میں ملے اور خواجہ صاحب کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ چند ماہ قبل انھیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ سگریٹ نوشی چھڑوادی گئی، علمی و ادبی کام بیماری کے سبب چھوٹ گئے، اب وہ بستر تک محدود ہوگئے تھے۔ چغتائی صاحب نے اختلافات ترک کرکے دوبارہ ملنے پر زور دیا۔

جنوری ۲۰۰۴ء میں، میں نے کراچی آنے کے بعد خواجہ صاحب سے رابطہ کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس زمانے میں وہ سی ویو اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ میں جب ان سے ملا تو بہت خوش

ہوئے۔ اس وقت وہ بہت کم زور ہو چکے تھے۔

کچھ عرصے بعد جب طبیعت بحال ہوئی تو شغلِ دیرینہ کا اعادہ کیا۔ اس زمانے میں وہ اپنے والد خواجہ عبدالوحید کی ڈائری مرتب کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ قبل مرزا یاس یگانہ چنگیزی پر ان کی تالیف ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی تھی۔ انھیں احساس تھا کہ زندگی کی مہلت بہت کم رہ گئی اس لیے وہ اپنے علمی اور ادبی کام سمیٹنا چاہتے تھے۔ صحت بحال ہوتے ہی وہ ناظم آباد کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس مکان کے بارہ کمروں میں صرف دو کمرے ان کے تصرف میں تھے باقی کمروں میں کتابیں تھیں۔ اس شہرِ علم سوز میں وہ زندگی بھر علم و ادب کی شمع جلائے رہے۔ دور دور سے اہلِ علم ان سے استفادے کے لیے آتے تھے۔ اتوار کا دن انھوں نے عام ملاقاتیوں کے لیے وقف کیا تھا۔ ان کا ذاتی مال و متاع کتابوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ فروری ۲۰۰۵ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو جنازے پر لوگوں کا ہجوم ان کی مقبولیت کی دلیل تھا۔ اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

☆☆☆

قاضی اختر جُونا گڑھی

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا
(مشفق خواجہ)

چوں کہ میرے لیے انجمن ترقیِ اُردو مشفق خواجہ صاحب کی یادوں کا ایک بنیادی حوالہ ہے، لہٰذا میں اپنی یادوں کے سفر کا آغاز بھی انجمن کے ذکر سے کروں گا۔ یوں بھی مشفق خواجہ صاحب سے تعارف اور بعد میں تفصیلی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی انجمن ہی سے شروع ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مولوی عبدالحق صاحب دہلی سے کراچی تشریف لا چکے تھے اور لارنس روڈ کے نزدیک شماروا مندر کی عمارت میں انجمن ترقیِ اُردو کے دفتر کا قیام ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب کو ایسے افراد کی سخت ضرورت تھی جو انجمن کے بنیادی اغراض و مقاصد کے فروغ میں اُن کا ساتھ دے سکیں۔ چناں چہ اس سلسلے میں قرعۂ فال میرے مرحوم والد قاضی احمد میاں اختر جُونا گڑھی کے نام پڑا جس کا احوال خود مولوی صاحب نے اپنی کتاب ”انجمن کا المیہ“ میں بیان کیا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں والد مرحوم نے انجمن کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی صاحب کے برابر والے کمرے میں بیٹھا کرتے تھے۔ انجمن کی عمارت کی پیشانی پر درج اقبال کا یہ شعر آج بھی میرے حافظے کا حصہ ہے:

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

میری عمر اس وقت فقط چھ برس تھی۔ میں پرائمری اسکول میں زیرِ تعلیم تھا جو انجمن کی عمارت کے بالمقابل مشن روڈ پر واقع تھا۔ چناں چہ انٹرول میں صوفی عبدالرشید صاحب مجھے اسکول سے، والد صاحب کے پاس لے آتے تھے، جہاں میں اُن کے حکم کی تعمیل میں، چائے اور بسکٹوں کے ناشتے

میں شریک ہوتا — یہ میرا انجمن سے پہلا تعارف تھا۔

انجمن ترقیِ اُردو سے والد مرحوم کا تعلق ۱۹۵۳ء تک قائم رہا جس کے بعد وہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) استعفیٰ دے کر سندھ یونی ورسٹی، حیدر آباد (سندھ) کے شعبۂ اسلامی تاریخ سے بہ حیثیت صدر شعبہ وابستہ ہوگئے۔ ۶ راگست ۱۹۵۵ء کو حرکتِ قلب بند ہونے کے سبب وہ حیدر آباد میں وفات پا گئے۔ والد صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مقالات، مضامین اور رسائل مرتب کرلیے تھے جن پر وہ علامہ سید سلیمان ندوی سے مقدمہ لکھوانا چاہتے تھے لیکن ۱۹۵۴ء میں علامہ کراچی میں انتقال کرگئے اور اگلے ہی برس قاضی صاحب بھی دنیا سے سدھار گئے اور یوں ان مقالات و مضامین کی اشاعت ممکن نہ ہوسکی۔ ان کے انتقال کے وقت میری عمر بارہ برس تھی۔ چناں چہ مجھے ان علمی اور تحقیقی مقالات کی اہمیت اور اشاعت کی ضرورت کا کماحقہ، شعور نہ تھا لیکن اس کم عمری میں بھی مجھے یہ ادراک ضرور تھا کہ مجھے اس خزانے کو بہ ہر صورت محفوظ رکھنا ہے۔

۱۹۶۲ء میں، میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے کراچی کے معروف کالج، اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ میری عمر اس وقت ۱۹ ربرس کے لگ بھگ تھی۔ والد مرحوم کے مرتب کردہ تمام مقالات اور مضامین جوں کے توں ایک بڑے سے صندوق میں محفوظ رکھے تھے۔ کچھ عرصے بعد جب جناب اختر حسین، انجمن ترقیِ اُردو کے صدر مقرر ہوئے تو میں نے ایک درخواست اُن کے نام لکھی جس میں یہ گزارش کی گئی تھی کہ میرے والد کی انجمن کے لیے گراں قدر خدمات کی روشنی میں کیا ہی مناسب ہو کہ یہ تمام مقالات و مضامین انجمن کے زیرِ اہتمام شائع ہوجائیں۔ اختر حسین صاحب نے فوری طور پر اس کی منظوری دے دی اور مجھ سے کہا گیا کہ مقالات و مضامین کی بھی فائلیں فوری طور پر مشفق خواجہ صاحب تک پہنچا دوں جو انجمن کے ناظمِ مطبوعات تھے۔ درحقیقت یہی وہ موڑ تھا، جس تک پہنچنے کے لیے مجھے یہ طویل تمہید باندھنی پڑی۔ مشفق خواجہ، انجمن کی عمارت کی دوسری منزل پر کتب خانۂ خاص سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنا دفتر رکھتے تھے۔ میں والد صاحب کے مقالات کی فائلیں لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ میری اُن سے یہ بالکل پہلی ملاقات تھی۔ میں اُن کی شخصی وجاہت، پُرکشش شخصیت اور خوش خلقی سے بے حد متاثر ہوا۔ اُن کے حسنِ سلوک نے ایک لمحے کے لیے بھی اجنبیت کا کوئی احساس نہ ہونے دیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں خواجہ صاحب کو کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ یہ ۱۹۶۳ء کا سال تھا اور انجمن، اگست کے مہینے میں ''قومی زبان'' کے بابائے اُردو نمبر کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ جب میں خواجہ صاحب سے ملا تو وہ کافی دیر تک مجھ سے والد مرحوم کی نجی اور خانگی زندگی اور اُن کے احباب کے حوالے سے سوالات پوچھا کیے۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ کہنے لگے، ''انجمن قومی زبان کا بابائے اُردو نمبر نکال رہی ہے۔ آپ اس موقعے کی رعایت سے مولوی صاحب اور اپنے والد کے مابین تعلقات کے حوالے سے ایک مضمون مجھے لکھ کر دے دیں۔'' خواجہ صاحب نے یہ کہہ کر مجھے ایک بہت بڑی آزمائش

میں ڈال دیا۔ عمر کے جس دور سے میں گزر رہا تھا، اس میں بالعموم نوجوانوں کو فلموں وغیرہ کا شوق اور جنون ہوتا ہے۔ فلموں ہی کے حوالے سے میں چند ایک مضامین کراچی سے شائع ہونے والے فلمی ہفت روزہ اخبار ''نگار'' میں شائع کروا چکا تھا۔ لیکن ''قومی زبان'' جیسے خالص علمی اور تحقیقی پرچے کے لیے سنجیدہ نوعیت کا مضمون لکھنا میرے بس کی بات ہرگز نہ تھی۔ ابھی میں اُن کی اس پیش کش پر غور کرنے میں مصروف تھا کہ وہ گویا ہوئے، ''کیا آپ کے والد کے کاغذات میں، مولوی عبدالحق صاحب کے تحریر کردہ خطوط بھی موجود ہیں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تو بس ٹھیک ہے'' وہ بولے، ''آپ کے مضمون کے ساتھ، ہم اُن خطوط کو بھی شامل کردیں گے اور ہاں مولوی صاحب نے قاضی صاحب مرحوم کے تعزیتی اجلاس میں، جو تقریر کی تھی اُسے بھی مضمون کے ساتھ ہی شائع کردیا جائے گا۔'' ذرا خیال فرمایئے میری عمر اُس وقت بیس برس تھی۔ مشفق خواجہ صاحب، انجمن ترقیِ اُردو جیسے وقیع اور مؤقر علمی، ادبی اور تحقیقی ادارے کے ناظمِ مطبوعات تھے اور مجھ جیسے نوآموز نوجوان سے سنجیدہ مضمون کی فرمائش کر رہے تھے۔ مارے خوشی کے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اک عجب لہر اور نشے کے عالم میں جھومتا جھامتا گھر پہنچا۔ مولوی صاحب نے والد مرحوم کو جتنے خطوط لکھے تھے انھیں یک جا کیا اور خواجہ صاحب کے حکم کی تعمیل میں فوری طور پر مضمون لکھنے کے لیے بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں سے شروع کروں، کیسے ختم کروں؟ بہ ہرطور میں نے بھی خواجہ صاحب کا دیا ہوا چیلنج قبول کرلیا تھا اور کمر ہمت کس کر باندھ لی تھی۔ دو تین دنوں کی مسلسل کاوش اور محنت کے بعد بالآخر میں یہ مضمون لکھنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ مضمون کو خوش خط کرنے کے بعد اسے لے کر فوراً خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا۔ مضمون اور مولوی صاحب کے خطوط دیکھ کر خواجہ صاحب بہت خوش ہوئے، کہنے لگے، ''یہ چیزیں میرے پاس چھوڑ جائیں۔ میں فرصت سے انھیں دیکھ لوں گا۔''

بالآخر، اگست کا مہینہ آن پہنچا۔ ۱۶ر تاریخ کو انجمن کے احاطے میں مولوی صاحب کی دوسری برسی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جلسے میں شہر کے نمائندہ اہلِ علم، اہلِ قلم اور دانش ور حضرات نے مولوی عبدالحق صاحب کی متنوع اور گوناگوں خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔ مولوی صاحب کو جدا ہوئے ابھی دو برس ہی گزرے تھے اور اُن کے بچھڑنے کا غم اور زخم ابھی تازہ تھا۔

جلسے کے اختتام پر ''قومی زبان'' کے بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۳ء کی ایک ایک کاپی مقررین اور اہلِ علم حضرات کی خدمت میں پیش کی گئی۔ ایک کاپی خواجہ صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے خود مجھے پیش کی اور بولے، ''دیکھ لیجیے آپ کا مضمون بھی اس میں شامل ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اُن کے چہرے پر مسرت اور شادمانی کی جو کیفیت تھی اُسے میں کبھی فراموش نہیں کر پایا۔ خواجہ صاحب نے مجھ سے اپنی زندگی کا پہلا ادبی مضمون لکھوا کر گویا میری آئندہ زندگی کی ایک مخصوص سمت اور مقصد کا تعین کردیا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو اسے مبالغے پر محمول مت کیجیے گا کہ اس مضمون کی ''قومی زبان'' میں اشاعت کے بعد

میں کئی راتوں ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا۔ بعد میں یہ خاص نمبر میں اپنے ساتھ اسلامیہ کالج لے گیا اور اپنے اُردو کے استاد پروفیسر ممتاز حسین کے علاوہ، ہم جماعت احباب کو بھی بڑے فخر سے دکھاتا رہا۔

والد مرحوم کے جو مقالات و مضامین میں نے جناب اختر حسین، صدر انجمن کے کہنے پر، مشفق خواجہ صاحب کے حوالے کیے تھے اُن میں "سر سید کا علمی کارنامہ" کے عنوان سے، وہ طویل مقالہ بھی شامل تھا جو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے زیرِ اہتمام، سر سید احمد خاں کی یاد میں منعقدہ جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ یہ والد صاحب کے انتقال سے چند ماہ پیش تر کا واقعہ ہے۔ سید الطاف علی بریلوی کانفرنس کے سیکریٹری ہوا کرتے تھے۔ انھیں یہ مقالہ بے حد پسند تھا اور وہ اسے خود شائع کرنے کے خواہش مند تھے، چناں چہ انھوں نے مشفق خواجہ صاحب سے رابطہ کیا اور وہ مقالہ اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ بعد ازاں انھوں نے اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا جو اب جامعہ کراچی کے ایم اے اُردو کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ چند برس بعد ہی ایران کی شاہی حکومت کی جانب سے شہنشائیت کے ڈھائی ہزار سالہ جشن کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ قاضی صاحب مرحوم کے اُردو مقالات و مضامین میں سے بیش تر ایسے تھے جن کا تعلق فارسی شعریات و ادبیات سے تھا۔ والد کے جگری دوست اور ہمارے محترم کرم فرما ڈاکٹر ممتاز حسن احسن اس بات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ان دنوں ترقی اُردو بورڈ (اب اُردو ڈکشنری بورڈ) کے صدر تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ایران کے ڈھائی ہزار سالہ جشنِ شہنشائیت کے موقعے پر ترقی اُردو بورڈ ایرانی حکومت سے اظہار یک جہتی کی علامت کے طور پر یہ مقالات شائع کرے، چناں چہ انھوں نے بھی مشفق خواجہ صاحب ہی سے رابطہ کیا اور اُن سے مطلوبہ مضامین طلب کر لیے۔ ایک ملاقات کے دوران مشفق خواجہ صاحب نے مجھے ان تمام مضامین کی ایک فہرست اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی اور مجھے ہدایت کی کہ میں یہ مضامین جناب شان الحق حقی، سیکریٹری ترقی اُردو بورڈ تک پہنچا دوں جو اُس زمانے میں پاکستان ٹیلی وژن، کراچی اسٹیشن کے سیلز آفیسر تھے اور میٹروپول ہوٹل کے نزدیک شفیع کورٹ نامی عمارت میں اُن کا دفتر تھا۔ میں نے خواجہ صاحب کی ہدایت کے بہ موجب فارسی شعر و ادب کے حوالے سے لکھے گئے سارے مضامین کے مسودات حقی صاحب تک پہنچا دیے، جنھیں ترقی اُردو بورڈ نے "مقالاتِ اختر" کے عنوان سے ۱۹۷۲ء میں شائع کر دیا۔ یہ کتاب ٹائپ میں طبع شدہ ہے۔

مشفق خواجہ صاحب کی توجہ اور مہربانی سے والد صاحب کے مقالات و مضامین دو کتابوں کی شکل میں شائع ہو چکے تھے۔ تاہم بقیہ مضامین جو انجمن کی تحویل میں تھے اور جن میں اُردو کے پہلے باقاعدہ اور باضابطہ صاحب دیوان شاعر ولی گجراتی پر لکھے گئے، سات معرکتہ الآرا مقالات بھی شامل تھے، ان کی اشاعت کا مرحلہ ہنوز نہ آ سکا تھا جس کے اسباب اور وجوہ سے میں اُس وقت بھی قطعی لاعلم تھا اور آج بھی، جب کہ انجمن نے وہ مضامین شائع کر دیے ہیں، میں اسی طرح اُن نامعلوم وجوہ سے یکسر بے خبر ہوں۔ بہرنوع، اپنے والد کی علمی اور ادبی یادگار کو کتابی شکل میں محفوظ دیکھنے کی خاطر میں اکثر وقت ملنے پر انجمن

کے دفتر جاتا رہتا تھا اور مشفق خواجہ صاحب سے، ان مضامین کی اشاعت کے بارے میں بھی پوچھ لیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں کراچی سے شائع ہونے والے اُردو اخبار "حریت" کا بڑا نام ہوا کرتا تھا اور روزنامہ "جنگ" کے بعد دوسری پوزیشن اسی اخبار کی تھی۔ میں نے "حریت" کے میگزین کے لیے جدید غزل گو شعرا کے انتخاب اور مختصر تعارف کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ میری خواہش تھی کہ مشفق خواجہ صاحب کی غزلوں کا انتخاب بھی ان صفحات پر شائع کیا جائے۔ ایک ملاقات کے دوران میں نے اپنی خواہش کا اظہار اُن سے کر دیا۔ انھوں نے بلاکسی لیت ولعل کے رضامندی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ کل میں اپنی بیاض دفتر لے آؤں گا آپ اُسی میں سے یہاں بیٹھ کر انتخاب کر لیجیے گا۔ میں سمجھتا ہوں اور اپنی اس رائے پر مجھے آج بھی شدید اصرار ہے کہ مشفق خواجہ صاحب کی تخلیقی شخصیت کا بنیادی حوالہ اُن کی غزل ہے، جس سے وہ آگے چل کر، نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر دست کش ہو گئے تھے۔ بہ ہر کیف ادبی تحقیق اور تفتیش کی جانب اُن کے بڑھتے ہوئے رجحان اور دلچسپی نے انھیں غزل گوئی سے بہت دُور کر دیا تھا اور وہ اسے غالباً فضول کام سمجھنے لگے تھے۔ بہ ہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ انھوں نے تحقیق اور تدوین جیسے خشک اور ٹھوس موضوعات کے ساتھ ساتھ، طنز و مزاح لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا، ورنہ ہم طنز و مزاح اور ہجو کے، تین بے مثال مجموعوں "خامہ بگوش کے قلم سے"، "سخن در سخن" اور "سخن ہائے ناگفتنی" سے محروم ہی رہ جاتے۔ اس موضوع پر میں آگے چل کر بات کروں گا۔ سرِدست تو اتنا جان لیجیے کہ "ابیات" کے عنوان سے مشفق خواجہ صاحب کا پہلا اور آخری شعری مجموعہ ۱۹۷۸ء میں "مکتبۂ نیا دور" کے زیرِ اہتمام شائع ہوا تھا جس میں اُن کا ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۷ء تک کا کلام شامل ہے۔ یہ شعری مجموعہ گزشتہ کئی برسوں سے نایاب ہے اور اس کا حاصل کرنا کارِ دارد کے مترادف۔ میں بے حد ممنون اور شکر گزار ہوں محترمہ پروفیسر عابدہ صاحبہ کا جو اُردو یونی ورسٹی میں شعبۂ اُردو کی سربراہ ہیں اور جنھوں نے مجھے خواجہ صاحب کا شعری مجموعہ "ابیات" فوٹو اسٹیٹ کرا کے دیا تاکہ میں اپنے مضمون میں اس مجموعے سے اقتباس کر سکوں۔ عابدہ صاحبہ کو یہ مجموعہ خواجہ صاحب نے بذاتِ خود اپنے دستخط کے ساتھ پیش کیا تھا۔ میں چاہوں گا کہ اب آپ مشفق خواجہ صاحب کی ایک نمائندہ غزل اور متفرق اشعار کا مطالعہ کریں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ خواجہ صاحب کی غزل میں کیا کیا امکانات پوشیدہ تھے اور روحِ عصر کی کیسی ترجمانی اس میں موجود ہے۔

یہ کوئی دل تو نہیں ہے کہ ٹھہر جائے گا
وقت اِک خوابِ رواں ہے سو گزر جائے گا

ہر گزرتے ہوئے لمحے سے یہی خوف رہا
حسرتوں سے مرے دامن کو یہ بھر جائے گا

دل شفق رنگ ہوا ڈوبتے سورج کی طرح
رات آئے گی تو ہر خواب بکھر جائے گا

شدتِ غم سے ملا زیست کو مفہوم نیا
ہم سمجھتے تھے کہ دل جینے سے بھر جائے گا
چند لمحوں کی رفاقت ہی غنیمت ہے کہ پھر
چند لمحوں میں یہ شیرازہ بکھر جائے گا
اپنی یادوں کو سمیٹیں گے بچھڑنے والے
کسے معلوم ہے پھر کون کدھر جائے گا؟
یادیں رہ جائیں گی اور یادیں بھی ایسی جن کا
زہر آنکھوں سے رگ و پے میں اُتر جائے گا

قدم اُٹھے تو عجب دل گداز منظر تھا
میں آپ اپنے لیے راستے کا پتھر تھا
ہر اک عذاب کو، میں سہہ گیا، مگر نہ ملا
وہ ایک غم جو مرے حوصلے سے بڑھ کر تھا
تمام عمر کی تنہائیاں سمیٹی ہیں
یہی مرے در و دیوار کا مقدر تھا

کتنے چہروں پہ رہا عکس مری حیرت کا
مہرباں مجھ پہ ہوئے آئنہ پیکر کیا کیا
رہ گزرِ دل کی نہ پل بھر کو بھی سنسان ہوئی
قافلے غم کے گزرتے رہے اکثر کیا کیا

گزرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
نہ جانے کون سا لمحہ اُداس کر جائے
ہے ایک خواب مری خود فریب آنکھوں میں
اگر یہ خواب مری روح میں اُتر جائے

غم ہی لے دے کے مری دولتِ بیدار نہیں
یہ خوشی بھی ہے میسر، کوئی غم خوار نہیں

خود سے بھی توڑ چکا ہوں میں تعلق اپنا
اب مری راہ میں حائل کوئی دیوار نہیں
زندہ رہ لوں کسی صورت تو بڑی بات ہے یہ
ورنہ جاں سے تو گزرنا کوئی دشوار نہیں

اک ایسا شخص بھی دائم سفر میں رہتا ہے
جو قید اپنے ہی دیوار و در میں رہتا ہے
فقیرِ گوشہ نشیں اپنی ذات میں گم ہے
اب ایک اور ہی عالم نظر میں رہتا ہے

جانے کیا قصۂ غم تھا کہ نظر نے تیری
بھولنے بھی نہ دیا، یاد بھی کرنے نہ دیا

جس کے نہ ملنے سے کھلے راہِ طلب کے پیچ و خم
میں بھی اُسی کے واسطے اپنی تلاش میں رہا

ہزار خواب ہیں ان خود فریب آنکھوں میں
بچھڑ کے بھی وہ یہاں سے کہیں نہ جائے گا

گزر گئے ہیں جو دن اُن کو یاد کرتا گیا
یہ زندگی کے لیے روز روز مرتا گیا
مری نظر میں گئے موسموں کے رنگ بھی ہیں
جو آنے والے ہیں اُن موسموں سے ڈرتا گیا

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اُسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گیا

سوزِ دوام کا صلہ میری طرح کسے ملا
جس کے لیے جلا تھا میں خود وہ بجھا گیا مجھے
دل کو اُداس کر گئی ایک نگاہِ التفات
سارے جہاں کی بے رُخی دے گئی یہ صلہ مجھے

یہ حال ہے مرے دیوار و در کی وحشت کا
کہ میرے ہوتے ہوئے بھی مکان خالی ہے
دمِ نظارہ مری حیرتوں پہ غور نہ کر
کہ میری آنکھ ازل سے یونہی سوالی ہے
مرے وجود کو جس نے جلا کے خاک کیا
وہ آگ اب ترے دامن تک آنے والی ہے

اسی لیے نہ کیا تلخیِ جہاں کا گلہ
ترا خیال پسِ پردہ مسکراتا تھا

نہ جانے کس کے لیے میرے گھر کا دروازہ
کُھلا ہے اور مری تنہائیوں پہ ہنستا ہے

اے کاش بتا دے کوئی شوریدہ سروں کو
ہر سایہ ترا سایۂ دیوار نہیں ہے

کام کچھ آ نہ سکی رسمِ شناسائی بھی
شاملِ بزم تھی شاید مری تنہائی بھی

ہم نے چاہا تھا کہ دُنیا سے کنارا کرلیں
ہم نے دیکھا تو ہمیں رونقِ دنیا نکلے

ایک تیرا ہی تبسم تو نہ تھا وجہ سکوں
میرے آنسو بھی محبت میں بہت کام آئے

اس انتظار میں آئے گا لوٹ کر کوئی
جلا ہے شمع کی مانند عمر بھر کوئی

زندگی اپنی کچھ اس طرح سے گزری ہے کہ تُو
مل بھی جاتا تو ترا راستہ دیکھا کرتے

جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں، خواجہ صاحب کا کمرہ، انجمن کی دوسری منزل پر کتب خانہ خاص کے بالکل برابر تھا۔ یہ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا، شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہاں بیٹھنے والا شخص خود بہت بڑا تھا۔ خواجہ صاحب کے اسی چھوٹے سے دفتر میں بسا اوقات معروف ادیبوں، شاعروں اور اہلِ قلم سے بھی تعارف ہوجایا کرتا تھا۔ ایک دن جب میں اُن کے دفتر پہنچا تو حیدر آباد سندھ سے استاد اختر انصاری اکبر آبادی تشریف لائے تھے اور خواجہ صاحب سے گفتگو میں مصروف تھے۔ دونوں کے مابین ہونے والی بات چیت سے مجھے اندازہ ہوا کہ باہمی طور پر کافی بے تکلفی موجود ہے۔ جو حضرات ایک بار بھی خواجہ صاحب سے ملے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ وہ بے حد زندہ دل، خوش مزاج، خوش طبع اور بذلہ سنج انسان تھے۔ ہر منٹ دو منٹ کے بعد وہ ایسی کوئی بات کہہ دیتے یا فقرہ کس دیا کرتے تھے جسے سن کر آدمی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجائے۔ بالخصوص اپنے بے تکلف احباب کی موجودگی میں خواجہ صاحب کی رگِ طنز و ظرافت خوب پھڑکتی تھی۔ چناں چہ استاد اختر انصاری اکبر آبادی کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے بولے، ان سے آپ واقف ہیں؟ یہ ہیں استاد اختر انصاری اکبر آبادی جن کے لیے کسی دل جلے نے کہہ رکھا ہے:

ملک جب ہوا تقسیم ہاتھ اپنے کیا آیا؟
ایک اختر انصاری وہ بھی اکبر آبادی!

میں نے دیکھا کہ اختر صاحب، سر جھکائے خاموشی سے خواجہ صاحب کے جملوں کا وار سہنے میں مصروف ہیں۔ خواجہ صاحب پھر گویا ہوئے، ''ان کے بارے میں ایک مزے کی بات اور ہے! جب استاد کراچی وارد ہوتے ہیں تو ہم اُن کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہیں اور جب ہم ان کے پاس حیدر آباد جاتے ہیں تب بھی اُستاد میزبانی کا شرف ہمیں ہی بخش دیتے ہیں۔'' اس جملے میں جو کاٹ اور لطف پوشیدہ ہے اُس کا مزہ آج بھی بدستور قائم ہے۔

دن یوں ہی گزرتے رہے۔ مہ و سال کا سلسلۂ روز و شب، حادثات کی نقش گری میں محو تھا کہ اچانک خواجہ صاحب نے انجمن ترقی اُردو سے سبک دوش ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اس فیصلے کے کیا اسباب تھے، میں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی تھی۔ خواجہ صاحب انجمن سے چلے گئے تو میری مایوسی میں اور اضافہ ہوگیا۔ میں چاہتا تھا کہ والد مرحوم کے بقیہ مضامین بالخصوص ولی گجراتی پر سلسلۂ مضامین کسی نہ کسی طرح انجمن شائع کردے۔ اس سلسلے میں شبیر علی کاظمی صاحب سے بھی متعدد بار ملاقات ہوئی جو انجمن کے سکریٹری تھے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ کے مصداق نہ جانے کون سی مصلحت اور رکاوٹ آڑے آرہی تھی کہ یہ مضامین ایک سابق صدر کی سرکاری منظوری کے باوجود اشاعت پذیر ہونے سے اب تک محروم تھے۔ میں نے بھی اپنے طور پر تمام ممکنہ کوششیں جاری رکھیں کہ کسی بھی طرح والد مرحوم کی یہ علمی امانت کتابی صورت میں محفوظ ہوجائے۔ میرے صبر اور مستقل مزاجی کی بھی داد دیجیے کہ میں پورے پچیس برس تک ان مضامین کے انجمن کی جانب سے چھپنے کا انتظار کرتا رہا لیکن بے سود! چناں چہ میں نے تہیہ کرلیا کہ اب کسی فیصلہ کن اقدام کا وقت آن پہنچا ہے۔ جناب نور الحسن جعفری (اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے) انجمن کے نئے صدر مقرر ہوچکے تھے۔ میں نے اپنے والد کے مضامین اور اُن کی عدم اشاعت کے حوالے سے پورا ماجرا ایک خط میں تفصیل کے ساتھ بیان کرکے رجسٹرڈ ڈاک سے انھیں ارسال کردیا۔ جعفری صاحب نے فوری طور پر میری درخواست پر ایکشن لیا اور اُن کے حکم اور فیصلے کے عین مطابق ان مضامین کو "مضامین اختر جونا گڑھی" کے عنوان سے انجمن کے اشاعتی منصوبے میں شامل کرلیا گیا۔ اس طرح ایک ایسے ہفت زبان عالم اور محقق کے مضامین کو "دن کی روشنی" دیکھنا نصیب ہوئی جس کی پُرخلوص اور دیانت دارانہ خدمات کا اعتراف خود مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تعزیتی تقریر میں کیا تھا۔

انجمن ترقی اُردو سے سبک دوش ہونے کے بعد مشفق خواجہ صاحب "کاشانۂ رحمت" میں گوشہ نشیں ہوگئے اور پھر اسی گوشۂ عافیت سے وہ آخرت کے سفر پر روانہ ہوئے۔ گوشہ نشینی کی یہ مدت ایک رُبع صدی سے زیادہ ہی تھی لیکن انھوں نے اپنی بیش قیمت متاعِ حیات کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور کاشانۂ رحمت کے ایک کمرے میں بیٹھ کر انھوں نے اعلیٰ پائے کے تحقیقی اور علمی کارنامے انجام دیے جو ہماری آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں گے۔ یہاں میں ایک اہم بات آپ کو بتانا بھول گیا تھا سو وہ یاد دلاتا چلوں۔ جب میں ۱۹۶۰ء کے اوائل میں مشفق خواجہ صاحب سے ملنے کی غرض سے انجمن جایا کرتا تھا، تو وہ صوفی عبدالرشید صاحب کی بنائی ہوئی چائے میں اپنی دراز میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیا سے کچھ نکال کر چائے کی پیالی میں ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک دن میرے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ انھیں شوگر کی تکلیف ہے اس لیے وہ چائے میں چینی کے بجائے یہ ننھی ننھی گولیاں (غالباً سکرین) استعمال کرتے ہیں۔ اس واقعے سے اندازہ کیجیے کہ خواجہ صاحب کو شوگر کا مرض تقریباً

گزشتہ پینتیس چالیس برسوں سے لاحق تھا۔ اسی نامراد بیماری نے بالآخر ان کا کام تمام بھی کردیا۔ گوشہ نشینی کے اس تمام عرصے میں بارہا مشفق خواجہ صاحب سے ملاقاتیں رہیں۔ ۱۹۷۸ء میں، میں نے اپنے پاس موجود تمام کاغذات اور دستاویزات جن کا تعلق میرے والد کی علمی و ادبی زندگی سے تھا، خواجہ صاحب کے سپرد کردیے تھے کیوں کہ پرانا مکان فروخت کرنے کے بعد نقل مکانی کا سلسلہ درپیش تھا اور مجھے ڈر تھا کہ یہ بچا کھچا سرمایہ کہیں ضائع نہ ہوجائے۔ چناں چہ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے وہ ساری فائلیں خواجہ صاحب کی تحویل میں دے دیں تاکہ ان کی حفاظت کا مناسب بندوبست ہوسکے۔

۱۹۹۸ء کا کون سا مہینا تھا، یہ تو اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ ایک شام گھر پر خواجہ صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے، ''سندھ یونی ورسٹی جام شورو کے مجلّہ 'تحقیق' میں آپ کے والد پر ایک گوشہ شائع کیا گیا ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو ایک کاپی کل کسی وقت آکر مجھ سے لے لیں۔'' میں حسبِ وعدہ کاشانہ' رحمت پہنچا۔ خواجہ صاحب نے مجلّہ ''تحقیق'' کا شمارہ نمبر ۸ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، ''دیکھیے ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے کس خوش اسلوبی سے قاضی صاحب مرحوم پر یہ گوشہ مرتب کیا ہے۔'' میں نے فوراً یہ شمارہ ان کے ہاتھوں سے لے لیا۔ وفورِ شوق میں اسی وقت ورق گردانی شروع کردی۔ ۱۹۷۸ء میں قاضی صاحب کے حوالے سے جتنے کاغذات، مضامین، دستاویزات میں نے مشفق خواجہ صاحب کی تحویل میں دیے تھے وہ سب کے سب اس مجلّے میں شامل تھے۔ فرطِ مسرت سے میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ میں نے خواجہ صاحب کا رسمی شکریہ ادا کیا اور کاشانہ رحمت کی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگیا اور آج یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے خواجہ صاحب کا یہ شعر سماعت میں گونج رہا ہے:

یادیں رہ جائیں گی اور یادیں بھی ایسی جن کا
زہر آنکھوں سے رگ و پے میں اُتر جائے گا

☆☆☆

مشفق خواجہ کے خطوط

بنام رفیع الدین ہاشمی

تمہید

مشفق خواجہ اپنی شاعری اور تحقیق کے برعکس دوست نوازی میں بہت فیاض اور مکتوب نگاری میں خاصے بسیار نویس تھے۔ اُردو دنیا کے بہت کم لوگ اس معاملے میں ان کے ہم پلہ ہوں گے۔ وہ خط کا جواب ضرور دیتے تھے اور ممکنہ حد تک جلد از جلد۔ اجنبیوں، طلبہ اور خردوں کو بھی جواب سے محروم نہ رکھتے۔ وہ احباب کو از خود بھی خط لکھنے سے دریغ نہ کرتے۔

مکاتیبِ مشفق خواجہ تحقیق و تنقید اور مطالعے کا ایک اہم، دلچسپ اور مستقل موضوع ہے۔ اس سے مرحوم کی شخصیت کے ایسے نادر پہلو سامنے آسکتے ہیں جن کا علم شاید کسی اور ذریعے سے ممکن نہ ہو۔ مزید برآں یہ علم و ادب کا بیش بہا خزینہ بھی ہیں۔ اس احساس کے تحت راقم خواجہ صاحب کے دوست احباب کو آمادہ کرتا رہا کہ مرحوم سے ہماری محبت اور تعلقِ خاطر کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ ان کے خطوط کو مرتب کر کے شائع کر دیا جائے۔ خود میں نے نو خطوط مختصر حواشی کے ساتھ ''مخزن'' لاہور، شمارہ ۹ میں شائع کرا دیے ہیں۔ مزید اڑتیس منتخب خطوط ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

راقم کے پاس مرحوم کے ڈیڑھ سو خط محفوظ رہ گئے۔ یہ سارے کے سارے تو شائع کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ان میں سے چند ایک رسمی نوعیت کے ہیں، پھر بھی مزید کچھ خطوط آئندہ کسی موقعے پر شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

زیرِ نظر منتخب خطوط ایسے ہیں جن سے خواجہ صاحب کے سوانح اور شخصیت کا کوئی نہ کوئی پہلو منکشف ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ انھوں نے کالم نگاری صرف اور صرف صلاح الدین شہید کے پاسِ خاطر کی اور سات سال تک کوئی معاوضہ نہیں لیا، یا یہ کہ آخر زمانے میں اپنے کتب خانے کے ساتھ ۱۹ اپنے نامکمل

کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بہت فکر مند تھے، پھر یہ کہ دوستوں کی ضروریات کے سلسلے میں جزئیات تک پر ان کی نگاہ رہتی تھی۔ اس طرح خطوں سے کسی علمی و ادبی مسئلے پر ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے، کوئی علمی اشکال دور ہوتا ہے یا قاری کو راہ نمائی ملتی ہے۔ خواجہ صاحب سے میری خط کتابت ۱۹۶۷ء میں شروع ہوئی۔ پہلی ملاقات بھی مئی ۱۹۶۷ء میں کراچی میں ہوئی تھی۔ زیرِ نظر انتخاب میں اپنے نام پہلا خط بھی شامل کر رہا ہوں، محض بہ طور یادگار، ورنہ اس کی سوانحی یا علمی اہمیت کچھ نہیں ہے، محض ایک اطلاع ہے۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب انجمن ترقی پاکستان میں مددگار معتمد تھے، چوں کہ یہ دفتری نوعیت کا مراسلہ تھا، اس لیے ٹائپ میں ہے (باقی تمام خطوط مرحوم کے دست نوشت ہیں)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب صحتِ املا کے بارے میں ابھی زیادہ حساس نہ تھے۔ اس خط میں ''تمغۂ بابائے اُردو'' لکھا ہے (بجائے: تمغائے بابائے اُردو)۔

خطوں پر حواشی اور توضیحات بھی دی جارہی ہیں جن سے متن کی تفہیم میں مدد ملے گی۔ حواشی مختصر اور تعارفی ہیں، محققانہ نہیں۔ یہ وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ چند ایک خطوں کے بعض حصے یا جملے یا الفاظ حذف کر کے وہاں نقطے لگائے گئے ہیں۔

پہلے خط کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ انجمن ترقی اُردو پاکستان نے غالباً اسی برس طے کیا تھا کہ ہر سال انجمن ایم اے اُردو میں اوّل آنے والے طالب علم کو ''تمغائے بابائے اُردو'' (مع پانچ سو روپے) دیا کرے گی۔ راقم نے پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ۱۹۶۶ء میں ایم اے اُردو اوّل بہ درجہ اوّل میں پاس کیا تھا۔ جنوری یا فروری ۱۹۶۷ء میں نتیجہ آنے پر انجمن کو اطلاعی خط لکھا، جواباً ذیل کا خط موصول ہوا۔

☆

(۱)

تاریخ: ۷/اگست ۱۹۶۷ء

محترمی، تسلیم

آپ کے مکتوب مؤرخہ یکم اگست کے حوالے سے ترقیم ہے کہ تمغۂ بابائے اردو کسی طالب علم کو براہِ راست نہیں دیا جاتا۔ ہر یونی ورسٹی اپنے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد سے قبل انجمن کو مطلع کرتی ہے اور تمغہ (مع پانچ سو روپے) ارسال کر دیا جاتا ہے۔

آپ کے سلسلے میں پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی، آپ کے خط کی نقل یونی ورسٹی کے کنٹرولر امتحانات کی خدمت میں بھیج دی گئی ہے۔ ان کا جواب آنے پر مناسب کارروائی کی جائے گی۔

مخلص مشفق خواجہ
مددگار معتمد

☆

(۲)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

گرامی نامہ مل گیا تھا۔ شکریہ

اقبال والی کتاب ان شاء اللہ جلد ہی آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔[☆۱]

اُردو بورڈ لاہور نے ''جائزۂ مخطوطات اُردو'' بھی شائع کردی ہے۔ میں نے اعزازی نسخوں کے لیے انھیں جو فہرست بھیجی ہے اس میں آپ کا نام نامی بھی شامل ہے۔

اس وقت ایک زحمت دے رہا ہوں۔ اختر انصاری اکبر آبادی (حیدر آباد) آج کل بیمار ہیں۔ ان کے مالی حالات خرابی کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ یہاں کے دوست جو کچھ کر سکتے تھے، انھوں نے کیا لیکن اب معاملہ زیادہ نازک ہوگیا ہے، اس لیے ادیبوں کی طرف سے ایک اپیل حکومت کو بھیجی جا رہی ہے۔ اس کی ایک کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ازراہ کرم اس پر سرگودھا کے ادیبوں کے دستخط کرا دیجیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے دستخط ضرور ہونے چاہئیں۔ اُن کا نام بڑا ہے اور اس کا اثر بھی زیادہ ہوگا۔[☆۲]

امید ہے آپ توجہ فرمائیں گے، اور جلد۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ ۱۷۔۵۔۷۹ء

☆

(۳)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

پہلے آپ کی گراں قدر کتاب ''خطوطِ مودودی'' ملی اور پھر گرامی نامہ۔ اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ کتاب مرتب کر کے آپ نے ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔ اُردو کے مکاتیبی ادب میں یہ کتاب یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ہے۔[☆۳] مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی دینی اور علمی حیثیت ان کی ادبی حیثیت پر اس حد تک غالب آگئی ہے کہ ان کے ادبی پہلو خصوصاً اسلوب کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ میری رائے میں مولانا نے اُردو کو ایک ایسا توانا اسلوب دیا ہے جو ہر قسم کے مطالب کے ادا کرنے

☆۱۔ مولوی احمد دین (۱۸۶۶ء۔۱۹۲۹ء) کی کتاب: ''اقبال'' (۱۹۲۶ء) جسے تصحیحات و حواشی اور ایک مفصل مقدمے کے ساتھ خواجہ صاحب نے انجمن ترقی اردو پاکستان سے ۱۹۷۹ء میں شائع کرایا تھا۔

☆۲۔ اس زمانے میں راقم کا قیام سرگودھا میں تھا چنانچہ اختر انصاری اکبر آبادی (م: ۱۸؍اگست ۱۹۸۵ء) کے لیے مالی اعانت کی اپیل پر ڈاکٹر وزیر آغا سمیت سرگودھا کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے دستخط حاصل کر کے اپیل خواجہ صاحب کو بھیج دی تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے خود بھی انھیں ایک چیک بھیجا تھا۔

☆۳۔ ''خطوطِ مودودی'' دوم، مرتبین: رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد، منشورات، لاہور، ۱۹۹۵ء۔

کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ کبھی اس موضوع پر تفصیل سے لکھیں۔☆۴

"اقبال از احمد دین" کے سلسلے میں آپ نے بہت مفید معلومات سے نوازا ہے۔ آپ کا گرامی نامہ میں نے سنبھال کر رکھ لیا ہے، اس کی روشنی میں نظرِ ثانی کروں گا۔☆۵

ایک علم دوست شخص ہیں، سید محمد نواز صاحب۔ میرے کرم فرما ہیں۔ ان کے پاس مولانا مودودیؒ کے کچھ خطوط ہیں۔ میرے حوالے سے آپ انھیں ملیے۔ سروس شو کمپنی میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کا کوئی اشتہاری ادارہ ہے جس کے وہ مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ لاہور ہی میں رہتے ہیں۔ سروس شو والوں کو فون کر کے سید محمد نواز صاحب کا پتا معلوم کیا جا سکتا ہے۔☆۶

میرے پاس بھی مولانا کے کچھ خطوط ہیں، تلاش کروں گا اور آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

"تحقیقی ادب" ان شاء اللہ اگلے ماہ ضرور شائع ہو جائے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۹۔۷۔۸۳ء

☆

(۴)

برادرِ مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ مل گیا تھا۔ بے حد ممنون ہوں۔

آپ نے شاید مجھے پیشہ ور کالم نویس سمجھ لیا ہے کہ جیسے یہ میرا ذریعۂ معاش ہو یا عادت☆۷۔ زندگی کے راستے میں بے شمار مقامات ایسے آتے ہیں جہاں آدمی کچھ دیر تک رُک کر گرد و پیش کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کالم نگاری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ نہ صرف اب بلکہ اس سے پہلے بھی بارہا دوسری جگہوں سے خامہ فرسائی کی دعوت مل چکی ہے لیکن

☆۴۔ میں تو اس موضوع پر، ایک آدھ شذرے کے سوا، تاحال کچھ نہیں لکھ سکا، تاہم پروفیسر خورشید احمد کی مرتبہ "ادبیاتِ مودودی" میں اس موضوع پر ضیا احمد بدایونی، احسن فاروقی، ابوالخیر کشفی اور ابواللیث صدیقی ایسے اکابرِ ادب کے مضامین شامل ہیں۔ بھارت کی بعض جامعات میں مولانا کی ادبیانہ حیثیت پر تین پی ایچ ڈی ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں ایم اے اور ایم فل کے مقالے لکھے گئے اور ایک پی ایچ ڈی ہو رہا ہے۔

☆۵۔ بعد ازاں میں نے اس پر ایک تبصرہ بھی لکھا ("جسارت" کراچی ۹ نومبر ۱۹۷۹ء)۔ خواجہ صاحب، کتاب پر نظرِ ثانی نہ کر سکے اور یہ ذمہ داری راقم کو سونپی، چناں چہ اس کا نیا ایڈیشن اقبال اکادمی لاہور سے زیرِ طبع ہے۔

☆۶۔ میں نے سید نواز (م: نومبر ۱۹۸۹ء) سے دو خط حاصل کر کے "خطوطِ مودودی" دوم میں شائع کیے۔ سید نواز نہایت نفیس شخص تھے، مزید دیکھیے: کتاب مذکور۔

☆۷۔ "جسارت" سے محمد صلاح الدین شہید کی علاحدگی کے بعد خامہ بگوش کا کالم بھی بند ہو گیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ آپ تو کالم جاری رکھیں۔ یہ ان کے جوابی تاثرات تھے۔

جس کو ہوں جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

کالم نگاری کی وجہ سے ہفتے میں دو دن میرے ذہن پر بوجھ رہتا تھا اور باقی پانچ دن پڑھنے والوں کے ذہنوں پر۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ہم سب آرام سے ہیں۔

والد صاحب مرحوم کے نام مولانا مودودیؒ کے خطوط آپ کو ضرور پیش کروں گا۔ اس سال کاغذات کی ترتیب کے کام کو اوّلیت دے رہا ہوں☆[۸] کیا آپ نے سید محمد نواز صاحب سے مولاناؒ کے خطوط حاصل کر لیے تھے۔☆[۹]

محمد صلاح الدین صاحب کی ''جسارت'' سے علاحدگی کی وجہ سے ''جسارت'' کو خاصا نقصان پہنچا ہے۔ اس اخبار کی ساری ساکھ اس اداریہ نویس کی وجہ سے تھی جسے علاحدہ کیا گیا ہے۔ محمد صلاح الدین اور ''جسارت'' لازم و ملزوم تھے۔ یہ اختراق بلکہ انشقاق ان سب لوگوں کے لیے تکلیف دہ ہے جو ''جسارت'' اور محمد صلاح الدین صاحب دونوں کے خیر خواہ ہیں۔ آخر آپ لوگوں نے کیا سوچا ہے۔

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

کیا کوئی صورت ایسی نہیں ہوسکتی کہ سینہ چاکان چمن سے پھر سینۂ چاک آملیں۔ محمد صلاح الدین صاحب نے ''جسارت'' کے لیے جو قربانیاں دی ہیں، ان کی کوئی دوسری مثال برصغیر کی صحافت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کیا یہ شخص ایسے سلوک کا مستحق تھا؟ آپ جماعت والوں کو سمجھایئے☆[۱۰] کہ اگر جسارت کو زندہ رکھنا ہے تو یکم جنوری ۸۴ء سے پہلے کی صورتِ حال کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔

لاہور میں آپ سے ملاقات مختصر رہی۔ جی چاہتا تھا کہ دیر تک آپ سے بات چیت ہو لیکن لاہور کا قیام اتنا مختصر تھا کہ آپ سے دوبارہ ملاقات نہ ہوسکی۔ بہ ہر حال آئندہ سہی!

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۳۰۔۱۔۸۴ء

☆

(۵)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

ابھی کچھ دیر پہلے آپ کا گرامی نامہ ملا، اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کو ارمغانِ علمی☆[۱۱] پیش کرنے کا خیال کئی مہینے پہلے

☆☆۸۔ افسوس ہے مذکورہ خطوط حاصل نہ ہو سکے۔

☆☆۹۔ دیکھیے: خط ۳، حاشیہ ۴۔

☆☆۱۰۔ یہ خواجہ صاحب کی خوش خیالی تھی کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں۔

☆☆۱۱۔ میں نے اپنے طور پر استاد محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب (پ: ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء) کے لیے ایک علمی ارمغان تیار کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ اس کا جواب ہے۔

میرے دل میں بھی آیا تھا۔ گویا استادِ ازل نے یہ بات ایک ہی وقت میں ہم دونوں کے دل میں ڈالی۔ میں نے بس یہ غلطی کی کہ آپ سے مشورہ نہ کیا۔ قاسمی صاحب کو بتا دیا تھا کہ اس مجلس میں ڈاکٹر وزیر آغا کو شامل کیا ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کو بھی مطلع کر دیا تھا کہ قاسمی صاحب مجلس کے صدر ہوں گے۔ ان دونوں کی فراخ دلی ہے کہ میری خاطر ''یکجائی'' گوارا کرلی۔ کاش آپ کا خط پہلے آجاتا تو میں اس مجلس میں آپ کو بھی شامل کرلیتا۔☆۱۲ بہر حال ''ارمغان'' جب چھپے گا تو اس میں آپ کا نامِ نامی شامل ہوگا۔ آپ ہی اس کے مرتب ہوں گے۔ مقالے کی تیاری بھی ابھی سے شروع کر دیجیے۔

اب تک جو کام ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستان کے متعدد اہلِ علم کو خط لکھے تھے۔ بہت سوں نے مضامین کا وعدہ کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون موصول ہو چکا ہے۔ رشید حسن خاں صاحب کا مضمون آج کل میں آنے والا ہے۔ پاکستانی اہلِ قلم کو اسی ہفتے خط لکھوں گا۔ ازراہِ کرم ایسے پاکستانی اہلِ قلم کے ناموں کی فہرست بنا دیجیے جنھیں خط لکھے جائیں۔ لاہور کی حد تک مقالوں کی فراہمی کا کام آپ ہی کو کرنا ہوگا۔

ارمغان میں صرف علمی و ادبی مقالات شامل کرنے کا منصوبہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر صرف ایک مضمون ہوگا۔ یہ مضمون ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھ رہے ہیں۔

آپ کے دونوں خط مل گئے تھے لیکن یہاں جو حالات رہے، ان کی وجہ سے طبیعت سخت بیزار تھی۔ کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے میں ایک چھوٹی سی خدمت بھی انجام نہ دے سکا۔ یعنی آپ کی مطلوبہ کتابیں نہ بھجوا سکا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے یہ کتابیں کسی ذریعے سے حاصل کرلی ہوں۔ بہ واپسی ڈاک مطلع فرمایئے۔ میں مطلوبہ کتابیں فوراً بھیج دوں گا۔

''مجلسِ ادبیاتِ مشرق'' کے نام سے میں نے ایک علمی ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو بہ وقتِ ملاقات ہوگی۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۔۴۔۸۷ء

☆

(۶)

برادرِ مکرم و محترم، سلام مسنون

میرے ہاں قیام سے آپ کو جو زحمت اٹھانی پڑی، امید ہے اب تک اس کا تاثر زائل ہو چکا

☆۱۲۔ خواجہ صاحب کا یہ خط ''ارمغانِ علمی'' کے مطبوعہ پیڈ پر ہے جس کے مطابق ارمغان کی مجلسِ ادارت و مشاورت احمد ندیم قاسمی (صدر) ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، علی جواد زیدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مختار الدین احمد، خلیق احمد اور مشفق خواجہ (معتمد اعزازی) پر مشتمل تھی اور ارمغان کی تیاری ''مجلسِ ادبیاتِ مشرق'' کے زیرِ اہتمام ہو رہی تھی۔ ارمغان کا مزید ذکر آئندہ خطوط میں آئے گا۔

ہوگا۔ میرا مجموعۂ کلام ''ابیات'' آپ کے پاس ہے، شاید یہ شعر آپ کی نظر سے گزرا ہو۔

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اُسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گیا

جب اس گھر میں میری یہ حالت ہے تو آپ پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی۔ بہ ہر حال آپ کی تکالیف سے زیادہ، مجھے اپنی اُن خوشیوں کا خیال آتا ہے جو میں نے آپ کی قربت سے کشید کیں۔ اگر تحسین فراقی صاحب بھی ساتھ ہوتے تو مزہ آجاتا۔ ہم آپ دونوں اپنے ناموں میں ''وصالی'' کے جزو کا اضافہ کر سکتے تھے۔

پہلا گرامی نامہ ڈاکٹر احمد سجاد صاحب☆[۱۳] کے ذریعے ملا، دوسرا ڈاک سے۔ ان عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اس کا بھی بہت شکریہ کہ آپ نے رئیس احمد جعفری پر مضمون لکھ دیا۔ بہت اچھا مضمون ہے☆[۱۴] نظامی کے مضمون کا عکس بھی مل گیا۔ شکریہ۔

میں نے کل کی ڈاک سے ایک پیکٹ بھیجا ہے۔ اس میں آپ کی مطلوبہ کتابوں کے عکس ہیں۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے کچھ کتابیں دی تھیں، وہ بھی ہیں۔ ڈھاکے سے ایک رسالہ ''مجلس'' آیا ہے۔ اس میں تراجم اقبال (بنگالی) پر تبصرہ ہے۔ اس تبصرے کا عکس بھی ہے۔ اکبر حیدری کشمیری صاحب کا آپ کے نام ایک لفافہ آیا تھا، وہ بھی پوسٹ کر دیا گیا ہے☆[۱۵]

آپ نے اپنے خط میں کچھ خاص نمبروں اور کتابوں کے نام لکھے ہیں جو آپ کے پاس زائد ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی میرے پاس نہیں۔ اس لیے آپ یہ سب بھجوا دیجیے۔ اس کے ساتھ ہی اگر آپ اورینٹل کالج میگزین کا سید عبداللہ نمبر بھی بھجوا سکیں تو کرم ہوگا۔

عقیل صاحب کے لیے آپ نے جو رسالے ڈاکٹر احمد سجاد صاحب کے ہاتھ بھجوائے تھے، وہ میں نے انھیں دے دیے تھے۔

اقبال نمبر جو میرے کتب خانے میں ہیں، اُن کی فہرست بنوا کر بھجوا دوں گا۔

''پریم سنگم'' کہاں رکھی ہے؟☆☆[۱۶] اقبالیات کی الماری میں یا آپ نے وہاں سے نکال کر مجھے دی تھی۔ آپ رہ نمائی کیجیے تاکہ یہ کتاب آپ کی نذر کر سکوں۔

مجلہ ''رئیس احمد جعفری کی یاد میں'' آپ لے گئے، بہت اچھا کیا۔ اس میں اجازت کی کیا

☆۱۳۔ ڈاکٹر احمد سجاد (سابق صدر شعبۂ اردو رانچی یونی ورسٹی، بہار) ان دنوں وہ پاکستان کے دورے پر تھے۔ لاہور سے کراچی جا رہے تھے تو میں نے خواجہ صاحب کے لیے خط ان کی ذریعے بھیجا تھا۔

☆۱۴۔ خواجہ صاحب نے ۱۳ مارچ ۱۹۸۹ء کے خط میں فرمائش کی تھی کہ ''اقبالیات رئیس احمد جعفری'' کے عنوان پر ایک مضمون کی ضرورت ہے۔ اس کی تعمیل میں یہ مضمون بھیجا گیا تھا جو جعفری مرحوم کی یاد میں شائع شدہ ایک سووینئر میں شامل ہوا۔

☆۱۵۔ بھارت کے معروف محقق اکبر حیدری کاشمیری (پ: ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء) سری نگر اور حیدر آباد کی جامعات میں اُردو کے پروفیسر رہے ہیں۔

☆☆۱۶۔ مارچ ۱۹۸۹ء میں، راقم چند روز خواجہ صاحب کے ہاں مقیم رہا اور پہلی بار ان کے کتب خانے کی سیر کی۔ اقبالیات کی بعض دوسری کتابوں کی طرح ''پریم سنگم'' کے بھی دو نسخے نظر آئے۔ خواجہ صاحب نے، بعد ازاں مجھے یہ بھی بھجوا دی تھی۔

بات ہے۔ اس کے اگر آپ ایک سے زائد نسخے لے جاتے تو مجھے خوشی ہوتی۔

"ارمغانِ علمی" کا کام باقاعدگی سے رمضان کے بعد شروع کروں گا۔ کل ہی علی گڑھ سے ڈاکٹر مختار الدین احمد کا خط آیا ہے کہ انھوں نے چند مقالے علی گڑھ کے اہلِ علم سے حاصل کر لیے ہیں۔

پیکٹ کی وصولی کی اطلاع ضرور دیجیے گا تا کہ اطمینان ہو کہ یہ آپ کو مل گیا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۱۷۔۴۔۸۹ء

آپ کی طلبِ صادق کا نتیجہ یہ ہے کہ خط لکھنے کے بعد میں اس تاریخی کمرے میں گیا جہاں آپ کا قیام تھا۔ "پریم سنگم" نظر آ گئی۔ اسے رجسٹری سے بھیج رہا ہوں۔[☆۱۷] اس کے ساتھ ایک کتاب "مکالماتِ راغب و جوش" بھی ہے۔ یہ تحسین فراقی صاحب کو دے دیجیے۔ یہ نہایت زہریلی کتاب ہے۔ تحسین صاحب کو الگ خط لکھا ہے کہ اس کتاب کے بارے میں اخبارات میں آنا چاہیے۔ ایک اسلامی ملک میں ایسی کتاب کا شائع ہونا، حیرت ناک بھی ہے اور افسوس ناک بھی۔ اس میں جگہ جگہ اسلام کے خلاف بہت کچھ ہے۔

شریف بقا کی کتاب بھی سابقہ پیکٹ میں شامل تھی۔

☆

(۷)

محترمی و مکرمی سلام مسنون

۱۵ اپریل کو ایک خط لکھا تھا، شاید وہ آپ کو نہیں ملا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے پاس ڈاکٹر گیان چند وغیرہ کے جو مضامین ہیں وہ بھیج دیجیے۔ "دائرے" اور "قومی زبان" وغیرہ میں چھپوا دوں گا۔[☆۱۸] "زندگی" میں آپ نے حمزہ فاروقی کی کتاب پر جو شذرہ لکھا ہے۔[☆۱۹] اس سے وہ بہت خوش ہیں۔ کہنے لگے، اگر ہاشمی صاحب کراچی میں ہوتے تو میں اُن کو دعوت کرتا۔ میں نے عرض کیا۔ کراچی میں، میں اُن کا نمائندہ ہوں۔ آپ دعوت کیجیے،

☆۱۷۔ "پریم سنگم" میں علامہ اقبال اور ان کے مداح اور قدر دان مہاراجا سرکشن پرشاد شاد (۱۸۶۴ء۔۱۹۴۰ء، سابق وزیرِ اعظم حیدر آباد دکن) کا "ملا جلا فارسی" کلام شامل ہے۔ ہر صفحے پر دو کالم ہیں۔ دائیں علامہ اقبال کی رباعی اور بائیں اسی بحر میں شاد کی رباعی۔ ۶۶ صفحات کا یہ مجموعہ خواجہ حسن نظامی نے دہلی سے نومبر ۱۹۵۱ء میں شائع کرایا تھا۔

☆۱۸۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنے چند مضامین اشاعت کے لیے مجھے بھجوائے تھے، ایک تو میں نے "اورینٹل کالج میگزین" میں شائع کرا دیا تھا (خضرِ راہ کا قدیم متن) اور باقی مضامین خواجہ صاحب کو بھجوا دیے تھے۔

☆۱۹۔ حمزہ فاروقی کی کتاب "حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے" (ادارہ تحقیقاتِ پاکستان پنجاب یونی ورسٹی، لاہور ۱۹۸۸ء) پر میرا ایک تعارفی مضمون، ہفت روزہ "زندگی" لاہور میں شائع ہوا تھا۔

ثواب اُن تک پہنچا دوں گا۔ سو یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ کی نمائندگی کر کے کام و دہن کی آزمائش سے گزر چکا ہوں۔ ''آزمائش'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ کھانے کے ساتھ ان کی گفتگو بھی مجھے نگلنی پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گفتگو ہضم ہوئی نہ کھانا۔ اُس دن سے پیٹ خراب ہے۔ اتنی عمر گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ صحبت خراب ہو تو پیٹ بھی خراب ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے سابقہ خط میں یہ عرض بھی کیا تھا کہ اب مجھے پنجاب یونی ورسٹی کی کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔ فہرست دیکھی تو معلوم ہوا سب کتابیں میرے پاس ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۷۔۵۔۹۰ء

☆

(۸)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

گرامی نامہ ملا اور کتاب ''اقبالیاتی جائزے'' بھی☆[۲۰] ان عنایات کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ بکھرے ہوئے مضامین کو یک جا کر دیا۔ اب ان سے استفادہ کرنا عام اور آسان ہو جائے گا۔ یہ بے حد معلوماتی مضامین ہیں۔ ان کی کتابی صورت میں یک جائی بے حد ضروری تھی۔ کتاب کا دوسرا نسخہ طاہر مسعود صاحب کو پیش کر دوں گا☆[۲۱]

اب تو ہندوستانی ادیب اسی طرح کثرت سے آ رہے ہیں جس طرح ہندوستان سے بُری خبریں آتی ہیں۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جن سے مل کر خوشی ہو۔ اسلوب احمد انصاری صاحب☆[۲۲] ایسے ہی کم لوگوں میں سے ہیں۔ ان سے تین چار ملاقاتیں ہوئیں اور کافی مفید۔ کتابیں ہندوستان سے البتہ ایک سے ایک بہتر آ رہی ہیں۔ خصوصاً شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی اور بعض دوسرے نقادوں کی کئی اچھی اچھی کتابیں آئی ہیں۔ فاروقی نے غالب اور میر پر جو کتابیں لکھی ہیں، وہ اگر مل جائیں تو ضرور ملاحظہ کیجیے۔ وارث علوی نے تو اکٹھی چار کتابیں شائع کی ہیں۔ دو تنقیدی مجموعے ہیں، ایک افسانے پر کتاب ہے اور ایک بیدی پر۔ معلوم نہیں آپ نے وارث علوی کو پڑھا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو ضرور پڑھیے۔ اگرچہ یہ شخص، آپ کے نقطۂ نظر سے، خاصا ''غیر شرعی'' نظر آئے گا، لیکن باتیں فکر انگیز کرتا ہے۔

''تحقیق نامہ''☆[۲۳] کی پروف ریڈنگ آخری مراحل میں ہے۔ اس کتاب نے بہت وقت

☆۲۰۔ راقم کا مجموعہ مضامین: گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۹۰ء

☆۲۱۔ معروف صحافی، ادیب اور معلم جناب طاہر مسعود، ان دنوں جامعہ کراچی کے شعبۂ صحافت و ابلاغیات کے صدر نشین ہیں۔

☆۲۲۔ ممتاز نقاد سابق صدر شعبۂ انگریزی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی۔

☆۲۳۔ خواجہ صاحب کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ، ناشر: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۱ء

لے لیا۔ پہلے تو مضامین کی نظر ثانی کی، پھر پروف ریڈنگ کے دوران کئی صفحات تبدیل کرنا پڑے۔ دوسروں کی غلطیاں پکڑتے پکڑتے اپنی غلطیاں بھی پکڑنی شروع کر دیں! حالاں کہ یہ کام مجھے اپنے سے بہتر لوگوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

اگر زحمت نہ ہو تو حسنات اکیڈمی والوں کو فون کر دیجیے کہ ماہر القادری کے "سیاحت نامہ"☆۲۴ کی ایک اور جلد بھیج دیں۔ یہ میں ہندوستان ایک دوست کو بھیجوں گا کیوں کہ اس میں اُن کا ذکر ہے۔ حسنات اکیڈمی والے، آپ کی ضمانت پر مجھے کتابیں بل کے ساتھ بذریعہ رجسٹری بھیج دیتے ہیں۔ میں رقم منی آرڈر سے بھیج دیتا ہوں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۲۵۔۵۔۹۱ء

☆

(۹)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

چند روز ہوئے ایک خط لکھا تھا، امید ہے ملا ہوگا۔

عبدالقوی دسنوی☆۲۵ صاحب کا خط آپ کے نام موصول ہوا ہے۔ یہ منسلک ہے۔ "شاعر" کے ایڈیٹر افتخار امام صدیقی آج کل کراچی میں ہیں۔ اگر آپ اپنی نئی کتاب☆۲۶ انھیں تبصرے کے لیے بھیج سکیں تو اچھا ہو۔ وہ اس کتاب کو میری میز پر دیکھ کر اسے حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہو گئے۔

مظفر حسین برنی صاحب☆۲۷ سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ اقبال کے ایک دو خط بھیجوں گا۔ مندرجہ ذیل دو خط دستیاب ہوئے ہیں۔ از راہِ کرم مطلع فرمایئے کہ یہ دونوں خط کسی مجموعے میں شامل تو نہیں۔

ا۔ حیدر آباد دکن میں ایک صاحب تھے محمد احمد اللہ منصور حیدر آبادی۔ ان کی ایک چھوٹی سی کتاب "آفتابِ ہند" چھپی تھی۔ اس میں پنڈت نہرو کے بارے میں منظومات ہیں۔ کتاب پر سالِ طباعت درج نہیں لیکن یہ طے ہے کہ کتاب آزادی کے بعد چھپی ہے کیوں کہ نہرو کے نام کے ساتھ "وزیر اعظم ہندوستان" لکھا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں مصنف کے نام مختلف لوگوں کے خطوط ہیں۔ خط کی نقل ورق

☆۲۴۔ ماہر القادری (۱۹۰۷ء۔۱۹۷۸ء) کے سفرناموں کا یہ مجموعہ طالب الہاشمی نے مرتب کیا تھا۔ ناشر: حسنات اکیڈمی لاہور۔

☆۲۵۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی (پ: یکم نومبر ۱۹۳۰ء) محقق، نقاد اور ادیب۔ سیفیہ کالج بھوپال میں شعبۂ اردو کے استاد رہے۔ اقبال پر متعدد کتابوں کے مصنف و مولف۔

☆۲۶۔ "اقبالیاتی جائزے" — دیکھیے: خط ۸، حاشیہ ا۔

☆۲۷۔ مظفر حسین برنی (پ: ۱۴ اگست ۱۹۲۳ء) سابق آئی سی ایس، بھارت کے متعدد صوبوں کے گورنر بھی رہے۔

کے دوسری طرف ملاحظہ کیجیے۔ اگر یہ خط کسی مجموعے میں نہیں ہے تو برنی صاحب کے کام کا ہے۔☆۲۸

۲۔ ۲۹رمئی ۱۹۳۳ء کو علامہ اقبال نے ڈاکٹر ریاض الحسن کے نام ایک خط (انگریزی) لکھا تھا جس میں میسولینی کا ذکر ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ خط چھپ چکا ہے لیکن یہ یاد نہیں کہ عکس چھپا ہے یا نہیں۔ اگر عکس نہیں چھپا تو یہ بھی اُن کے کام آجائے گا۔☆۲۹

حوالے کی ساری کتابیں موجود ہیں، اور میں دیکھ سکتا ہوں، لیکن آپ چوں کہ اقبال کے انسائی کلوپیڈیا ہیں، اس لیے مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ آپ کی سند حاصل ہے۔ اگر آپ جلد جواب عنایت فرمائیں تو کرم ہوگا۔

صدیقی صاحب ایک ہفتے تک یہاں رہیں گے۔ اگر اجازت ہو تو طاہر مسعود والی کتاب انھیں دے دوں۔ طاہر صاحب کے لیے دوسری بھجوا دیجیے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۳۔۶۔۹۱ء

جناب مکرمی نقاش سیرت محمد احمد خاں صاحب منصور

تسلیم۔ آپ کا والا نامہ معہ پارسل کتب وصول ہوا۔ افسوس ہے کہ گزشتہ دو سال سے علیل ہوں۔ مشاغل علمی قریباً ترک ہو چکے ہیں اور خط کتابت بھی شاذ ہی کرتا ہوں۔ اس پر بھی میں نے آپ کے کتب وغیرہ دیکھے۔ آپ کی نظم و نثر دونوں اچھی ہیں۔

فقط
نیاز مند، محمد اقبال
۲۴رفروری ۱۹۳۶ء، لاہور

☆

(۱۰)

برادر مکرم، سلام مسنون

۱۷رجون کا گرامی نامہ آج ۲۴رجون کو ملا۔ تاخیر کا سبب کرفیو ہے جو میرے علاقے میں نافذ ہے۔ گزشتہ چھ سات برسوں سے کراچی کی قسمت میں یہی کچھ لکھا ہے!

☆۲۸۔ میں نے فوراً خواجہ صاحب کو مطلع کر دیا کہ مذکورہ خط، اقبال کے کسی مجموعۂ مکاتیب میں شامل نہیں ہے۔ ان دنوں جناب مظفر حسین برنی اقبال کے مکتوبات جمع کر رہے تھے۔ ان کا مرتبہ: ''کلیات مکاتیب اقبال'' چار جلدوں میں اردو اکادمی دہلی سے چھپ چکا ہے۔

☆۲۹۔ اس خط کا انگریزی متن مع اردو ترجمہ راقم کے مرتبہ مجموعے: ''خطوط اقبال'' (لاہور، ۱۹۷۶ء) میں شامل ہے۔

سرسید سے می نار کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب☆[۳۰] نے مجھے ذاتی طور پر خط لکھا ہے، لیکن انجمن کے نام کوئی خط نہیں آیا۔ میں نے جواباً انھیں لکھا ہے کہ وہ انجمن اور حکیم محمد سعید☆[۳۱] کو وفد بھیجنے کے لیے خط لکھیں۔ جب یہ خطوط آجائیں گے تو میں کوشش کروں گا کہ آپ دونوں کے نام کسی ایک وفد میں شامل ہوجائیں☆[۳۲]

ویزے کے سلسلے میں آپ ہرگز یہ ظاہر نہ کیجیے گا کہ سے می نار میں شرکت کے لیے جارہے ہیں۔ ذاتی وجوہ بیان کیجیے گا۔ ہندوستانی سفارت خانہ سے می نار وغیرہ میں شرکت کے لیے ویزا جاری نہیں کرتا۔ بابائے اُردو سے می نار میں جو لوگ انجمن اور ہمدرد کی طرف سے گئے تھے، انھوں نے ذاتی وجوہ کی بنا پر ویزے لیے تھے۔ جنھوں نے ایسا نہیں کیا تھا، وہ نہیں جاسکے تھے۔

کوئٹہ جاتے ہوئے، کراچی ضرور تشریف لایئے۔ اچھا ہے کچھ وقت آپ کے ساتھ گزر جائے☆[۳۳]

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے دُرست بتایا کہ دو کتابوں پر کام مکمل کرلیا ہے۔ ایک تو کالموں کا انتخاب ہے☆[۳۴] اور دوسری ''کلیاتِ یگانہ''۔ کالموں پر بہت وقت ضائع ہوا۔ نظر ثانی اس انداز سے کی ہے کہ بعض کالموں کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ یعنی انھیں از سرِ نو لکھا ہے۔ یگانہ کا متن مرتب کرلیا ہے، اب حواشی لکھ رہا ہوں۔ اور بھی کئی کام شروع کر رکھے ہیں، جب کسی کام سے اُکتا جاتا ہوں تو دوسرا کام ہاتھ میں لے لیتا ہوں۔

اقبال ایوارڈ☆[۳۵] کے سلسلے میں لاہور کا پروگرام ہے۔ دیکھیے سہیل عمر صاحب کب اس کی میٹنگ کرتے ہیں۔

تحسین صاحب سے میرا اسلام کہیے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۳-۶-۹۳ء

☆۳۰۔ معروف محقق، نقاد اور انجمن ترقی اُردو ہند کے جنرل سکریٹری، بھارت کے ایک بڑے مجاہد اُردو (پ: ۲۲؍ جنوری ۱۹۳۳ء)۔

☆۳۱۔ ہمدرد والے حکیم محمد سعید شہید (م: ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

☆۳۲۔ دونوں سے مراد راقم اور تحسین فراقی ہیں۔ دعوت نامہ ہمیں ملا تھا مگر ویزے کے مرحلے سے قبل، بعض دوسری وجوہ سے ہم دونوں بھارت نہ جاسکے۔

☆۳۳۔ کوئٹہ نہ جاسکا، خواجہ صاحب سے متوقع ملاقات بھی نہ ہوسکی۔

☆۳۴۔ یہ ذکر ہے کالموں کے پہلے مجموعے ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کا۔ یہ انتخاب تو مظفر علی سید مرحوم نے کیا تھا، نظرثانی مصنف نے کی (ناشر: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور ۱۹۹۵ء)۔

☆۳۵۔ ''قومی صدارتی اقبال ایوارڈ'' ہر تین سال کے دورانیے میں اقبال پر بہترین تحقیقی و تنقیدی (ایک اُردو اور ایک انگریزی) کتاب پر دیے جاتے ہیں۔ اس کا اہتمام اقبال اکادمی کرتی ہے۔ خواجہ صاحب اُردو ایوارڈ کمیٹی کے رکن تھے۔

☆

(۱۱)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۳/ دسمبر موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔

"قومی زبان" کے ادارۂ تحریر میں میرے نام کی شمولیت میری مرضی کے بغیر ہوئی ہے۔☆۳۶ میں نے کہہ دیا ہے کہ آئندہ میرا نام شائع نہ کیا جائے۔ انجمن سے میرا تعلق ہے اور بہت سے معاملات میں شریک رہتا ہوں لیکن کام کی حد تک، نام کہیں نہیں آنے دیتا۔ پچھلے دنوں انجمن کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے ڈاکٹر اسلم فرخی کے فرائض صرف مطبوعات کی حد تک محدود کر دیے گئے تھے، اس لیے "قومی زبان" سے اُن کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ ایک دن عالی صاحب دفتر گئے اور یہ ہدایت دے آئے کہ ادارۂ تحریر میں میرا نام بھی شامل کر دیا جائے۔ مجھے اس کا اُس وقت علم ہوا جب رسالہ شائع ہو چکا تھا۔

آئندہ آپ کو "قومی زبان" ہی نہیں اُردو بھی باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

"قومی زبان" کا نومبر کا شمارہ شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ ایک مہینے کی تاخیر سے شائع ہوا تھا، نومبر میں دو شمارے شائع کر کے تاخیر کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

لاہور آنے کا مسئلہ یہ ہے کہ سہیل عمر صاحب نے دسمبر کے دوسرے ہفتے میں میٹنگ☆۳۷ رکھنے کے لیے کہا تھا، مگر اس مہینے میں میری یہاں کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں، اس لیے میں نے انھیں لکھا ہے کہ میٹنگ جنوری کے دوسرے ہفتے میں رکھیے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب یہاں تشریف لائے۔ پانچ روز قیام کیا۔ بہت اچھا وقت اُن کے ساتھ گزرا۔

اب تو آپ لوگوں کے دہلی جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۲۸/ نومبر کو ڈاکٹر گیان چند کو یہاں آنا تھا (بابائے اُردو یادگاری لیکچر کے لیے) انھیں بھی ویزا نہیں ملا۔

اس انتظار میں ہوں کہ میں لاہور جاؤں یا آپ کراچی تشریف لائیں تو آپ سے تفصیلی گفتگو ہو۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۷۔۱۲۔۹۲ء

☆۳۶۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے ماہوار رسالے "قومی زبان" کے ادارۂ تحریر میں خواجہ صاحب کا نام دیکھ کر، میں نے عرض کیا تھا کہ آپ نے اپنی ذمہ داری بڑھا لی ہے، علمی کاموں کے لیے وقت اور کم ہو جائے گا۔ خواجہ صاحب کی یہ وضاحت، اس کے جواب میں ہے۔

☆۳۷۔ قومی صدارتی اقبال ایوارڈ کے منصفین کی میٹنگ۔

☆

(۱۲)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

لاہور میں آپ سے ملاقاتوں کی خوش گوار یادوں سے لدا پھندا ۱۳ر فروری کی رات کو میں کراچی پہنچا۔ درمیان میں چند روز اسلام آباد، مری، حسن ابدال اور ٹیکسلا کی سیر کی۔ یہاں پندرہ دنوں کی ڈاک جمع تھی، پھر لاہور میں جو کتابیں حاصل کی تھیں، وہ بھی میری عدم موجودگی میں یہاں پہنچ چکی تھیں۔ چند روز ان چیزوں کے ساتھ بسر کیے اور پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اب کے سفر میں ''ارمغانِ علمی'' کا بوجھ میرے سر سے اتر کر آپ کے سر پر منتقل ہو گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ اب یہ کام بہتر طور پر انجام پائے گا۔ آپ کو زحمت تو ہوگی، جو مضامین میں نے آپ کو دیے ہیں، ان کی فہرست مجھے بھجوا دیجیے تاکہ میں مزید اہلِ علم سے مضامین حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ ان مضامین کے عنوانات سامنے ہوں گے تو موضوعات کی تکرار سے بچا جا سکے گا۔☆۳۸

اب کے نعیم صدیقی صاحب سے مختصر ملاقات رہی۔ جی چاہتا تھا کہ ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کروں مگر ایک دوسری جگہ جانے کا وعدہ کر چکا تھا، اس لیے بادلِ ناخواستہ اس محفل سے اٹھنا پڑا۔☆۳۹

آپ کے دولت خانے پر ظفر حجازی صاحب سے ملاقات رہی۔ اُن سے مل کر خوشی ہوئی۔ اُن کا نورانی چہرہ اب تک آنکھوں میں ہے۔ دائرۃ المعارف کی آخری جلد عنایت کر کے انھوں نے مجھے اور آپ کو، دونوں کو بھاگ دوڑ سے بچا لیا۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے جو خطوط وہ جمع کر چکے ہیں، انھیں پہلی جلد کی صورت میں شائع کر دیں تو دوسری جلد کے لیے بہت سے خطوط پیش کر دوں گا۔ کراچی کے منشی ریاض الدین کے نام کئی خطوط میں نے ''قومی زبان'' یا کسی دوسرے رسالے میں چھپوائے تھے۔ کیا یہ ان کی نظر سے گزرے ہیں؟ یہ خطوط سرور اکبر آبادی صاحب نے میری فرمائش پر مرتب کیے تھے۔☆۴۰

☆۳۸۔ ''ارمغانِ علمی'' کا ذکر ۲ر فروری ۱۹۸۷ء کے خط میں ہو چکا ہے۔ خواجہ صاحب، اقبال ایوارڈ کی میٹنگ میں لاہور آئے تو اس موقعے پر انھوں نے ارمغان کی تیاری کی ذمہ داری سونپ دی۔ متعلقہ مضامین و کاغذات بھی میرے حوالے کیے۔ مجلسِ ادارت و مشاورت میں چند نئے ناموں کا اضافہ کیا گیا اور مجلسِ ادبیاتِ مشرق کا ''دفتر'' بھی لاہور منتقل ہوا۔

☆۳۹۔ نعیم صدیقی (م: ۲۵ر ستمبر ۲۰۰۲ء) مدیر ''سیارہ'' سے یہ ملاقات، ان کے مکان واقع اچھرہ میں ہوئی تھی۔ راقم کے علاوہ برادرم تحسین فراقی اور جعفر بلوچ بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے چند تصاویر بھی بنائی تھی۔ غالباً نعیم صاحب سے یہ اُن کی آخری ملاقات تھی۔

☆۴۰۔ میرے دوست پروفیسر محمد صدیق ظفر حجازی (پ ۵ر اگست ۱۹۳۵ء) حال استاد اردو گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن لاہور سید محمد عبداللہ مرحوم کے خطوط جمع کر کے مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انھوں نے خطوط جمع تو کیے، مگر مجموعے کی ترتیب و اشاعت ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔

آپ نے غرناطہ کا جو خوب صورت یادگاری ایش ٹرے دیا تھا، وہ میں نے ایسی جگہ رکھا ہے کہ ہروقت نظر پڑتی رہے۔ اسے بہ طور ایش ٹرے استعمال کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں ہے۔ اس کا حُسن مجروح ہوجائے گا۔ ایسی خوب صورت چیز سے یہ سلوک بدذوقی کا ثبوت ہوگا۔[☆۴۱]

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۲۔۲۔۹۳ء

☆

(۱۳)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

صابر کلوروی صاحب[☆۴۲] آج تشریف لائے اور انھوں نے آپ کا خط، کتابوں کے ساتھ دیا۔ اُن کی موجودگی میں ڈاک آئی تو آپ کا ۱۴ر اپریل کا خط بھی مل گیا۔ ان سب عنایات کے لیے ممنون ہوں۔ مگر یہ عنایات نامکمل ہیں۔ جو کتابیں آپ نے غالب لائبریری اور انجمن کے لیے بھیجی ہیں، اُن کا ایک ایک نسخہ میرے لیے بھی آنا چاہیے۔ میرے پاس ان کے ہندوستانی ایڈیشن بھی نہیں ہیں۔

خامہ بگوشیاں کرنے کا قطعاً ارادہ نہیں تھا۔ مگر صلاح الدین صاحب کا اصرار اور مسلسل اصرار میرے ارادے پر حاوی رہا۔ ساڑھے تین برس تک میں کوئی نہ کوئی عذر اس خیال سے پیش کرتا رہا کہ بالآخر وہ بھول جائیں گے کہ خامہ بگوش کا کالم اُن کے ہاں چھپتا تھا مگر جب بھی وہ کسی غیر ملکی دورے سے واپس آتے تو تقاضا پہلے سے زیادہ شدید ہوتا۔ ''تکبیر'' کے قاری ہر جگہ انھیں یاد دلاتے کہ یہ کالم دوبارہ جاری ہونا چاہیے۔ آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ کالم شروع تو کردیا ہے مگر ابھی طبیعت ادھر نہیں آئی۔ اس کا میرے معمولات پر خاصا اثر ہوا ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ کم از کم دو مرتبہ پورا مسودہ ضرور لکھتا ہوں اور پھر آخر وقت تک کاٹ چھانٹ کرتا ہوں۔ میرے حق میں دعا کیجیے کہ یہ مشکل آسان ہو۔ کالم ۲۳ر مارچ کے شمارے سے شروع ہوا ہے۔ اس کے بعد کے شمارے میں کالم نہیں تھا۔ اب تک تین کالم چھپ چکے ہیں۔ کل چوتھا آئے گا۔

میں ۲۱ر مارچ کو اسلام آباد گیا۔ ۲۹ کو واپس آیا۔ چار دن اسلام آباد میں اور ایک ایک دن حسن ابدال، جہلم اور مری بھوربن میں گزارا۔ حسن ابدال میں تاریخی مقامات دیکھے۔ اکبری نورتن میر فتح اللہ شیرازی اور ان کے بھائی میر ہمام کا مقبرہ دیکھا۔ جہلم میں جلیل قدوائی صاحب سے ملاقات کی۔ وہاں وہ اپنے

☆۴۱۔ سفرِ اندلس (نومبر ۱۹۹۱ء) میں، راقم نے غرناطہ سے خواجہ صاحب کے لیے ایک راکھ دان (ایش ٹرے) خریدا تھا۔ تقریباً سال بھر بعد، لاہور میں ملاقات (جنوری ۱۹۹۳ء) پر انھیں پیش کیا۔

☆۴۲۔ ڈاکٹر صابر کلوروی نقاد، محقق اور اقبالیات کے متخصص۔ حال ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، پشاور یونی ورسٹی۔

بیٹے بریگیڈیئر خالد قدوائی کے پاس مقیم ہیں۔ وہاں آرام و آسائش کراچی کی نسبت بہت زیادہ ہے مگر ''ادبی تنہائی'' سے پریشان ہیں۔ میرے ساتھ آمنہ تھیں، ڈاکٹر گوہر نوشاہی اور ڈاکٹر سلطانہ بخش بھی تھیں☆۴۳ ہم لوگوں سے مل کر وہ خوش ہوئے اور اصرار کرتے رہے کہ کم از کم ایک رات ہم اُن کے ہاں قیام کریں مگر ممکن نہ تھا۔

اسلام آباد میں ایک روز زاہد منیر عامر صاحب☆۴۴ کا فون آیا تھا اور اُنھوں نے اطلاع دی کہ آپ بھی اسلام آباد آرہے ہیں۔ میں نے اُنھیں اپنا فون نمبر لکھوا دیا کہ آپ کو دے دیں۔ منتظر رہا مگر افسوس آپ نہ آسکے۔ عجیب اتفاق ہے کہ انھیں دنوں میرزا ادیب صاحب بھی وہیں تھے مگر ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر رہے۔ بعد میں اُن کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ کسی کتاب کی رونمائی کے سلسلے میں وہاں گئے۔ اب کے اسلام آباد میں تین روز ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے ساتھ گزرے۔ اتنا وقت ہم دونوں نے لاہور میں بھی کبھی اکیلے میں نہیں گزارا۔

حمید نسیم صاحب کی کتاب میں طباعت کی خاصی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اُنھوں نے ایک غلط نامہ بنا کر دیا ہے، اُس کا عکس بھیج رہا ہوں، دوسری کاپی ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کو دے دیجیے۔ حمید نسیم صاحب کی کتاب، اقبال پر لکھی گئی کتابوں سے بہت مختلف ہے۔ حکیم الامت کے وہ قائل نہیں، شاعر اقبال کو وہ مانتے ہیں۔ اس کتاب پر اگر آپ کہیں تبصرہ کر دیں تو بہت اچھا ہو☆۴۵

آپ کے پہلے دونوں خط بھی مل گئے تھے۔ ان کے جواب میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ اسلام آباد سے واپس آنے کے بعد طبیعت ناساز رہی، اس لیے معمول کے مطابق کام نہ کر سکا۔ اب ان دونوں خطوں کو سامنے رکھ کر جواب لکھتا ہوں، مگر پہلے یہ کہ رسالہ ''تنویر'' کراچی کا اقبال نمبر بہ صورت عکس آپ کو مل گیا، اچھا ہوا۔ اس کی بس تاریخی اہمیت ہے، کوئی خاص بات نہیں۔

تاجور پر ایم اے کا جو مقالہ لکھا گیا تھا، مجھے اس کا عکس چاہیے لیکن میں آپ پر بار نہیں ہونا چاہتا، اگر آپ عکس کے اخراجات وصول کرنے پر آمادہ ہوں تو بنوا دیجیے۔ دراصل اس قسم کے کام تو مجھے پڑتے ہی رہیں گے۔ اس لیے آپ تکلف سے کام نہ لیں☆۴۶ منصورہ سے ایک کتاب ''یادگار لمحات'' از عاصم صدیقی شائع ہوئی ہے۔ اس کی بھی مجھے ضرورت ہے۔ پبلشر النار بک سینٹر۔ اُن سے کہیے وی پی

☆۴۳۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش، اُن دنوں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے وابستہ تھیں۔

☆۴۴۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر (پ: ۱۸؍ جولائی ۱۹۶۶ء) اُس وقت اسلام آباد میں مقیم تھے۔

☆۴۵۔ حمید نسیم (۱۹۲۰ء۔۱۹۹۸ء) کی کتاب ''اقبال: ہمارے عظیم شاعر'' (ناشر: فضلی سنز، کراچی) پر تبصرہ لکھنے کا ارادہ تھا شروع کیا، مگر ناتمام رہ گیا۔ اس کتاب پر ۱۹۹۱ء۔۱۹۹۳ء کا ''قومی صدارتی اقبال ایوارڈ'' دیا گیا۔

☆۴۶۔ خواجہ صاحب کو تاجور نجیب آبادی پر ایم اے کے تحقیقی مقالے کی نقل درکار تھی۔ مجھے دستیاب نہ ہو سکا (غالباً اس موضوع پر مقالہ لکھا ہی نہیں گیا) بعد ازاں اسلامیہ کالج لاہور کے استاد لطیف ساحل صاحب نے اس موضوع پر تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

پی کر دیں۔ یا آپ خرید کر مذکورہ عکس کے ساتھ ارسال فرما دیجیے۔ اس کی قیمت بھی عکس کی لاگت کے ساتھ بھیج دوں گا۔☆۴۷

خطوط☆۴۸ کی ترتیب کے سلسلے میں آپ نے جو لکھا ہے، وہ واقعی خاصا مشکل کام ہے۔ لیکن یہ آسان ہوسکتا ہے، اس طرح کہ ہر مکتوب نگار کو ایک نمبر دے دیجیے۔ جب اُس کا خط آئے اُس نمبر کے لفافے میں رکھ دیجیے۔ میں یہی کرتا ہوں۔ اب تک تقریباً دو ہزار لفافے بن چکے ہیں اور بعض لوگوں کے خطوں کی تعداد سیکڑوں میں ہے، جیسے مالک رام، میرزا ادیب، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ یہ تو میرے نام کے خط ہوئے، دوسروں کے نام کے خطوں کا بھی ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے، اُسے بھی اسی طرح مرتب کر رہا ہوں۔ میں خود نہیں کرتا، کوئی نہ کوئی اہل کار میری نگرانی میں یہ کام کرتا رہتا ہے۔ غیر اہم خطوں کو میں ضائع کر دیتا ہوں، لیکن نسبتاً غیر اہم ادیبوں کے خطوط ایک ہی نمبر کے تحت رکھ دیتا ہوں۔ ان لفافوں میں ان ادیبوں کے متعلق اخباری تراشے اور مضامین وغیرہ بھی رکھے جاتے ہیں۔ مگر میرے پاس یہ ذخیرہ اتنا بڑا ہے کہ اسے سنبھالنا میرے بس کی بات نہیں۔ پریشان ہوں کہ:

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

امید ہے اورنگ زیب صاحب نئے ماحول سے مانوس ہوگئے ہوں گے۔ دوسری جگہ پر زاہد منیر عامر آجائیں تو بہت اچھا ہو☆۴۹ اس نوجوان کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔

سفر نامہ مکمل ہوگیا ہو تو مسودہ بھجوا دیجیے☆۵۰ پیرس کا سفرنامہ اس میں بطورِ ضمیمہ شامل کر دیجیے کہ پیرس کا سفر بھی اصل سفر ہی کی وجہ سے شروع ہوا تھا ورنہ یہ روداد بن لکھی رہ جائے گی۔

جی ہاں میں ''ترجمان القرآن'' کا خریدار ہوں اور اس میں آپ کے تبصرے دیکھتا رہتا ہوں۔ آپ نے فرصت کے منتظر کاموں کی جو فہرست لکھی ہے، اُس میں تقریباً سبھی کام بہت اہم ہیں، مگر سب سے اہم مولانا نصر اللہ خاں عزیز کی سرگزشت کی تدوین ہے۔ اسے آپ جس قدر جلد کر سکیں اچھا ہے☆۵۱

سویامانے سے اسلام آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ جاپانی سفارت خانے میں ''مشیر امور

☆۴۷۔ ''سید مودودی کے ساتھ یادگار لمحات'' مرتبہ: عاصم نعمانی۔ ادارہ معارف اسلامی لاہور۔ ۱۹۸۸ء

☆۴۸۔ مشاہیر اور احباب کے آمدہ خطوط، کسی ترتیب سے رکھنے اور محفوظ کرنے کا مسئلہ درپیش تھا، خواجہ صاحب نے یہ ترکیب بتائی۔

☆۴۹۔ ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر (پ: ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۵۳ء) ۲۰ فروری ۱۹۹۳ء کو اور ڈاکٹر زاہد منیر عامر ۲۶ جنوری ۱۹۹۵ء کو بطور لیکچرر، شعبۂ اردو اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہوئے۔ اب دونوں اساتذہ ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔

☆۵۰۔ راقم کا سفرنامہ اندلس ''پوشیدہ تری خاک میں'' — خواجہ صاحب نے مسودہ دیکھا اور مفید مشورے دیے۔

☆۵۱۔ صحافی، ادیب اور شاعر ملک نصر اللہ خاں عزیز (۱۸۹۷ء۔ ۱۹۷۹ء) اپنی یادداشتیں اپنے ہفت روزہ ''ایشیا'' لاہور میں لکھتے رہے۔ راقم نے اقساط جمع کر لی تھیں اور انھیں کتابی صورت میں مرتب کرنے کا ارادہ تھا، اسی اثنا میں اختر حجازی صاحب نے ۱۹۹۴ء میں انھیں کتابی صورت میں ''زندگانی کی گزرگاہوں میں'' کے عنوان سے تنظیم پبلی کیشنز لاہور سے شائع کرا دیا۔

افغانستان'' ہے۔☆۵۲ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تحسین فراقی صاحب یونی ورسٹی سینٹ کا انتخاب لڑ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ملکی سینٹ کا انتخاب بھی لڑیں۔ دوسرا خط اُن کے نام اسی لفافے میں رکھ رہا ہوں۔ یہ انھیں دے دیجیے۔ یہاں سے ایک نامعقول کتاب ''خطوطِ جوش'' چھپی ہے۔ اس کے نمونے کے چند صفحے بھیج رہا ہوں۔ یہ بھی تحسین صاحب کے لیے ہیں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ اُردو میں کیا کیا کچھ چھپ رہا ہے۔ پچھلے دنوں پرانے رسالوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اقبال کی نظم ''تنہائی'' کا منظوم ترجمہ نظر آیا اور ایک طویل نظم جو علامہ اقبال کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے۔ ان دونوں کے عکس بھیج رہا ہوں شاید آپ کے کسی کام آئیں۔

زیبا صاحب☆۵۳ بیمار ہو گئے لہٰذا اب آپ کی کتاب (تین سال)☆۵۴ پر ادیب سہیل صاحب سے تبصرہ لکھواؤں گا۔

دیکھیے آپ کے طویل خط کے جواب میں، میں نے بھی طویل خط لکھ ڈالا۔

''علامہ اقبال اور میر حجاز'' کے لیے دلی شکریہ قبول فرمایئے۔☆۵۵

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۹۔۴۔۹۴ء

☆

(۱۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کے دونوں خط بھی ملے اور کتابیں بھی۔ ان عنایات کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ تاخیر سے جواب دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ کراچی میں زمینی بلائیں ہی کیا کم تھیں کہ اب ۳؍جولائی سے آفاتِ سماوی نے بھی اِدھر کا رخ کر رکھا ہے۔ ایسی بارشیں پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ زندگی کے تمام معمولات میں بے ترتیبی آ گئی ہے اور اُس پر یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدا جانے کیا ہو؟ جس مکان میں کتابوں کے سوا اور کچھ نہ ہو، اُس کے لیے مسلسل بارشیں بے حد ضرر رساں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب تک سب کچھ محفوظ رہا ہے۔

آپ کی مصروفیات کا حال معلوم ہوا۔ آدمی کو زندہ رہنے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے، اور

☆۵۲۔ سویامانے یاسر نے ۱۹۹۱ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اُردو کی سند حاصل کی تھی۔ آج کل وہ اوساکا یونی ورسٹی فار فارن اسٹڈیز (جاپان) میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔

☆۵۳۔ غالباً شجاع احمد زیبا (۱۹۲۲ء۔۱۹۹۵ء)

☆۵۴۔ ''اقبالیات کے تین سال، ۱۹۸۷ء۔۱۹۸۹ء''۔ الحمرا پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۳ء۔

☆۵۵۔ راقم کی کتاب: ''علامہ اقبال اور میر حجاز''۔ بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۹۳ء۔

کرنا چاہیے۔ آپ جو نصابی کام کر رہے ہیں، لازماً اس کا مالی فائدہ ہوگا۔ ایسا کام کیوں چھوڑا جائے جب کہ آج کل کے حالات میں جائز آمدنی کے اندر زندگی بسر کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کالم نگاری سے میں بیزار ہوں۔ جس روز کالم لکھنا ہوتا ہے، میری جان عذاب میں ہوتی ہے، مگر اس کا معقول معاوضہ ملتا ہے اس لیے سب کام چھوڑ کر یہ کام کرتا ہوں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تحسین فراقی صاحب کو نقوش ایوارڈ ملا ہے۔[۵۶] آج ہی انھیں بھی مبارک باد کا خط لکھ رہا ہوں۔

سویامانے آج چند گھنٹوں کے لیے کراچی میں تھے۔ وہ کسی دفتری کام سے سنگاپور جا رہے ہیں۔ اُن کا فون آیا۔ وہ ملنا چاہتے تھے مگر میرے علاقے میں کل سے گولیاں چل رہی ہیں۔ متعدد افراد زخمی اور ہلاک ہو چکے ہیں، لہٰذا میں نے انھیں آنے سے منع کر دیا۔ اب وہ واپسی پر کراچی آئیں گے تو ملاقات ہوگی۔ سویامانے کا مقالہ بہت اچھا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اب یہ چھپ جانا چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ زاہد منیر عامر اس پر نظرِ ثانی کریں گے۔ اس کے بعد یہ چھپے گا۔ غلام عباس پر یہ مقالہ شائع ہوگا تو بہت سی نئی چیزیں سامنے آئیں گی۔[۵۷]

تحسین صاحب کو رشید حسن خاں صاحب نے ''جائزۂ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'' کے تبصرے پر مبارک باد دی۔[۵۸] یہ بڑی بات ہے۔ خان صاحب جیسے سخت گیر آدمی کسی کو ذرا کم ہی مبارک باد دیتے ہیں۔ ویسے اس جائزے کی اشاعت سے وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے کیوں کہ آج کل نثار احمد فاروقی سے تعلقات کچھ کشیدہ ہیں۔ فاروقی صاحب نے ''فسانۂ عجائب'' پر ایک سخت مضمون لکھا ہے۔ بے شمار غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ رشید حسن خاں صاحب نے اس کے جواب میں جو مقالہ لکھا ہے، وہ بھی بہت عالمانہ ہے۔ سارے اعتراضات رد کر دیے ہیں۔ یہ دونوں مقالے ''آج کل'' میں چھپے ہیں۔[۵۹] میں نے ''دائرے'' والوں سے کہا ہے کہ وہ ان دونوں مقالوں کو یک جا شائع کر دیں۔ ''دائرے'' آپ کو ملتا ہوگا۔ اس کے لیے اگر آپ کچھ لکھیں تو ممنون ہوں گا۔ ممنون ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میں مضامین کی فراہمی میں ان کی مدد کرتا رہتا ہوں۔ کیا یہ آپ کو مل رہا ہے؟ ''غالب'' کے تنِ مُردہ میں بھی جان ڈالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ''تخلیقی ادب'' کا بچا کھچا ''مال'' ان کو دے دیا ہے۔

۵۶۔ تحسین صاحب کو ان کے مضمون ''علامہ اقبال اور مسلم نشاۃ ثانیہ'' پر نقوش ایوارڈ ملا تھا اب یہ ان کی کتاب ''جہاتِ اقبال'' (بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۹۳ء) میں شامل ہے۔

۵۷۔ یہ ان کا ایم اے اُردو کا مقالہ تھا: ''غلام عباس، سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ'' (نگران: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) جو بعد ازاں ''غلام عباس۔ ایک مطالعہ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ناشر: سنگِ میل لاہور، ۱۹۹۶ء۔

۵۸۔ مظفر حسین برنی کے مرتبہ ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'' جلد سوم پر یہ تفصیلی تبصرہ پہلے ''سیارہ'' لاہور میں چھپا، اب یہ تحسین فراقی کے مجموعۂ مضامین: ''اقبال: چند نئے مباحث'' (اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۹۷ء) میں شامل ہے۔

۵۹۔ ''فسانۂ عجائب'' (مدونہ: رشید حسن خاں) پر نثار احمد فاروقی (م: ۲۸ نومبر ۲۰۰۴ء) نے بہت سے اعتراضات کیے تھے۔ رشید حسن خاں کا جوابی مضمون راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔

سویامانے کا ذکر میں نے اپنے کالم میں نہیں کیا تھا، معین الدین عقیل صاحب نے کیا تھا۔ عقیل صاحب پچھلے دنوں چند روز کے لیے کراچی آئے تھے۔ اُن سے ایک مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آج کل ایک طویل تفریحی سفر پر ہیں۔ آپ سے تو مراسلت ہوگی۔

ادیب سہیل بے چارے کتاب کے تبصرے میں جو کچھ لکھ گئے، اس سے انھیں معذور سمجھیے کیوں کہ وہ ان امور سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں۔

''اُردو'' آپ کو باقاعدگی سے ملے گا۔ پچھلے شمارے بھی بھیجنے کے لیے کہہ دیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق کا دہلی سے خط مجھے بھی آیا ہے۔ اُنھوں نے مجھے نظام خطبات کے سلسلے میں مدعو کیا ہے۔☆[۶۰] میرے بارے میں اُنھیں کچھ غلط فہمی ہے، ورنہ میں ان کاموں کا اہل نہیں ہوں۔ معذرت کا خط لکھ دیا ہے۔

تاجور پر اگر کوئی مقالہ نہیں لکھا گیا تو بات ختم ہوجاتی ہے۔ خدا کرے ساحل صاحب اس موضوع کا حق ادا کریں۔☆[۶۱] تاجور نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ اُن کے مضامین کی اشاعت بہت ضروری ہے۔

افتخار امام کے بارے میں، میں نے جو کچھ کالم میں لکھا ہے، وہ محض تفننِ طبع کے لیے ہے۔ اس کالم کو اُنھوں نے بھی پسند کیا ہے۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۳۔۸۔۹۴ء

''اقدار'' کا متعلقہ شمارہ یا مضمون کا عکس جلد ہی بھیجوں گا۔☆[۶۲]

☆

(۱۵)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۲۶ر اکتوبر کو میں نے آپ کو خط لکھا، اُسی تاریخ کو آپ نے بھی لکھا جو آج مجھے ملا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ۲۵ر کا لکھا ہوا خط بھی مل گیا۔ میرے خط میں ایک آدھ بات جواب طلب تھی: توجہ فرمایئے۔

☆۶۰۔ ڈاکٹر عبدالحق، اس زمانے میں دہلی یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اردو تھے۔ شعبۂ اردو ہر سال کسی نام ور شخصیت کو سالانہ نظام خطبات کے سلسلے میں خطبے کے لیے مدعو کیا کرتا تھا۔

☆۶۱۔ ۱۹ر اپریل ۱۹۹۴ء کے خط میں اس کی وضاحت آچکی ہے۔

☆۶۲۔ ''اقدار'' کراچی جنوری ۱۹۹۵ء میں رشید حسن خاں صاحب کا مضمون: ''کلامِ اقبال کی تدوین'' چھپا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت تھی، خواجہ صاحب نے بعد ازاں یہ عکس بھجوا دیا۔ یہ مضمون راقم کی کتاب: ''اقبالیات: تفہیم و تجزیہ'' (اقبال اکادمی پاکستان کراچی، ۲۰۰۴ء) میں بہ طور ضمیمہ شامل ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کتابوں کی طباعت کے سلسلے میں ذرا جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے آپ کی کتاب کے سلسلے میں جو کچھ کیا، اُس پر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ معاملہ آپ کے حسبِ منشا طے پا گیا۔☆۹۳ اب اس کے پروف بھی آپ خود پڑھیے گا، ورنہ اتنی غلطیاں ہوں گی کہ آپ پریشان ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی اور بزمِ اقبال کی کوئی بھی کتاب اُٹھا لیجیے، اتنی اغلاط نظر آئیں گی جیسے یہ کتابیں اغلاط کے نمونے کے طور پر چھاپی گئی ہوں۔ اسی لیے میں نے اپنی کتاب (تحقیق نامہ) کے لیے شرط لگا دی تھی کہ میں اسے کراچی میں چھپواؤں گا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ میں نے ایک مرتبہ سارے پروف خود ڈاکٹر صاحب سے بھی پڑھوائے اور اُنھوں نے متعدد اغلاط کی نشان دہی کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ میری کتاب میں معنوی اغلاط تو مل جائیں گی، کتابت کی غلطی نہیں ملے گی۔

انجمن کی مطبوعات ''ترجمان القرآن'' کے لیے بھجوا دی جائیں گی۔ آپ کی مطلوبہ کتاب بھی ان میں شامل ہوگی۔

جی ہاں، کشور ناہید والا مضمون اس لائق نہیں تھا کہ ''قومی زبان'' میں شائع ہوتا۔ ادیب سہیل دراصل بڑے ''معصوم'' قسم کے آدمی ہیں۔ اُنھوں نے غور ہی نہیں کیا کہ محترمہ کیا کچھ لکھ گئی ہیں۔ بہرحال اب یہ طے کیا گیا ہے کہ کسی زندہ ادیب پر کوئی مضمون ''قومی زبان'' میں شائع نہیں ہوگا اور اگر شائع کرنا ضروری ہوا تو اُس کی پیشگی اجازت لی جائے گی۔

اب ایک نہایت ضروری کام جو فوری توجہ کا مستحق ہے۔

ممتاز حسن مرحوم سے آپ واقف ہوں گے، ذاتی طور پر بھی اور ایک اقبال دوست کی حیثیت سے بھی۔ ادارۂ یادگارِ غالب کی طرف سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے (فی الحال اردو مضامین)۔ کچھ مضامین شان الحق حقی صاحب نے جمع کیے ہیں اور کچھ میں نے۔ کمپوزنگ ایک دو روز میں شروع ہو جائے گی۔ ممتاز صاحب نے اقبال پر کئی مضامین لکھے تھے جن میں اُن کے خطباتِ صدارت بھی شامل ہیں۔ مجھے ان مضامین کی فہرست کی ضرورت ہے۔ چوں کہ تمام مآخذ آپ کی نظر میں ہیں، اس لیے آپ چشم زدن میں یہ فہرست بنا سکتے ہیں۔ لہٰذا میری رہ نمائی فرمائیے۔☆۹۴

آپ کے خط آتے ہیں تو جی خوش ہوتا ہے۔ آپ کے ''پے در پے'' خطوں سے میں کیوں

☆۹۳۔ راقم کی کتاب ''کتابیاتِ اقبال'' کے نئے ایڈیشن کی کتابت (کمپوزنگ) کا مسئلہ تھا۔ اقبال اکادمی کے ناظم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب چاہتے تھے کہ مسودہ ان کے حوالے کر دیا جائے، کمپوزنگ اکادمی میں ہو اور راقم باقی مراحل سے لاتعلق ہو جائے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر اسے بہتر سمجھتا تھا کہ کتابت حسبِ منشا خود کراؤں، پروف خوانی اور تصحیح بھی خود ہی کروں۔

☆۹۴۔ راقم نے مطلوبہ فہرست خواجہ صاحب کو فی الفور بھیج دی۔ یہ تب سے میرے پاس تیار رکھی تھی جب میں نے ''علامہ اقبال اور ممتاز حسن'' کے عنوان سے ایک مضمون ''قومی زبان'' کراچی اپریل ۱۹۷۵ء میں لکھا تھا۔ شان الحق حقی (پ: ۱۵ ستمبر ۱۹۱۷ء) کا مرتبہ مجموعہ ''مقالاتِ ممتاز حسن'' کے نام سے ۱۹۹۵ء میں ادارۂ یادگارِ غالب کراچی سے شائع ہوا۔ خواجہ صاحب کے ایما پر میرا مضمون نظرِ ثانی کے بعد متذکرہ بالا مجموعے کے حصہ اقبالیات میں بہ طور ''پیش لفظ'' شامل کیا گیا۔

گھبرانے لگا۔ ہاں جب خط نہیں آتا ہے تو الجھن ہوتی ہے۔ زندگی کے کاروبار میں میرا خالص منافع آپ ہی جیسے دو چار دوست تو ہیں جن سے مل کر اور بات کر کے اور جن کو یاد کر کے دلی مسرت ہوتی ہے۔

اکرام چغتائی صاحب سے کبھی ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔ وہ بے چارے آج کل پریشانی میں ہیں۔ چند روز ہوئے ان کا فون آیا تھا، میں نے اُن سے کہا تھا کہ وہ اسلام آباد جا کر میرے چھوٹے بھائی سے ملیں۔ معلوم نہیں وہ اسلام آباد گئے یا نہیں۔ اب میں نے وزیرِ تعلیم سے ان کی ملاقات کرانے کا ایک وسیلہ ڈھونڈ لیا ہے۔ اُن کا فون نمبر میرے پاس نہیں ہے۔ ازراہ کرم اُنھیں فون کر کے کہیے کہ وہ کسی بھی دن رات کو آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک مجھے فون کر لیں۔ ۳/اور ۶/نومبر کے علاوہ۔ جو کچھ اُن سے کہنا ہے، خط میں نہیں لکھا جا سکتا۔ نیز اُن سے یہ بھی کہیے کہ اپنا بائیو ڈیٹا مجھے بھیج دیں۔

عبداللہ قریشی صاحب کا انتقال ہو گیا، کسی اخبار میں خبر نہیں چھپی۔ اس لیے تاریخِ وفات بھی معلوم نہیں ہوئی۔ ازراہِ کرم مطلع فرمایئے کہ ان کا انتقال کب ہوا۔ کیا آپ نے ان کے بارے میں کبھی کچھ لکھا تھا؟ ''قومی زبان'' میں ایک دو مضمون چھاپنے کا ارادہ ہے۔☆۶۵

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۱۔۱۱۔۹۴ء

☆

(۱۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

بہت دن ہوئے آپ کا خط ملا تھا جو آپ نے محمد صلاح الدین شہید کے بارے میں میرا کالم پڑھ کر لکھا تھا۔☆۶۶ چوں کہ جواب طلب بات کوئی نہیں تھی، اس لیے میں اس انتظار میں رہا کہ اس سے پہلے میں نے آپ کو جو جواب طلب خط لکھا تھا، اُس کا جواب آ جائے تو لکھوں گا۔ آپ شاید بھول گئے۔ ایک بات اُس خط میں بہت ضروری تھی کہ ممتاز حسن مرحوم کے بارے میں آپ نے جو مضمون لکھا تھا (بہ حوالہ اقبالیات) اس پر نظرِ ثانی کر کے بھیج دیجیے تو اُسے مرحوم کے زیرِ طبع مجموعہ مضامین میں شامل کرلیا جائے۔ یہ مجموعہ کمپوز ہو چکا ہے۔☆۶۷ عید کے بعد طباعت کا کام شروع ہو جائے گا۔ لہٰذا توجہ فرمایئے۔ اُس خط میں کچھ اور باتیں بھی تھیں، اُسے دیکھ کر جواب لکھیے۔

☆۶۵۔ محمد عبداللہ قریشی، مورخ، ادیب اور اقبالیات کے متخصص (م: ۱۲/اگست ۱۹۹۴ء)۔ راقم نے ان سے اقبالیات پر ایک مصاحبہ ''سیارہ'' لاہور، مئی جون ۱۹۸۸ء میں شامل کرایا تھا۔ اس کی نقل خواجہ صاحب کو ارسال کر دی۔

☆۶۶۔ محمد صلاح الدین کی شہادت پر مجھے جو رنج و قلق ہوا، اس کا اظہار خواجہ صاحب کے نام ایک خط میں کیا تھا۔

☆۶۷۔ یہ ذکر ہے: ''مقالاتِ ممتاز حسن'' کا۔ میں نے مطلوبہ مضمون خواجہ صاحب کو بھیج دیا تھا، جو زیرِ طبع مجموعے میں شامل ہوا۔ خط ۱۵ حاشیہ ۲ میں اس کا تفصیلی ذکر آ چکا ہے۔

آپ نے لکھا تھا کہ ''اقدار'' میں رشید حسن خاں کا ایک مضمون کلامِ اقبال کی تدوین کے بارے میں چھپا ہے۔ اسے تلاش کیا مگر نہ ملا۔ یہ دراصل اُس وقت تک شائع ہی نہیں ہوا تھا۔ آپ کو شاید خاں صاحب نے اُس کے طبع ہونے کی پیشگی اطلاع دی تھی۔ ''اقدار'' کا تازہ شمارہ آیا تو یہ اس میں موجود تھا۔ اس کا عکس منسلک ہے۔ اس رسالے پر صرف جلد نمبر اور شمارہ نمبر لکھا ہے۔ تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ بہ ہر حال یہ جنوری ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا ہے۔ کسی رسالے پر تاریخِ اشاعت درج نہ کرنا، نہایت احمقانہ بات ہے۔ بعض رسالوں والے یہ حرکت اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ اُن کے پرانے رسالے کو بھی نیا سمجھ کر خریدتے رہیں۔

ایک مضمون ناطق گلاؤٹھوی کا بھی بھیج رہا ہوں جو ماہر القادری کے بارے میں ہے۔ فاروق صاحب کو دے دیجیے گا۔ اُنھوں نے چوں کہ ماؔہر پر کام کیا ہے اس لیے اُن کے علم میں ہونا چاہیے کہ ماؔہر کے بارے میں ایک ایسا مضمون بھی لکھا گیا تھا۔ فاروق صاحب کا مقالہ کب تک شائع ہو رہا ہے۔☆۶۸ ماؔہر صاحب پر یاد آیا کہ طالب ہاشمی صاحب نے اب تک ماہر صاحب کی کتنی کتابیں شائع کی ہیں☆۶۹ اگر ان کی فہرست مل جائے تو وہ کتابیں میں منگوالوں گا جو میرے پاس نہیں ہیں۔

محمد صلاح الدین صاحب کے بعد ''تکبیر'' میں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے اپنے اس ارادے سے متعلقہ لوگوں کو مطلع بھی کر دیا تھا، لیکن ایک روز رفیق افغان اور اصمعی صاحب آگئے اور انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھنے کے لیے کہا۔ آپ یقین کیجیے کہ میں صرف اور صرف صلاح الدین صاحب کے لیے لکھتا تھا۔ اس راہ پر مجھے الطاف حسن قریشی صاحب نے لگایا اور صلاح الدین صاحب نے اس راہ سے ہٹنے نہ دیا۔ کئی مرتبہ دوسرے اخبارات سے پیش کش ہوئی مگر میں نے انکار کر دیا اور ''تکبیر'' میں بلا معاوضہ لکھتا رہا۔ سات سال لکھا اور کوئی معاوضہ نہ لیا۔ صلاح الدین صاحب بار بار کہتے رہے کہ دوبارہ کالم شروع کروں گا مگر میں معذرت کرتا رہا۔ آخر انھوں نے یہ کہا کہ میں نے حرم شریف میں دعا کی ہے کہ آپ دوبارہ کالم لکھنا شروع کریں تو میں لکھنے پر مجبور ہوا (اس کی تفصیل میں نے مذکورہ کالم میں لکھی تھی)۔ اب محض ایک روایت نبھا رہا ہوں ورنہ کالم لکھنے کو جی نہیں چاہتا، بلکہ وقت کے ضائع جانے کا احساس ہوتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اب تو جی چاہتا ہے کہ صرف اپنے نامکمل کاموں کو مکمل کروں یا جو مکمل کام رکھے ہیں انھیں نظرِ ثانی کے بعد چھپوا دوں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ میرے پاس

☆۶۸۔ میرے عزیز دوست اور ہم جماعت ڈاکٹر عبدالغنی فاروق (پ: یکم جون ۱۹۴۲ء، سابق صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ سائنس کالج، وحدت روڈ، لاہور) کا منذکرہ ڈاکٹریٹ کا یہ مقالہ: ''ماہر القادری حیات اور ادبی خدمات'' کے عنوان سے ۲۰۰۰ء میں ادارۂ معارف اسلامی لاہور سے شائع ہوا۔

☆۶۹۔ جناب طالب الہاشمی سیرت، سوانح صحابہ و اکابر امت پر تخصص رکھتے ہیں۔ انھوں نے ماہر القادری کی تحریروں کے متعدد مجموعے مرتب اور شائع کیے ہیں مثلاً: ''ہماری نظر میں'' (کتابوں پر تبصرے) ''ادبی معرکے'' (لسانی اور ادبی مباحث) ''سیاحت نامۂ ماہر'' (اسفاری روداد یں) وغیرہ ''یادِ رفتگاں'' دو حصے (شخصیات پر مضامین)۔

کلاسیکی شعرا پر تقریباً ڈیڑھ سو غیر مطبوعہ مضامین رکھے ہیں اور ایک درجن سے زیادہ مضمون مرتب کیے ہوئے، موجود ہیں۔ عادت یہ ہے کہ کام کرتا ہوں اور اٹھا کے رکھ دیتا۔ اب عمر کی اس منزل میں ہوں کہ اس ''عیاشی'' کا متحمل نہیں ہوسکتا، اس لیے غیر مطبوعہ کاموں کو چھپوانے کی فکر میں ہوں۔

آج کل ایک پریشانی اور بھی ہے کہ میرے کتب خانے کا کیا ہوگا؟ ۵۰، ۶۰ ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسالے ہیں اور خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ پہلے سوچا تھا کہ حکیم محمد سعید صاحب کے بیت الحکمت میں جمع کرا دوں مگر اس لائبریری کی حالت نہایت خراب ہے۔ اس لائبریری میں بڑی تعداد بے کار کتابوں کی ہے۔ ڈھنگ کی کتابیں کم ہیں اور وہ بھی وقت پر نہیں ملتیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لائبریری کتابوں کا جنگل بن گئی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ مجلسِ ادبیاتِ مشرق کے نام سے ایک ٹرسٹ بنا کر اپنا کتب خانہ محفوظ کردوں مگر کراچی کے حالات نے اس منصوبے پر عمل سے باز رکھا۔

تحسین صاحب کہاں ہیں؟ ایک عرصے سے اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔ ملاقات ہو تو میرا سلام کہیے اور یہ بھی کہ بے نیازی حد سے گزرگئی ـ امید ہے اورنگ زیب صاحب کا آپ خیال رکھتے ہوں گے۔ یہ آدمی مجھے بہت عزیز ہے اور اتنا اچھا لگتا ہے کہ کبھی اس کی وجہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔

خدا کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۹۔۲۔۹۵ء

☆

(۱۷)

برادرِ عزیز و مکرم۔ سلامِ مسنون

آپ کا مکتوب مورخہ ۹/اکتوبر ملا۔ ممنون ہوں۔

اب خدا کا شکر ہے کہ میں خیریت سے ہوں۔ اس مہینے کے آخر میں لاہور کا پروگرام ہے۔ میں بہاول پور ہوتا ہوا لاہور پہنچوں گا۔ بہاول پور میں سید سعید احمد مرحوم ☆۰۷ کے اہلِ خانہ سے تعزیت کے لیے جانا ہے۔

☆۰۷۔ سید سعید احمد (م: یکم اگست ۱۹۹۶ء) بہاول پور میں فارسی کے استاد تھے۔ خواجہ صاحب سے نہایت گہرا دلی تعلق تھا۔ وہ بھی مرحوم کو حد درجہ عزیز رکھتے تھے۔ راقم کے نام ۲/نومبر ۱۹۹۶ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''آپ کو معلوم ہوگا کہ یکم اگست کو سید سعید احمد کا انتقال ہوگیا۔ آپ اُن سے بہاول پور میں ملے تھے۔ ایسا بے غرض محبت کرنے والا بلکہ مجھ پر جان چھڑکنے والا، اب نہیں ملے گا۔ میں بھی انھیں اپنے حقیقی بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ وہ صرف مجھ سے ملنے گرمیوں کی تعطیلات میں کراچی آتے تھے۔ اب کے وہ آئے تو صبح سے شام تک میرے ہاں رہتے تھے۔ رات کو بیوی بچوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ ۳۱/ جولائی کو پانچ بجے تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھے، دوسرے روز آنے کا وعدہ کرکے ایسے گئے کہ مجھے زندگی بھر کے لیے سوگوار کر گئے۔ اگست کا پورا مہینہ میں نے بستر پر گزارا۔ یہ اس سانحے کا اثر تھا۔''

آپ یہاں ایک دن کے لیے کیوں آئیں۔ بہت سے دنوں کے لیے آیئے۔☆۱ے جب کوئی میرے ہاں بہ طور مہمان مقیم ہوتا ہے تو میں اپنے دل کو اس خیال سے شرمندہ ہونے سے بچالیتا ہوں کہ مہمانِ عزیز کو یہاں قیام سے جو تکالیف ہوں گی، وہ بہ ہر حال اُن تکالیف سے کم ہوں گی جو اُس کو اپنے گھر میں درپیش رہتی ہیں۔ گھر میں ہزار طرح کی پریشانیاں ہوتی ہیں، مگر میرے گھر میں کتابوں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں تو پھر پریشانی کیا۔ چند ماہ قبل اورنگ زیب صاحب☆۲ے ایک رات کے لیے تشریف لائے تھے۔ اُن کا قیام و طعام ہی نہیں، شب گزاری بھی ایک صوفے پر ہوئی۔ ایک مرتبہ اقبال مجددی صاحب☆۳ے رات بھر کے لیے مہمان ہوئے تو لپٹے ہوئے بستر کو کھولنے کی نوبت ہی نہ آئی کہ وہ رات بھر کتابوں کی الماریوں کے پاس کھڑے کتابوں کی گرد جھاڑتے رہے۔

میں لاہور آؤں گا تو بہت سا وقت آپ کے ساتھ گزاروں گا۔ ''کتابیاتِ اقبال'' کیا آپ چاہیں تو اقبال اکیڈمی کے معاملات میں بھی مشورہ کر سکتے ہیں۔☆۴ے مشورہ دینے میں گرہ سے جاتا ہی کیا ہے۔ مرزا ظفر الحسن مرحوم (غالب لائبریری والے) کو جب کوئی لائبریری کے سلسلے میں مشورہ دیتا تھا تو وہ کہتے تھے، مشوروں کی تو میرے پاس کئی الماریاں بھری رکھی ہیں، آپ کوئی عملی مدد کیجیے، اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھیے۔

میں مکتبۂ اسلوب کی فہرست بھیج رہا ہوں، ظفر حجازی صاحب سے کہیے کہ اس فہرست میں اُن کی پسند کی جو کتابیں ہیں، اُن پر نشان لگا دیں۔ یہ کتابیں اُن کی خدمت میں بھیج دی جائیں گی۔ آپ بھی اپنی پسند کی کتابوں کو نشان زد کر دیجیے۔

''ارمغانِ وحید'' کے سلسلے میں عارف نوشاہی صاحب کا خط آیا تھا۔ اس کا میں نے جو جواب لکھا ہے، اُس کی نقل منسلک ہے۔ اُنھیں تین نئے مضامین بھجوا دیے ہیں۔ پروف ریڈنگ کے سلسلے میں محمد عالم مختارِ حق صاحب☆۵ے سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا۔ اُنھیں سے پروف پڑھوایئے، یہ کام اُنھیں دیتے وقت بتا دیجیے کہ میری خواہش ہے کہ یہ کام وہی کریں۔

☆۱ے۔ کراچی جانے کا یہ عزم روبہ عمل نہ آسکا۔

☆۲ے۔ ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر، اُستاد شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج لاہور۔

☆۳ے۔ پروفیسر اقبال مجددی صاحب محقق، مترجم ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف و مولف۔ پروفیسر اقبال مجددی صاحب اسلامیہ کالج لاہور میں تاریخ کے استاد ہیں۔

☆۴ے۔ راقم کی تالیف ''کتابیاتِ اقبال'' (اقبال اکادمی پاکستان لاہور، طبع اول ۱۹۷۷ء) کا نیا ایڈیشن زیرِ ترتیب تھا، اس ضمن میں خواجہ صاحب سے بعض مشورے مطلوب تھے

☆۵ے۔ جناب محمد عالم مختارِ حق لاہور کے معروف اہلِ علم اور مصنف و محقق ہیں۔ خواجہ صاحب کی فرمائش پر بعض اوقات ان کے لیے پروف خوانی کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ اپنے نام خواجہ صاحب کے خطوں کا مجموعہ مرتب کر کے ناشر (مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور) کے سپرد کر چکے ہیں۔

اچھا اب اجازت دیجیے۔
خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۷-۱-۹۶ء

☆

(۱۸)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کے "قسط وار" خط ملے اور پرسوں بیٹی نے بھی فون پر جواب کے لیے یاد دہانی کرائی۔ میں دراصل ایک دل چسپ کام میں ایسا محو تھا کہ خط کتابت کی طرف سے غافل ہوگیا۔ ایک جگہ سے بہت سے پرانے رسائل مل گئے تھے۔ انھیں جلد از جلد واپس کرنا تھا۔ رسالوں کی ورق گردانی اور پھر مطلوبہ مضامین کے عکس بنوانے میں خاصا وقت صرف ہوگیا۔ اب یہ کام ختم ہوا ہے تو معمول کے کاموں کی طرف متوجہ ہوا ہوں۔ نوازش علی صاحب کے انتقال کا بے حد صدمہ ہوا۔ آج سے پانچ سال پہلے جب وہ ایران سے واپسی پر ڈاکٹر آفتاب اصغر اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے ساتھ کراچی آئے تھے تو ایک شام اُن کے ساتھ گزاری تھی۔ وہ تو بالکل نوجوان تھے۔ کیا کسی حادثے میں انتقال ہوا؟ خدا مغفرت فرمائے وہ ایک نفیس انسان تھے۔☆۷۶

خدا کا شکر ہے کہ "ارمغانِ علمی" کی اشاعت کا انتظام بالآخر ہوگیا۔ عارف نوشاہی صاحب سے میں نے یہ کہا تھا کہ اس کتاب کو وہ اپنے ادارے سے چھپوا دیں۔ خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک پبلشر کے اشتراک سے چھپوا رہے ہیں۔☆۷۷ شاد عظیم آبادی (حمید نسیم) چھپ تو چکا ہے مگر یہ کسی کے علم میں نہیں۔ مضمون بہت اچھا ہے، آپ اسے ضرور شامل کریں۔ ایک بات کا بہ ہر حال ہمیں خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی بھی مصنف ۵۔۵، ۶۔۶ سال انتظار نہیں کرسکتا۔ اگر ارمغان میں دو چار مطبوعہ مضامین بھی شامل ہوجائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا مضمون ان کے مجموعے میں شامل ہے۔ اسے آپ خارج کرسکتے ہیں۔ میں شاید ہی مضمون لکھ سکوں، کوشش کروں گا۔ اگر کچھ لکھ سکا تو ایک مہینے کے اندر

☆۷۶۔ شیخ نوازش علی صاحب اورینٹل کالج لاہور میں فارسی کے استاد تھے۔ یک بہ یک حملۂ قلب میں ۶/ مارچ ۱۹۹۶ء کو انتقال کرگئے۔ ڈاکٹر محمد آفتاب اصغر (پ: یکم مارچ ۱۹۴۰ء) اورینٹل کالج لاہور میں فارسی زبان و ادب کے استاد، بعد ازاں صدرِ شعبہ رہے۔

☆۷۷۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی (پ: ۲۷ر مارچ ۱۹۵۵ء) اُن دنوں ادارہ تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد سے وابستہ تھے اور انھی کی کاوش سے ادارۂ مذکور نے "ارمغانِ علمی" شائع کرنا منظور کرلیا تھا۔ لیکن ارمغان کی ترتیب و تدوین میں تاخیر کے سبب ادارۂ تحقیقات کی پیش کش سے پورا فائدہ نہ اٹھایا جاسکا، البتہ ادارے نے ابتدا میں اشاعتِ کتاب کے سلسلے میں کچھ رقم ناشر کو ارسال کی تھی۔ نوشاہی صاحب آج کل گورنمنٹ کالج اصغر مال راول پنڈی میں صدر شعبہ فارسی ہیں۔

اندر بھیج دوں گا۔ باقی مضامین میں سے علی جواد زیدی اور ڈاکٹر نارنگ اور رشید حسن خاں کے مضامین بھی غالباً چھپ چکے ہیں۔ انھیں فی الحال روک لیجیے۔ اگر مزید مضامین دستیاب نہ ہوں تو پھر انھیں شامل کر لیجیے۔ گوہر نوشاہی صاحب کو میں نے کئی بار یاد دہانی کرائی ہے، آپ بھی انھیں خط لکھ دیجیے بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے فون کرا دیجیے۔ سائز تو وہی ہوگا جو ادارہ تحقیقات والے چاہیں گے لیکن ان کی کتابیں مروج سائز میں بھی چھپی ہیں۔ مثلاً کلیات بیدل۔

کچھ مضامین میرے پاس رکھے ہیں۔ وہ اگلے چند روز میں تلاش کر کے بھیجوں گا۔ ایک مضمون تو ڈاکٹر مختار الدین احمد کا ہے۔ انھوں نے ممتاز حسن کے خطوط بنام دوار کا داس شعلہ مرتب کیے ہیں۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کا ہے۔ دو چار اور بھی ہوں گے۔ ڈاکٹر حسن عباس جو ایران سے رام پور منتقل ہو چکے ہیں وہ ایک مضمون لکھ رہے ہیں۔ اگر آپ فرمائیں تو تین مضمون (ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر حنیف فوق) یہاں سے لکھوائے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب سے بھی کہہ سکتا ہوں۔ ایک مضمون آج ہی میری فرمائش پر قاضی قیصر الاسلام نے ڈاکٹر وحید قریشی کے پتے پر آپ کے لیے بھیجا ہے۔ یہ فلسفے سے متعلق ہے۔ ایک آدھ ایسا مضمون بھی ہونا چاہیے۔☆۷۸

کتاب ''اقبال کی پہلی بیوی'' کا نیا ایڈیشن یہاں سے شائع ہوگیا ہے۔ بیگم آفتاب اقبال نے شائع کیا ہے۔ اس کے شروع میں انھوں نے ایوب صابر صاحب کے خلاف نہایت سخت الفاظ میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اُن کو ''شیطان'' تک کہہ دیا ہے۔ بیگم آفتاب اقبال سے میں نے کہا ہے کہ اس کی چند کاپیاں مجھے دیں۔ مل گئیں تو آپ کے اور تحسین صاحب کے لیے بھیجوں گا۔☆۷۹

رسالہ ''غالب'' شائع ہوگیا ہے۔ آپ کے لیے اور دیگر احباب کے لیے بھیجا جا چکا ہے۔ امید ہے مل ہوگا۔ ایک روز جاپان سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کا فون آیا تھا۔ خیریت سے ہیں۔☆۸۰

ارمغان میں مضمون نگاروں کے مختصر کوائف بھی ہونے چاہییں۔

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۳-۴-۹۶ء

☆۷۸۔ ان میں سے بعض مضامین تو لکھے اور لکھوائے ہی نہ جا سکے۔ ارمغان میں صرف غیر مطبوعہ مضامین ہی شامل کیے گئے۔ تفصیل ارمغان میں موجود ہے۔

☆۷۹۔ ''اقبال کی پہلی بیوی'' از سید حامد جلالی، کا دوسرا ایڈیشن بیگم آفتاب اقبال نے شائع کرایا تھا۔

☆۸۰۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (پ: ۲۳ / ۱۹۴۰ء) سابق صدر شعبہ اردو اور ڈین یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور، ان دنوں جاپان میں مقیم تھے۔ وہ تقریباً چار سال تک اردو زبان کی تدریس کے لیے وہ جاپان کے ایک ادارے جائیکا سے وابستہ رہے۔

☆

(۱۹)

برادرِ عزیز و مکرم سلامِ مسنون

آپ کو اس خط کے ساتھ میرا ایک اور خط بھی ملے گا۔ ہوا یہ کہ آپ کے پچھلے خط کا جواب کل لکھا تھا۔ یہ میں آپ کو پوسٹ کرنے ہی والا تھا کہ آج آپ کا ۱۶ر ستمبر کا گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کے لیے ممنون ہوں۔

بزمِ اقبال اور اقبال اکیڈمی جیسے اداروں کی فہرست کو ''کتابیاتِ اقبال'' میں شامل کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اوّل تو یہ تجارتی نوعیت کی چیزیں ہیں، دوسرے ان سے کوئی علمی فائدہ نہ ہوگا کہ ان فہرستوں میں شامل تمام کتابیں خود ''کتابیاتِ اقبال'' میں شامل ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس قسم کی فہرستیں ان اداروں نے تقریباً ہر سال شائع کی ہیں اور یہ فہرست پچھلے سال کی فہرست سے مختلف ہے۔ ایسی صورت میں آپ کو تمام فہرستوں کا اندراج کرنا ہوگا جو ایک بے فائدہ بات ہوگی۔ اقبال کی زندگی میں اقبال کی کتابوں کے جو اشتہارات شائع ہوتے رہے ہیں، وہ تو کسی نہ کسی تحقیقی مقصد کو پورا کرسکتے ہیں لیکن اقبالیات سے متعلق تجارتی نوعیت کی فہرستوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے میری رائے☆[۸۱] ہے کہ آپ ان فہرستوں کو نظر انداز کردیں۔

''عالم گیر'' نومبر ۱۹۳۷ء میں ماہر القادری کے کچھ ''نثر پارے'' چھپے تھے، ان کا عکس بھی بھیج رہا ہوں۔ یہ فاروق صاحب کو دے دیجیے۔

عارف حجازی☆[۸۲] صاحب کا کیا حال ہے؟ اُنھوں نے لاہور میں ازراہِ کرم مجھے ''کلیاتِ ماہر'' عنایت کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اُن کی دل چسپی کی کچھ کتابیں انھیں پیش کروں تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں اُن کی عنایت کو بھول گیا۔ ازراہِ کرم مطلع فرمایئے کہ وہ کس قسم کی کتابیں پسند کرتے ہیں؟ ویسے اُن کی گفتگو سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پسندیدہ کتاب ''بہشتی زیور'' کے مردانہ حصے ''بہشتی گوہر'' کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ اس سلسلے میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اکتوبر میں لاہور آنے سے پہلے ایک دو کتابیں انھیں بھیج دوں۔

یہ مہینہ تو مہمانوں کی نذر ہوگیا۔ تبسم کاشمیری، سہیل عمر، ڈاکٹر محمد سلیم اختر (ایران) مظفر علی سید اور انتظار حسین آئے۔ ایک ایک دن ان کے ساتھ گزارا۔ بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ تبسم کاشمیری صاحب کا تو کل اوساکا سے فون بھی آیا تھا۔ یہ اُردو ادب کی تاریخ لکھ رہے ہیں جو بہ یک وقت اُردو،

۸۱۔ راقم کا خیال تھا کہ اقبالیات کے بارے میں جو کتاب، کتابچہ یا فولڈر، کچھ نہ کچھ معلومات فراہم کرتا ہو، اس کا حوالہ ''کتابیاتِ اقبال'' میں شامل کرلیا جائے۔ اس ضمن میں راقم نے اقبالیاتی فہارسِ کتب کے بارے میں خواجہ صاحب سے رائے طلب کی تھی، یہ وضاحت اسی سلسلے میں ہے۔

۸۲۔ صحیح: ظفر حجازی

انگریزی اور جاپانی زبانوں میں شائع ہوگی۔☆۸۳

اب آپ میرے دونوں خط سامنے رکھ کر جواب لکھیے، مگر اگلے برس نہیں، اسی سال اور اسی مہینے۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۱۔۹۔۹۴ء

آپ کے نام رشید حسن خان صاحب کا خط آیا ہے۔ وہ منسلک ہے۔

☆

(۲۰)

برادرِ مکرم، سلام مسنون

کتابوں کی وصولی کی رسید مل گئی تھی۔ سید امجد الطاف مرحوم سے متعلق مضمون ''قومی زبان'' میں اشاعت کے لیے دے دیا ہے۔☆۸۴ آپ کا ''سرکاری'' خط بھی مل گیا تھا۔ بے حد شکریہ۔ مگر آپ کو تو معلوم ہے کہ زندگی بھر جلسوں وغیرہ سے اجتناب کیا ہے، اب آخری وقت میں مسلمان کیا ہوں گا۔ اس لیے میری دلی معذرت قبول فرمائیے۔ ویسے دسمبر میں لاہور آؤں گا، آپ سے ملاقات کے لیے۔

''مقالاتِ ممتاز'' چھپ گئی ہے۔ ادارۂ یادگارِ غالب کی طرف سے آپ کو کتاب کے دس نسخے ملیں گے۔ ازراہِ کرم کتاب کا ایک ایک نسخہ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر کو دے دیجیے۔ باقی سات نسخے آپ کے لیے ہیں، ''ترجمان القرآن'' اور ''سیارہ'' وغیرہ میں تبصرے کرا دیجیے۔

آپ نے ستمبر میں لکھا تھا کہ آپ کے نام ایک طویل خط لکھنا چاہتا ہوں مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہیں لکھ رہا۔ اب تو آپ خدا کے فضل سے پوری طرح صحت یاب ہو چکے ہیں، اس لیے خط کا قرض چکا دیجیے۔

یہاں کے حالات بدستور ہیں۔ ہفتے میں کم از کم دو ہڑتالیں تو ہو جاتی ہیں۔ مجھ پر تو کوئی اثر نہیں ہوتا کہ میں خود ہی ۳۵/ برس سے ہڑتال پر ہوں، مگر یہ احساس کہ میں باہر نہیں نکل سکتا، خاصا تکلیف دہ ہے۔ ہڑتالوں کا بس ایک ہی فائدہ ہے کہ ملاقاتی نہیں آتے۔ . .

پرانے رسالوں میں ماہر القادری سے متعلق کچھ اور تحریریں ملی ہیں، یہ جلد ہی آپ کو بھیجوں

☆۸۳۔ تبسم کاشمیری (پ: ۲۹/ جنوری ۱۹۴۰ء) کی ''اردو ادب کی تاریخ'' اردو میں سنگ میل لاہور سے ۲۰۰۳ء میں چھپی۔ انگریزی اور جاپانی زبانوں میں اس کی اشاعت کا علم نہیں۔ تبسم صاحب اوائل ۲۰۰۵ء میں اوساکا یونی ورسٹی فار فارن اسٹڈیز سے سبک دوش ہونے کے بعد اب لاہور میں مقیم ہیں۔

☆۸۴۔ سید امجد الطاف (م: جولائی ۱۹۹۵ء) کے بارے میں میرا مضمون ''قومی زبان'' جنوری ۱۹۹۶ء میں شائع ہو گیا تھا۔ مرحوم حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے قدیمی رکن اور اعلیٰ پائے کے ادیب، شاعر اور محقق تھے۔ بہ وقتِ وفات اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونی ورسٹی کے صدر نشین تھے۔

گا، فاروق صاحب کے لیے۔ ماہر القادری پر ان کا مقالہ کب تک شائع ہو رہا ہے؟

حیدر آباد دکن کے اخبار ''سیاست'' میں اقبال سے متعلق دو مضمون نظر آئے تھے۔ ان کے تراشے بھیج رہا ہوں۔ مولانا وحید الدین خاں کے مضمون کے جواب میں ''سیاست'' میں کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔[☆۸۵] افسوس کہ وہ سب دستیاب نہیں ہو سکے۔ ممکن ہے آپ کے پاس ''سیاست'' آتا ہو، ایسی صورت میں سب تحریریں آپ کے پیشِ نظر ہوں گی۔

''مقالاتِ ممتاز'' کی تکمیل کے بعد بھی ممتاز صاحب کے کئی مضامین ملے۔ اُن کے متعدد خطوط بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے ممتاز صاحب کے خطوط بنام دوار کا داس شعلہ مرتب کر کے بھجوا دیے ہیں۔ اب یہ چیزیں ''غالب'' میں شائع کروں گا اور موقع ملا تو ان کی تحریروں کا ایک اور مجموعہ شائع کر دیا جائے گا۔[☆۸۶] مرحوم سے میرے بہت قریبی مراسم تھے۔ وہ میرے حال پر بے حد مہربان تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں جو دو چار بہترین انسان دیکھے ہیں، وہ اُن میں سے ایک تھے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ اُن کے علمی و ادبی کام محفوظ ہو جائیں۔ مرحوم کے پاس علامہ اقبال سے متعلق نوادر کی پوری ایک الماری تھی۔ علامہ کے ایک سو سے زیادہ خط اُنھوں نے اِدھر اُدھر سے جمع کیے۔ ایما ویگناسٹ کے نام کے اصل خط بھی ان میں شامل تھے۔ علامہ کی تمام تصانیف کے کئی کئی دستخطی نسخے تھے۔ چند نادر تصویریں بھی تھیں۔ یہ سب چیزیں ضائع ہو گئیں۔ ہوا یہ کہ وہ جس مکان میں رہتے تھے، اُس پر بینک کا قرض تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد مکان کی قرقی عمل میں آئی۔ تمام سامان باہر نکال دیا گیا جو کئی دن تک باہر پڑا رہا۔ نوادرِ اقبال والی آہنی الماری کوئی چوری کر کے لے گیا اور بھی بہت سے بیش قیمت کاغذات ضائع ہوئے۔ یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔[☆۸۷]

تحسین فراقی صاحب اور اورنگ زیب صاحب سے میرا سلام کہیے، خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۷۔۱۱۔۹۵ء

☆۸۵۔ علامہ اقبال کے خلاف بھارت کے نامور مصنف اور عالم وحید الدین خاں کے ایک مضمون کے جواب میں حیدر آباد کے روزنامہ ''سیاست'' میں متعدد مضامین شائع ہوئے تھے۔

☆۸۶۔ راقم کے علم کی حد تک، ممتاز حسن کے مضامین کا یہ موعودہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔

☆۸۷۔ مذکورہ نوادر کا ضیاع اقبالیات کے بڑے سانحات میں سے ایک ہے، لیکن خوش قسمتی سے ایما ویگے ناسٹ کے نام خطوطِ اقبال کی عکسی نقول، جرمن نومسلم اور سفارت کار محمد امان ہوبوہم ممتاز حسن مرحوم سے حاصل کر چکے تھے۔ ہوبوہم سے مذکورہ خطوط کی نقول ڈاکٹر سعید اختر درانی نے حاصل کیں۔ یہ خطوط اُردو ترجمے اور توضیحات کے ساتھ، درانی صاحب کی تصنیف ''اقبال یورپ میں'' کے دوسرے ایڈیشن (فیروز سنز لاہور ۱۹۹۵ء) میں شامل ہیں۔

☆

(۲۱)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

ایک مفصل خط دو روز ہوئے پوسٹ کیا ہے۔ امید ہے ملا ہوگا۔ آج کی ڈاک سے ابھی کچھ دیر پہلے، آپ کا ۲۶/اکتوبر کا خط ملا ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر گیان چند سے ابھی تک آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ تو آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ جاوید طفیل صاحب سے میری کئی مرتبہ فون پر بات ہو چکی ہے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ میری عدم موجودگی میں ڈاکٹر صاحب کے پاس کار رہے گی اور ایک رہ نما بھی، وہ جس سے چاہیں ملیں اور جہاں چاہیں جائیں۔ بہ ہر حال اب تک اُن سے آپ کی کئی ملاقاتیں ہو چکی ہوں گی۔ اگر ممکن ہو تو تفصیل لکھیے گا۔☆[۸۸] ارمغان سے متعلق آپ کے سوالوں کے سلسلے میں عرض ہے کہ:

۱) شروع میں ایک صفحے پر مجلس کے اراکین کے نام ضرور دیجیے۔ اس سے کتاب کے وقار میں اضافہ ہوگا۔

۲) دیباچہ آپ خود ہی لکھیے۔ میں نہ مرتب نہ مضمون نگار، سارا کام آپ نے کیا ہے۔ ہاں بہ طور تبرک احمد ندیم قاسمی صاحب سے ایک صفحہ لکھوا لیجیے کہ وہ مجلسِ مشاورت کے صدر ہیں۔

۳) اکبر حیدری کے حالات منسلک ہیں مگر یہ دس بارہ سال پہلے تک کے ہیں۔ اُن کی آٹھ دس کتابیں اور چھپ چکی ہیں۔ قاضی قیصر الاسلام کو فون کر دیا ہے۔ وہ اپنے کوائف آپ کو براہِ راست رجسٹری سے بھیج رہے ہیں۔ معین الدین عقیل کی پیدائش کا تو علم ہے، سالِ پیدائش کا نہیں۔ اُن کی کسی کتاب کے فلیپ پر ضرور ہوگا۔ کچھ بھی لکھ دیجیے کون تحقیق کرے گا۔☆[۸۹]

برسلز کی کانفرنس کے لیے مقالہ ضرور لکھیے، ایسے مواقع بار بار نہیں ملتے، آپ کو ضرور جانا چاہیے۔☆[۹۰]

☆۸۸۔ ڈاکٹر گیان چند لاہور پہنچ کر اپنے میزبان جاوید طفیل صاحب (مدیر نقوش) کے ہاں مقیم ہو گئے تھے۔ دو تین روز تک، باوجود تگ و دو کے ہم اُن سے ملنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تا آنکہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کی طرف سے ایک شام عامر ہوٹل (نزد حکومت پنجاب سکریٹریٹ) میں ان کے اعزاز میں ایک استقبالیے کا اہتمام کیا۔ لاہور کے بہت سے ادیب اس میں شریک تھے۔ بعد ازاں شعبۂ اُردو اورینٹل کالج لاہور کی طرف سے ان کے اعزاز میں سینیٹ ہال لاہور میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (حال شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) اور ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی بھی موجود تھے۔ یہ حضرات بھی ان دنوں اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے۔

☆۸۹۔ ''ارمغانِ علمی'' میں اکبر حیدری کاشمیری کا کوئی مضمون شامل نہ ہو سکا۔ باقی ہدایات کی تعمیل ہو گئی۔

۹۰۔ اقبال فاؤنڈیشن یورپ کے زیرِ اہتمام گینٹ نزد برسلز کے علامہ اقبال سیمینار (۱۸۔۱۹/نومبر ۱۹۹۷ء) کا ذکر ہے، جس میں پاکستان سے تحسین فراقی، محمد اکرام چغتائی، محمد سہیل عمر، خالد احمد (فرائیڈے ٹائمز) اور راقم شریک ہوئے۔ سیمینار کی مفصل روداد دیکھیے: ''اقبالیات'' لاہور جنوری ۱۹۹۸ء، نیز: ''تفہیم و تجزیہ'' لاہور، ۱۹۹۹ء۔

اقبال کی نثر پر آپ کی شاگرد کی کتاب اقبال اکیڈمی نے بھیجی ہے۔ اچھا کام ہے۔ آپ نے بہت عمدہ مقالہ لکھوایا ہے۔ جی خوش ہوا۔☆[۹۱] خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۳۰۔۱۰۔۹۷ء

☆

(۴۲)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا گرامی نامہ مع مضمون موصول ہوگیا تھا۔ ممنون ہوں، مضمون ''قومی زبان'' میں اشاعت کے لیے بھیج دیا ہے۔

آپ کی طبیعت کی ناسازی کی اطلاع سے تشویش ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب آپ روبہ صحت ہیں۔ ڈاکٹروں نے آرام کے لیے کہا ہے تو اس پر سختی سے عمل کیجیے اور اس کا بھی کوئی حل تلاش ہونا چاہیے کہ آخر آپ بار بار کیوں بیمار پڑتے ہیں، اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ کسی اچھے اسپتال میں مکمل چیک اپ کرایا جائے۔ میں نے یہی کیا اور خدا کا شکر ہے کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔

''ارمغانِ علمی'' کا نام اب ارمغانِ تاخیر رکھ دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس کام میں مسلسل تاخیر ہوتی چلی جارہی ہے۔ نصف درجن مقالہ نگار اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، باقی کو خدا اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ تحسین صاحب اگر وقت نہیں نکال پاتے تو آپ ڈاکٹر اورنگ زیب اور عزیزی رفاقت علی شاہد سے کام لیجیے۔

جعفر بلوچ صاحب نے پچھلے دو دن کراچی میں گزارے۔ اُن سے لاہور کے دوستوں کا ذکر رہا۔ اچھا وقت گزرا۔

''صحیفہ'' کا تازہ شمارہ (نمبر ۱۵۲) آپ نے دیکھا ہوگا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے ڈاکٹر وحید قریشی کا ذکر نہایت سوقیانہ پیرائے میں کیا ہے۔ پڑھ کر افسوس ہوا۔☆[۹۲]

اپریل میں اسلام آباد جانا ہوگا۔ ممکن ہوا تو آپ سے اور دوسرے دوستوں سے ملاقات کے لیے ایک دن کے لیے لاہور بھی آؤں گا۔ پچھلے نومبر میں آپ سے ملاقات نہ ہونے کی تلافی تو کرنی ہی ہے۔

☆۹۱۔ راقم کی شاگرد زیب النسا نے ایم اے اُردو کا مقالہ ''اقبال کی اردو نثر'' کے عنوان سے تحریر کیا جو اسی زمانے میں اقبال اکادمی پاکستان لاہور سے شائع ہوا تھا۔

۹۲۔ مذکورہ شمارے میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھا تھا: ''محمد ایوب شاہد کے اس کام کو تحقیقی قرار دینے کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی ایسا معتبر قلم یا ڈیل ڈول چاہیے'' (''صحیفہ'' لاہور، شمارہ ۱۵۲، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء)

آپ کی صحت و شادمانی کی دعاؤں کے ساتھ۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۳۔۳۔۹۸ء

برادرم تحسین فراقی سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہیے۔

☆

(۲۳)

برادرم عزیز و مکرم، سلام مسنون

منسلکہ خط لکھ کر لفافہ بند کر دیا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کا مکتوب مورخہ ۸؍ مارچ موصول ہوا۔ دیباچہ میں نے دیکھا۔ اس میں تین جگہ ترمیم تجویز کرتا ہوں، بعض لوگ ''سال ہا سال'' کو درست نہیں سمجھتے۔ میں نے لکھا تھا تو اس پر اعتراض کیا گیا تھا۔ ''سال ہا سال'' کے بعد ''تک'' کا استعمال بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ ''صدارتی تمغا برائے حسنِ کارکردگی کا اعزاز عطا کیا۔'' اس کی بجائے ''صدارتی اعزاز برائے حسنِ کارکردگی عطا کیا'' ہو تو اچھا ہے۔ ''مرتبین'' سے پہلے ''نیازمند'' کی ضرورت نہیں۔☆[۹۳]

مشمولات کی فہرست موضوع وار بنانی مشکل ہے۔ الف بائی ترتیب اس لیے مناسب نہیں کہ بعض غیر اہم مضمون نگاروں کے مضامین پہلے آجائیں گے۔ میری رائے میں شروع کے چھ مضامین ان حضرات کے ہوں، باقی آپ جیسے مناسب خیال فرمائیں، شامل فہرست کر لیں۔ ۱۔ ڈاکٹر نذیر احمد، ۲۔ مفتی محمد رضا فرنگی محلی، ۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ۴۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ۵۔ رشید حسن خاں، ۶۔ شان الحق حقی۔

مقالہ نگاروں کے کوائف میں غلطیاں اور کمیاں خاصی ہیں۔ میں نے سبز روشنائی سے تصحیح کر دی ہے۔ اسے آپ ملاحظہ فرمالیں۔

پہلے مقالوں کی فہرست ہو (عنوان ''فہرست'' کافی ہے) اور پھر کوائف (اس کا عنوان ''مقالہ نگار'' مناسب ہے)۔

مجموعے کا انتساب ہرگز کسی کے نام نہیں ہونا چاہیے۔ اس قسم کے مجموعے کسی کے نام منسوب نہیں کیے جاتے۔ اصل انتساب تو اُس کے نام ہوتا ہے جس کی خدمت میں کتاب پیش کی جاتی ہے اور یہ انتساب آپ کر ہی چکے۔ مقالہ نگاروں سے متعلق چار صفحات واپس بھیج رہا ہوں۔ جناب آپ قدم قدم پر مشورہ نہ کیجیے۔ جو جی میں آئے کر گزریے۔ مشوروں سے کام بگڑتا ہے۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۳۔۳۔۹۸ء

☆۹۳۔ یہ سب ہدایات ''ارمغانِ علمی'' بپاسِ خدماتِ علمی و ادبی ڈاکٹر وحید قریشی کے سلسلے میں ہیں (مرتبین: رفیع الدین ہاشمی، تحسین فراقی، عارف نوشاہی) جو بالآخر ۱۹۹۸ء ہی میں القمر انٹرپرائزز لاہور سے شائع ہو گئی تھی۔

☆

(۴۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کو خط لکھنے کے ساتھ ہی میں جواب کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ اب کے جواب نہیں آیا تو تشویش ہوئی۔ میں نے تحسین صاحب کے نام کے خط میں اس تشویش کا اظہار بھی کیا۔ آپ کا خط آیا تو معلوم ہوا کہ طبیعت ناساز تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب آپ صحت یاب ہو چکے ہیں۔ میں نے جو خط لکھا تھا، اُس میں کئی باتیں جواب طلب تھیں، از راہِ کرم وہ خط تلاش کیجیے اور جواب لکھیے۔ ایک بات یاد ہے جو میں نے احمد ندیم قاسمی صاحب کے دیباچے کے بارے میں لکھی تھی کہ اس میں سے میرا نام کاٹ دیجیے۔ میں نے تحسین صاحب سے بھی یہ گزارش کی تھی۔ اُن کا جواب آ گیا کہ میری گزارش مان لی گئی۔☆۹۴

سفرنامے کے پروف مل گئے ہیں۔ اس کے دو تین باب تو میں پہلے پڑھ چکا ہوں۔ بہ ہر حال میں ان شاء اللہ لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا۔ میں دو چار صفحے لکھ بھی دوں گا☆۹۵ مگر آپ وقت کی آخری حد بتا دیجیے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ سفرنامے کو بہ غور پڑھنے کے لیے کم از کم ایک مہینہ درکار ہوگا۔ لکھنے میں، میں اتنا کاہل ہوں کہ سوائے خطوں کے زندگی میں کوئی تحریر قلم برداشتہ نہیں لکھی۔ یہاں تک کہ کالم کے بھی کم از کم دو مسودے ہمیشہ تیار کیے۔

اقبال اکیڈمی میں بیٹھ کر کام کرنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔☆۹۶ میرا خیال ہے کہ آنے جانے میں وقت ضائع ہوگا، دوسرے وہاں ملنے جلنے والے بھی وقت ضائع کریں گے۔ گھر میں جس آرام اور سہولت سے کام ہو سکتا ہے، دوسری جگہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں کتبِ حوالہ یا لائبریری کے استعمال کے سلسلے میں ہفتے میں ایک روز چلے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی لائبریری میں اتنا کچھ ہے کہ اقبال اکیڈمی کی لائبریری سے استفادے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوگی۔ اس سلسلے میں مجھے اور بھی اندیشہ ہے جس کا اظہار کر دینا ضروری ہے۔ جہاں دوستی کا معاملہ ہو، وہاں ہر معاملے میں احتیاط ضروری ہے۔ بعض لوگ تعلقات کی نوعیت کے مطابق رویہ بنا لیتے ہیں۔ سہیل عمر بہت اچھے آدمی ہیں، لیکن اکیڈمی سے باقاعدہ تعلق کی صورت میں ان کا رویہ تبدیل ہو سکتا ہے۔

☆۹۴۔ ''ارمغانِ علمی'' کی تقدیم میں جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا: ''بطور خاص علمی تحقیق میں انھیں (ڈاکٹر وحید قریشی کو) استاد کا مقام حاصل ہے اور وہ حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع، پروفیسر رشید حسن خاں اور جناب مشفق خواجہ کے سے اساتذۂ تحقیق کی صف میں شامل ہیں۔'' خواجہ صاحب نے بعد کے خطوں میں بھی اصرار کیا کہ ان کا نام نکال دیا جائے، چناں چہ ان کے پیہم اصرار پر ہم نے ان کا نام حذف کر دیا۔

☆۹۵۔ راقم کا سفرنامہ اندلس ''پوشیدہ تری خاک میں'' — بعد میں دارالتذکیر لاہور سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔

☆۹۶۔ تعطیلات میں راقم اور تحسین فراقی نے اقبال اکادمی کے خنک ماحول میں جا بیٹھ کر کام کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو ایک ڈیڑھ ماہ تک چلتا رہا۔

عارف نوشاہی صاحب کی ملازمت کے ختم ہونے کی افسوس ناک اطلاع مل گئی تھی۔☆[97] خدا کرے اُنھیں کوئی بہتر کام مل جائے۔ اُن کی صحیح جگہ کوئی یونی ورسٹی ہوسکتی ہے۔ ''ارمغان'' پانچ سو ہی کی تعداد میں چھپے مگر چھپے تو! اس میں خاصا وقت صرف ہوگیا، توجہ فرمائیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے آپ گاہے گاہے ملتے رہیے۔ جو شخص زندگی بھر انجمن آرائیاں کرتا رہا ہو، وہ خانہ نشین ہوجائے تو اُس پر قیامت گزر جاتی ہے۔ ہر شخص مشفق خواجہ نہیں ہوسکتا کہ مہینوں گھر سے باہر نہ نکلے اور خوش رہے۔ میرزا ادیب صاحب سے بھی کبھی کبھار مل لیا کیجیے۔ مجھے اُن کی طرف سے تشویش رہتی ہے۔ انھیں بھی یہی شکایت ہے کہ کوئی اُن سے نہیں ملتا۔ محمد ایوب صابر☆[98] صاحب نے ایبٹ آباد آنے کی دعوت دی تھی جسے میں نے شکریے کے ساتھ قبول کرلیا تھا لیکن یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میں اپنی بنائی ہوئی زنجیروں میں اس طرح جکڑا ہوا ہوں کہ ان زنجیروں کو میں خود بھی نہیں توڑ سکتا۔

کچھ دن ہوئے میں نے زاہد منیر عامر صاحب کے ذریعے ایک خط بھیجا تھا، امید ہے ملا ہوگا۔ ''علامت'' میں تبصرے سے میں سمجھا تھا کہ سفرنامہ چھپ گیا ہے۔☆[99] میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اورینٹل کالج میگزین کا جو شمارہ آپ نے مرتب کیا ہے، وہ بھجوا دیجیے۔☆[100]

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۸۔۷۔۹۷ء

☆

(۲۵)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

بے حد شرمندہ ہوں کہ بہت تاخیر سے خط لکھ رہا ہوں۔ دراصل اس دوران میں بہت سے ایسے کاموں میں مصروف رہا جو میرے معمول کے خلاف تھے، مثلاً مہمانوں کی بے تحاشا آمد، ادبی مہمان بھی اور غیر ادبی بھی۔ آمنہ کے اور خود اپنے علاج کے سلسلے میں بار بار اسپتال جانا، بے شمار کتابوں کا آنا۔ امید ہے آپ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر خط نہ لکھنے کی معذرت قبول فرمائیں گے۔

☆۹۷۔ ادارہ تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد سے وابستگی ختم ہوگئی تھی۔

☆۹۸۔ ڈاکٹر محمد ایوب صابر سابق صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد۔ اقبال کے متخصص اور اقبالیات پر متعدد کتابوں کے مصنف۔

☆۹۹۔ سفرنامہ اندلس کا اوّلین متن ''نقوش'' میں چھپا تھا۔ ''علامت'' کے مدیر محمد سعید شیخ (م: ۱۸ردسمبر ۲۰۰۲ء) نے اس پر مفصل تبصرہ کیا تھا۔

☆۱۰۰۔ یہ ۱۹۹۶ء کا شمارہ تھا، جس میں راقم نے ''اورینٹل کالج کے موجودہ اساتذہ'' کے عنوان سے اساتذہ کا کوائف نامہ مرتب کیا تھا۔

''ارمغانِ علمی'' کے ۳۹ نسخے مل گئے تھے۔ جلد سازی کے بعد کتاب کی ظاہری صورت بھی اچھی خاصی نکل آئی ہے۔ اس کی تقسیم شروع کر دی ہے۔ ان شاء اللہ تبصرے بھی جلد شائع ہوں گے۔ کتابوں کی تقسیم کے لیے آپ نے جو فہرست بھیجی تھی، وہ گم ہو گئی ہے۔ ازراہِ کرم دوبارہ یہ فہرست بھیج دیجیے۔ معین الدین عقیل صاحب کا فون آیا تھا۔ وہ آج کل کراچی میں ہیں[☆۱۰۱]۔ ان کا نسخہ انھیں دے دوں گا۔ ہندوستان کے نسخے اگلے چند روز میں روانہ کروں گا۔

ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کے قیام کا انتظام یہاں نہایت عمدہ ہو گیا تھا۔ دو بار انھیں انجمن ترقی اُردو میں بہ طور خاص مدعو کیا گیا۔ دو مرتبہ وہ غریب خانے پر تشریف لائے۔ طویل ملاقاتیں ہوئیں[☆۱۰۲]۔ اور دلچسپ باتیں ہوئیں۔ دوسری مرتبہ میں نے انھیں اور احباب کو ایک ہوٹل میں کھانے پر مدعو کیا۔ طاہر مسعود صاحب سے انٹرویو کے لیے کہا اور یہ میرے گھر پر ہی ہوا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کی بعض باتیں نہایت تعجب انگیز ہیں، مثلاً انتظار حسین کو وہ سرے سے افسانہ نگار ہی نہیں مانتے اور نسیم حجازی کو قرۃ العین حیدر سے بڑا ناول نگار جانتے ہیں۔ محفل احباب میں، میں نے اُن سے چبھتے ہوئے سوال کیے اور اُن کے کاموں کی داد ان الفاظ میں دی کہ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ آپ نے غالب اور قرۃ العین حیدر پر کتابیں لکھ کر ان دونوں کو مشرف بہ اسلام کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا سنجیدگی سے یہ خیال ہے کہ غالب بہت پکا مسلمان تھا اور اُس کی رندی و آوارگی کی داستانیں جھوٹی ہیں۔ ایک موقعے پر انھوں نے اس سے انکار کیا کہ اُن کا جماعت اسلامی سے کوئی تعلق ہے۔ اس پر میں نے گزارش کی کہ آپ علی الاعلان ایسی بات نہ کریں، اگر جماعتِ اسلامی سے آپ بے تعلق ہو گئے تو جماعت، خانۂ بے چراغ ہو جائے گی کہ اُس کے پاس آپ ہی تو ادبی نقاد ہیں۔ اس جملے سے وہ خود بھی محظوظ ہوئے۔

گزشتہ ہفتے سہیل عمر اور اکرام چغتائی دو دن کے لیے کراچی آئے تھے۔ ایک شام میرے ساتھ ہی گزاری۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کہاں ہیں؟ جب سے وہ پنجاہ ہزاری ہوئے ہیں[☆۱۰۳] اُن کا مزاج ہی نہیں ملتا۔ کتاب بھیجوں تو رسید نہیں دیتے، خط لکھوں تو جواب نہیں دیتے۔ دو ہفتے ہوئے اُن کی ایک شاگرد کا فون آیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب عنقریب آپ کو خط لکھیں گے۔ اس خوش خبری کا شکریہ ادا کر دیجیے۔

☆۱۰۱۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل (پ: ۲۵ جون ۱۹۴۷ء) اُن دنوں تدریسِ اُردو کے سلسلے میں ٹوکیو یونی ورسٹی فار فارن اسٹڈیز سے وابستہ تھے۔ تعطیلات کرسمس میں کراچی آئے ہوئے تھے۔ آج کل جامعہ کراچی میں صدر شعبۂ اُردو کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

☆۱۰۲۔ ڈاکٹر عبدالمغنی بھارت کے معروف نقاد اور مجاہدِ اُردو۔ تیسری علامہ اقبال عالمی کانگرس (پنجاب یونی ورسٹی لاہور) ۱۹۹۸ء میں شرکت کے بعد لاہور سے کراچی گئے تھے۔ اُس زمانے میں، وہ ایل این متھلا یونی ورسٹی بہار کے وائس چانسلر تھے۔

☆۱۰۳۔ تحسین صاحب کو اُن کے مجموعۂ مضامین ''اقبال، چند نئے مباحث'' پر ۱۹۹۷ء کا ''وزیراعظم ادبی ایوارڈ'' مع پچاس ہزار روپے ملا تھا۔

مجھے شرمندگی ہے کہ میں اب تک آپ کا سفرنامہ نہیں پڑھ سکا۔ لیکن اب مزید تاخیر نہیں ہوگی اور بہت جلد واپس بھجوا دوں گا۔ رسالہ ''اُردو'' کے آپ کے مطلوبہ شمارے کے لیے دفتر کو ہدایت کر دی ہے۔ تازہ شمارے کے ساتھ یہ آپ کو جلد ہی ملے گا۔ اقبال سے متعلق کتابیں تلاش کر کے آپ کو بھجوا دوں گا۔ آوا جعفری پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کے چھ نسخے ارسال ہیں۔ ہر نسخے پر ایک نام لکھا ہے اور جس پر نام نہیں وہ ''ترجمان القرآن'' کے لیے ہے۔ اس پر آپ تبصرہ کر دیں تو کرم ہوگا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۵-۱۲-۹۸

☆

(۳۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آج ہی آپ کا لفافہ ملا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کا انٹرویو خاصا خندہ آور ہے۔ موصوف خاصے انتہا پسند ہیں اور غضب یہ ہے کہ جن ادیبوں کی تحریریں نہیں پڑھیں، اُن کے بارے میں بھی رائے دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ ہندوستان کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں بھی، اسی وجہ سے انھیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ جو شخص ش مظفر پوری کو قاضی عبدالودود اور کلیم الدین احمد کے برابر جگہ دیتا ہو، اُس کو سات خون معاف ہونے چاہئیں۔ البتہ ایک بات اُنھوں نے صحیح لکھی ہے کہ ''بڑا نقاد تو میں خود ہوں۔'' افسوس کہ میں نے کالم نگاری ترک کر دی، ورنہ ایک نہایت عمدہ کالم لکھا جا سکتا تھا۔☆[۱۰۴]

زیب النسا صاحبہ کے لیے ''مولانا ظفر علی خاں کی اُردو نثر'' نہایت عمدہ موضوع ہے۔ اس موضوع پر آج تک کام نہیں ہوا، اور میرا خیال یہ ہے کہ مولانا کی نثری خدمات، اُن کی شاعری سے کہیں زیادہ ہیں۔ وہ صاحب طرز تھے۔ اعلیٰ درجے کے مترجم تھے۔ اخلاقی، تاریخی، ادبی، سیاسی اور علمی موضوعات پر اُنھوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ کئی مجموعے مرتب ہو سکتے ہیں۔ اُن کے نثری انتخابات شائع ہوئے ہیں مگر زیادہ تر تحریریں رسالوں اور اخباروں میں منتشر اور دفن ہیں۔ جعفر بلوچ صاحب نے مولانا کے نثری مجموعے اور رسالوں کے مضامین جمع کر رکھے ہیں۔ اُن سے مدد ملے گی۔ ''زمیندار'' کا مکمل فائل لاہور میں ڈاکٹر محمد صادق کے پاس تھا۔ ایک مرتبہ تحسین فراقی صاحب کے ساتھ میں اُن کے ہاں گیا تھا۔ اُنھوں نے ایک بہت بڑی دیواری الماری دکھائی تھی کہ اِس میں ''زمیندار'' کا فائل ہے۔ یہ وہی ڈاکٹر صادق ہیں جنھوں نے سید احمد شہیدؒ پر ایک کتاب تین جلدوں میں مرتب کی تھی، نیز مولانا ظفر علی خاں کے دو تین نثری انتخابات شائع کیے تھے۔ یہ کام محنت کا اور گھومنے کا ہے۔ دیکھ لیجیے کہ یہ طالبہ اس طرح

☆[۱۰۴] عبدالمغنی صاحب کا یہ انٹرویو ''نوائے وقت'' کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔

کی محنت کر سکیں گی کہ نہیں۔

ایک موضوع اقبال کے اُن معاصرین کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے جنھوں نے علمی و ادبی کام بڑے پیمانے پر کیے مگر اب زمانہ انھیں بھولتا جا رہا ہے، مثلاً مولوی محبوب عالم، مولوی انشاء اللہ خان، مولوی احمد دین، مولوی الف دین، خوشی محمد ناظر اور ''مخزن'' کے متعدد شاعر اور مضمون نگار۔ ان سب سے اقبال کے مراسم بھی تھے۔ عنوان کچھ یوں ہو سکتا ہے ''اقبال اور ان کے معاصرین'' (پنجاب میں)۔

ایک موضوع ''اورینٹل کالج کے اساتذہ، بیسویں صدی کے ربع اوّل تک'' بھی ہو سکتا ہے۔ اہلِ علم کی پوری ایک کہکشاں کو اس مقالے میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

خواجہ ناصر نذیر فراق، خواجہ حسن نظامی، مہدی افادی، خواجہ محمد شفیع پر بھی کام ہو سکتا ہے۔

مبین مرزا صاحب کو میں نے ''ارمغان'' کا ایک نسخہ پہلے ہی دے دیا تھا، جسارت میں کالم لکھنے کے لیے۔ شاہد علی خاں کو بھیجنے کا ارادہ ہے۔

سید معین الرحمٰن صاحب کا انٹرویو بھی خوب تھا۔ میرے ''پُر پیچ'' ہونے کا علم انھیں بہت تاخیر سے ہوا۔ موصوف کے لیے دعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔

یہ بہت عمدہ تجویز ہے کہ ۱۴ فروری کو ڈاکٹر وحید قریشی کی سال گرہ منائی جائے۔ اس کی صدارت اگر احمد ندیم قاسمی کریں تو اچھا ہے۔ مقررین میں مرزا محمد منور، انتظار حسین، شہزاد احمد تو ضرور ہوں۔

سفرنامہ دیکھ رہا ہوں۔ رفتار ست اس لیے ہے کہ کتابت کی غلطیاں بھی درست کرتا جا رہا ہوں۔ آپ نے تصحیح کی ہے، اس کے باوجود غلطیاں رہ گئی ہیں۔ روزانہ رات کو بارہ سے ایک بجے تک کا وقت اس کام کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔

تحسین صاحب سے میرا سلام کہیے۔ انھیں جلد ہی خط لکھوں گا۔

ہاں جناب! کئی بار لکھ چکا ہوں کہ اورینٹل کالج میگزین کے جو شمارے پچھلے دو تین برسوں میں شائع ہوئے ہیں، وہ مجھے نہیں ملے۔ خصوصاً وہ شمارہ جس میں اساتذہ کا ''کچا چٹھا'' ہے۔ توجہ فرمائیے۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۲۔۲۔۹۹ء

☆

(۲۷)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

بے حد شرمندہ ہوں کہ ایک طویل عرصے کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ سفرنامے کا مسودہ بھی بہت تاخیر سے واپس کر رہا ہوں۔ کیا بتاؤں کہ پچھلے تین مہینے کیسے گزرے۔ بیگم، اپنی بہن کے ساتھ ابھی تک اسپتال میں ہیں۔ گھر کا نظام پہلے ہی کون سا ٹھیک تھا، اب تو بالکل چوپٹ ہو گیا۔ یہ گھر نہیں رہا،

اقبال اکیڈمی بن گیا ہے کہ شور زیادہ اور کام کچھ بھی نہیں۔ اسپتال آنا جانا تو لگا رہتا ہی ہے، اس پر مہمانوں کی آمدورفت، آمد زیادہ اور رفت کم۔ اُس روز فون پر آپ سے کہا تھا کہ کل مسودہ پوسٹ کردوں گا مگر مہمانوں کے آجانے سے وعدہ پورا نہ کرسکا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ شدید گرمی اور حبس کے ساتھ بجلی غائب، کئی راتیں، جاگ کر گزاریں۔ میں زندگی بھر اکبر کا ہم خیال رہا:

وصل ہو یا فراق ہو اکبر
جاگنا ساری رات مشکل ہے

بڑھاپے میں ساری رات جاگنے کا تجربہ بھی کرلیا۔

اس دوران آپ کے سفرنامے کے لیے ایک چھوٹا سا فلیپ لکھ دیا ہے جو منسلک ہے۔ اگر پسند آئے تو سبحان اللہ، پسند نہ آئے تو پھاڑ کر پھینک دیجیے۔ خواہش تو یہی تھی کہ بھرپور دیباچہ لکھوں، مگر گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل.....

سفرنامے کے پروفوں میں حسب توفیق کتابت کی اغلاط کی تصحیح کردی ہے، سرخ روشنائی سے۔ کہیں کہیں آپ کی عبارت کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش کو جرأت رندانہ سمجھ کر نظر انداز کردیجیے۔ البتہ ایک امر میں احتیاط ضروری ہے کہ ہندی الفاظ کو الف پر ختم کرنے کی درست روش کے ساتھ بعض فارسی الفاظ بھی زد میں آگئے ہیں، (مثلاً پردہ اور نقشہ جیسے الفاظ کو الف پر ختم کرنا درست نہیں)۔ میں نے ایسے الفاظ کو بھی درست کردیا ہے۔

''ارمغان'' کے تمام وہ نسخے جو ہندوستانی ادیبوں کے لیے تھے، ڈاک سے بھجوا دیے ہیں۔ اس پر ''جسارت'' میں کالم اور ''جنگ'' میں تبصرہ بھی شائع ہوگیا ہے۔ ''قومی زبان'' میں۔ امید ہے یہ تحریریں آپ کی نظر سے گزری ہوں گی۔

ڈاکٹر محمد ایوب شاہد کا مضمون میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ مل سکتا ہے؟ ☆☆۱۰۵

''ارمغان علمی'' کی تمام جلدیں تقسیم ہوگئیں۔ دو چار لوگوں کے نسخے امانتاً میرے پاس ہیں (جیسے شان الحق حقی کا)۔ نجم الاسلام صاحب کو آپ ہی بھجوائیے۔

رفاقت علی شاہد کو میں نے خط لکھا ہے کہ وہ یہاں آجائیں۔ اُن کے لیے نئی ملازمت کی فکر میں ہوں۔ جب رفاقت یہاں آجائیں تو اُس کے چند روز بعد آپ بھی آجائیے۔ رفاقت کا پہلے آنا اس لیے ضروری ہے کہ آپ کے قیام کے انتظامات میں وہ میرا ہاتھ بٹاسکیں۔ آپ آئیں تو پھر آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ یا زیادہ سے زیادہ وہ تکالیف ہوں جو اس گھر میں قیام کی وجہ سے میں اٹھاتا ہوں۔ ☆☆۱۰۶

☆☆۱۰۵۔ ڈاکٹر محمد ایوب شاہد، گورنمنٹ کالج اٹک میں اُردو کے استاد ہیں۔ یاد نہیں آرہا، خواجہ صاحب نے اُن کے کس مضمون کی فرمائش کی تھی۔

آپ نے کسی کے نام ایک خط بھیجا تھا جو دو روپے والے لفافے میں تھا۔ خط میں نے دستی پہنچا دیا تھا، لفافہ واپس بھیج رہا ہوں کہ آئندہ کام آئے۔

ایک دلچسپ خبر یہ ہے کہ بیگم آفتاب اقبال نے ایک ضخیم کتاب آفتاب اقبال کے بارے میں لکھی ہے۔ یہ جلد ہی شائع ہو رہی ہے۔☆۱۰۷

اکبر حیدری کاشمیری کی کتاب ''اقبال کی صحتِ زبان'' کیا آپ کے پاس ہے؟

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۲۷۔۵۔۹۹ء

☆

(۲۸)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

ایک عرصے سے آپ سے رابطہ نہیں۔ آپ کو جولائی کے آخر میں آنا تھا۔ میں نے کہلوا دیا تھا کہ اگست کے شروع میں آیئے تاکہ ایک شادی کی مصروفیت سے فارغ ہو جاؤں اور کراچی میں آپ کے قیام کے دوران سارا وقت آپ کی حاشیہ نشینی میں صرف کرسکوں اور آپ آرام سے اقبال پر حواشی لکھتے رہیں۔ آج اگست کی بارھویں ہے، دور دور تک آپ کی آمد کے آثار نہیں۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ میں یہاں آنکھیں فرشِ راہ کیے بیٹھا ہوں اور آپ خدا جانے کہاں ہیں؟

برادرم تحسین فراقی کی بھی کوئی اطلاع نہیں۔ سنا ہے کہ وہ مکان تعمیر کرا رہے ہیں۔ اچھا ہے یہیں تعمیر کرالیں۔ سنا ہے جنت میں مکانوں کی بڑی قلت ہوگی۔ ایران میں اُن کی جگہ پر چھاپا مارنے والے مشکور حسین یاد صاحب میرے حال پر مہربان ہیں۔ ایران سے اُن کا فون آیا تھا کہ یہاں دل نہیں لگ رہا، کرنے کو کوئی کام ہی نہیں۔ میں نے کہا، تحسین فراقی صاحب کو بلا لیجیے۔ اُن کے ساتھ وقت اچھا گزرے گا۔ کہنے لگے، ایک نیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے آپ کو تلوار نہ سمجھیے، مزاح نگار سمجھیے تو گزارا ہو جائے گا۔ لاہور سے بھی وہ اکثر فون کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے بہ یک وقت دو اطلاعیں دیں کہ میری آنکھیں خراب ہیں، آپریشن کی ضرورت پڑے گی۔ دوسری اطلاع یہ تھی کہ اُن کے شاگردِ رشید، نواز شریف نے اُنھیں فلم سنسر بورڈ کا چیئرمین بنا دیا ہے۔ میں

☆۱۰۶۔ رفاقت علی شاہد (پ: ۱۰ر جون ۱۹۶۶ء) تو کراچی جا کر خاصا عرصہ خواجہ صاحب کے ہاں مقیم رہے مگر راقم اس زمانے میں کراچی نہیں جا سکا۔

☆۱۰۷۔ ''علامہ اقبال اور ان کے فرزند، کبر آفتاب اقبال''۔

نے کہا یہ اطلاعیں تو لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نواز شریف کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آپ کی بینائی کم زور ہے، اس لیے آپ فلم سنسر بورڈ کے چیئرمین کے فرائض بخوبی ادا کر سکیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسے۔ ویسے یہ اُن کی خوبی ہے کہ اُن کے بارے میں کچھ بھی کہا جائے، برا نہیں مانتے۔ معاف کیجیے، تحسین صاحب کے ذکر پر حضرت یاؔد یاد آگئے۔ تحسین صاحب اب کہاں جا رہے ہیں۔ ذرا بتایئے تاکہ میں یاؔد کو اطلاع دوں کہ فوراً وہاں اپنا تقرر کرالیں۔ یاؔد صاحب نواز شریف کے دور میں ہر عہدہ حاصل کر سکتے ہیں، سوائے وزارتِ عظمیٰ کے کہ نواز شریف اُن سے کبھی یہ نہیں کہے گا کہ ایں جا برائے استاد خالیست۔☆۱۰۸

معین الرحمٰن صاحب نے جو دیوان غالب شائع کیا ہے، وہ آپ کی نظر سے گزرا؟ میرا خیال یہ ہے کہ اُن کے پاس دیوانِ غالب کا کوئی قلمی نسخہ نہیں ہے۔ یہ نسخہ جس کا اُنھوں نے عکس شائع کیا ہے، پنجاب یونی ورسٹی کا نسخہ ہے۔ سنا ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی کا اصل نسخہ غائب ہو گیا ہے؟ اس سلسلے میں آپ کو کچھ معلوم ہو تو بتایئے گا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے نسخے پر قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر سید عبداللہ لکھ چکے ہیں۔ اس نسخے میں اور معین صاحب کے نسخے میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ یہ ایک دل چسپ موضوع ہے، مگر اس کی اطلاع معین صاحب کے کسی دشمن کو، یہاں تک کہ خود معین صاحب کو بھی نہ دیجیے گا، ورنہ خواہ مخواہ کا فساد ہوگا۔☆۱۰۹

اپنی اور احباب کی خیریت سے فوراً مطلع فرمایئے۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۲۔۸۔۹۹ء

☆

(۲۹)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

ابھی چند لمحے قبل گرامی نامہ مورخہ ۳۱ راگست موصول ہوا۔ ممنون ہوں۔ آپ بھی جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ آپ نے زندگی میں جتنے اسفار کیے ہیں، میں اُتنی مرتبہ تو اپنے مکان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک نہیں گیا۔ آپ پر رشک آتا ہے۔ میرا بھی بہت جی چاہتا ہے کہ خوب گھوموں

☆۱۰۸۔ اجمالاً یہ قصہ یوں ہے کہ تہران یونی ورسٹی میں استادِ اُردو کی اسامی کے لیے جملہ امیدواروں میں تحسین فراقی صاحب کا نام سرِفہرست تھا، توقع تھی کہ ان کا تقرر ہو جائے گا مگر کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ منظور حسین یاد صاحب، تقرر کا پروانہ لے کر تہران چلے گئے ہیں حالاں کہ وہ امیدواروں میں شامل ہی نہ تھے۔ چند ماہ بعد یاد صاحب واپس آگئے۔ یہ اسامی ۶.۵ برس تک خالی پڑی رہی اور اُردو کے طالب علم استاد سے محروم رہے تا آنکہ فراقی صاحب کو جنوری ۲۰۰۵ء میں تہران بھیجا گیا۔

☆۱۰۹۔ معین صاحب نے اسے ''نسخۂ خواجہ'' کے نام پر پیش کیا تھا، اس ''فساد'' کی تفصیل ''محاکمہ، دیوان غالب نسخۂ لاہور (مسروقہ)'' مرتبین: پروفیسر جعفر بلوچ + رفاقت علی شاہد، علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۱ء میں دیکھی جا سکتی ہے۔

پھروں مگر شکستہ پائی راہ کی دیوار بن جاتی ہے۔ میری یہ کیفیت میرے اس شعر میں دیکھیے:

اک ایسا شخص بھی دائم سفر میں رہتا ہے
جو قید اپنے ہی دیوار و در میں رہتا ہے

اور یہ واقعہ ہے کہ میں دائم سفر میں رہتا ہوں۔

عزیزی رفاقت وسط ستمبر تک قرار کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں آپ آجاتے تو اچھا رہتا۔ میرے کتب خانے کی سیر میں، خصوصاً مکرر کتابوں کے ذخیرے تک رسائی میں وہ بہت معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔☆۱۱۰

ستمبر کے آخر یا اکتوبر کے شروع میں اسلام آباد کا پروگرام ہے۔ ایک ضروری میٹنگ میں شرکت کرنی ہے جسے میں آپ کی آمد کے خیال سے ملتوی کرتا رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اسلام آباد جانا ہوگا تو لاہور کا پھیرا بھی لازماً ہوگا۔ خدا کرے تحسین فراقی صاحب اور اورنگ زیب صاحب اُس وقت تک وہاں ہوں۔ ان دونوں کے بغیر تو پورا لاہور میرے لیے منصورہ بن جائے گا کیوں کہ صرف آپ کا وقت ضائع کروں گا۔

آپ کے دونوں شاگرد آئے تھے۔ ایک ایک ملاقات رہی۔ رؤف امیر مجھے زیادہ کارگزار نظر آئے۔☆۱۱۱

بیگم آفتاب اقبال نے ایک اور کتاب لکھی ہے۔ خاصی ضخیم — "علامہ اقبال اور اُن کے فرزندِ اکبر"۔ میں نے سب دوستوں کے لیے اس کا ایک ایک نسخہ حاصل کر لیا ہے۔ رفاقت کے ہاتھ بھیجوں گا۔ ایوب صابر صاحب سے بھی کہیے، وہ یہ کتاب نہ خریدیں۔ انھیں بھی پیش کردوں گا۔ مجھ سے بھی "دیوان" پر مضمون لکھنے کی فرمائش ہے۔☆۱۱۲ میں نے جواب میں اپنے خدشات لکھ بھیجے۔ اُنھوں نے یہ تو تسلیم نہیں کیا کہ اُن کا نسخہ، وہی گم شدہ نسخہ ہے، مگر یہ لکھا ہے کہ میں یہ نسخہ پنجاب یونی ورسٹی کو تحفۃً پیش کردوں گا۔ اسی کو کہتے ہیں عطائے تو بہ لقائے تو۔

آپ کا خیر اندیش۔
مشفق خواجہ ۲۵۔۸۔۹۹ء

☆۱۱۰۔ کراچی نہ جاسکا، اس محرومی کی تلافی کبھی نہ ہو سکے گی۔

☆۱۱۱۔ راقم کی نگرانی میں ہارون الرشید تبسم (استاد اردو، گورنمنٹ اقبال مسلم کالج سرگودھا) ایم اے جلیس پر اور عبدالرؤف امیر (استاد اردو، ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ) رفیق خاور پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیق کر رہے تھے۔ لوازمے کی تلاش میں دونوں کراچی گئے تھے اور وہاں منجملہ دیگر اصحاب کے خواجہ صاحب سے بھی ملے تھے۔ اب دونوں اصحاب ڈگریاں حاصل کرکے "ڈاکٹر" ہو چکے ہیں۔

☆۱۱۲۔ "دیوانِ غالب" کے اُس نسخے کا ذکر ہے جسے معین صاحب نے "نسخۂ خواجہ" کا نام دے کر پیش کیا تھا۔ معین صاحب نے بہتوں سے (جن میں راقم آثم بھی شامل ہے) فرمائش اور اصرار کرکے مضامین لکھوائے تھے، جنھیں "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحسین" (مرتبین: معراج نیر زیدی، ندیم سید) الوقار پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا تھا۔

☆

(۳۰)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

معلوم نہیں، آپ کی آواز میں کیا جادو تھا کہ ۱۱؍جنوری کی رات کو فون پر آپ سے بات کرنے کے بعد میری طبیعت سنبھلنا شروع ہوگئی اور آج میں خدا کے فضل و کرم سے پوری طرح صحت مند ہوں، بلکہ کل ہی سے طبیعت اس قدر ٹھیک تھی کہ میں نے معمول کے مطابق کام شروع کر دیا۔ پہلا خط کل رشید حسن خاں صاحب کو لکھا تھا اور دوسرا آج آپ کو لکھ رہا ہوں کہ آپ کی مسیحا نفسی کا شکریہ ادا کرسکوں۔ لاہور کے دوست کتنے خوش نصیب ہیں کہ وہ جب چاہیں آپ سے مل سکتے ہیں اور آپ سے باتیں کر سکتے ہیں۔ اس بیماری میں تکلیف اتنی زیادہ رہی کہ زندگی کی ہر چیز بے کار معلوم ہوتی تھی اور پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ خدا کی سب سے بڑی نعمت صحت ہے اور اس کی قدر کرنی چاہیے۔ لیکن میں نے اس کا کبھی خیال نہیں کیا۔ آئندہ کے لیے سبق حاصل ہوا کہ بے اعتدالیوں کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے مگر زندگی ہی کتنی باقی رہ گئی ہے کہ بے اعتدالیوں کے خوف سے چال چلن درست کرلیا جائے۔ ہاں تحسین فراقی صاحب سے کہہ دیجیے کہ انھیں ابھی دیر تک کام کرنا ہے، اس لیے اندلس جا کر محتاط رہیں☆[۱۱۳] اور کوئی ایسی بات نہ کریں جس کا نتیجہ ویسا ہی بُرا ہو جیسا اندلس کے مسلمان حکمرانوں کے سامنے آیا۔ ہم نے علم کی سلطنت تحسین صاحب کو بخش رکھی ہے، اسے وہ اپنی خوش اعمالیوں سے روبہ زوال نہ ہونے دیں اور وہاں کے جلوؤں میں گم ہو کر ہمیں بھول نہ جائیں۔ میرا خیال ہے کہ تحسین صاحب کی نگرانی کے لیے دوستوں میں سے کسی کو ساتھ جانا چاہیے مگر اورنگ زیب صاحب کو نہیں☆[۱۱۴] کہ وہ کم عمر ہیں اور اُن کے خود بہک جانے کا اندیشہ ہے۔ جو شخص بے پیے ہی نشے میں رہتا ہو، اُس کی ''مستی'' سے خدا محفوظ رکھے۔

معاف کیجیے اورنگ زیب صاحب کے ساتھ میں بھی بہک گیا حالاں کہ اس وقت ایک نہایت افسوس ناک خبر آپ تک پہنچانی ہے، جس کی اطلاع مجھے خود ایک گھنٹا پہلے ملی ہے۔ بنگلہ دیش سے ایک دوست شام بارک پوری☆[۱۱۵] صاحب کا خط آیا ہے کہ ۲۳؍دسمبر ۱۹۹۹ء کو ڈھاکا میں ڈاکٹر ابو سعید نور الدین کا انتقال ہوگیا۔ اس کا الم ناک پہلو یہ ہے کہ اُن کے اہلِ خانہ ملک سے باہر تھے اور انتقال کے وقت کوئی اُن کے پاس نہ تھا۔ حق مغفرت کرے کہ وہ بہت عمدہ انسان تھے۔ میری اُن سے چالیس برسوں کی دوستی تھی۔ وہ کراچی یونی ورسٹی کے پہلے پی ایچ ڈی تھے۔ اُن کے اصل نگراں مولوی عبدالحق تھے، بعد میں کاغذی نگراں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ہوئے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد خط کتابت رہتی تھی اور جب

☆۱۱۳۔ اندلس کی ایکانتے یونی ورسٹی میں نو تشکیل ''اقبال و پاکستان اسٹڈیز چیئر'' پر تحسین صاحب کا تقرر ہوگیا تھا اور وہ اس نئی ذمہ داری پر جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ مگر افسر شاہی کی طرف سے گوناگوں رکاوٹوں کے سبب وہ نہ جاسکے۔

☆۱۱۴۔ ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر۔

☆۱۱۵۔ شام بارک پوری: بنگلہ دیشی اردو افسانہ نگار۔

کبھی وہ کراچی آتے تھے، ملاقات ہوتی تھی۔ آخری ملاقات ۱۲ر نومبر ۱۹۹۶ء کو ہوئی تھی جب وہ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور یا اسلام آباد آئے تھے اور واپسی پر کراچی ٹھہرے تھے۔ ازراہِ کرم اس کی اطلاع ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو دے دیجیے۔ اس سلسلے میں ایک زحمت بھی کرنی ہوگی۔ مرحوم کے بارے میں ایک خبر لاہور کے اخباروں میں چھپوا دیجیے تاکہ اُن کے سب دوستوں کو علم ہو جائے۔ خبر کی نقل مجھے بھجوا دیجیے تاکہ کراچی کے اخبارات میں چھپوا سکوں۔ ان کے حالات آپ کو اقبال صدی کے بروشر میں مل جائیں گے۔ ان کی آخری کتاب "اُردو ادب کی تاریخ" ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اپنے ادارے سے دو جلدوں میں شائع کی ہے۔☆۱۱۶

"تفہیم و تجزیہ" اور "خطباتِ رسولؐ" کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ مضامین کا مجموعہ نہایت عمدہ ہے اور سارے مضامین بہت کام کے ہیں۔ اس دوران میں وہ کتابیں بھی مل گئیں جو آپ نے لاہور میں عنایت فرمائی تھیں (فرحت اللہ بیگ وغیرہ)۔ آپ کی چار کتابیں انجمن ترقیِ اُردو کے کتب خانۂ خاص میں داخل کر دی ہیں (فرحت اللہ بیگ، تفہیم و تجزیہ، خطبات، تصانیفِ مودودی)☆۱۱۷ ان چاروں پر "قومی زبان" میں تبصرہ بھی آ جائے گا۔

سید محمد نبی والی کتاب (پیشۂ وکالت ـــ) میں آپ کو بھیج دوں گا۔ آپ اس سے اپنے کام کی چیزیں لے کر واپس کر دیجیے گا۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں جھنڈیر کا پروگرام نہایت مناسب رہے گا۔ لیکن آپ کی طرف سے حتمی فیصلہ چاہیے تاکہ سفر کے انتظامات کیے جا سکیں۔ ازراہِ کرم جعفر بلوچ صاحب☆۱۱۸ اور اورنگ زیب صاحب سے بات کر کے مطلع فرمائیے تاکہ میں جھنڈیر والوں سے بات کر لوں۔ ہوگا یوں کہ میں یہاں سے اور آپ تینوں حضرات لاہور سے ملتان پہنچیں گے۔ وہاں سے ہم جھنڈیر جائیں گے۔ پروگرام ایسا ہوگا کہ ایک دن اوچ میں اور ایک دن بہاول پور میں گزاریں گے۔ یہ دو دن لازماً ہمارے پروگرام میں شامل ہونے چاہئیں۔ "حتمی فیصلے" سے مراد تاریخوں کا تعین ہے۔☆۱۱۹

☆۱۱۶۔ ڈاکٹر ابو سعید نور الدین کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "اسلامی تصوف اور اقبال"، اقبال اکادمی پاکستان سے متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ ان کی "اُردو ادب کی تاریخ" مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور سے دو جلدوں میں چھپی تھی۔

☆۱۱۷۔ یہ چار کتابیں حسبِ ذیل تھیں:

ا۔ مضامین فرحت اللہ بیگ (انتخاب و مقدمہ) القمر انٹرپرائزز لاہور، ۱۹۹۹ء

ب۔ تفہیم و تجزیہ (تحقیقی تنقیدی مضامین) فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۹۹ء

ج۔ خطباتِ رسولؐ (منتخب خطبوں کا ترجمہ) منشورات لاہور، ۱۹۹۹ء

د۔ تصانیفِ مودودی (توضیحی کتابیات) ادارہ معارفِ اسلامی لاہور، ۱۹۹۹ء

☆۱۱۸۔ پروفیسر جعفر بلوچ (پ: ۲۷ر جنوری ۱۹۴۷ء) شاعر، ادیب اور نقاد، حال استاد شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج سائنس، وحدت روڈ لاہور۔

۱۱۹۔ جھنڈیر لائبریری (میلسی) جانے کا پروگرام بالآخر اپریل ۲۰۰۰ء میں روبہ عمل آسکا۔ خواجہ صاحب کراچی سے براستہ ملتان اور تحسین فراقی اور اورنگ زیب عالم گیر لاہور سے براہِ راست وہاں پہنچے۔ افسوس ہے راقم وہاں نہ جا سکا اور خواجہ صاحب اور دیگر دوستوں کی چند روزہ صحبت سے محروم رہا۔

''کتاب نما'' کئی ماہ سے میرے پاس نہیں آرہا۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۲۵۔۸۔۹۹ء

☆

(۳۱)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

اب کے آپ نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو کسی زمانے میں محترم قاضی حسین احمد صاحب نے پوری قوم کے ساتھ کیا تھا۔ ہر طرف ''قاضی آوے ای آوے'' کا نعرہ گونج رہا تھا، لیکن دور دور تک اُن کے آنے کے آثار نہیں تھے۔ جھنڈیر کا پروگرام آپ کے ایما پر بنایا گیا، تاریخ آپ کی مرضی سے مقرر کی گئی، باقی سب آگئے، آپ ہی نہ آئے۔ حضرت فراقی بھی آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش میں تھے، لیکن میری دھمکی کارگر ہوگئی کہ اگر آپ نہ آئے تو میں ہوائی سفر کے ساڑھے چار ہزار روپے آپ سے وصول کروں گا۔ افسوس کہ فون پر آپ سے رابطہ نہ ہوسکا اور اب تو جی چاہتا ہے کہ آپ سے بہ طور ہرجانہ دُگنی رقم وصول کی جائے۔ آپ سے ملنے کے لیے میں ہی نہیں، میزبان بھی بے قرار تھے۔☆[۱۴۰] انھوں نے آپ کی تمام تصانیف ایک جگہ جمع کر دی تھیں کہ ان پر آپ سے دستخط کرائیں گے۔ آپ کے نہ آنے کا افسوس اُس وقت زیادہ ہوا، جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کے نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کو صدور شعبہ کی ایک میٹنگ میں شرکت کرنی تھی۔ جناب آپ جھنڈیر آتے تو وہاں آپ کو صدر الصدور کی مسند پر بٹھایا جاتا اور ہم چاروں آپ کے حاشیہ نشین ہوتے۔

آپ نے جھنڈیر تشریف نہ لا کر میرا ہی نہیں، اپنا بھی نقصان کیا۔ ایسا عظیم الشان ذاتی کتب خانہ پاکستان میں کوئی دوسرا نہیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں اور ان میں بہت سی ایسی جو نوادرات کا درجہ رکھتی ہیں۔ اقبالیات کا شعبہ بھی خاصا باثروت ہے۔☆[۱۴۱]

آپ سے مجھے دلی محبت ہے، مگر کتنی؟ اس کا احساس جھنڈیر جا کر ہی ہوا۔ وہاں ہر وقت آپ یاد آتے تھے۔ آپ کی کمی بے حد محسوس ہوتی تھی۔ باقی تینوں تو حال مست تھے، انھیں کوئی پروا ہی نہیں تھی کیوں کہ وہ لاہور ہر روز آپ سے ملتے ہیں۔

آپ کے نہ آنے پر تو حیرت تھی ہی، مزید حیرت اس پر ہے کہ آپ نے میری دل جوئی کے لیے کوئی خط بھی نہیں لکھا۔

☆۱۴۰۔ میزبان میاں مسعود احمد صاحب تھے۔ لائبریری انھی کے ذوق اور کاوشوں سے مرتب ہوئی ہے۔ راقم کے ذخیرۂ کتب کا کچھ حصہ بھی یہاں محفوظ ہے۔ چند ماہ پہلے ''قومی زبان'' کراچی میں جھنڈیر لائبریری میلسی پر مفصل تعارفی مضمون (از ڈاکٹر عبدالستار نیازی) شائع ہوا تھا۔

☆۱۴۱۔ میاں مسعود احمد صاحب بارہا دعوت دے چکے ہیں مگر تاحال ایسے عظیم الشان کتب خانے کی زیارت سے محروم ہوں۔ جھنڈیر کے سفر کا عزم راسخ ہے۔ دیکھیے کب پورا ہوتا ہے۔

خدا آپ کو خوش و خرم اور صحت مند و توانا رکھے۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۵۔۴۔۲۰۰۰ء

☆

(۳۲)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کا خط ملا، آپ کی مصروفیات کی تفصیل جان کر خوشی ہوئی۔ انسان کو مصروف ہی رہنا چاہیے۔ صحت و سلامتی کا راز اسی میں ہے۔ میری رائے میں تو علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کو بند ہی ہو جانا چاہیے۔ اس کا کلوز ہونا اوپن ہونے سے بہ درجہا بہتر ہے۔ اس یونی ورسٹی نے اعلیٰ ڈگریوں کو جس طرح سہل الحصول بنایا اور تعلیم کے نام پر جہالت کو فروغ دیا ہے، اُس سے ہماری بڑی رسوائی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان سے باہر اس یونی ورسٹی کی ڈگری کو نہ صرف یہ کہ تسلیم نہیں کیا جاتا، بلکہ حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ادارۂ تالیف و ترجمہ کی نظامت بھی اب آپ کے ذمے ہے۔☆۱۲۲ اس ادارے کے اغراض و مقاصد سے آگاہی ہو جائے تو میں یقیناً کچھ تجاویز پیش کر سکتا ہوں۔ جہاں تک "سیرِ افلاک" کی اشاعت کا خیال ہے تو میرے نزدیک یہ تجویز مفید نہیں ہے۔ یہ کتاب آوٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہے۔☆۱۲۳ سائنس کی کتابیں وقت گزرنے کے ساتھ اشاعتِ ثانی کے لائق نہیں رہتیں۔ مجھے اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ دوسروں کے شائع کردہ کاموں کو آپ دوبارہ شائع کریں۔ انجمن کی اصطلاحات پر نظرِ ثانی کی گئی تھی اور یہ تمام اصطلاحات اُردو سائنس بورڈ لاہور نے شائع کر دی تھیں۔ ان کی مزید اشاعت نامناسب ہوگی۔ آپ کا جواب آنے پر میں کوشش کروں گا کہ کوئی نادر چیز اشاعت کے لیے حاصل کر سکوں۔

آپ کہتے ہیں کہ شعبے میں ۱۹ اساتذہ تھے اب صرف چار ہیں۔ یہ شعبہ کیسے چلائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اکیلے عالم گیر صاحب ہی پورا شعبہ چلا سکتے ہیں، چار تو بہت زیادہ ہیں۔☆۱۲۴

شعبۂ اُردو کی تاریخ ضرور لکھوائیے۔ میرے خیال میں یہ ایک مفید کام ہوگا۔ زاہد منیر عامر ہی

☆۱۲۲۔ ادارۂ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونی ورسٹی کا ایک علمی و تحقیقی ادارہ ہے۔ بالعموم شعبۂ اُردو کا سربراہ یا کوئی سینئر استاد اس کا ناظم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور سید وقار عظیم کے دورِ نظامت میں ادارے نے اصطلاحات کے تراجم اور سائنسی مضامین کی بہت سی مفید کتابیں شائع کیں۔ راقم نے اپنے مختصر دورِ نظامت میں (مئی ۲۰۰۰ء۔ ۶؍ جولائی ۲۰۰۱ء) میں ادارے کا جمود توڑنے اور اسے فعال و متحرک کرنے کی اپنی سی کاوش کی، متعدد منصوبے بنا کر پیش کیے مگر کچھ پیش نہ گئی۔ اس دور میں جامعہ کے سربراہ ایک سابق جرنیل تھے۔

☆۱۲۳۔ خیال تھا "سیرِ افلاک" دوبارہ چھاپی جائے جو کسی زمانے میں انجمن ترقی اُردو پاکستان نے شائع کی تھی۔

☆۱۲۴۔ انیس نہیں، میں نے خط میں لکھا تھا کہ ایک وقت شعبۂ اُردو میں نو اساتذہ تھے۔ میرے زمانۂ صدارت میں چھ اساتذہ رہ گئے تھے (تحسین فراقی، فخر الحق نوری، اورنگ زیب عالم گیر، زاہد منیر عامر، محمد کامران اور راقم) سفرِ جھنڈیر کے دنوں میں فقط چار۔

اس کام کے لیے موزوں ہوسکتے ہیں۔ اُن کے پاس نظر بھی اور فہم بھی۔ اُنھوں نے ایچی سن کالج کے بارے میں بہت عمدہ مضمون لکھا تھا۔ آپ اُنھیں آمادہ کیجیے۔ ویسے اس شعبے میں ایک ریسرچ آفیسر تو آپ کو رکھنا ہی پڑے گا۔[۱۲۵]

جی ہاں، جھنڈیر میں میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ دراصل خالص دودھ، خالص گھی اور خالص اجناس مجھے راس نہیں آئیں۔ زندگی بھر جعلی اور بناپتی اغذیہ پر گزارا کیا ہے، معدہ اب خالص چیزوں کو قبول نہیں کرتا۔ آپ کے وہاں نہ آنے کا اب تک قلق ہے۔ آپ ہوتے تو وہاں کے قیام کا لطف دوبالا ہوجاتا۔

تحسین فراقی صاحب کے مقالے کی خوب دھوم ہے۔[۱۲۶] معین الرحمٰن نے اپنا رسالہ الموسوم بہ عذرِ لنگ بڑے پیمانے پر تقسیم کیا۔ جو اُسے دیکھتا ہے، تحسین صاحب کے مقالے کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ کل کے اخبار "ڈان" میں انتظار حسین نے کالم لکھا ہے جو تحسین صاحب کے حق میں ہے۔ اس کا عکس بھیج رہا ہوں۔ یہ اُنھیں دے دیجیے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے بات ہوئی۔ اُنھوں نے بتایا کہ لاہور میں ڈاکٹر سلیم اختر وغیرہ نے یہ اُڑا دی ہے کہ تحسین صاحب سے مضمون مشفق خواجہ نے لکھوایا ہے اور ڈاکٹر وحید قریشی تقسیم کررہے ہیں۔ یہ ہم دونوں پر اتہام ہے۔ تخریبی کاموں کے لیے تحسین صاحب خود ہی آمادہ رہتے ہیں، کسی دوسرے کو اُنھیں بھڑکانے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے اُنھوں نے معین صاحب کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ خود تو لکھا ہی تھا، اب دوسرے بھی لکھ رہے ہیں۔ سنا ہے کہ کراچی میں ایک صاحب پمفلٹ شائع کررہے ہیں جس میں تحسین و معین کے فرمودات پر محاکمہ ہے۔ دوچار اخباری کالم بھی شائع ہونے والے ہیں۔ ان سب "معین آزار" تحریروں کا گناہ تحسین صاحب کے سر جائے گا۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ آج کل معین صاحب کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے۔ "فتحِ دین" بھی سنا ہے، بہت بیمار ہے۔ وہ کہتا ہے، میں نے تو صرف پنجاب یونی ورسٹی کی مہر پر اپنے نام کی چیپی لگائی تھی، اتنے معمولی جرم کی سزا اتنی شدید بیماری کی صورت میں کیوں مل رہی ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۵۔۶۔۲۰۰۰

پچھلے دنوں رسالہ "شاعر" کے پرانے پرچے دیکھ رہا تھا کہ مولانا ماہر القادری کا ایک خط نظر آیا۔ اس میں بعض اہم معلومات ہیں۔ اس کا عکس منسلک ہے۔ یہ ازراہِ کرم ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کو دے دیجیے اور اُنھیں یہ بھی بتا دیجیے کہ "شاعر" میں مولانا کی بے شمار تحریریں شائع ہوئی ہیں۔

---

[۱۲۵]۔ شعبۂ اردو کی تاریخ لکھوانے کا خیال آیا۔ جیسا کہ خواجہ صاحب نے لکھا ہے: زاہد منیر ہی اس کے لیے موزوں تھے (اور اب بھی وہی موزوں ترین ہیں) مگر وہ آمادہ نہ ہوئے۔ ایچی سن کالج پر ان کا متذکرہ مضمون اب "چار موسم، ایچی سن کالج میں" کے نام سے ملک اینڈ کمپنی کے زیرِ اہتمام کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔

[۱۲۶]۔ "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ۔ اصل حقائق" ۲۰۰۰ء۔

☆

(۳۳)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کے کئی خط پے در پے ملے۔ عنایت کی اس بارش کے لیے ممنون ہوں۔ آپ کے ان خطوں سے کئی تازہ اطلاعات ملیں نیز آپ کی مصروفیات کا اندازہ ہوا۔ حافظ محمود شیرانی سے متعلق مجلّہ چھاپنے کا خیال بہت عمدہ ہے مگر آپ نے مقالہ نگاروں کو جو مہلت دی ہے، وہ بہت کم ہے۔ اتنے عرصے میں تو بقول غالب، لپٹا ہوا بستر بھی نہیں کھولا جاسکتا، مقالہ کون لکھے گا۔ ڈاکٹر نذیر احمد (دہلی، علی گڑھ) نے ''یادگار نامہ، قاضی عبدالودود'' شائع کیا ہے، اس میں پانچ برس صرف ہوئے ہیں۔ آپ نے جن اہلِ علم کو خطوط روانہ کیے ہیں، ان کے علاوہ کوئی میری نظر میں ایسا نہیں ہے کہ اُسے مقالہ لکھنے کے لیے کہا جائے۔ ہاں اگر آپ تنقید نگاروں کو بھی شایانِ التفات سمجھیں تو کئی لکھنے والے ہاتھ آسکتے ہیں۔ میری رائے میں معیاری مجموعے کے لیے کم از کم ایک سال کی مدت تو لازماً درکار ہوگی۔☆۱۲۷

آپ نے اپنے پچھلے ایک خط میں ادارۂ تالیف و ترجمہ کے لیے کوئی مسودہ طلب کیا تھا۔ اس دوران ایک صاحب باقر نقوی سے ملاقات ہوئی۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کی کتاب الفریڈ نوبیل کے بارے میں اُردو سائنس بورڈ نے چھاپی ہے۔ اُنھوں نے کلوننگ اور DNA کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں ان سے یہ مسودہ لے کر آپ کو بھیج دوں یا کہوں کہ وہ آپ سے رابطہ کریں۔☆۱۲۸

ٹھوکر نیاز بیگ سے آگے چلے جانے والے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی باتوں کو آپ نے خوب قلم بند کیا۔☆۱۲۹ ان میں نادر معلومات ہیں۔ آپ کم از کم مہینے میں ایک بار اُن سے ضرور ملیے اور ٹیپ ریکارڈ سامنے رکھ کر گفتگو کیجیے۔ یقین ہے کہ اس طرح بہت سی معلومات محفوظ ہوجائیں گی۔ جس

☆۱۲۷۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں (پ: ۱۸/ جولائی ۱۹۴۸ء) کے زمانۂ صدارت میں، شعبۂ اُردو کو یونی ورسٹی سے کچھ ریسرچ گرانٹ ملی تھی۔ طے ہوا کہ شعبے کے مرحوم اساتذہ کی یاد میں چند یادگاری جلدیں مرتب و شائع کی جائیں۔ محمود شیرانی، سید عبداللہ، عبادت بریلوی، وقار عظیم اور سجاد باقر رضوی کے لیے جلدوں کی تیاری کا کام مختلف اساتذہ کو سونپا گیا۔ شیرانی پر جلد کی ذمہ داری راقم اور زاہد منیر عامر کو تفویض ہوئی۔ یہاں اس کا ذکر ہے۔ متذکرہ جلد ہم نے ''ارمغانِ شیرانی'' کے نام فروری ۲۰۰۲ء میں شائع کر دی تھی۔ باقی جلدیں ابھی تک نہیں چھپ سکیں۔

☆۱۲۸۔ چوں کہ ادارۂ تالیف و ترجمہ بالکل بے اختیار تھا اس لیے یہ تجویز بھی روبہ عمل نہ آسکی۔

☆۱۲۹۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اپنی قدیمی رہائش (این ۱۲۹ سمن آباد) ترک کرکے ٹھوکر نیاز بیگ سے بھی آگے ۲۱۵، ای ای ایم ای کالونی میں جا مقیم ہوئے۔ اس حوالے سے ان دنوں وہ اپنے ہر ملاقاتی کو اپنا یہ شعر سنایا کرتے تھے:

چکر تھا ایک پاؤں میں، بھاگے چلے گئے
ٹھوکر نیاز بیگ سے آگے چلے گئے

انھی دنوں کی ایک ملاقات میں، راقم نے شعر کے ساتھ ان کی کچھ گفتگو بھی قلم بند کرکے خواجہ صاحب کو ارسال کی تھی۔

زمانے میں ڈاکٹر صاحب کراچی میں تھے، میں نے اُن سے کہا تھا کہ جن شخصیات سے اُن کے تعلقات رہے ہیں، اُن سے متعلق اپنی یادداشتیں قلم بند کر ڈالیں۔ تقریباً چالیس شخصیات کی ایک فہرست بھی بنائی تھی، مگر افسوس کہ اُنھوں نے کسی ایک پر بھی نہیں لکھا۔ بیماری، اقبال اکیڈمی اور مقتدرہ کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے تقریباً ۲۵ برس ضائع ہو گئے۔ اُن کا سارا علمی و تحقیقی کام ۲۵ برسوں سے پہلے کا ہے۔ اس دوران میں نے اُن سے بارہا کہا کہ میر حسن والے مقالے پر نظرِ ثانی کریں تاکہ اسے چھپوایا جا سکے مگر وہ اس کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ ڈاکٹر صاحب جیسا باکمال آدمی ہمارے ملک میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو کہ بہ یک وقت اُردو ادب، فارسی ادب، تاریخ برصغیر اور تحریکِ پاکستان پر اُن کی گہری نظر ہے۔ کاش وہ اپنے اصل کام کی طرف لوٹیں۔ ممکن ہے آپ کی بات چیت سے وہ دوبارہ علمی طور پر فعال ہو جائیں۔ خدا اُن کو صحت اور طویل عمر سے نوازے اور وہ اپنے نامکمل کاموں کو مکمل کر سکیں۔

......................(چند سطور حذف ہیں)

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کا دفتری کاموں کا تجربہ خوش گوار رہا۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ دفتری کاموں کے نتیجے میں اکثر لوگ ناخوش ہو جاتے ہیں اور پھر ذہنی دباؤ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ خدا آپ کو اس سے محفوظ رکھے۔ کوشش کیجیے کہ دفتری کاموں سے چھٹکارا حاصل ہو جائے، ورنہ آپ کی علمی سرگرمیاں متاثر ہوں گی[☆۱۳۰] آپ کا یہ خیال درست ہے کہ میں اس جنجال سے محفوظ رہا۔ حال ہی میں مجھے مقتدرہ کی صدر نشینی کی پیش کش ہوئی۔ بہت اصرار تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ میں ملازمت کا اہل ہی نہیں ہوں۔ میں نے خورشید رضوی صاحب کا نام پیش کیا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

''اُردو بک ریویو' مجھے آج تک نہیں ملا۔ آپ نے اس کا سالانہ چندہ کتنا ادا کیا ہے، مطلع فرمایئے تاکہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں[☆۱۳۱] اگر اس رسالے کے پچھلے شمارے بھی مل سکیں تو بہت اچھا ہو۔ ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی رسالہ نہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز کا ''نقطۂ نظر'' ہے، لیکن اس کی نظر بے حد کم زور ہے۔ مذہبی یا متعلقاتِ مذہب سے سروکار ہے۔ علمی کتابوں کو عموماً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ادبی کتابیں (شاعری، افسانہ) ضرور نظر انداز کریں لیکن ادب کے حوالے سے علمی تحقیق کو نظر انداز کرنا کوتاہ نظری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ رسالہ، باوجود عمدہ طباعت کے، کتابوں کی دنیا کے بارے میں، بہ حیثیت مجموعی، کوئی رہ نمائی نہیں کرتا۔

☆۱۳۰۔ یہ شعبۂ اُردو کی صدارت کی ذمہ داری تھی۔ اس کا آغاز یکم اپریل ۲۰۰۰ء کو ہوا تھا۔ اگلے برس جون میں راقم نے اپنی علالت (اور جراحت کے بعد، معالجین کی ہدایت) کے پیشِ نظر رئیس جامعہ سے درخواست کر کے اس ذمہ داری سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور اسی روز (۹ جولائی) سے تحسین فراقی نے یہ بارِ گراں خوشی خوشی اٹھا لیا۔

☆۱۳۱۔ لاہور میں ایک صاحب دلی سے چند پرچے منگاتے تھے۔ میں اُن کے ذریعے بہ شمول خواجہ صاحب، بعض دوستوں کو پرچہ بھجواتا تھا۔

سعید شیخ صاحب بہت محبت کرنے والے انسان ہیں، اور پھر میرے والد صاحب کے دوستوں میں سے ہیں۔ میری کوتاہی ہے کہ میں پچھلی مرتبہ لاہور گیا تو اُن سے نہیں ملا۔ اس سال کے آخر تک لاہور کا پروگرام ضرور بنے گا۔ اب کے سب سے پہلے شیخ صاحب کے در دولت پر دستک دوں گا۔ لاہور آنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ سہیل عمر اقبال ایوارڈ کی میٹنگ بلائیں .....

علی گڑھ کا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' معلوم نہیں، آپ کی نظر سے گزرتا ہے یا نہیں۔ اس میں اسپین کا ایک سفرنامہ شائع ہوا ہے۔ اس کا عکس بھیج رہا ہوں۔ یہ آپ کی دل چسپی کی چیز ہے۔

قاضی محمد حسین یا تلمذ حسین (اس وقت صحیح نام یاد نہیں آ رہا) کا سفرنامہ اندلس☆[۱۳۲] اس لائق ہے کہ دوبارہ شائع ہو۔ کیوں نہ آپ اسے مرتب کر دیں۔ ایک دیباچہ اور جہاں ضرورت ہو وہاں حواشی آپ لکھ دیں۔ اس وقت ایک پبلشر میرے ہاتھ میں ہے، وہ اسے نہایت اہتمام سے شائع کر دے گا اور آپ کو معاوضہ بھی دے گا۔

.....آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ معین صاحب کے بڑے متین الرحمٰن مرتضٰی نے طاہر مسعود سے یہ کہا کہ تحسین فراقی نے مضمون خود نہیں لکھا، مشفق خواجہ نے لکھ کر دیا ہے☆[۱۳۳] ظاہر ہے یہ بات معین صاحب ہی نے بڑے بھائی سے کہی ہوگی۔ معلوم نہیں تحسین صاحب کے عشق میں مجھے اور کیا کیا کچھ سننا ہوگا۔

اچھا جناب اب اجازت دیجیے کہ ورق تمام ہوا، باقی مدح اگلے خط میں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۲۔۸۔۲۰۰۰ء

☆

(۳۳)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

معذرت خواہ ہوں کہ اب کے میں بھی آپ کا مقلد بن گیا یعنی خط کا جواب خاصی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ آج کل ''کلیات یگانہ'' کے حواشی کمپوز ہو رہے ہیں، انھیں فوراً پڑھنا ہوتا ہے۔ دو مرتبہ خواندگی کر چکا ہوں، اب تیسری مرتبہ پروف دیکھوں گا۔ باریک کتابت میں تین سو صفحات ہیں۔ ایک مشکل میں جان ہے۔

آپ کے سفرنامے کی اشاعت کے سلسلے میں عرض ہے کہ پبلشر آج کل ملک سے باہر ہے۔

☆۱۳۲۔ ''سفرنامۂ اندلس'' (۱۹۲۷ء) کے مصنف قاضی ولی محمد ہیں۔ بلاشبہ یہ اندلس کا نہایت عمدہ سفرنامہ ہے۔ افسوس ہے خواجہ صاحب کی تجویز پر عمل نہ کر سکا۔

☆۱۳۳۔ مراد ہے، کتابچہ: ''دیوان غالب: نسخۂ خواجہ، اصل حقائق''۔

وہ جب واپس آئے گا تو کراچی آ کر مجھ سے ملے گا۔ تب مسودہ اُس کے حوالے کروں گا۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ آپ قاضی صاحب کے سفرنامۂ اندلس پر کام جاری رکھیے۔ یہ آپ جس قدر جلد مکمل کریں گے، اُسی نسبت سے آپ کے سفرنامے کی اشاعت بھی جلد ہوگی۔ یہ پبلشر کتاب چھاپنے میں تاخیر نہیں کرتا۔ عام پبلشروں کے مقابلے میں تیز رفتاری سے کام کرتا ہے۔☆۱۳۴

امید ہے اب آپ پوری طرح صحت یاب ہو چکے ہوں گے اور کالج جانا شروع کر دیا ہوگا۔☆۱۳۵

''ارمغانِ شیرانی'' کے لیے مضمون لکھنے کو میرا جی بھی چاہتا ہے، مگر مذکورہ مصروفیت کی بنا پر شاید نہ لکھ سکوں۔ بہ ہر حال آپ کا حکم ہے، کچھ نہ کچھ کروں گا۔☆۱۳۶ ''اردو بک ریویو'' میرے پاس آنا شروع ہوگیا ہے۔ اب تک دو شمارے آ چکے ہیں۔ مگر جناب یہ رسالہ دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی، نہایت معمولی قسم کی کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ایک سے ایک عمدہ علمی کتاب شائع ہو رہی ہے مگر ان لوگوں کو کچھ علم نہیں۔ پھر مذہبی کتابوں پر زیادہ زور ہے، اور وہ بھی ایسی جو تبلیغی مقاصد کے لیے چھپتی ہیں اور پہلے بھی کئی بار چھپ چکی ہیں۔ یہی حال ہمارے اسلام آباد والے رسالے کا ہے جو اختر راہی مرتب کرتے ہیں۔ اس کے تبصرے دیکھ کر تو یہ لگتا ہے جیسے پاکستان میں صرف پمفلٹ چھپتے ہیں۔ اس قسم کا معیاری رسالہ صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو گروہ بندی سے بلند ہوں، اور کتابوں کی وصولی کا انتظار نہ کریں، کتابیں خرید کر اُن پر تبصرے کرائیں۔ ''اردو بک ریویو'' کے ستمبر اکتوبر کے شمارے میں ایک آپ بیتی ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' پر تبصرہ ہے۔ تبصرہ نگار نے کتاب میں شامل ستائش تحریروں کا ایک ایک جملہ نقل کر کے تبصرہ مکمل کر دیا ہے۔ بہ ہر حال ایک کام کی چیز نظر آ گئی اور وہ ہے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے بارے میں آپ کا مختصر مضمون۔ مرحوم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا، حالاں کہ وہ بہت اہم مصنف تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس مضمون کو قدرے بڑھا کر ''قومی زبان'' کے لیے مجھے بھیج دیں۔ آپ نے ''عروجِ اقبال'' کی بہ جا طور پر تعریف کی ہے۔ میری رائے میں ڈپٹی نذیر احمد پر اُن کا مقالہ بھی بے مثال ہے۔ برصغیر کی یونی ورسٹیوں کے پی ایچ ڈی کے دس مقالات کا انتخاب کیا جائے تو یہ اس میں ضرور شامل ہوگا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے، انسان بھی بہت عمدہ تھے۔☆۱۳۷

☆۱۳۴۔ خواجہ صاحب راقم کا سفرنامہ اندلس الحمرا، اسلام آباد سے شائع کرانا چاہتے تھے اور انھوں نے ناشر (شفیق ناز صاحب) سے بات بھی کر لی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ۶،۵ سفرنامے اکٹھے شائع کیے جائیں۔ اسی لیے انھوں نے مجھے قاضی ولی محمد کا سفرنامہ مرتب کرنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ میں نہ کر سکا۔ ادھر خواجہ صاحب اور ناشر کے درمیان ملاقات میں مہینوں کا وقفہ آیا۔ میں نے اپنا سفرنامہ واپس منگا کر لاہور سے شائع کرا دیا۔

☆۱۳۵۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء کی ایک شام سرِ راہ ایک موٹر سائیکل کی ٹکر سے کولہے کی ہڈی کو ضعف پہنچا، معالج کے حسبِ ہدایت ڈیڑھ ماہ کی طبی رخصت پر رہا، نومبر کے اوائل میں کالج جانا شروع کیا تھا۔

☆۱۳۶۔ خواجہ صاحب خود تو ''ارمغانِ شیرانی'' کے لیے مضمون نہ لکھ سکے۔ البتہ بھارت کے بعض اہلِ قلم کے مضامین ہمیں اُن کی معرفت حاصل ہوئے۔ ان کی تفصیل انھوں نے ۱۹؍ مارچ ۲۰۰۰ء کے خط میں بیان کی ہے۔

انجمن میں ادیب سہیل صاحب کے نام آپ کا کارڈ دیکھا۔☆۱۳۸ میں تو کتابت کی غلطیوں کی طرف انھیں متوجہ کر کر کے تھک گیا ہوں.... نومبر کے شمارے میں کم از کم دو جگہ فواکہات کو "فواکحات" لکھا ہے۔ میں نے اُن کو بتایا تو کہنے لگے، "اچھا، میں تو اسے بڑی ح سے سمجھتا تھا۔" اب بتائیے ایسے ظالم کا کیا کرے کوئی۔

"اُردو بک ریویو" کے دو سو روپے میری طرف ہیں۔ تھوڑی سی رقم اور صرف کر دیجیے۔ خرم مراد کی کتاب "لمحات" منصورہ سے شائع ہوئی ہے۔☆۱۳۹ اس کا ایک نسخہ پبلشر سے کہیے کہ میرے نام پوسٹ کر دے، رجسٹری سے۔ کتاب کی قیمت، "اُردو بک ریویو" کے چندے کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھجوا دوں گا۔ آپ کا شکریہ۔

تحسین صاحب سے کہیے رشید حسن خاں کی "املاے غالب" اگلے دو تین روز میں چھپ جائے گی۔ اس کا ایک غیر مجلد نسخہ میں انھیں فوراً بھیج دوں گا۔

کلوننگ والی کتاب تو اُردو سائنس بورڈ والے چھاپ رہے ہیں۔ البتہ ایک اور مسودہ بھجوا سکتا ہوں۔ آپ نے احمد الدین مارہروی مرحوم کا نام سنا ہوگا۔ عالم فاضل آدمی تھے۔ اُنھوں نے حیوانیات کا ایک ان سائی کلو پی ڈیا مرتب کیا تھا، بے شمار کتابوں سے استفادہ کر کے۔ اس میں ہر قسم کے حیوانات کے بارے میں انضباتی ترتیب سے معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اُردو میں ایسی عمدہ کتاب کبھی نہیں لکھی گئی، اگر آپ فرمائیں تو یہ مسودہ آپ کو بھجوایا جا سکتا ہے۔☆۱۴۰

عید کے بعد بہاول پور سنٹرل لائبریری اور جھنڈیر لائبریری جانے کا ارادہ ہے۔ کیا آپ ایک ہفتے کے لیے وقت نکال سکتے ہیں؟ اورنگ زیب صاحب میرے ساتھ ہوں گے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۱۔۱۱۔۲۰۰۰ء

☆

☆۱۳۷۔ اپنے مرحوم استاد ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (م: ۱۷ر جون ۲۰۰۰ء) پر میں نے ایک مختصر شذرہ لکھا تھا جو "اُردو بک ریویو" دہلی میں چھپا تھا، اس میں اضافہ نہ کر سکا۔ "عروجِ اقبال" (بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۷ء) پر قومی اقبال ایوارڈ مل چکا ہے۔ "نذیر احمد دہلوی: احوال و آثار" (مجلس ترقی ادب لاہور) صدیقی صاحب کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے۔ ان کی وفات پر شعبۂ اُردو کے اساتذہ نے ایک نشست میں طے کیا کہ دیگر مرحوم اساتذہ کے ساتھ، صدیقی صاحب کے لیے ایک یادگاری جلد مرتب کی جائے اور یہ کام میں نے اپنے ذمے لیا تھا، لیکن یہ منصوبہ بھی تاحال التوا کا شکار ہے۔

☆۱۳۸۔ میں نے ادیب سہیل صاحب کو "قومی زبان" کی بعض اغلاط املا و کتابت کی طرف متوجہ کیا تھا۔

☆۱۳۹۔ "لمحات" (منشورات لاہور، ۲۰۰۰ء) خرم مراد (۱۹۳۲ء۔۱۹۹۶ء) کی آپ بیتی ہے، جو میں نے خواجہ صاحب کو بھجوا دی تھی۔

(۳۵)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کے لیے مضامین تلاش کرنے میں خاصا وقت صرف ہوا۔ اگر یہ مضامین کسی ایک جگہ رکھے ہوتے تو فوراً بھیج دیتا۔ مگر درجنوں فائلوں اور ڈھیروں کاغذات کے انبار میں انھیں ڈھونڈ نکالنا ایسا ہی مشکل کام ہے جیسا آپ کے ساتھ جھنڈیر کا پروگرام بنانا۔ پچھلی مرتبہ آپ آتے آتے رہ گئے اور اس مرتبہ ہمیں جاتے جاتے روک دیا۔ بہ ہر حال بعد از خرابیِ بسیار چھ نہایت عمدہ مضامین بھیج رہا ہوں۔ یہ سب غیر مطبوعہ ہیں۔

''۱۔ مصحفی سے منسوب دو تذکرے'' از ڈاکٹر حنیف نقوی۔ نقوی صاحب نے یہ مضمون ''نقوش'' کے لیے بھجوایا تھا مگر ''نقوش'' کا عام شمارہ شاید ہی نکلے۔ لہٰذا مضمون آپ کو بھیج رہا ہوں۔ نقوی صاحب کو اطلاع کر دی ہے۔

۲۔ ''زخ ش کی شخصیت خطوط کے آئینے میں''۔ شاہ الحق حقی صاحب کو زخ ش کے غیر مطبوعہ خطوط مل گئے تھے۔ انھیں سامنے رکھ کر یہ مضمون لکھا گیا ہے۔

۳۔ ''مخطوطہ 'ہدیۃ المورخین' کا ایک ورق،'' ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری۔

۴۔ ''یہاں وہاں کا ارتقائی سفر'' از فرید احمد برکاتی۔ یہ فرید احمد برکاتی وہی ہیں جنھوں نے ''فرہنگِ میر'' مرتب کی ہے۔ پچھلے دنوں حکیم محمود احمد برکاتی صاحب ہندوستان گئے تھے۔ فرید صاحب (جو اُن کے قریبی عزیز ہیں) نے انھیں یہ مضمون دیا کہ پاکستان کے کسی جریدے میں چھپوا دیں۔ انھوں نے مجھے دیا۔ میں آپ کو پیش کرتا ہوں۔ میں نے حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کو فون پر اس کی اطلاع دی اور ساتھ ہی فرمائش کی کہ وہ ''ارمغانِ شیرانی'' کے لیے مقالہ عنایت فرمائیں۔ اتفاق سے حکیم صاحب نے حال ہی میں چار سال کی محنت کے بعد حکیم احسن اللہ خاں پر مقالہ مکمل کیا ہے اور وہ اب اسے صاف کر رہے ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ ایک ہفتے میں وہ یہ مقالہ عنایت فرما دیں گے۔ میں آپ کو بھیج دوں گا۔

۵۔ ''شاگردانِ رشک'' از ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔ یہ اپنے موضوع پر واحد مقالہ ہے۔ میں اسے ''اُردو'' میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اب یہ صحیح جگہ چھپے گا۔

۶۔ ''دیوانِ عطارد،'' مرتبہ خضر نوشاہی۔ یہ سندھ کی ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ پہلی مرتبہ یہ کلام چھپے گا اور پہلی مرتبہ ہی شاعر کا مفصل تعارف ہوگا۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس لیے نوشاہی صاحب نے مجھے دیا کہ کسی رسالے میں شائع کرا دوں۔

۱۴۰۔ خواجہ صاحب نے مذکورہ مسودہ بھجوا دیا تھا، مگر افسوس کہ ادارۂ تالیف و ترجمہ اسے شائع نہ کر سکا، چناں چہ مسودہ واپس خواجہ صاحب کو پہنچا دیا گیا تھا۔

آخری دونوں مقالے قدرے طویل ہیں، مگر موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ''ارمغان'' کے ۳۰، ۴۰ صفحات کے اندر آجائیں گے۔ چھوٹے چھوٹے خراب مقالے چھاپنے سے بہتر ہے کہ اچھے طویل مقالوں کے لیے گنجائش نکالی جائے۔

اگر کسی وجہ سے کوئی مقالہ آپ شائع نہ کرسکیں تو فوراً واپس کردیں۔[☆۱۴۱]

وہ جو حیوانیات سے متعلق کتاب میں نے بھیجی تھی، اُس کا کیا ہوا؟[☆۱۴۲]

مضامین کے ساتھ رسالہ ''غالب'' کے دو نسخے بھی بھیج رہا ہوں۔ ایک اعجاز بٹالوی صاحب کے لیے ہے اور دوسرا اکرام چغتائی صاحب کے لیے برادرم اورنگ زیب صاحب کے حوالے کردیجیے۔ انھوں نے پروفیسر عبدالشکور احسن کے مقالات کا مجموعہ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، یہ وعدہ انھیں یاد دلا دیجیے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے بھی اس کتاب کی فرمائش کی ہے۔ اُن کے لیے بھی ایک اعزازی نسخہ حاصل کیجیے۔ اگر آپ براہِ راست نہ بھیج سکیں تو مجھے عنایت کیجیے میں دوسری کتابوں کے ساتھ پوسٹ کردوں گا۔[☆۱۴۳]

اب ذرا دل تھام کے بیٹھیے۔ ایک نہایت دردناک مسئلے پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ سید معین الرحمٰن کے خلاف جو مہم چل رہی ہے، اگرچہ اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں، مگر اب پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے۔ موصوف بے حد پریشان ہیں۔ اتنے پریشان کہ انھیں اپنی موت کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ اُنھوں نے میرے نام ایک خط لکھا جس کی نقل منسلک کررہا ہوں[☆۱۴۴] ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خط پڑھ کر طبیعت بے چین ہوگئی۔ کسی بھی انسان کی اتنی پریشانی مجھ سے نہیں دیکھی جاسکتی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اب اُنھیں معاف کردیا جائے۔ تحسین فراقی صاحب لاہور والوں کو منع کرسکتے ہیں۔ آپ میرا یہ خط اور موصوف کا خط تحسین صاحب کو دکھائیے اور کہیے کہ وہ غصہ تھوک دیں۔ جس شخص کی حالت اتنی خراب ہوچکی ہو اسے معاف ہی کردینا چاہیے۔ فی الحال یہ سب کچھ میرے، آپ کے اور تحسین صاحب کے درمیان بہ صیغۂ راز ہونا چاہیے۔ اورنگ زیب صاحب کا مشورہ بھی حاصل کرلیجیے۔ موصوف کے اس خط کا کسی سے ذکر نہ کیا جائے۔ موصوف کے سب سے بڑے دشمن .....میں ہیں۔ اُن کو سمجھانے کے لیے

☆۱۴۱۔ خواجہ صاحب نے یہ سب مقالے ''ارمغانِ شیرانی'' کے لیے بھجوائے تھے۔ اکبر حیدری کاشمیری اور خضر نوشاہی کے مقالے شامل نہ ہوسکے اور واپس کردیے گئے۔ باقی چاروں شامل ہیں۔

☆۱۴۲۔ جیسا اوپر ذکر ہوا، مذکورہ کتاب (کا مسودہ) واپس خواجہ صاحب کو پہنچا دیا گیا تھا۔

☆۱۴۳۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن سابق صدر شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج لاہور، حال پروفیسر ایمریطس پنجاب یونی ورسٹی۔ ان کا متذکرہ بالا مجموعہ مقالات احسن'' (مرتبین: آفتاب اصغر + معین نظامی) شعبۂ فارسی اورینٹل کالج لاہور نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔

۱۴۴۔ یہ ۳ر مارچ کا خط ہے، جو کئی جگہ شائع ہوچکا ہے، مثلاً ڈاکٹر صدیق جاوید کی ''ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، تحقیق کے چراغ تلے'' (مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۰۵ء) ص ۳۶۱۔ یہ خط ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے توسط سے خواجہ صاحب کو بھیجا گیا اور اس کی نقول ادا جعفری، حسین مجروح، رشید حسن خاں اور کالی داس گپتا رضا کو۔

فرمان فتح پوری صاحب کوشش کر رہے ہیں۔ موصوف کے خط کے بین السطور سے ظاہر ہے کہ اُن کا یہ خیال ہے کہ اس سارے معاملے کو میری تائید حاصل ہے، اسی لیے اُنھوں نے میرے بعض کرم فرماؤں کو خط کی نقلیں بھیجی ہیں تا کہ وہ مجھ پر اثر ڈالیں۔ اس قسم کی بات کسی کو بھی مشتعل کرنے کے لیے کافی ہوسکتی ہے مگر مجھ سے کسی کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔ اس لیے میں موصوف کو معاف کرتا ہوں۔ اس سارے معاملے میں موصوف کا کردار مجرمانہ رہا ہے۔ وہ جس ذہنی اذیت سے گزر رہے ہیں، میرے خیال میں اتنی ''سزا'' کافی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ موصوف نے اپنے جوابی پمفلٹ میں تحسین صاحب کے کسی اعتراض کا جواب نہیں دیا اور گستاخانہ لب و لہجے میں بات کی ہے، مگر اب اُنھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ لہٰذا معاف کر دینا ہی بہتر ہے۔ اس سلسلے میں آپ جلد از جلد اپنی رائے لکھیے اور کوشش کیجیے کہ یہ قضیہ ختم ہو۔ میں معین صاحب کو خط لکھ رہا ہوں کہ میں اس قضیے کو ختم کرانے کی کوشش کروں گا۔

آپ کراچی کب آ رہے ہیں؟ عقیل صاحب لندن گئے ہیں۔ شاید اس مہینے کے آخر تک کراچی آئیں گے۔ ان کی موجودگی میں آپ کراچی آئیں تو اچھا ہے تا کہ آپ اُن کی شان دار لائبریری دیکھ سکیں۔ میں شاید اپریل کے مہینے میں لاہور کا رخ کروں۔ آپ کو اور تمام احباب کو پہلے سے اطلاع کردوں گا تا کہ کوئی لاہور سے بھاگنے کی کوشش کرنا چاہے تو کرلے۔

یکم اپریل کو پیر حسام الدین راشدی مرحوم کی برسی پر اُن کے بھتیجے حسین شاہ راشدی نے پیر صاحب کے نیاز مندوں کو اُن کی قبر پر لے جانے کا پروگرام بنایا ہے، اگر اس روز آپ یہاں ہوئے تو آپ کو ساتھ لے چلوں گا۔ اس طرح آپ ٹھٹھہ کا تاریخی مقام دیکھ سکتے ہیں۔[☆۱۳۵]

آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ دو کتابوں کی قیمت لکھی، تیسری کی نہیں۔ اب حساب بہ وقتِ ملاقات ہی ہوگا۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۱۹۔۳۔۲۰۰۱ء

☆

(۳۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

خداوند تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ ۱۱ر مارچ کو اپنے گھر واپس آ گیا۔[☆۱۳۶] زندگی معمول کے مطابق گزر رہی ہے۔ بس ذرا پرہیز، احتیاط اور آرام کا عنصر بڑھا دیا ہے۔ کام تو میں نے وہیں شروع

☆۱۳۵۔ افسوس ہے کہ میں کراچی نہ جا سکا اور ٹھٹھہ کے پروگرام میں شمولیت سے بھی محروم رہا۔

کردیا تھا، اب ذرا بہتر طور پر کر رہا ہوں کہ حوالے کی کتابیں جو وہاں نہیں تھیں، یہاں موجود ہیں۔

میں تو اس لائق نہ تھا، مگر آپ جیسے مخلصوں اور محبت کرنے والوں کی دعاؤں سے صحت یابی ہوئی ہے۔ دعا کیجیے کہ جو مہلت ملی ہے، اُس میں اپنے نامکمل کاموں کو مکمل کرسکوں اور کوئی ڈھنگ کا کام بھی کرسکوں۔

بیماری سے پہلے میں نے والد صاحب کا روزنامچہ کمپوزنگ کے لیے دے دیا تھا۔☆۱۴۷ یہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۸ء تک کی ڈائری ہے۔ تین سال تو مکمل ہیں، باقی سالوں کی ڈائری جزوی ہے۔ تقریباً پانچ سو صفحات ہیں۔ ان کے پروف پڑھنے کے علاوہ ایک دو اور کام بھی اُسی مکان میں مکمل کیے تھے جہاں میں بیماری کے بعد منتقل ہوگیا تھا۔ وہ مکان ایک خوب صورت علاقے میں ہے۔ میری قیام گاہ عین سمندر کے کنارے تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے بھائی بہن اُسی علاقے میں رہتے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتے تھے۔

بیماری کے دوران آپ نے متعدد مرتبہ فون کرکے میری ہمت بندھائی۔ میری صحت یابی کے اسباب میں آپ کا یہ کرم بھی شامل ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۶-۳-۲۰۰۴ء

☆

(۳۷)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اب آپ روبصحت ہیں۔ خداوند کریم آپ کو صحت مند و توانا رکھے کہ آپ اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کی صحت کا مقیاس ہیں۔ کم از کم میں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ آپ بیمار پڑ جاتے ہیں تو طبیعت میری بگڑ جاتی ہے۔

یہ بہت اچھا ہے کہ آپ فی الحال آرام کررہے ہیں۔ بیماری کا اصل علاج آرام ہی ہے۔ آپ نے اچھا کیا اورینٹل کالج کی تدریس کا سلسلہ ختم کردیا، ادارۂ معارفِ اسلامی کا بھی اتنا ہی کام کیجیے

☆۱۴۶۔ یہ خط، خواجہ صاحب کی طویل علالت کے بعد کا ہے۔ ان کی علالت کے دوران میں کبھی کبھار ٹیلی فون پر ان کی بیمار پرسی کرلیتا تھا۔

☆۱۴۷۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ عبدالوحید، علامہ اقبال کے قریبی احباب میں شامل تھے۔ اقبال سے ملاقاتوں اور ان کی صحبتوں کی روداد کا، غالباً ایک حصہ انھوں نے ''اقبال کے حضور'' کے عنوان سے ''نقوش'' اقبال نمبر ۱۹۷۷ء میں شائع کرایا تھا۔ مکمل روزنامچے کی اشاعت خواجہ صاحب کے پیشِ نظر تھی۔ وفات سے قبل، غالباً وہ اسے اشاعت کے لیے دے چکے تھے۔

جتنا اپنے آپ کو تھکائے بغیر کیا جا سکے۔ یہ ادارہ چوں کہ گھر کے نزدیک ہے، دوسرے خالص علمی ہے اور یہاں اورینٹل کالج جیسی فضا نہیں ہے، اس لیے اس سے وابستگی رہنی چاہیے۔☆۱۴۸

میری صحت، خدا کا شکر ہے، اطمینان کے لائق ہے۔ کام کی میز پر بیٹھتا ہوں تو بھول جاتا ہوں کہ دل ریزہ ریزہ لیے بیٹھا ہوں۔ آپ ہی کی طرح دوائیں اور دعائیں، دونوں ہی کام آرہی ہیں۔

کل رات میں نے رشید حسن خان صاحب کو فون کیا تھا۔ خیریت سے ہیں، مگر آواز سے نقاہت ظاہر تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال دو سال پہلے ہوگیا تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کا حال پوچھا تو اُن کی وفات کا ذکر کیا اور کہا کہ جب اُن کی ضرورت زیادہ تھی تو وہ چلی گئیں۔ اس جملے سے اُن کا شدید کرب ظاہر ہوتا ہے۔☆۱۴۹

اقبال اکیڈمی کی نئی کتابیں آئیں تو اُن میں ڈاکٹر گیان چند کی ابتدائی کلام والی کتاب بھی تھی۔☆۱۵۰ میں نے سہیل عمر صاحب سے کہا کہ اس سلسلے کی پہلی کڑی تو ''اقبال از احمد دین'' ہے، اُسے آپ شائع کیوں نہیں کرتے؟ وہ اس پر آمادہ ہیں۔ میرے لیے اس کتاب پر نظرِثانی کرنا ممکن نہیں۔ اگر مقدمے میں، میں نے کوئی بات غلط لکھی ہو تو آپ ''پس نوشت'' کے عنوان سے اس کی تصحیح کر دیجیے۔ یا احمد دین اور اس کی کتاب کے متعلق کوئی نئی بات آپ کے سامنے ہو تو وہ لکھ دیجیے۔ آپ سہیل عمر صاحب سے بات کر لیجیے۔ کتاب کی پروف ریڈنگ وغیرہ اب میں نہیں کر سکتا، اس لیے مطبوعہ نسخے کا عکس ہی شائع کر دیا جائے۔☆۱۵۱

والد صاحب مرحوم کے روزنامچے پر کام جاری ہے۔ ان شاء اللہ اس سال کے آخر تک چھپ جائے گا۔

عبدالرحمٰن بزمی صاحب کی علالت کا سن کر تشویش ہوئی۔ خدا انھیں صحتِ کاملہ و عاجلہ سے نوازے۔ اب اُن جیسے مخلص اور وضع دار لوگ دنیا میں بہت کم ہیں۔ میں اُن کی صحت یابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ آپ سے فون پر بات ہو تو میری نیک تمنائیں اُن تک پہنچا دیجیے گا۔☆۱۵۲

مرحوم ابن فرید کے میرے نام خط خاصی تعداد میں ہونے چاہییں۔ میں ان شاء اللہ بہت جلد ان کے عکس بھجوا دوں گا۔ کیا اُن کے خطوط کا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ ہے؟☆۱۵۳

☆۱۴۸۔ راقم پنجاب یونی ورسٹی سے سبک دوشی (۳۱ رمارچ ۲۰۰۲ء) کے بعد بھی ایک معاہدے کے تحت ایم اے اور پی ایچ ڈی کی جماعتوں کی تدریس کا کام ہفتے میں دو روز انجام دیتا رہا مگر جون ۲۰۰۳ء میں، راقم نے صدرِ شعبہ (تحسین فراقی صاحب) کو مطلع کر دیا کہ آئندہ سیشن سے یہ خدمت انجام دینے سے قاصر رہوں گا۔

☆۱۴۹۔ خواجہ صاحب نے راقم کے نام اپنے خط (۲۵ راپریل ۲۰۰۳ء) میں مطلع کیا تھا کہ ۲۸ رمارچ ۲۰۰۳ء کو خاں صاحب کی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے ڈیڑھ برس بعد خود خواجہ صاحب کے ذہن سے یہ بات محو ہوگئی۔

☆۱۵۰۔ اقبال اکادمی نے ۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ''ابتدائی کلام اقبال'' کا عکسی ایڈیشن شائع کیا تھا۔

☆۱۵۱۔ جیسا کہ سابقہ خطوط کے حواشی میں ذکر آچکا ہے، احمد دین کی مذکورہ کتاب اقبال اکادمی سے جلد شائع ہونے کی توقع ہے۔

لاہور کے دوست یقیناً ہندوستان سے بہت کتابیں لائے ہوں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے گھر بیٹھے ہندوستانی کتابیں مل جاتی ہیں۔ پچھلے ایک مہینے میں خدا بخش لائبریری پٹنہ، مکتبہ جامعہ دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی اور متعدد مصنفین کی ارسال کردہ ایک سو سے زیادہ کتابیں موصول ہوئی ہیں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ ۸۔۱۰۔۲۰۰۴ء

☆

(۳۸)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

بے حد معذرت خواہ ہوں کہ آپ کے خط کا جواب تاخیر سے دے رہا ہوں۔ آج کل مہمانوں کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ کچھ خاندان کے افراد بیرونِ ملک سے آئے ہیں اور کچھ ادبی دوست۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر انور معظم آج کل کراچی میں ہیں۔ خلیق انجم تو خیر ایک ہی دن کئی گھنٹے میرے ساتھ رہے، البتہ انور معظم روزانہ آتے ہیں کیوں کہ اُن سے میرے خصوصی مراسم ہیں اور وہ مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اور اُن کی بیگم صاحبہ جیلانی بانو اُٹھ کر گئے ہیں۔ کل ڈاکٹر سلیم اختر بھی آجائیں گے، ''نگار'' کے جلسے میں۔ ایک دن اُن کے ساتھ گزرے گا (یہ ہر سال ہوتا ہے، وہ کراچی آتے ہیں، نگار کے جلسے میں تو ایک دن میرے ساتھ گزارتے ہیں)۔ کل اور پرسوں ڈاک خانہ ۲۵ر دسمبر اور اتوار کی وجہ سے بند رہے گا۔ میں یہ خط آج ہفتے کے روز لکھ کر رکھ دوں گا تاکہ کل اور پرسوں کی مصروفیت میں یہ کام رہ نہ جائے۔ پیر کے روز پوسٹ کروں گا۔

رشید حسن خاں صاحب کا خط ملا۔ ''لفظیاتِ اقبال'' کا جو خاکہ اُنھوں نے بھیجا ہے، وہ میں نے بہ غور پڑھا۔ میری رائے میں یہ نہایت اہم اور ضروری کام ہے اور ضرور ہونا چاہیے۔ آپ سہیل عمر صاحب سے بات کیجیے اور کام شروع کرا دیجیے۔ لیکن اس سے پہلے معاوضے کا تعین ہونا چاہیے اور معاوضے کا ایک حصہ اُنھیں پیشگی ادا کر دینا چاہیے۔ خاں صاحب کے مالی حالات ایسے نہیں ہیں کہ محض مستقبل کی امید پر کام شروع کر دیں۔ رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں سہیل عمر صاحب بہتر طور پر کوئی راستہ نکال سکتے ہیں۔

☆۱۵۲۔ عبدالرحمٰن بزمی (پ: ۲۷ر اگست ۱۹۳۰ء) ہمارے نہایت مخلص اور محبت کرنے والے دوست ہیں۔ کینیا سے ہجرت (یکم جنوری ۱۹۷۲ء) کے بعد لندن آگئے۔ پیشے کے اعتبار سے آرکی ٹیکٹ ہیں۔ لندن ٹرانسپورٹ میں آرکی ٹیکٹ کی ملازمت سے دسمبر ۱۹۹۲ء میں سبک دوشی کے بعد لندن ہی میں مقیم ہیں۔ نہایت عمدہ علمی و ادبی ذوق رکھتے ہیں، خود شاعر اور ادیب ہیں۔ ان دنوں ان کا آپریشن ہوا تھا، علیل تھے اور راقم کے سفرنامے ''پوشیدہ ترک خاک میں ......'' میں بزمی صاحب کا ذکر، احوالِ پیرس کے ضمن میں بکثرت ملتا ہے۔

☆۱۵۳۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر ابن فرید کے یہ موعودہ خطوط مجھے نہ بھیج سکے۔

آپ کے خط کی موصولی کے بعد ایک روز میں نے رشید حسن خاں صاحب کو فون کیا تھا اور آپ کے خط کا ذکر کیا تھا۔ وہ بیماری اور دیگر پریشانیوں کے باوجود اس کام کو انجام دینے کے خواہاں ہیں لہٰذا آپ کوئی ایسی صورت نکالیے کہ وہ جلد از جلد کام شروع کر دیں۔ خاں صاحب نے کام کا جو خاکہ بھیجا ہے، وہ نہایت مناسب ہے، اس میں کسی ترمیم یا تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ کام اُسی خاکے کے مطابق ہونا چاہیے۔☆۱۵۴

عبدالوہاب خان صاحب سلیم کی عنایت کردہ دونوں کتابیں مل گئی ہیں۔ اُن کا شکریہ فون پر ادا کر چکا ہوں اور آپ کا اب ادا کرتا ہوں۔ آپ نے ان کتابوں کے بھیجنے میں بہت زحمت اُٹھائی۔ یہ عبدالوہاب خان صاحب انسان نہیں فرشتہ معلوم ہوتے ہیں۔ اتنی دور بیٹھ کر اتنا خیال رکھنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور یہ سلوک دو چار افراد کے ساتھ نہیں، بے شمار لوگوں کے ساتھ ہے۔ معلوم نہیں انھیں کیسے یہ علم ہو گیا کہ میری تاریخِ پیدائش ۱۹ر دسمبر ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ۱۹ر دسمبر کی صبح کو میرے گھر ایک گلدستہ ایک کوریئر سروس کے ذریعے آ گیا۔ ساتھ ہی مبارک باد کا کارڈ بھی تھا۔ شام کو مبارک باد کا فون آیا۔ بتائیے کون یہ کھکھیڑ اُٹھائے گا!☆۱۵۵

ابنِ فرید مرحوم کے خطوط میں نے نکال لیے ہیں۔ جلد ہی ان کے عکس بنوا کر ارسالِ خدمت کروں گا۔ فوٹو کا کام ملازم سے کراتا ہوں، ایک ساتھ سارے خط نہیں دوں گا، تھوڑے تھوڑے کر کے عکس بنواؤں گا۔ اس لیے ممکن ہے، اس کام میں کچھ تاخیر ہو جائے۔

اقبال از احمد دین کو اقبال اکیڈمی سے ضرور چھپوا دیجیے۔ یہ کتاب کم از کم اُن کتابوں سے بدرجہا بہتر ہے جو آج کل اکیڈمی کی طرف سے شائع کی جا رہی ہیں...... جاوید اقبال کے ذکر پر یاد آیا، کیا ''اپنا گریباں چاک'' کے بارے میں ''معاصر'' میں میرا خط آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ مجھے تو یہ آپ بیتی فرزندِ اقبال کے شایانِ شان نظر نہیں آئی۔☆۱۵۶

.....میری نظر سے گزر چکی ہے، بلکہ اس کے بعد اس کے مصنف بھی دو تین بار نظر سے گزر چکے ہیں۔ ایک ذریعے سے مجھ تک یہ پیغام بھی پہنچا ہے کہ وہ اپنے لکھے پر نادم ہیں۔ دراصل قصّہ یہ

☆۱۵۴۔ افسوس ہے اقبال اکادمی نے رضامندی نہیں دی اور یہ کام نہ ہو سکا۔

☆۱۵۵۔ عبدالوہاب خان سلیم (پ: ۶ر فروری ۱۹۳۹ء) طویل عرصے تک پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں کتاب دار رہے۔ اب کئی برس سے امریکا میں مقیم ہیں اور دنیا کے حوالے سے، ان کے حلقۂ احباب میں، راقم جیسے گوشہ نشین شخص سے لے کر بھارت اور پاکستان کے نام ور ادیب اور شاعر تک شامل ہیں۔ کتابوں کے نہایت شائق، بیسیوں علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت میں ان کی مالی اعانت شامل رہی ہے۔ وہ احباب کو مختلف تحائف کے علاوہ ان کی مطبوعہ کتابیں بھجوانے میں سرگرم رہتے ہیں۔ بھارت اور پاکستان سے اپنی پسند کی کتابیں برابر خرید خرید کر منگاتے رہتے ہیں۔ آپ بیتی اور سفرناموں (بہ طور خاص سفرِ حج وعمرہ) کا اپنا بڑا ذخیرہ، بلا مبالغہ دنیا میں کہیں نہیں ہوگا۔ مجموعی طور پر بھی ان کا کتب خانہ، امریکا کا سب سے بڑا اُردو کتب خانہ ہے۔ جن لوگوں کو سلیم صاحب سے علاقہ رہا، وہ ان کے خلوص، محبت، نیک نفسی و دین داری کی شہادت دیں گے۔

ہے کہ ہمارے ہاں ہر ادیب اپنے آپ کو ''کمالِ فن'' انعام کا مستحق سمجھتا ہے اور ہر سال وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی حق تلفی ہوئی ہے۔ انعام ایک ہے اور مستحقین کی تعداد سو ڈیڑھ سو سے کم نہیں، لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ سب کو خوش کیا جاسکے۔ ......بے تاب پوری نے جو کچھ لکھا ہے، وہ صدفی صد جھوٹ ہے۔ میرے ساتھ ہر مرتبہ چار پانچ چوٹی کے ادیب جج ہوتے ہیں جنھیں میں قائل کرسکتا ہوں نہ مجبور۔ قاسمی صاحب پر بھی جھوٹا الزام لگایا جارہا ہے۔ میں نے گزشتہ سال ''اخبارِ اردو'' میں وضاحت کی تھی۔ قاسمی صاحب ہرگز اُس کمیٹی کے رکن نہیں تھے جس نے اُنھیں کمالِ فن ایوارڈ دیا تھا۔ یہ خط آپ کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔☆۱۵۷ اوروں کا تو ذکر چھوڑیے، ....تک مجھ سے ناراض ہیں کہ قاسمی صاحب کے بعد اُنھیں کمالِ فن ایوارڈ کیوں نہیں ملا اور یہ بات اُنھوں نے خود مجھ سے کہی۔ چالیس برسوں کے تعلقات اُنھوں نے ختم کرلیے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جس کمیٹی نے اُنھیں کمالِ فن نہیں دیا، اُسی کمیٹی نے اُن کی ایک کتاب پر ایک لاکھ روپے کا انعام دیا۔ وہ اُنھوں نے وصول کرلیا۔ مزہ تو جب تھا کہ وہ یہ انعام لینے سے انکار کردیتے۔ میں ہر سال اس لیے جج ہوتا ہوں کہ اکثر سینئر ادیب جج بننے سے انکار کردیتے ہیں، اس بنا پر کہ اُن کا نام تو انعام کے لیے زیرِ غور آنا چاہیے۔

جی ہاں ''الحمرا'' نظر سے گزرتا ہے۔ ڈاکٹر صدیق جاوید نے اسی رسالے میں م۔ ر کا خط پڑھ کر اُس کے بارے میں پوری ایک کتاب لکھ دی ہے۔ کتاب کا مسودہ میں نے دیکھا ہے۔ مختصر سی رائے بھی میں نے لکھ دی ہے۔ یہ کتاب میری رائے کے ساتھ بہت جلد شائع ہو رہی ہے۔☆۱۵۸

والد صاحب کا روزنامچہ تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی یہ پریس بھیج دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ایک دو اور منصوبوں پر بھی کام جاری ہے۔ دعا فرمایئے کہ میں انھیں مکمل کرسکوں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۴-۱۲-۲۰۰۴ء

☆☆☆

☆۱۵۶۔ ''معاصر'' لاہور، اپریل تا دسمبر ۲۰۰۴ء، جلد ۳، شمارہ ۲ — ۴۔

☆۱۵۷۔ ''اخبارِ اردو'' مقتدرہ، اسلام آباد۔

☆۱۵۸۔ مذکورہ کتاب ''ڈاکٹر معین الرحمن، تحقیق کے چراغ تلے'' کے نام سے مثال پبلشرز، فیصل آباد نے شائع کی ہے (مئی ۲۰۰۵ء)۔ اس پر خواجہ صاحب کی رائے انھی کے عکسِ تحریر میں شامل ہے۔

بنام شبنم شکیل

☆

محترمہ و مکرمہ، تسلیمات!

مجھے یہ خط بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا، مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ میں کئی ماہ تک لکھنے پڑھنے کے لائق نہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بڑی حد تک صحت یاب ہو چکا ہوں اور گزشتہ کئی مہینوں کی جمع شدہ ڈاک دیکھ رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتاب ''تقریب کچھ تو'' اب دیکھنے کا موقع ملا۔

پہلے تو دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ایسی دل چسپ کتاب عنایت کی اور پھر معذرت پیش کرتا ہوں کہ بہت تاخیر سے اس کی وصولی کی اطلاع دے رہا ہوں۔ تقریباتی تحریریں عموماً ہوا میں اُڑ جاتی ہیں اور جن کی ان میں تعریف ہوتی ہے اُن کے سوا انھیں کوئی یاد بھی نہیں رکھتا۔ مگر آپ کی تقریباتی تحریریں تو بالکل مختلف نوعیت کی ہیں، آپ نے بہت اچھا کیا کہ انھیں کتابی صورت میں محفوظ کر دیا۔

ان تحریروں میں کہیں آپ بیتی ہے اور کہیں جگ بیتی، کہیں شخصی خاکہ نگاری جھلک دکھاتی ہے اور کہیں خود کلامی کی۔ کہیں وہ آورد نہیں ہے جو تقریباتی تحریروں کا خاصہ ہے۔ مختصر یہ کہ اس کتاب کو پڑھتے وقت کہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ میں کتاب پڑھ رہا ہوں، یہی محسوس ہوا کہ کتاب اپنے آپ کو پڑھوا رہی ہے۔

عابد صاحب مرحوم سے میرا بھی نیاز مندی کا رشتہ تھا۔ ملاقات تو ایک ہی ہوئی تھی لیکن خط کتابت کا سلسلہ رہتا تھا۔ تلاش کروں تو اُن کے دس بیس خط نکل ہی آئیں گے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ ۴۔۵۔۲۰۰۴ء

☆☆☆
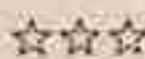
بنام تحسین فراقی

(۱)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

ابھی ابھی گرامی نامہ ملا۔ بیگم صاحبہ کی ناسازیِ طبع کا حال پڑھ کر تشویش ہوئی۔ خدا سے دعا ہے کہ انھیں صحتِ کاملہ عطا ہو۔

آپ کی طرف سے فوری طور پر خط نہ آنے کی وجہ سے تشویش تھی۔ بہ ہر حال اب یہ تشویش ختم ہوئی، اور اطمینان ہوا کہ آپ نے وہ تمام کام، ازراہِ عنایت، انجام فرما دیے جو میں نے، ازراہِ جسارتِ بے جا، آپ کے سپرد کیے تھے، سوائے ایک کام کے کہ حضرت عارف عبدالمتین کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ کیا میری کتابیں اور خطوط انھیں مل گئے تھے؟ اور یہ کہ جواب نہ دینے کا سبب کیا ہے؟ امید ہے آپ پہلی فرصت میں اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

آپ نے گرامی نامے میں، اور اس سے پہلے، کالم میں میرے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اُس کا بہت بہت شکریہ۔ اپنا حال تو اہلِ تصوف کا سا ہے۔ کوئی اچھا ہوتا ہے تو اُسے اچھا نظر آتا ہوں۔ ورنہ وہی کچھ نظر آتا ہوں جو ہوں۔ آپ نے مجھے اپنے پر قیاس کیا ہے، اس لیے خوبیاں نظر آگئیں۔ رہی شگفتگیِ طبع تو یہ غم کا پردہ ہے۔ اس غم کا احوال آپ کو "ابیات" کے مطالعے سے معلوم ہوگا۔ جواباً نہیں، بہ طور امرِ واقعہ عرض کرتا ہوں کہ آپ سے مل کر حقیقی خوشی حاصل ہوئی۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جن سے دو ایک بار مل کر محسوس ہو کہ برسوں کی شناسائی ہے۔

یہاں سب احباب خیریت سے ہیں۔ پرسوں مولانا ابوسلمان صاحب کے گھر پر اجتماع ہوگا۔ اُن کی ایک صاحب زادی کی رخصتی ہے، اور دوسری کا نکاح ہے۔

گزشتہ ہفتے معین الدین عقیل، اظہر حقی اور میں، اپنی بیگمات کے ساتھ نواب شاہ گئے۔ پروگرام تو ایک ہفتے کا تھا، مگر تیسرے روز ہی واپس آ گئے۔ ایسی گرمی تھی کہ برداشت سے باہر تھی۔ سنا ہے

لاہور کا بھی یہی حال ہے۔ ارادہ ہے کہ رمضان کے بعد وہاں آؤں گا۔ پھر آپ سے ملاقات رہے گی۔

رسالے کا کام چل رہا ہے۔☆[۱] یہ بھی رمضان کے بعد ہی شائع ہو سکے گا۔ خواجہ ذکریا صاحب کا مقالہ ابھی تک نہیں ملا☆[۲] شاید کل کی ڈاک سے ملے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی انھوں نے پوسٹ ہی نہ کیا ہو۔ خواجہ کو خواجہ ہی سمجھ سکتا ہے۔

طارق عزیز☆[۳] صاحب کا بھی خط آیا تھا، انھیں جواب لکھ دیا تھا۔ تصویریں ابھی بنوائی نہیں ہیں، گرمی اور پھر برسات کی وجہ سے گھر سے نکلنا کم ہی ہوتا ہے ویسے اچھی آئی ہیں۔ ان شاء اللہ بھیجوں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۹۔۷۔۸۰ء

☆

(۲)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون۔

گرامی نامہ مورخہ ۲۲؍ جولائی ملا اور شعلہ کا مضمون☆[۴] بھی۔ ان عنایات کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے انتظار حسین صاحب سے مضمون جس مستعدی سے حاصل کیا ہے اُس کا جواب نہیں۔ اگر مجھے ہندوستان سے اطلاع نہ ملتی تو یہ مضمون انتظار صاحب ہی کے پاس پڑا رہتا۔ بہ ہر حال اُن کا کرم ہے کہ وہ ہندوستان سے میرے لیے یہ تحفہ لے کر آئے۔ مضمون کے بارے میں آپ کی رائے درست ہے۔ شعلہ نے تو ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ جیسے یگانہ کوئی آسمانی مخلوق ہو۔ بہت سی باتیں غلط بھی لکھی ہیں۔ میں نے اس کا بڑا حصہ قلم زد کر دیا ہے اور ''خلاصہ'' شائع کر رہا ہوں۔

ابو سلمان صاحب آج کل اپنے اعزاز میں جلسے منعقد کرانے میں مصروف ہیں۔ پچھلے دنوں ایک بڑے ہوٹل میں شان دار تقریب ہوئی تھی۔ تمام مقررین کی تقریریں انھیں کو لکھنی پڑیں اور اب تمام اخباروں میں روداد یں لکھنے اور چھپوانے کا کام جاری ہے۔ ایسی مصروفیت میں وہ بھلا خط کا جواب کیوں دینے لگے۔ آج کل تو وہ بات کا جواب بھی مشکل سے دیتے ہیں۔ ایوب قادری صاحب کی طرف سے خط کا جواب اُسی صورت میں مل سکتا ہے کہ آپ جوابی لفافہ بھیجیں۔ ویسے قادری صاحب بھی مولانا ابو سلمان جیسی تقاریب کا ہدف ہیں۔ ان دونوں کی پی ایچ ڈی کی ڈگری ان کے نیاز مندوں کے حق میں عدالت

☆۱۔ مراد ''تحقیقی ادب'' سے ہے جس کا ڈول اس وقت ڈالا جا رہا تھا۔

☆۲۔ غالباً اشارہ اُس خاکہ نما مضمون کی طرف ہے جو مرحوم جعفر طاہر کے حوالے سے لکھا گیا تھا۔ ''تحقیقی ادب'' کے شمارۂ اول میں شائع ہوا۔

☆۳۔ معروف ادیب ڈاکٹر طارق عزیز جو اُن دنوں میری ہی طرح پی ایچ ڈی اُردو کے لیے کوشاں تھے۔

☆۴۔ اشارہ ہے دوارکا داس شعلہ کے اس مضمون کی طرف جو خواجہ صاحب نے ''تحقیقی ادب'' کے دوسرے شمارے میں شائع کیا تھا۔ یہ مضمون ''یہ تیس برس کا قصہ ہے'' کے زیرِ عنوان شائع ہوا۔

کی ڈگری ثابت ہو رہی ہے۔ دعا کیجیے کہ ان دونوں کا سلسلۂ تعلیم بند ہو جائے اور یہ اب اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ دیں۔ ڈر ہے کہ کہیں اُن کے حصے کی تعلیم بھی یہ خود ہی حاصل نہ کر لیں۔

عارف عبدالمتین صاحب کی علالت کا حال پڑھ کر افسوس ہوا، خدا انھیں صحت دے اور اس کی توفیق بھی کہ وہ خطوں کے جواب اور موصولہ کتابوں کی رسید بھجوا دیا کریں۔ صاحب! ایسا معلوم ہوتا ہے موصوف کسی وجہ سے ناراض ہیں ورنہ کہیں یہ سنا ہے کہ کوئی محبت میں کتابیں بھیجے اور اُسے رسید تک نہ ملے۔ خیر اگر اُن کی خوشی اسی میں ہے تو مجھے کیا۔

خواجہ ذکریا صاحب کا مضمون مل گیا ہے۔ دلچسپ مضمون ہے۔

طارق عزیز صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہیے۔ اُن کے خاکے کی نقل مجھے مل گئی ہے۔ ان شاء اللہ اُن کے لیے چند اور نوادر بھیجوں گا۔ سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی کے میگزین میں رسم الخط کے بارے میں کچھ مضامین چھپے تھے، اُن کی نقول میرے پاس ہیں، تلاش کر رہا ہوں۔

اور ہاں جناب ''نیا دور'' کا دریا بادی نمبر اُسی جگہ رکھا تھا، جہاں ہم نے تلاش کیا تھا۔ اگر ابھی تک ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے نہ ملا ہو تو میں یہ بھجوا دوں۔

مجھے لطافت لکھنوی کے دیوان کی ضرورت ہے (یہ امانت کے بیٹے تھے۔ دیوان کا نام ''ریاضِ لطافت'' ہے)۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے پاس یا یونی ورسٹی لائبریری میں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب سے روزانہ فون پر بات ہوتی ہے لیکن جب ان سے کوئی کام ہوتا ہے تو میں لاہور ہی کے کسی کرم فرما سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی توجہ دلائے۔ لہٰذا آپ سے ملاقات ہو تو مذکورہ دیوان کی فرمائش کیجیے۔ اس کا عکس یا اصل نسخہ مستعار درکار ہے۔

عید کے بعد لاہور آنے کا پختہ ارادہ تھا، لیکن بعض حالات کی وجہ سے یہ ارادہ نیم پختہ ہوتا جا رہا ہے، ممکن ہے عید تک یہ پختگی بالکل ختم ہو جائے۔ بہ ہر حال خواہش اپنی جگہ رہے گی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۲۸۔۷۔۸۰ء

☆

(۳)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

آپ کا ۲۳ر اکتوبر کا گرامی نامہ کل کی ڈاک سے ملا ہے۔ یہی صورت آپ کے مضمون کے ساتھ پیش آئی۔ اس کی کتابت ۳۰ر اکتوبر کو ملی تھی۔ آپ کا کرم کہ آپ نے محمد عالم صاحب کے ساتھ مل کر کتابت خوانی کی۔ یہاں میں نے بھی کتابت پڑھی اور حسب استطاعت و توفیق اُن اغلاط کو گرفت میں لیا جو آپ کی اور محمد عالم صاحب کی نظر سے رہ گئی تھیں۔ اس مضمون میں پندرہ بیس انگریزی الفاظ بھی

آئے ہیں۔ یہ الفاظ ایسی بے دلی سے لکھے گئے ہیں کہ گزشتہ صدی میں اگر انگریزی اسی انداز سے لکھی جاتی تو آج برِ صغیر سے اس زبان کا رواج اُٹھ چکا ہوتا۔ مجبوراً تمام الفاظ بٹر پیپر پر چھپوائے گئے اور کاتب کے حوالے کیے گئے کہ وہ انھیں متعلقہ مقامات پر چپکا دے۔ آپ کے مضمون کی ''تحریف آوری'' کے بعد ہی اصل کام شروع ہوا ہے۔ یعنی کاپیاں جوڑنے کا کام۔ اب توقع ہے کہ ۱۲ر نومبر تک یہ کام ختم ہوگا اور پھر پریس کا مرحلہ شروع ہوگا۔ نومبر کے آخر تک ''تخلیقی ادب'' آپ کو ملے گا۔ آپ کے مضمون کی جو سطریں چھوٹ گئی تھیں، اُن کو شامل کرنے کے لیے اُنھیں صفحات کی اتنی ہی سطریں حذف کرنی پڑی ہیں تاکہ کتابت صفحے کی گنجائش سے بڑھ نہ جائے۔ جو سطریں حذف کی گئی ہیں، وہ بالکل ''بے ضرر'' تھیں، اور اُن سے آپ کا مدّعا مجروح نہ ہوگا۔ آپ کا مضمون طویل ضرور ہے، لیکن اس کا کوئی حصہ زائد از ضرورت نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ کو اس موضوع پر پوری کتاب لکھنی چاہیے۔ ''اُردو تنقید تقسیم کے بعد''۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مضمون کے مطالعے سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اس موضوع پر اس حد تک حاوی ہیں۔ اس مضمون کی اشاعت سے خاصا ہنگامہ ہوگا۔ میرے بعض قریبی احباب سخت ناراض ہوں گے، ان کی ناراضی مول لینی ہی پڑے گی، اس لیے کہ آپ نے کوئی غلط بات نہیں لکھی۔ کوئی بات میرے نزدیک غلط ہوتی تو میں ضرور حذف کر دیتا۔ ساری باتیں صحیح اور سچی ہیں، لیکن سچ بولنا خسارے کا سودا ہے۔ میں اس کے تلخ نتائج بھگت چکا ہوں اور آپ بھگتنے کے لیے تیار رہیے۔☆۵

مولانا ابوسلمان صاحب نے اپنی سابقہ ملازمت سے استعفیٰ نہیں دیا۔ مولانا تو ایک ایک وقت میں کئی ملازمتیں کرنے کے عادی رہے ہیں، وہ ایسی عاقبت نااندیشی کا ثبوت کیسے دے سکتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ''عروسِ ہزار داماد'' ہیں۔ سابقہ ملازمت سے جائز تعلق اب بھی باقی ہے۔ صرف اپنی خدمات منتقل کرائی ہیں، اُسی طرح جیسے بعض لوگ اپنی وفاداریاں منتقل کرتے رہتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی صاحب کا ممنون ہوں کہ وہ ''تخلیقی ادب'' کے منتظر ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کے ''معاصر'' کے سامنے میرے رسالے کی وہی حیثیت ہوگی جو غالب کے سامنے عارف عبدالمتین کی۔☆۶

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۳۔۱۱۔۸۰ء

☆۵۔ یہ مقالہ خواجہ صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں ''اُردو تنقید کے دس سال'' کے زیرِ عنوان لکھا گیا تھا۔ خواجہ صاحب کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور پاک و ہند میں اس مقالے کے ضمن میں تائید و مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ڈاکٹر محمد حسن (دہلی) اور ''ابن کراچی'' نے اس کے خلاف لکھا۔ ''ابن کراچی'' (معلوم نہیں یہ کون بزرگ تھے) نے دو تین سطریں تو ''تخلیقی ادب'' پر لکھیں باقی زورِ قلم ''اُردو تنقید کے دس سال'' پر صرف فرمایا۔ محمد علی صدیقی، منظر امکانی وغیرہ کو بھی یہ مقالہ نہ بھایا۔

☆۶۔ اسے محض خواجہ صاحب کے انکسار ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''تخلیقی ادب'' اپنے موضوعات اور پیش کش کے اعتبار سے بائیس برس گزر جانے کے باوجود آج بھی حوالے کی ایک چیز ہے اور تادیر رہے گا۔

☆

(۴)

برادرِ محترم و مکرم، سلام مسنون

تازہ گرامی نامہ ملا۔ اس سے پہلے کا خط بھی مل گیا تھا، ان سب عنایتوں کا شکریہ۔ فاروق اعجاز صاحب جو کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ بہت سے لوگوں کے فون اور خطوط آئے کہ فیروز سنز اور کوآپرا جیسی مرکزی دکانوں پر "تخلیقی ادب" موجود نہیں ہے۔ اس سے مجھے تشویش ہوئی تھی کہ پرچہ کہیں اُن کے گودام ہی میں پڑا نہ رہ جائے۔ قیمت واقعی زیادہ ہے لیکن کمیشن وضع ہونے کے بعد جو کچھ ملتا ہے، اُس سے لاگت بھی نہیں نکلتی۔ رسالہ خاصا فروخت ہو رہا ہے، لیکن اس سے فائدہ کوئی نہیں، بس یہ سمجھیے کہ نقصان کی شرح میں کمی ہو رہی ہے۔ تیسرے شمارے کی تیاری شروع کردی ہے۔ آپ بھی تیاری شروع کردیجیے۔ ترجمہ ہو تو کسی "خالص" ادبی مضمون کا۔ ورنہ پھر کسی بھی پسندیدہ موضوع پر آزادانہ لکھیے۔ بس یہ خیال رہے کہ اپریل کے آخری ہفتے تک مسوّدہ مجھے مل جائے۔

انور سدید صاحب یہاں بھی آئے تھے۔ آپ کے مضمون کی بہت تعریف کر رہے تھے، اور اس کا اعتراف تو سبھی نے کیا ہے کہ آپ نے بڑی محنت کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے، باخبر ہو کر لکھا ہے۔ ایک سہو کا مجھے بھی افسوس ہے اور وہ یہ کہ جمیل جالبی کا ذکر رہ گیا۔ انھوں نے اس دہائی میں خاصا کام کیا تھا۔

عقیل صاحب کو آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔ "تخلیقی ادب" پر "ماہِ نو" میں بھی مفصل تبصرہ آنا چاہیے۔ اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ میں "ماہِ نو" کا خریدار تھا۔ دسمبر ۷۹ء تک یہ پرچہ مجھے ملتا رہا۔ پھر انھوں نے باوجود یاد دہانیوں کے نئے سال کے لیے پرچہ وی پی پی سے نہ بھیجا۔ میں جنوری ۸۰ء سے اب تک کے تمام شمارے خریدنا چاہتا ہوں۔ کتنے پیسے بھیجوں اور کس کو بھیجوں؟ اگر آپ اپنے تعلقات کو کام میں لاکر یہ تمام پرچے وی پی پی سے بھجوا دیں تو کرم ہوگا۔

اس کا شکریہ کہ آپ نے سب لوگوں کو پرچے پہنچا دیے۔ امجد صاحب کو بھی کسی نہ کسی طرح پہنچا دیجیے تاکہ انھیں یہ شکایت نہ ہو کہ سب کو پرچہ بھیجا اور اُن کو نہیں بھیجا۔

ہندوستان میں بھی "تخلیقی ادب" بہت پسند کیا گیا ہے۔ کئی رسالوں میں تبصرے آئے ہیں۔ چند روز ہوئے آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس سے بھی دس منٹ کا تبصرہ نشر ہوا تھا۔

محمد علی صدیقی صاحب نے اظہر جاوید کو ضرور خط لکھا ہوگا۔ انھوں نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ "جسارت" والے اُن کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُن کے خلاف اس اخبار میں کچھ نہ آئے۔ میں نے اخبار والوں سے کہا ہے کہ معاملہ ختم کردیں۔

"تحقیق نامہ" یعنی "بازیافت" مئی تک شائع ہوگا۔ کتابت کا کام جاری ہے۔ اس وقت

میرے پیشِ نظر تین کام ہیں۔ (۱) تخلیقی ادب نمبر۳ (۲) بازیافت (۳) جائزۂ مخطوطات جلد دوم کی نظرِ ثانی۔☆۷ ان کاموں سے فارغ ہوتے ہی والد صاحب مرحوم کے نام کے خطوط☆۸ اور اُن کے روزنامچے☆۹ کی ترتیب کا کام شروع کروں گا۔ آج کل یہ چیزیں نقل کی جارہی ہیں۔ ایک کل وقتی نقل نویس کو اسی کام پر متعین کر رکھا ہے۔ مولانا دریا بادی مرحوم نے آپ بیتی میں اس کا ذکر نہیں کیا کہ اُن کے انگریزی ترجمۂ قرآن کے سلسلے میں میرے والد صاحب نے مدد کی تھی۔ معلوم نہیں کیوں۔ اب اُن کے خطوط شائع ہوں گے تو حقیقتِ حال واضح ہو جائے گی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ''اسلام اور الاسلام''☆۱۰ میں مولانا دریا بادی کی کتابوں پر تبصرے شائع نہیں ہوئے۔ ''وائس آف اسلام'' تو جمعیۃ الفلاح کا رسالہ تھا۔ اس کا فائل اُن کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

یونس احمر صاحب کے لیے پرچہ آپ ہی کے پتے پر بھجوا رہا ہوں۔ ازراہِ کرم انھیں بھجوا دیجیے۔ شکریہ۔ آپ کے دونوں خط سامنے رکھ کر یہ خط لکھا ہے سب باتوں کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ

☆

(۵)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۳۰ر دسمبر مل گیا تھا۔ یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ''تخلیقی ادب'' آپ کو پسند آیا۔ سب سے زیادہ ہنگامہ خیز آپ کا مضمون ثابت ہوا ہے۔ جو آپ کو نہیں جانتے، وہ یہ پوچھتے ہیں کہ یہ کون ہیں؟ جو جانتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ظالم ایسا تو نہ تھا۔ کسی کو شکوہ کہ اُس کا ذکر نہیں آیا۔ کسی کو شکایت کہ اُس کا تذکرہ ''برنگِ دیگر'' ہے اور جو غیر جانب دار ہیں، وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ لکھنے والا باخبر

☆۷۔ مشفق خواجہ کے معرکہ آرا تحقیقی کارنامے ''جائزۂ مخطوطاتِ اُردو'' کی صرف ایک جلد شائع ہوئی۔ وفات سے پہلے دوسری جلد پر نظرِ ثانی مکمل ہو گئی تھی۔ اصلاً ان کا خیال یہ تھا کہ یہ کام سات جلدوں میں مکمل ہو سکے گا۔ افسوس کہ ان کی اچانک رحلت سے یہ عہد ساز کام ادھورا رہ گیا۔ خود کہا کرتے تھے: کارِ دنیا کسے تمام نکرد۔

☆۸۔ ان خطوط کے اس حصے سے میں نے بھرپور استفادہ کیا جو مولانا دریا بادی نے خواجہ عبدالوحید کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط کی نقلیں کمالِ عنایت سے خواجہ صاحب نے مجھے بھیجی تھیں۔

☆۹۔ خواجہ عبدالوحید کے اس روزنامچے پر مشفق خواجہ نظرِ ثانی مکمل کر کے رخصت ہوئے۔ معلومات کا ایک خزینہ ہے۔ خدا کرے جلد شائع ہو۔

☆۱۰۔ انگریزی پرچہ جو پہلے اسلام اور بعد ازاں الاسلام کے نام سے خواجہ عبدالوحید کی ادارت میں لاہور اور ازاں بعد کراچی سے شائع ہوتا رہا۔

ہے۔ اپنے موضوع پر اُس کی مضبوط گرفت ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض لوگ جواب لکھنے کے لیے چاقو چھری تیز کررہے ہیں۔ بیش تر لوگوں نے آپ کا یہ پہلا تنقیدی مضمون پڑھا ہے اور اُن کے لیے یہ خاصا ''دھماکا خیز'' ثابت ہوا ہے۔ معلوم نہیں لاہور والوں پر کیا گزری☆[11]

میں نے ابھی صرف اُن کو ''تخلیقی ادب'' بھیجا جن کے مضامین شامل ہیں۔ دوسرے حضرات کو اسی ہفتے بھیجوں گا۔ انور سجاد اور امجد اسلام امجد صاحب کا پتا کیا ہے؟ یہ بھی کہیے کہ آپ کی رائے میں کن کن لوگوں سے رابطہ قائم کرنا چاہیے؟

پاشا صاحب☆[12] بہت خوش ہیں۔ اُنھوں نے کل ہی آپ کو خط لکھا ہے، امید ہے ملا ہوگا۔ لاہور کے اخبارات میں تبصروں کی طرف توجہ فرمائیے۔ ''نوائے وقت'' کے لیے میرزا ادیب صاحب نے کالم لکھ دیا ہے۔ یہ جلد ہی چھپ جائے تو اچھا ہے۔ انتظار حسین صاحب کے لیے اکرام چغتائی کو رسالہ بھیجا ہے۔ امید ہے اُنھوں نے پہنچا دیا ہوگا۔ انتظار حسین صاحب سے ملاقات ہو تو اُن سے کہیے کہ ''مشرق'' میں کچھ لکھ ڈالیں۔

اور باقی سب خیریت ہے سوائے اس کے کہ مفت پرچہ حاصل کرنے والوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ قرض خواہوں کی طرح آتے ہیں، مہمانوں کی طرح بیٹھتے ہیں، احسان کرنے والوں کی طرح رخصت ہوتے ہیں۔ میرے حق میں دعا کیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ ۶۔۱۔۸۱ء

☆

(۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

خط ملا، غزل ملی، نظم ملی اور یہ مژدہ ملا کہ مضمون جون کے وسط تک مکمل ہو جائے گا۔ ان ڈھیر ساری عنایتوں کے لیے ممنون ہوں۔ غزل بہت پسند آئی۔ مطلع تو کمال کا ہے۔ بھئی بُرا نہ مانیے گا، یہ تو بتائیے کہ آپ جیسے شرفا عشق و عاشقی کا روگ کیوں کر پال لیتے ہیں؟ آپ اندر سے تو میرے ہم پیشہ معلوم ہوتے ہیں، باہر کی ملمع کاری اپنے بس کی بات نہیں۔

میں نے خواجہ عبدالرشید صاحب کو خط لکھا تھا۔ جواب گھر ہی سے آیا تھا۔ اس میں اسپتال

☆۱۱۔ اس مضمون پر لاہور والوں کا ردِعمل بھی ملا جلا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون میرے اسلوبِ نقد کا پہلا بھرپور تعارف ثابت ہوا۔

☆۱۲۔ مراد پاشا رحمٰن سے ہے جو ''تخلیقی ادب'' کے معاونین میں تھے۔

جانے کا ذکر نہیں تھا۔ اگر آپ وہاں جائیں تو میری طرف سے پوچھ لیجیے گا اور پھر مفصل کیفیت لکھیے گا۔ یہ خبر باعثِ مسرت ہے کہ اُن کی بینائی بحال ہو رہی ہے۔

ولیم کوپر کی نظم بہت اچھی تھی، ترجمہ سبحان اللہ۔ ان جذبات میں، میں بھی شریک ہوں۔ میری والدہ کا انتقال ۷۵ء میں ہوا تھا۔ یہ زخم تازہ ہے، اور شاید زندگی بھر تازہ رہے گا۔[۱۳☆☆]

قائم نقوی صاحب نے "ماہِ نو" کا کوئی پرچہ نہیں بھیجا۔ انھیں شاید حاصل کرنے میں دقت ہو رہی ہوگی۔ اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ قیمتاً بھجوا دیجیے۔ ابنِ انشا مرحوم کہا کرتے تھے کہ لوگ کھانا مانگ کر نہیں کھاتے، کپڑے مانگ کر نہیں پہنتے، لیکن کتابیں مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا ابوسلمان فرماتے ہیں کہ کتاب اور عورت مفت مل جائیں تو آدمی ان کی قدر نہیں کرتا (اسی لیے مولانا اُن کتابوں اور اُن عورتوں کی بڑی قدر کرتے ہیں جو اُن کی دسترس میں نہیں)۔ قائم صاحب سے کہیے "ماہِ نو" کے پرچے جب تک نہ ملیں گے میں قائم النار رہوں گا۔ خواجہ ذکریا صاحب نے تبصرہ لکھا یا نہیں؟ خواجہ صاحب کے بارے میں میرا تجربہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک کسی کام کا وعدہ کر لینا ہی کام کر دینے کے مترادف ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۰۔۵۔۸۱ء

☆

(۷)

برادرِ محترم و مکرم، سلام مسنون

ایک مفصل خط، آپ کے گرامی نامے کے جواب میں لکھ چکا ہوں۔ امید ہے ملا ہوگا۔ کل کی ڈاک سے "ماہِ نو" کے سابقہ شماروں کا پیکٹ مل گیا۔ کرم کردی الٰہی زندہ باشی۔ ازراہِ کرم مطلع فرمائیے کہ آپ نے کتنی رقم جمع کرائی تھی۔ آپ کی مہربانیاں پہلے ہی اتنی ہیں کہ جی نہیں چاہتا کہ میرے کسی شوق کا مالی خمیازہ آپ کو بھگتنا پڑے۔ ان پرچوں میں آپ کی بعض تحریریں نظر سے گزریں۔ یہ میرا خالص منافع ہے۔ ویسے کام کی دو اور چیزیں بھی تھیں۔ انور سدید اور امجد اسلام امجد کی لڑکپن کی تصویریں۔ ان سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ کبھی ان دونوں کے سروں پر بال ہما کا سایہ بھی تھا۔ معلوم نہیں اب یہ دونوں وگ اتار کر تصاویر کیوں کھنچواتے ہیں۔ امجد صاحب کے ذکر پر یاد آیا کہ ۵ جون کے "حریت" میں شوکت صدیقی نے ایک انٹرویو لینے والے سے کہا کہ "دہلیز" اور "وارث" اُن کے ایک ناول سے سرقہ ہیں۔ اب

☆☆۱۳۔ ولیم کوپر کی دل میں اتر جانے والی یہ نظم مجھے بھی اپنے حسب حال لگی تھی۔ اسے بہت سے اہلِ دل نے پسند کیا تھا۔ "تخلیقی ادب" میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں میرے شعری مجموعے "نقشِ اول" کا حصہ بنی۔

''حریت'' میں شوکت صدیقی کی تائید میں خطوط شائع ہو رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی منصوبے کے تحت امجد صاحب کے خلاف محاذ کھولا گیا ہے۔

میری کتاب ''غالب اور صفیر بلگرامی''[۱۴] شائع ہوگئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے ذریعے آپ کو ملے گا یا مل چکا ہوگا۔ لاہور میں تبصرے کے لیے یہ کتاب کس کس کے لیے آپ کو بھیجوں؟

میرے لائق کوئی خدمت!

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۱۹۔۶۔۸۱ء

برادرم اکرام چغتائی صاحب کہاں ہیں؟ ایک عرصے سے اُن کا خط نہیں آیا۔

آج کے ''ڈان'' میں ''تخلیقی ادب'' پر تبصرہ آیا ہے۔ اس میں آپ کا اور محمد علی صدیقی کا خصوصی ذکر ہے۔ گو آپ کے ساتھ تبصرہ نگار نے ناانصافی کی ہے، لیکن اُن کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

☆

(۸)

برادر محترم و مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا، ممنون ہوں۔ میرا تاثر آپ کو پسند آیا،[۱۵] شکریہ۔ یقین کیجیے اس میں ذرہ بھر بھی مبالغہ نہیں ہے۔ آپ کی تنقیدی صلاحیتوں کا میں دل سے معترف ہوں اور میرا دل یہ کہتا ہے کہ آگے چل کر اس میدان میں آپ بڑے کارنامے انجام دیں گے۔ کیا ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے آپ نے ''غالب اور صفیر بلگرامی'' حاصل کرلی۔ کتاب پر ''اردو ڈائجسٹ'' اور ''چٹان'' میں تبصروں کا انتظام ہو چکا ہے۔ ''نوائے وقت''، ''امروز''، ''ماہِ نو''، ''ادبِ لطیف'' اور ''قومی ڈائجسٹ'' کے لیے دس کتابیں دو پیکٹوں کی صورت میں عنقریب بھجوا رہا ہوں۔ اگر ان رسالوں، اخباروں میں سے بعض ایک ایک نسخے پر اکتفا کریں تو باقی کتابیں دیگر رسالوں میں تبصرے کے لیے دے دیجیے۔

ایک اور زحمت بھی دے رہا ہوں — دہلی سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے میری فرمائش پر ایک مضمون انتظار حسین کے فن پر لکھا ہے۔ یہ مضمون انھوں نے انتظار صاحب کو بھجوا دیا ہے تاکہ وہ پڑھ لیں اور مجھے لکھا ہے کہ میں یہ مضمون اُن سے منگوا لوں۔ ازراہِ کرم آپ اُن سے یہ مضمون حاصل کر لیجیے۔

☆۱۴۔ خواجہ صاحب کی یہ کتاب اپنے موضوع پر نادر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے میں نے اسی زمانے میں اس پر مفصل تبصرہ اورینٹل کالج کے مجلّے ''تحقیق'' میں شائع کیا تھا۔ یہ تبصرہ اب میری کتاب ''معاصر اُردو ادب'' (۲۰۰۰ء) میں شامل ہے۔

☆۱۵۔ میری درخواست پر خواجہ صاحب نے میرے پہلے تنقیدی مجموعے ''جستجو'' پر اپنے تاثرات ارسال کیے تھے۔ یہ قیمتی تاثرات کتاب کے پس ورق پر شائع ہوئے۔

منسلکہ خط انتظار صاحب کے نام ہے، یہ انھیں دے دیجیے، شکریہ۔

عقیل صاحب خیریت[☆۱۶] سے ہیں۔ خاموش شاید اس لیے ہیں کہ وہ اب مقتدرہ قومی زبان کے ماہوار رسالے "اخبار اردو" کے ایڈیٹر بھی ہو گئے ہیں۔ مصروفیات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں آنے والے ہیں۔ آپ کا سلام اُن تک پہنچا دوں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۵۔۷۔۸۱ء

☆

(۹)

برادرِ مکرم و محترم، سلام مسنون

پہلے آپ کا گرامی نامہ ملا اور اس کے دو روز بعد رجسٹرڈ پیکٹ۔ انتظار حسین صاحب سے مضمون حاصل کرنے اور پھر اُسے پوسٹ کرنے میں آپ کو جو زحمت ہوئی اُس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کا خیال درست ہے کہ نارنگ صاحب کا یہ مضمون، پہلا مفصل اور متوازن جائزہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ "معاصر" میں انتظار صاحب پر ایک سیکشن ہے۔ کہیں یہ مضمون تو اس میں شامل نہیں ہے۔ اگر یہ "معاصر" میں چھپ رہا ہے تو پھر "تخلیقی ادب" میں اسے شامل کرنا مناسب نہ ہوگا۔ ویسے اب کے "تخلیقی ادب" آپ کی دعاؤں سے، پہلے سے بہت بہتر ہوگا۔ ہندوستان کے کئی ممتاز اہلِ قلم نے اپنی تخلیقات بھیجی ہیں۔

"صفیر بلگرامی" کا ٹائٹل لیاقت حسین نے بنایا ہے۔ وہی صاحب جنھوں نے "تخلیقی ادب" کے سرورق بنائے تھے اور "ابیات" کا بھی۔

انتظار حسین صاحب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ جو کہانی لکھتے ہیں، لاہور کے بعض "دوست" سینے پر چھری رکھ کر کہانی چھین لیتے ہیں۔ یہی طریقۂ واردات ہم کیوں نہ آزمائیں۔ میں چاہتا ہوں تیسرے شمارے میں نارنگ صاحب کے مضمون کے ساتھ اُن کی کہانی ضرور ہو۔ میں انھیں خط لکھ رہا ہوں۔ آپ بھی گاہے بہ گاہے دور سے چُھری دکھاتے رہیے۔

اگست میں آپ اپنی کتاب کی طباعت سے فارغ ہو جائیں تو میرے کام کی طرف توجہ فرمائیے۔ وہی ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید پر لکھنے والا کام[☆۱۷]۔ اگر اُن کی کوئی کتاب آپ کے پاس نہ ہو تو لکھیے، میں بھجوا دوں گا۔

☆۱۶۔ ممتاز محقق ڈاکٹر معین الدین عقیل۔

☆۱۷۔ افسوس کہ خواہش کے باوجود وزیر آغا صاحب پر الگ سے کوئی تنقیدی مضمون نہ لکھ پایا۔ جو کچھ ہے سو وہی ہے جو "اردو تنقید کے دس سال" میں شامل ہے۔

ڈاکٹر عقیل صاحب کو اُن کی نئی ذمہ داری کی مبارک باد آپ کی طرف سے پیش کردی ہے، لیکن خود میں نے اظہار افسوس کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے گھر پر بیٹھ کر جو علمی کام کر سکتے ہیں، اُس کا نقصان ہوگا۔ میں اپنے سترہ سالہ تجربے کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ اداروں سے وابستگی نقصان دہ ہوتی ہے۔

پس نوشت

''تخلیقی ادب'' پر تبصرے ابھی تک آرہے ہیں۔ پشاور ریڈیو سے اشرف بخاری[۱۸] نے طویل تبصرہ کیا ہے۔ دو ہفتے پہلے ''ڈان'' میں بھی ایک کالم کا تبصرہ آیا تھا۔ ہندوستان کے ''عصری ادب'' میں بھی ڈاکٹر محمد حسن نے دل چسپ تبصرہ لکھا ہے۔ اس میں ایک جملہ آپ کی خاصی دلچسپی کا ہے:

> ''ترقی پسندوں کو برا بھلا کہنے اور جلی کٹی سنانے کی روش تحسین فراقی سے لے کر شہزاد منظر تک نے برتی ہے جو تعجب کی بات تو نہیں قابلِ رحم حرکت ضرور ہے۔

لاہور کے ''پاکستان ٹائمز'' میں محمد سلیم الرحمٰن صاحب نے تبصرہ کرنے کی خود ہی پیش کش کی تھی، لیکن پھر کسی مصلحت کی وجہ سے نہیں کیا اور تبصرے کے لیے رسالہ خالد احمد صاحب (قاسمی صاحب والے نہیں دوسرے) کو دے دیا۔ مگر ان صاحب نے ابھی تک تبصرہ نہیں کیا۔ اگر کہیں مل جائیں تو سبب پوچھیے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۴۔۷۔۸۱ء

☆

(۱۰)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۱۰ر ستمبر ملا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ ''جسارت'' کے کالم سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ''تخلیقی ادب'' کے زیرِ ترتیب شمارے نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ بہ یک وقت پانچ کاتب کام کر رہے ہیں۔ مسودات کی چھان بین سے لے کر کتابت کی تصحیح تک کا کام اکیلا ہی کر رہا ہوں اور پھر اسی سلسلے کی خط کتابت بھی خاصی ہوتی ہے۔ ایسے عالم میں کالم لکھنا تو کیا کوئی کالم پڑھنا بھی مشکل کام ہے۔ عطاء الحق قاسمی صاحب سے کہیے کہ وہ مجھ سے اتنے خوش گمان نہ ہوں۔ اب اُن کی تعریف میں کچھ چھپا ہے، خدانخواستہ آئندہ کوئی ایسی ویسی بات چھپ گئی تو وہ خواہ مخواہ بدگمان ہو جائیں گے۔ اور آپ نے میرے رنگ کی جو بات کہی ہے تو اب یہ حال ہے کہ چہرے تک کا

☆۱۸۔ اب مرحوم ہوگئے۔ نہایت اعلیٰ علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ روزنامہ ''مشرق'' پشاور میں ایک عرصے تک کالم لکھتے رہے جو بعد از وفات ''کالم گر'' کے زیرِ عنوان لاہور سے شائع ہوئے۔

رنگ اُڑ گیا ہے تو نثر میں رنگ کہاں سے آئے گا۔

شہزاد منظر صاحب نے کتابوں کا کاروبار شروع کیا ہے، انھوں نے کچھ انفرادی ''گاہک'' تلاش کیے ہیں اور اُن کے ہاتھ کتابیں بیچتے ہیں۔ وہ اچھے آدمی ہیں اور ہم سب کو اُن کی مدد کرنی چاہیے۔ معاملے کے وہ بہت کھرے ہیں۔ میرزا ادیب صاحب کی کتابیں بیچ کر اُن کو رقم بھجوا چکے ہیں۔ ''تخلیقی ادب'' بھی انھوں نے خاصا فروخت کیا تھا۔ اس لیے آپ انھیں بلاخوف و خطر کتابیں بھیج دیجیے۔☆[۱۹] ''جنگ'' کے لیے تبصرے کی دو کتابیں ضروری ہیں، باقی سب جگہ کے لیے ایک ایک کتاب کے لیے اُن سے کہیے۔

اس خط کے ساتھ ایک حقیر رقم کا چیک بھی منسلک ہے۔ یہ آپ کے اُس مضمون کے سلسلے میں ہے جو ''تخلیقی ادب'' کے دوسرے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ معاوضہ نہیں علامتی اعزازیہ ہے۔ میں نے جب رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا تھا تو اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ اہلِ قلم کا استحصال نہیں کروں گا۔ معاوضہ تو خیر میں کیا دے سکتا ہوں۔ میں کیا میری بساط کیا۔ لیکن بقدرِ اشکِ بلبل اعزازیہ تو دے سکتا ہوں۔ لہٰذا یہ حقیر رقم قبول فرمائیے۔ میں نے رسالے کی اشاعت کے فوراً بعد ہر مہینے دو تین ادیبوں کو اعزازیہ بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کی باری اب آئی ہے۔ تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ اگر کراچی آئیں تو پروگرام یوں بن سکتا ہے کہ پہلے کراچی میں آپ کی کتاب کی تقریبِ رونمائی ہو اور پھر حیدر آباد میں۔ اچھا ہے اسی بہانے آپ سے ملاقات ہو جائے گی☆[۲۰]۔ میں شاید اکتوبر میں لاہور آؤں۔ اس کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنے دولت خانے پر قیام کی دعوت دی ہے، لیکن ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے بہت پہلے طے ہو چکا ہے کہ انھیں کے ہاں ٹھہروں گا لیکن اس میں شک نہیں کہ زیادہ وقت آپ ہی کے ساتھ گزرے گا۔

حسبِ معمول انتظار حسین کے نام کا خط منسلک ہے۔ اسے پڑھ لیجیے اور پھر موصوف سے مل کر جواب بھی حاصل کر لیجیے۔ سلیم احمد صاحب کو فون پر آج ہی آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔ آپ نے ''ادبِ لطیف'' کو میری کتاب دی، ٹھیک ہے، لیکن یہ اُن لوگوں کے مطلب کی چیز نہیں۔ عصری ادب کے تبصرے کا عکس جلد ہی بھجوا دوں گا۔☆[۲۱]

اور سب سے اہم بات یہ کہ آپ کا مضمون کب آ رہا ہے؟

☆۱۹۔ شہزاد منظر نے مکہ بکس لاہور سے ''جستجو'' کے ۲۵ نسخے مناسب کمیشن کے ساتھ طلب کیے تھے اور رقم کی جلد ادائیگی کا وعدہ کیا تھا۔

☆۲۰۔ پہلی تنقیدی کتاب کی اشاعت کے وقت میں بہت پرجوش تھا۔ خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ کراچی و حیدر آباد میں اس کی تقریبِ رونمائی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، افسوس کہ میں خواہش کے باوجود کراچی و حیدر آباد نہ جا سکا۔

☆۲۱۔ ''عصری ادب'' (دہلی، مدیر ڈاکٹر محمد حسن) میں ''تخلیقی ادب'' کے پہلے دو شماروں پر تبصرہ مدیر کے قلم سے نکلا تھا۔ تمام مشمولات میں میرا مقالہ 'اُردو تنقید کے دس سال' کو شدت سے ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا۔ میں وہ تبصرہ دیکھنے کا متمنی تھا۔

کل مولانا ابو سلمان کے بیٹے کی شادی ہے۔ سب احباب جمع ہوں گے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۳۔۹۔۸۱ء

☆

(۱۱)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا اور انتظار حسین صاحب کا افسانہ۔ ان عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ انتظار صاحب کی شرکت سے افسانوی حصہ اب کے خاصا جان دار ہوگیا ہے۔

آپ کا مضمون اگر نومبر کے آخر تک مل جائے تو سبحان اللہ، ورنہ پھر آئندہ کسی پرچے میں یہ مضمون چھپے گا۔ حیرت ہے کہ ایک انتہائی مشکل موضوع پر آپ نے چند ہفتوں میں مضمون لکھ دیا تھا، مگر اب کے کئی مہینے بھی ناکافی ہوگئے۔ جولائی سے راہ دیکھ رہا ہوں۔ میں نے ایک مرتبہ خدا سے دعا مانگی تھی کہ آپ کو ڈاکٹر وحید قریشی جیسا علم ملے، معلوم ہوتا ہے کہ دعا قبول ہوئی، علم کے ساتھ ساتھ عادات بھی کچھ انھی جیسی ہوتی جارہی ہیں۔

حضرت! اخباریات کے سلسلے میں آپ مجھے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ میں کہاں اور یہ وبال کہاں۔ سنا ہے حضرت عقیل ہی یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ عقیل صاحب دیکھنے میں اتنے سنجیدہ ہیں کہ اگر کبھی کبھار مسکرا دیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مسکراہٹ نہ ہو کتابی چہرے پر کتابت کی کوئی غلطی ہو۔ لیکن جب لکھتے ہیں تو معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ محمد علی صدیقی نے بھی ایک روز فون پر آپ ہی جیسے خیالات کا اظہار کیا تو میں نے عرض کیا، ابھی تو آپ تعریف کررہے ہیں، لیکن کسی دن خدانخواستہ لکھنے والے نے آپ کی شان میں گستاخی کردی تو آپ میرے بارے میں رائے تبدیل کردیں گے، لہٰذا اپنی تعریف اپنے ہی پاس رکھیے۔ ان صاحب کی تازہ ترین تحقیق آپ نے سنی۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب ''ما و اقبال'' کے بارے میں کہنے لگے، ''ماوزے تنگ اور اقبال کے فکری اشتراک کے بارے میں بڑا معروضی مطالعہ ہے۔'' ☆۲۲

پچھلے خط میں، میں نے لکھا تھا کہ ''ماہِ نو'' جولائی ۸۰ء سے نہیں مل رہا لیکن پرچوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ مجھے مئی تک کے شمارے ملے ہیں۔

اب آپ ازراہِ کرم قائم نقوی صاحب سے کہیے کہ جون سے اب تک کے تمام شمارے وی

☆۲۲۔ صرف یہی نہیں حضرت نے علی شریعتی کے ہاں مستعمل اصطلاح ''متجدد'' کو بھی ''متحد'' پڑھا تھا اور لکھا تھا کہ علی شریعتی ملت اسلامیہ کو ''متحد'' ہونے کا درس دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک دلچسپ خبر اُس زمانے میں ''جسارت'' کے ادبی صفحے پر شائع ہوئی تھی تازہ بہ تازہ کے زیرِ عنوان۔ ملاحظہ ہو جسارت ۲۰ر فروری ۱۹۸۱ء۔

پی پی سے بھیج دیں اور ۸۲ء کا چندہ بھی وصول کر لیں۔ کہیں یہ قائم نقوی بھی ڈاکٹر وحید قریشی کے شاگرد تو نہیں؟ ''فنون'' میں ان کا کلام بالکل پسند نہیں آیا۔ اگر انھوں نے ''ماہِ نو'' کے شمارے بھیج دیے ہوتے تو میری رائے ان کے کلام کے بارے میں بھی کچھ بہتر ہو جاتی۔

منسلکہ خط انتظار حسین صاحب کے لیے ہے۔ ازراہِ کرم انتظار صاحب کی تصویر اور مختصر سوانحی کوائف حاصل کر لیجیے۔ اُن سے معلوم کرکے خود ہی لکھ دیجیے۔ سالِ پیدائش، تعلیم، تصانیف کی سند وار فہرست وغیرہ۔ اپنی تصویر اور کوائف بھی بھجوا دیجیے۔ اگر آپ کا مضمون نہ بھی ملا تو غزل اور نظم کا ترجمہ تو میں شامل کر ہی رہا ہوں۔

عطاء الحق قاسمی صاحب سے ملاقات کی تفصیل لکھ چکا ہوں۔ اُن کے بال مجھے بہت پسند آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خونِ عاشقاں اُن کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔

''فنون'' میں آپ کا خط پڑھا۔ محمد علی صدیقی اور عبدالعزیز خالد کو آپ نے ایک ہی تنقیدی لاٹھی سے ہانکا ہے۔ خالد صاحب تو خیر وسیع القلب ہیں، وہ علمی اختلاف کو برداشت کر جائیں گے مگر دوسرے صاحب تو غیر علمی اختلافات کو بھی برداشت کرنے کی توفیق نہیں رکھتے۔

عقیل صاحب کو آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔

جواب کا انتظار رہے گا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۵۔۱۱۔۸۱ء

☆

(۱۲)

برادرِ محترم و مکرم، سلامِ مسنون

گرامی نامہ ملا۔ ممنون ہوں — سب سے پہلے تو گھر میں ایک نئے فرد کے اضافے کی دلی مبارک باد قبول کیجیے۔[۲۳] میری اہلیہ کی طرف سے بیگم صاحبہ کی خدمت میں مبارک باد پہنچا دیجیے۔ ہم دونوں کی دعا ہے کہ یہ بچہ آپ دونوں کے لیے، آپ دونوں کے متعلقین کے لیے خیر و برکت کا باعث ہو۔ امید ہے بیگم صاحبہ اب پوری طرح صحت یاب ہو چکی ہوں گی۔

گھریلو مصروفیات کے پیشِ نظر یقیناً آپ پڑھنے لکھنے کے کاموں میں پوری طرح مشغول نہیں رہے ہوں گے۔ ایسی صورت میں آپ کا مضمون نہ لکھنا، حالات کے عین مطابق ہے۔ مجھے قطعاً کوئی شکایت نہیں۔ لکھنے لکھانے کا معاملہ تو زندگی بھر کا ہے۔ اب نہیں تو آئندہ سہی۔ میں کون سا آپ کا پیچھا چھوڑ دوں گا۔

☆۲۳۔ اشارہ میرے پہلے بیٹے عمر فاروق کی ولادت کی طرف ہے۔

انتظار صاحب والی تصویر بھی مل گئی اور آپ دونوں کے کوائف بھی۔ بہت بہت شکریہ۔ لیکن آپ نے اپنی تصویر نہیں بھیجی۔ میں نے جو تصویر اتاری تھی وہ شاید آپ کو پسند نہ آئی ہو لہٰذا اپنی پسند کی تصویر بھیج دیجیے۔ ''ماہِ نو'' کے شمارے ملے، لیکن ایک شمارہ اب بھی کم ہے یعنی ستمبر ۸۱ء کا۔ یہی وہ شمارہ ہے جس میں ''تخلیقی ادب'' پر تبصرہ چھپا ہے۔ اگر یہ شمارہ مل جائے تو بڑا کرم ہوگا۔

گلڈ کا انعام میں نے محض اس وجہ سے واپس کیا ہے کہ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔[☆۲۴] عطاء الحق قاسمی صاحب نے طفیل صاحب کا بیان چھاپا تھا اس کا جواب میں نے انھیں بھیجا ہے۔ معلوم نہیں وہ شائع کریں گے یا نہیں؟ اکرام چغتائی صاحب کہاں ہیں؟ کیا وہ ملک سے باہر چلے گئے؟ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ ۹-۱۲-۸۱ء

☆

(۱۳)

برادرِ محترم و مکرم، سلامِ مسنون

گرامی نامہ ملا، ممنون ہوں۔

عقیل صاحب خطوں کا جواب شاید اس لیے نہیں دیتے کہ آج کل وہ عروس ہزار داماد بنے ہوئے ہیں۔ کم و بیش نصف درجن اداروں سے اُن کا جائز یا ناجائز تعلق ہے۔ میں نے اُن سے بات کی تھی، کہنے لگے کہ فراقی صاحب کا وعدہ چار کالم مہینے میں لکھنے کا تھا، لیکن وہ بھیجتے ہی نہیں۔[☆۲۵] ہر دوسرے مہینے رسالہ ''اسلوب'' کی ڈمی چھاپنی پڑتی ہے، لیکن میں نے ڈمی کی بجائے کوئی مختصر کتاب چھاپ دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ بہت سی چیزیں ''بازیافت'' کے لیے کتابت کرائی تھیں۔ وہ پڑی ہیں۔ پہلے سلیم احمد کی کتاب چھاپی تھی، اب ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم کی ہے۔ ''اُردو قواعد'' چھاپی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، آپ دیکھیں گے تو خوش ہوں گے۔

محمد سلیم الرحمٰن کی تصویر کسی طرح حاصل کیجیے، ملاقات ہو تو میرا پیغام پہنچا دیجیے۔ تصویر کے سلسلے میں حضرت شرمیلا ٹیگور معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں لوگ شعر چھپواتے وقت تو شرماتے نہیں لیکن تصویر کے معاملے میں شرم فرماتے ہیں۔ مولانا نعیم صدیقی کی تصویر کے سلسلے میں فضل من اللہ صاحب نے وعدہ کیا تھا۔ اُن سے فرمائیے کہ کم از کم یہ وعدہ اسی دنیا میں پورا کر دیں۔ اکرام چغتائی صاحب ۱۰ر اپریل کو کراچی پہنچ رہے ہیں۔ تین چار روز میرے ساتھ گزاریں گے۔ پھر آگے روانہ ہوں

☆۲۴۔ جناب مشفق خواجہ کو ان کے تحقیقی کارنامے ''جائزۂ مخطوطاتِ اردو'' پر گلڈ انعام دیا گیا تھا جو انھوں نے قبول نہیں کیا تھا۔

☆۲۵۔ ان دنوں میں نے ''جسارت'' کے ادبی صفحے پر ''گویا دبستاں کھل گیا'' کے بجائے ''کتاب نامہ'' کے زیرِ عنوان کتابوں پر ریویو آرٹیکل لکھنا شروع کر رکھے تھے۔

گے۔ ۱۳ر۱۴ر اور ۱۵ر اپریل کو ڈاکٹر مختار الدین احمد علی گڑھ سے آ رہے ہیں۔ وہ دو ایک روز کراچی میں قیام کرنے کے بعد لاہور ایک دن کے لیے جائیں گے اور وہاں ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ قیام کریں گے۔ اس کی اطلاع ڈاکٹر صاحب کو دے دیجیے گا۔

"تخلیقی ادب" کی سول ایجنسی کے سلسلے میں کسی سے بات ہوئی؟ اُردو ڈائجسٹ والوں سے میں اب کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا کیوں کہ معاملے کے اچھے ثابت نہیں ہوئے۔ میری رقم اس طرح توڑ توڑ کر ادا کی جیسے کوئی کسی کو خیرات دیتا ہے۔ اب بھی ان کی طرف ایک بڑی رقم واجب ہے۔ دیکھیے یہ کب ملتی ہے۔

محمد ارشاد کے مضمون کا کیا معاملہ ہے۔ سنا ہے کہ اس پردے میں کوئی اور ہے؟ ☆۲۶

"تخلیقی ادب" بس کسی دن بھی آ سکتا ہے۔ واجبات وصول کر رہا ہوں۔ جس دن کاغذ کی خریداری کی رقم جمع ہوگئی اُسی دن طباعت شروع ہو جائے گی۔ اگلا شمارہ غلام عباس کے لیے مخصوص ہے۔ اس موضوع پر ابھی سے لکھنا شروع کر دیجیے۔ اب کے کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۸۔۴۔۸۲ء

☆

(۱۴)

برادرِ مکرم، سلام مسنون

آپ کو جان کر حیرت ہوگی (مسرت کیوں ہونے لگی) کہ ۲۸ر مئی کو میں لاہور پہنچ رہا ہوں۔ دو تین دن لاہور میں قیام رہے گا۔ ایک دن آپ مجھے لاہور کے تمام تاریخی آثار (مع ڈاکٹر عبداللہ چغتائی) دکھائیں گے۔ یہ ایک دن ابھی سے سنبھال کر رکھ لیجیے۔ مصروفیت کا عذر مسموع نہ ہوگا۔ وقت کم ہے، میں شاید سب دوستوں سے نہ مل سکوں، سب کی خوش بو آپ ہی میں مل جائے گی۔ میں شاید کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ تفصیلات ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے معلوم کر لیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۲۳۔۵۔۸۲ء

☆

۲۶۔ "فنون" میں عسکری صاحب اور دبستان عسکری کے ضمن میں ایبٹ آباد کے محمد ارشاد صاحب کا ایک سلسلۂ مضمون شروع ہوا تھا۔ اس کی جانب اشارہ ہے۔ چوں کہ اس زمانے محمد ارشاد صاحب معروف نہیں تھے اس لیے بعض حضرات کا خیال تھا کہ "منصور کے پردے میں" کوئی اور محوِ گفتگو ہے۔

(۱۵)

برادرِ محترم و مکرم، سلامِ مسنون

بہت عرصے سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا، حالاں کہ میرا آخری خط جواب طلب تھا اور میں نے عرض کیا تھا کہ عالی صاحب کے سفرناموں پر یا شاعری پر ایک مضمون چاہیے۔[☆۴۷] حیرت ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی شاگردی کے اثرات آپ نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد قبول کیے۔ وہ بھی وعدے کرنے میں بڑے فراخ دل ہیں اور ایفائے وعدہ کے وقت اپنی وسعتِ قلبی پر نادم ہوتے ہیں۔

آپ کی کتاب اب کے کراچی کی بجائے حیدر آباد سندھ بھیجی گئی تھی۔ صوفی عبدالرشید[☆۴۸] جن کے ذمے یہ کام کیا تھا وہاں سے ۱۵ر نومبر کا چیک اپنے نام لے کر آئے ہیں۔ گویا خُم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا۔ میں اپنے پاس سے چیک بھیج رہا ہوں۔ یہ آپ قبول کر لیجیے۔ میں پہلے بھی ایسا کر سکتا تھا، لیکن اُس وقت ''تخلیقی ادب'' نے زیرِ بار کر رکھا تھا۔ اب صورتِ حال بہتر ہے۔ اس لیے مجھے قطعاً کوئی زحمت نہیں ہوگی۔

اور سنائیے کیا حال ہے۔ پچھلے دنوں ''جسارت'' میں ''فنون'' پر جو کالم چھپا تھا اُس نے خاصا ہنگامہ کر رکھا ہے۔ بعض لوگوں نے شبہ کیا ہے کہ یہ کالم میں نے لکھا تھا۔ ذرا سوچیے ایسے کاموں سے میرا کیا تعلق؟ حد تو یہ ہے کہ بدخواہوں نے جناب احمد ندیم قاسمی کے کان بھی بھرے ہیں اور انھوں نے شکایت کا خط لکھا ہے۔ یہی نہیں ''حریت'' میں ایک جوابی کالم بھی شائع کرایا ہے۔ مشکور حسین یاد صاحب کا بھی ایک شکایتی خط آیا ہے۔ ان دونوں حضرات کو میں نے جواب دیا ہے کہ آپ نے جو کچھ سنا، غلط ہے۔

آپ کے تفصیلی خط کا انتظار رہے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۳۱۔۱۰۔۸۲ء

☆

(۱۶)

برادرِ محترم و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کے عنایت نامے کے انتظار میں ہوں۔ شدید انتظار اس لیے ہے کہ اب صرف آپ کے مضمون کی کتابت ہوگی، باقی سب کچھ تیار ہے۔

☆۴۷۔ بالآخر میں نے عالی صاحب کی سفرنامہ نگاری پر مقالہ لکھا۔ کچھ باتیں سخن گسترانہ بھی لکھ دی تھیں جو مضمون چھپنے کے بعد شاید عالی صاحب کو پسند نہ آئیں اسی لیے عالی صاحب پر چھپنے والے ارمغان میں میرا مضمون ''عالی جی کی سفرنامہ نگاری'' بار نہ پاسکا۔ یہ مقالہ ''تخلیقی ادب'' میں چھپنے کے کئی برس بعد میری کتاب ''معاصر اردو ادب'' میں شامل ہوا۔

☆۴۸۔ انجمن ترقی اردو کے بے مثال خیر خواہ اور خادم۔

۱۳،۱۲ کو ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سید عبداللہ صاحبان تشریف لائے۔ حسبِ معمول ان سے ملاقاتیں رہیں۔ آپ کو جان کر حیرت ہوگی کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے ربع صدی کی طویل رفاقت میں پہلی مرتبہ کوئی وعدہ پورا کیا۔ یعنی عالی صاحب کی شاعری پر مضمون لکھ ڈالا۔ محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں نے تین کتابیں بھیجی ہیں۔ ان میں ایک تو آپ کے پسندیدہ کالم نگار حمزہ فاروقی کا سفرنامہ ہے، دوسری ''پراچین اُردو''، تیسری محترمہ اداؔ جعفری کا مجموعۂ کلام، جو انھوں نے آپ تک پہنچانے کے لیے دیا تھا۔ اس کی رسید اگر آپ انھیں براہِ راست بھیج دیں تو مناسب ہوگا۔ اداؔ صاحبہ کے مجموعے پر آپ ''جسارت'' میں ضرور لکھیے گا۔ ''سیارہ'' میں آپ کا مقالہ دیکھا۔ آپ کی تنقید بھی دُور مار میزائل ہے۔ آپ نے ایک ایسے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے جس کے بارے میں صدفی صد پاکستانی لاعلم ہیں۔ میری معلومات میں تو بے حد اضافہ ہوا۔

''سیارہ'' والے سلیم احمد کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ ☆۲۹ اپنے ہم دردوں کو اتنی بے رحمی سے نہیں کھونا چاہیے۔ سلیم احمد جو کچھ بھی ہوں، ان کی ہم دردیاں اسلامی ادب کی تحریک سے رہی ہیں۔ ''سیارہ'' والوں کو اپنے ہم دردوں کو ہدف نہیں بنانا چاہیے۔ ضد میں آ کر سلیم احمد بھی محاذ کھول سکتے ہیں اور انھوں نے ایک دو کالم لکھے بھی ہیں۔ ☆۳۰ اس جھگڑے سے کسے فائدہ پہنچے گا۔ آپ ذرا محترم نعیم صدیقی صاحب کو سمجھایئے کہ یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں ہے۔ فضل من اللہ صاحب نے اپنے تبصرے میں ایک زیادتی یہ بھی کی ہے کہ ''نیا دور'' کے ایڈیٹر کا نام جمیل جالبی لکھا ہے جب کہ جالبی صاحب کا نام پرچے پر نہیں چھپتا۔

میں خیریت سے ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ بھی خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۵۔۱۲۔۸۲ء

☆

(۱۷)

برادرِ مکرم و محترم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا اور مضمون بھی۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ مقالہ آپ نے بہت اچھا

☆۲۹۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ سلیم احمد مرحوم نے حضرت یوسفؑ کے معروف خواب کی نفسیاتی توجیہ اپنے کسی مقالے میں کی تھی جس پر ''سیارہ'' کے مدیرِ انتظامی جناب فضل من اللہ نے انھیں اپنے پرچے میں شدید طور پر ہدفِ تنقید بنایا تھا۔

☆۳۰۔ اس زمانے میں سلیم احمد ''حریت'' (کراچی) میں کالم لکھا کرتے تھے۔

لکھا۔[۳۱] جی خوش ہوگیا۔ کرم کردی الٰہی زندہ باشی۔

مقالے کا پہلا حصہ پڑھ کر خیال آیا کہ جب آپ کمبل پوش کے سفرنامے کے بارے میں اتنی اچھی رائے رکھتے ہیں تو پھر اسے مرتب کیوں نہیں کر دیتے! ایک زمانے میں میرا ارادہ تھا کہ اسے مرتب کروں گا۔ اس مقصد کے لیے ایک خوش خط نقل بھی تیار کرائی تھی۔ اگر آپ کا ارادہ ہو تو یہ نقل آپ کو بھیج دوں۔[۳۲] میرے پیشِ نظر جو نسخہ تھا، اس کے کچھ صفحات کم تھے۔ یہ کمی آپ پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے نسخے سے پوری کر لیجیے۔ اس میں آپ کو کام زیادہ نہیں کرنا ہوگا۔ بس یہ کام ہے:

۱۔ لاہور کے نسخے سے لفظ بہ لفظ مقابلہ کرنا ہوگا۔

۲۔ بعض جگہ حواشی لکھنے ہوں گے کہ کہیں کسی مقام کا نام غلط ہے یا اُس کا تلفظ ایسا کیا ہے کہ اُسے پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔

۳۔ ایک عدد دیباچہ لکھنا ہوگا۔ کمبل پوش کے حالات کسی دوسری جگہ نہیں ملتے۔ جو کچھ مواد ہے وہ اسی سفرنامے کے اندر ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے میرا مذہب سلیمانی ہے۔

اس کی اشاعت کا انتظام میں کراؤں گا۔

آدا جعفری صاحبہ کی کتاب پر تبصرہ ''جسارت'' میں جلد لکھ دیجیے۔ یہ سلسلہ آپ باقاعدہ جاری رکھیے۔ لوگ اسے پسند کرتے ہیں اور اس کے انتظار میں رہتے ہیں۔

ملک حسن اختر نے مدیرِ ''جسارت'' کو ایک خط لکھا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ''جسارت'' میں اُن کے خلاف مہم چلائی گئی ہے۔ وجہ یہ بتائی ہے کہ خامہ بگوش اور تحسین فراقی کا اس تاریخ میں ذکر نہیں ہے، اس لیے یہ دونوں ناراض ہوگئے۔[۳۳] حضرت خامہ بگوش نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ اگر اس تاریخ میں اُن کا ذکر ہوتا تو وہ مصنف پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیتے۔ کیا زمانہ آگیا ہے کہ آپ سچی بات کہیں تو فوراً اسے بدنیتی پر مبنی قرار دے دیا جاتا ہے!

آج کل علی جواد زیدی صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ۱۴ر جنوری کو لاہور جا رہے ہیں۔

۳۱۔ اشارہ جمیل الدین عالی صاحب کے سفرناموں پر میرے مضمون کی طرف ہے جو اب میرے مجموعۂ مقالات ''معاصر اُردو ادب'' میں شامل ہے۔ یہ مقالہ اوّلاً خواجہ صاحب کے ''تخلیقی ادب'' شمارہ ۳ میں شائع ہوا تھا۔

۳۲۔ خواجہ صاحب کے ایما پر میں نے ان سے ''عجائبات فرنگ'' (تاریخ یوسفی) کی نقل بھیجنے کی درخواست کی جو مرحوم تحسین سروری سے تیار کرائی گئی تھی۔ بعد ازاں میں نے اسے اگست ۱۹۸۳ء میں مفصل مقدمے اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ محترم مظفر عباس نے میرے مرتبہ اور شائع کردہ سفرنامے (کمبل پوش) کے ایک برس بعد ''عجائبات فرنگ'' کو مکرراً شائع کیا مگر اس پر تاریخ بوجوہ ۱۹۸۲ء درج فرمائی۔ اپنے اس نسخے میں انھوں نے میرے تحقیقی اکتشافات و اولیات سے بغیر حوالے کے بھرپور استفادہ فرمایا تھا۔ اس پر اخبارات و رسائل میں دیر تک بحث مباحثے کا سلسلہ چلتا رہا۔

۳۳۔ ملک حسن اختر نے اسی زمانے میں ایک ''تاریخ ادب اُردو'' تالیف فرمائی تھی جس کے تحقیقی تسامحات کی مشفق خواجہ نے اپنے مخصوص انداز میں نشان دہی کی تھی۔ کتاب میں اس قدر اغلاط تھیں کہ ان پر ایک مضمون میں نے بھی باندھا تھا جو 'جسارت' کے ادبی صفحے پر شائع ہوا تھا۔ میں ان دنوں 'جسارت' میں ''کتاب نامہ'' کے زیرِ عنوان ہفتہ وار تبصرے لکھا کرتا تھا۔

بہت صاحبِ علم اور نفیس آدمی ہیں۔ میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ آپ ان سے ضرور ملیے گا۔

"الاعلام" والا مضمون دیکھا۔ لکھنے والا پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ عسکری صاحب کی تعریف میں جو مبالغہ ہوتا رہا ہے، یہ سب اُس کا ردِّعمل ہے۔☆۳۴ سنا ہے، علی گڑھ کے ابوالکلام قاسمی نے عسکری صاحب پر کوئی کتاب مرتب کی ہے☆۳۵ کیا یہ آپ کی نظر سے گزری ہے؟

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۹۔۱۔۸۳ء

☆

(۱۸)

برادرِ مکرم و محترم، سلامِ مسنون

آپ کا تعزیت نامہ مل گیا تھا۔ آپ کے حرفِ تعزیت سے بڑی تقویت ملی۔ بس دعا کیجیے کہ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔☆۳۶ م شین سفرنامہ نہیں لے گئے تھے بلکہ مضامین کا مجموعہ لے گئے تھے۔ سفرنامہ انھوں نے کسی پبلشر کو دیا تھا۔ بہرحال مجھے صحیح صورتِ حال یاد نہیں۔ آپ کی موجودگی ہی میں کچھ تفصیلات انھوں نے بتائیں تھیں یا پھر جب میں ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ اُن سے ملا تھا تو اس موضوع پر گفتگو ہوئی تھی۔ اب لاہور آؤں گا تو مزید معلومات حاصل کروں گا۔ مولانا ابو سلمان صاحب نے اُن کے بارے میں ایک مضمون گزشتہ جمعہ کو "جنگ" کے ادبی صفحے پر لکھا تھا، امید ہے نظر سے گزرا ہوگا۔

یٰسین رضوی صاحب کا کیا معاملہ ہے؟ میں اس سلسلے میں بالکل لاعلم ہوں۔ اگر آپ کچھ بتا سکیں تو کرم ہوگا۔

ایک دلچسپ بات سنیے۔ پچھلے سال میں نے محمد سلیم الرحمٰن صاحب سے کہا تھا کہ کمبل پوش کا سفرنامہ آپ مرتب کیجیے لیکن انھیں یہ تجویز پسند نہ آئی۔ اب اُن کا خط آیا ہے کہ وہ اور اکرام چغتائی مل کر یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انھیں لکھ دیا ہے کہ تحسین فراقی صاحب اب یہ کام کر رہے ہیں اور انھوں نے کام کا ایک حصّہ مکمل بھی کر لیا ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہو تو آپ بھی انھیں صورتِ حال سے مطلع کر دیجیے تاکہ خواہ مخواہ تکرار نہ ہو۔

☆۳۴۔ اشارہ محترم ساجد علی کے اس سلسلۂ مضامین کی جانب ہے جو "الاعلام" (مدیر: جاوید احمد غامدی) میں بہ سلسلۂ عسکری شائع ہوا تھا۔

☆۳۵۔ یہ کتاب "مشرق کی بازیافت" کے زیرِ عنوان شائع ہوئی تھی۔ مقالات کا نہایت عمدہ مجموعہ ہے۔

☆۳۶۔ اشارہ ہے خواجہ صاحب کے تایا زاد بھائی ممتاز محقق اور عالم کرنل خواجہ عبدالرشید کی وفات کی جانب۔ مرحوم سے میری بھی نیاز مندی تھی۔ میری نگرانی میں محترمہ عصمت بتول نے مرحوم کی علمی خدمات پر ایم اے (اردو) کا ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا یہاں شدید انتظار ہے۔ تقریباً روزانہ فون پر بات ہوتی ہے۔ ہر روز مژدہ سناتے ہیں کہ کل آوں گا۔ اگر وہ بالاقساط تشریف لاتے تو اب تک مکمل طور پر پہنچ چکے ہوتے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب پچھلے ہفتے آج ہی کے دن کراچی میں تھے۔ صبح سے رات تک کا وقت اُن کے ساتھ گزرا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۴-۴-۸۳ء

☆

(۲۰)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا گرامی نامہ مل گیا۔ معذرت خواہ ہوں کہ جواب قدرے تاخیر سے دے رہا ہوں۔ سبب یہ ہوا کہ ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) آگئے تھے۔ اس کے بعد میں حیدر آباد سندھ چلا گیا۔ ایک صاحب کے پاس مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ دو دن ان نوادر کو دیکھنے میں صرف ہوئے۔ رات دس بجے واپس آیا ہوں اور صبح سب سے پہلا کام یہ کر رہا ہوں کہ آپ سے ہم کلام ہوں۔

کمبل پوش کے سفرنامے کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اُس کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ آپ اسے جلد از جلد شائع کرا دیں۔ اصل کام اس کی اشاعت ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون چھاپے۔ میں نے جو آپ سے درخواست کی تھی کہ اسے مرتب کر دیجیے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ اسے میں ہی چھاپوں گا۔ ایک اچھی چیز ہے اور اسے بہ ہر حال منظرِ عام پر آنا چاہیے۔ اس کا وسیلہ مکہ بکس ہو یا مکتبۂ اسلوب، ایک ہی بات ہے۔ ویسے بھی مکتبۂ اسلوب کی طرف سے اتنی جلدی اشاعت ممکن نہیں کیوں کہ تمام وسائل "تخلیقی ادب" کی نذر ہو چکے ہیں۔

میں نے شاید پہلے عرض کیا تھا کہ کمبل پوش کے بارے میں آپ کو اودھ کی تاریخوں یا دوسری کتابوں میں کچھ نہیں ملے گا۔ جو کچھ بھی ہے، وہ اسی سفرنامے کے اندر ہے۔

مرزا ابو طالب کا سفرنامہ "میر طالبی"☆۳۷ آپ کو کہاں سے مل گیا؟ کون سا ایڈیشن ہے اور یہ کس کتب خانے میں ہے؟ میں ایک عرصے سے اس کی تلاش میں ہوں۔ کراچی میں یہ کسی جگہ نہیں ہے۔ میوزیم میں ایک قلمی نسخہ ہے لیکن بہت خراب خط میں... کمبل پوش کا پہلا ایڈیشن یہاں نہیں ہے ورنہ عکس حاصل کر کے بھیج دیتا۔

آج کل یہاں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی وجہ سے بڑی رونق ہے۔ وہ اپنی موجودہ ملازمت

☆۳۷۔ مرزا ابو طالب اصفہانی لندنی کے سفرنامے کا پورا نام ہے: "میر طالبی فی بلادِ افرنجی"۔ اس کا مطبوعہ نسخہ نہ صرف یونی ورسٹی لائبریری لاہور میں موجود ہے بلکہ اس کے ایک حصے کا اردو ترجمہ از مخزول مراد آبادی بھی مذکورہ لائبریری میں محفوظ ہے۔ میں نے "عجائباتِ فرنگ" کے مفصل مقدمے میں ان دونوں سے بخوبی استفادہ کیا تھا۔

سے بہت خوش ہیں۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ وہ پنجاب یونی ورسٹی کی سیاست سے محفوظ ہو گئے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۹۔۵۔۸۳ء

☆

(۲۱)

برادرِ محترم و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کے گرامی نامے کا شدید انتظار تھا، میرا خیال تھا کہ آپ بھارت سے واپسی پر طویل خط لکھیں گے جن میں سفر کے تاثرات و واقعات ہوں گے۔ لیکن آپ نے چند سطروں پر ٹرخا دیا۔ بہ ہر حال اب سفر کی یادداشتوں کو ایک مضمون کی صورت میں چھپوا دیجیے تاکہ معلوم ہو کہ آپ کس کس سے ملے اور کیا کیا باتیں ہوئیں۔☆۳۸

''عجائبات فرنگ'' کا انتساب اپنے نام دیکھ کر میں سخت شرمندہ ہوا۔ صرف انتساب ہی کیا کم تھا کہ شعر پڑھ کر میں مزید نادم ہوا۔ بعض شریف لوگوں کا یہ دستور ہوتا ہے کہ جب کسی عزیز میں کوئی خوبی دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں تو یہ تصور کر لیتے ہیں کہ وہ مفروضہ خوبی اُس شخص میں موجود ہے۔ آپ کا طرزِ عمل بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ بہ ہر حال آپ نے میری عزت افزائی کی ہے اور اس کے لیے ممنون ہوں۔

''جنگ''، ''ڈان'' اور ''جسارت'' میں تبصرے عنقریب شائع ہوں گے۔ ''جسارت'' میں پاشا رحمان لکھیں گے۔

''تخلیقی ادب'' واقعی شائع ہو رہا ہے، بلکہ کچھ کاپیاں پریس جا بھی چکی ہیں۔ نومبر میں لازماً (ان شاء اللہ) شائع ہو جائے گا۔ اسے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ دونوں حصے آٹھ آٹھ سو سے زائد صفحات کے ہیں۔ فی الحال پہلا حصہ مارکیٹ میں آئے گا۔ اُس کے ایک ماہ بعد دوسرا۔ یہ فیصلہ کاروباری نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کی اشاعت کے ساتھ میں بھی لاہور آؤں گا۔

عطاء الحق قاسمی صاحب کے بارے میں ایک کالم (مختار مسعود کے حوالے سے) شائع ہوا تھا تو وہ کچھ ناخوش ہوئے تھے، اُن کا خط بھی آیا۔ اس مرتبہ انھیں خوش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معلوم نہیں خوش ہوئے یا نہیں۔ میں نے انھیں خط لکھا تھا کہ سلیم احمد مرحوم کے بارے میں انھوں نے اپنے اخبار میں جو کچھ شائع کیا ہے، مجھے اس کی ضرورت ہے۔ ملاقات ہو تو یاد دلا دیجیے گا۔

☆۳۸۔ یہ میرا بھارت کا پہلا سفر تھا۔ ۱۹۸۳ء میں میری پی ایچ ڈی (اردو) کے لیے رجسٹریشن کو تقریباً ساڑھے تین چار برس ہو چکے تھے، پاکستان میں موجود تمام ممکنہ منابع کھنگال چکا تھا۔ اب سوچا کہ ہندوستان کی لائبریریوں کو بھی جھانک آؤں۔ مولانا دریابادی کے سلسلے میں دہلی، لکھنؤ اور دریاباد سے بڑا قیمتی لوازمہ دستیاب ہوا۔ وہاں کے متعدد اہلِ علم اور مولانا کے ملنے والوں سے فیض اٹھایا۔ ہندوستان میں میرا یہ قیام تقریباً ایک ماہ کا تھا۔

''روایت'' والوں نے اتنا اچھا پرچہ چھاپا اور مارکیٹ میں نہیں پھیلایا۔ ''نیکی کر دریا میں ڈال'' کی اس سے عمدہ مثال نہیں ملے گی۔ اس رسالے کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں جانا چاہیے تھا[☆۳۹]

اکرام چغتائی صاحب کہاں ہیں۔ اُن کو میں نے بعض چیزوں کے فوٹو اسٹیٹ بھیجے تھے۔ خط بھی لکھا تھا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۰۔۱۰۔۸۳ء

☆

(۲۲)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا ۱۷/۱۰ کا خط آج ملا۔ اس سے پہلے ۱۲/۱۰ کو میں ایک خط لکھ چکا ہوں۔ شاید وہ بھی اب تک مل چکا ہوگا۔

''جسارت'' کا معاملہ مجھے تو مفاہمت کی منزل تک پہنچتا نظر نہیں آتا۔ افسوس کہ محمد صلاح الدین صاحب کی بے مثال خدمات اور قربانیوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اردو صحافت کی تاریخ میں ان قربانیوں کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب سے اختر شیرانی کا مضمون[☆۴۰] ان شاء اللہ جلد حاصل کر کے بھیج دوں گا۔

اس کا بے حد شکریہ کہ آپ غلام عباس پر لکھیں گے۔

خامہ بگوش کو تو علاحدگی کے لیے بہانہ چاہیے تھا۔ یہ حضرت بہت عرصے سے پر تول رہے تھے۔ اب تک انھیں کئی اخبار والوں نے لکھنے کی دعوت دی ہے مگر ان صاحب کا خیال ہے کہ کسی دوسری جگہ وہ خامہ بگوشی نہیں کریں گے۔ ایسی وضع داری بھی کہیں دیکھنے میں نہیں آئی[☆۴۱]

''امروز'' میں ڈاکٹر انور سدید کا مضمون کمبل پوش کے سلسلے میں دیکھا۔ انھوں نے صریحاً جانب داری سے کام لیا ہے۔ معلوم نہیں انھیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اگر مظفر عباس صاحب نے کسی جگہ اعلان کیا ہوتا کہ وہ اس سفرنامے کو ایڈیٹ کر رہے ہیں تو پھر کہا جا سکتا تھا کہ تحسین فراقی اُن کا خیال لے اُڑے۔ انھوں نے مضمون ضرور لکھا لیکن مضمون لکھنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس سفرنامے کے

☆۳۹۔ سہیل عمر کی ادارت میں شائع ہوا۔ پہلا پرچہ اپنے مباحث کی ندرت کے باعث اب تک حوالے کی چیز ہے۔

☆۴۰۔ اختر شیرانی نے ''رومان'' میں کمبل پوش کے سفرنامے کو متعارف کیا تھا۔

☆۴۱۔ محمد صلاح الدین کی ''جسارت'' سے علاحدگی کے بعد مشفق خواجہ نے بھی ''جسارت'' میں خامہ بگوشی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بعد ازاں ''تکبیر'' جاری ہونے پر یہ سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔

جملہ حقوق اُن کے نام محفوظ ہو گئے۔☆۴۲

آپ نے ۸۳ء کا جو جائزہ لکھا ہے اُسے سب نے پسند کیا اور اُن لوگوں نے بہت ہی پسند کیا جن کا اس میں ذکر آیا ہے۔☆۴۳ مختار زمن صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بھئی یہ تحسین فراقی تو بہت باخبر ہے۔ میں نے کہا، ہاں آپ کی کتاب ان کی نظر سے گزر گئی ورنہ اُن کے بے خبر رہ جانے کا بھی امکان تھا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱-۲۱-۸۴ء

☆

(۴۳)

برادر مکرم و محترم، سلام مسنون

ابھی ابھی آپ کا گرامی نامہ ملا۔ اس سے پہلے ایک خط میں لکھ چکا ہوں۔ امید ہے ملا ہوگا۔ اُس کے جواب کا مجھے انتظار ہے۔ شیخ منظور الٰہی کا تو معلوم ہوگیا کہ اُن کا پرچہ آپ نے اکرام چغتائی صاحب کو دے دیا تھا۔ اعجاز بٹالوی اور ڈاکٹر انور سجاد صاحب کے پرچے آپ نے انھیں براہِ راست پہنچائے تھے یا کسی اور کو دیے تھے؟

''عجائبات فرنگ'' کے سلسلے میں اخباری بحث بے کار ہے۔ آپ اب اس میں حصہ نہ لیں۔ یہ شعبہ اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے جنھیں اخباری مراسلات چھپوا کر زندہ رہنا ہے۔ آپ کو تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

میرے مراسلے کی اشاعت کے بعد انور سدید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ممکن ہو تو اس کا فوٹو اسٹیٹ بھجوا دیجیے۔ کرم ہوگا۔ میں نے اکرام چغتائی صاحب کا مضمون نہیں دیکھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یوسف خان کمبل پوش کا تذکرۂ غوثیہ والے کمبل پوش سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح کمبل پوش کے سفرنامے کا فارسی میں ہونا بھی مشکوک ہے۔ بہ ہر حال میں چغتائی صاحب کو خط لکھ رہا ہوں کہ فارسی مخطوطہ کس کتب خانے میں ہے۔☆۴۴

☆۴۲۔ محترم مظفر عباس نے میرے ''عجائبات فرنگ'' (اشاعت اگست ۱۹۸۳ء) شائع کرنے کے ایک برس بعد جب اس سفرنامے کو شائع کیا تو اس پر سنہ اشاعت ۱۹۸۲ء درج کیا۔ چوں کہ انھوں نے بغیر حوالے کے میرے مقدمے سے بھرپور استفادہ کیا تھا لہٰذا اس پر مباحث کا ایک سلسلہ آغاز ہوا۔ یہ سلسلہ اخبارات و رسائل میں کم و بیش ایک برس تک جاری رہا اور اس میں مرتب اول (تحسین فراقی) کے حق میں اور اس کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا۔

☆۴۳۔ یہ جائزہ ''نوائے وقت'' میں شائع ہوا تھا۔

☆۴۴۔ یہ فارسی مخطوطہ ''تاریخ یوسفی'' (یوسف خاں کمبل پوش) کے نام سے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ذخیرے میں محفوظ ہے اور اسے راقم الحروف مرتب کر رہا ہے۔ ایوانوف کے مرتبہ فارسی مخطوطات کے جامع کیٹلاگ میں اس کا تذکرہ ہے ص ۱۳۴-۱۳۵۔ اس مکتوب کی تحریر کے وقت خواجہ صاحب مذکورہ مخطوطے کے وجود سے لاعلم تھے۔ بعد میں انھی کی کاوشوں سے مجھے اس مخطوطے کی نقل ملی۔

ڈاکٹر یونس حسنی صاحب سے میری بات ہوگئی ہے۔ انھیں آپ کا خط بھی مل گیا ہے۔ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ آئندہ چند روز میں وہ اختر شیرانی کے مضمون کا عکس آپ کو براہِ راست بھیج دیں گے۔ تمنائی صاحب کو میں نے فون کیا، لیکن وہ موجود نہیں تھے۔ کل پھر فون کروں گا اور ۱۸۴۷ء والے نسخے کی بات کروں گا۔

آج ہی اظہر جاوید صاحب کا خط آیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''تخلیقی ادب'' لاہور کے اکثر کتب فروشوں کے پاس نہیں ہے۔ ذرا مختار صاحب سے بات کیجیے کہ انھوں نے اسے ٹھیک طرح پھیلایا یا نہیں؟ اور اگر کبھی فیروز سنز کی طرف جانے کا اتفاق ہو تو معلوم کیجیے کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ اظہر جاوید صاحب ہی نے بتایا ہے کہ پرچہ وہاں بھی نہیں ہے۔ اگر فروخت ہو چکا ہے تو الطاف صاحب سے کہیے کہ وہ مزید منگوائیں۔

زاہد حسین انجم صاحب کا سوال نامہ جلد ہی پُر کرکے آپ کو بھیج دوں گا۔[☆۴۵]

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۲۱-۲-۸۴ء

☆

(۴۴)

محترمی و مکرمی، سلامِ مسنون

معذرت خواہ ہوں کہ ایک عرصے کے بعد حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔ بارشوں اور مہمانوں کی آمد کچھ ایسی غیر متوقع رہی کہ کام معمول کے مطابق نہ ہو سکے۔ مولانا امداد صابری، ڈاکٹر تنویر علوی اور بعض دوسرے کرم فرما ہندوستان سے آئے۔ علوی صاحب تو تقریباً میرے ہی مہمان تھے۔ پھر اس دوران میں دو مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے کرم فرمایا۔ وہ پرسوں دوپہر کو رخصت ہوئے ہیں۔ اس دوران میں آپ سے ملاقات کی صورت نکلی تھی۔ گزشتہ ماہ کی ۲۴ کو سیٹ بھی ریزرو کرائی تھی لیکن اچانک میرے چھوٹے بھائی کی طبیعت تشویش ناک حد تک بگڑ گئی۔ اس لیے سفر منسوخ کرنا پڑا۔ اب وہ خدا کے فضل سے پوری طرح صحت یاب ہے۔ ''روایت'' کے لیے لکھنے کو تو بہت جی چاہتا ہے، لیکن میں اتنے کاموں میں گھرا ہوا ہوں کہ وہ اطمینانِ قلب میسر نہیں ہے جو اس قسم کے مضمون لکھنے کے لیے ضروری ہے۔ بہ ہر حال کبھی آئندہ سہی۔

جی ہاں عطا صاحب کا کالم میں نے بھی دیکھا تھا۔ مجھے بھی اس میں جھلاہٹ کا احساس ہوا

☆۴۵۔ زاہد حسین انجم اس زمانے میں ''ہمارے اہلِ قلم'' کے زیرِ عنوان ایک کتاب مرتب کر رہے تھے۔ میں نے ان کا دیا ہوا سوال نامہ خواجہ صاحب کو بھیجا تھا۔ یہ کتاب کافی برس پہلے لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔

تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں وہ کالم پسند نہیں آیا جو میں نے انھیں ایوارڈ ملنے پر لکھا تھا۔ بات یہ ہے کہ جو لوگ دنیا بھر پر طنز و مزاح کی "بارش" کرتے ہیں، اگر اُن کی طرف ایک قطرہ بھی آ جائے تو قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس مرتبہ میں نے اُن کے کالم کو موضوع بنا کر حساب کتاب برابر کر دیا ہے۔ آپ پڑھیں گے تو خوش ہوں گے۔ اصولاً تو عطا صاحب کو بھی خوش ہونا چاہیے، لیکن عادتاً شاید وہ خوش نہ ہوں۔ بہ حال میرے دل میں اُن کی محبت ہے۔ "دھنک" کے تازہ شمارے میں اصغر ندیم سید اور سمرن چوہدری کے کالموں میں اُن کے ساتھ جو "مذاق" کیا گیا ہے، وہ مجھے پسند نہیں آیا۔

جی ہاں "جائزۂ مخطوطات" کی دوسری جلد مقتدرہ سے چھپے گی۔ اُردو بورڈ تو سائنس بورڈ بن گیا، لہٰذا اس کے غیر سائنسی منصوبے مقتدرہ نے لے لیے۔ دوسری جلد پر نظرِ ثانی کا کام جاری ہے تاکہ نئے سال سے طباعت شروع ہو سکے۔

والد صاحب کے نام کے خطوط (از حضرت دریا بادیؒ) جلد ہی ارسال کروں گا۔ اس کام میں جو تاخیر ہوئی، اُس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مگر اب مزید تاخیر نہیں ہوگی۔

مکہ بکس کے مختار صاحب سے ملاقات تو ہوتی ہوگی۔ انھیں اپنی طرف سے کہیے کہ ہر ماہ تھوڑی تھوڑی رقم بھجواتے رہا کریں۔ اُن کی طرف تقریباً پانچ ہزار روپے واجب ہیں۔ اس وقت "تخلیقی ادب" کے دو شمارے تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔ اگر وہ توجہ فرمائیں تو کرم ہوگا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۵-۸-۸۴ء

☆

(۳۵)

حضرتِ من، سلامِ مسنون

گرامی نامہ مل گیا تھا۔ ممنون ہوں۔ جواب میں تاخیر کا سبب یہ تھا کہ "مشاہیر سائنس" ☆۴۶ کی تلاش میں رہا۔ سوچتا تھا کہ سراغ مل جائے تو خط لکھوں۔ ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی، لیکن مایوس بھی نہیں ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی اس سلسلے میں کچھ عرض کروں گا۔

سنا ہے آپ گوشہ نشین ہو گئے ہیں؟ معلوم نہیں یہ حقیقت ہے یا افواہ؟ گوشہ نشینی کے بڑے فائدے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ بھی خاصا حوصلہ افزا ہے۔ جب سے باہر کی دنیا سے تعلق قطع کیا ہے، اندر کی دنیا کا اندھیرا دور ہو گیا ہے۔ نہ کسی کا برا اثر قبول کرنے کا موقع ملتا ہے اور نہ کسی پر اپنا برا اثر ڈالتا ہوں۔ سوائے اپنی ذات کے ہر بلا سے محفوظ ہوں۔

☆۴۶۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کی اردو میں ترجمہ کردہ نایاب کتاب، اب یہ میرے ذخیرۂ کتب میں ہے۔

پچھلے دو مہینے مہمانوں کی نذر ہوئے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کل رات ہی چار دن قیام کر کے رخصت ہوئے ہیں۔ اُن کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔

اگر آپ ''فرہنگِ اقبال'' کے چند لطائف کی نشان دہی کر سکیں تو کرم ہوگا۔ ضخیم کتاب ہے۔ لطائف تلاش کرنے میں خاصا وقت صرف ہوگا۔ آپ چوں کہ اسے دیکھ چکے ہیں، اس لیے آپ کو سہولت ہوگی۔ کتاب میرے پاس ہے، لیکن ابھی اسے غور سے نہیں دیکھا۔ آپ کا خط آئے گا تو خامہ بگوش سے کہوں گا کہ آپ کی فرمائش پوری کی جائے۔☆۲۷

''تخلیقی ادب'' کے دو شمارے اس وقت پریس میں ہیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد شائع ہوں گے۔ ان کی تفصیل منسلکہ اطلاع ناموں سے معلوم ہوگی۔

کچھ کتابیں بھی جلد ہی بھیجوں گا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ ۲۳۔۷۔۸۵ء

☆

(۲۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کے پہلے خط کا جواب میں نے فوراً دیا تھا۔ خدا جانے آپ تک کیوں نہیں پہنچا۔ ہندوستان میں ۵۴ دن گزارنے کے بعد واپس آیا تو کھانسی کا شکار ہوگیا۔ ایسی کھانسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے بہت سے دن ضائع ہوئے۔ اب خدا کا شکر ہے کہ ٹھیک ہوں اور معمول کے مطابق کام کر رہا ہوں۔ ہندوستان کا سفر بہت کارآمد تھا۔ بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ آٹھ شہروں کے آثارِ قدیمہ و آثارِ ادبیہ سے استفادہ کیا۔ بہت سی کتابیں جمع کیں۔ اب تو یہ سب کچھ ایک خواب سا نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے دوستوں سے جو محبت ملی، وہ بے مثال تھی۔ میں توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مجھ جیسے آوارۂ کوئے نااہلاں کو ''ارمغان''☆۲۸ کے لائق سمجھا جائے گا۔ اسے دیکھ کر شرمندگی ہوئی۔ اس کے کچھ نسخے آنے والے ہیں۔ آپ کو بھجواؤں گا۔

ملاقاتوں کا جہاں تک تعلق ہے، دہلی، لکھنؤ، بمبئی، علی گڑھ، بھوپال اور آگرے کی تقریباً تمام قابلِ ذکر شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ نئے پرانے سبھی طرح کے ادیبوں سے۔ پرانے اور گوشہ نشین لوگوں کو تلاش کر کر کے اُن سے ملا۔ کبھی ملاقات ہوگی تو تفصیل عرض کروں گا۔

☆۲۷۔ نسیم امروہوی صاحب کی اس تصنیف میں متعدد نایاب تحقیقی تسامحات اور مذہبی تعصبات شامل تھے۔ میں نے ان کے پیشِ نظر خواجہ صاحب سے اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تھی۔

☆۲۸۔ یعنی ''مشفق خواجہ ـــــ ایک مطالعہ'' شائع کردہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۸۵ء۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے مقالہ مکمل کر کے داخل کر دیا۔ یہ تو محض رسمی کام ہے، ورنہ آپ کو اس ڈگری سے کیا حاصل ہوگا۔ آپ کی اصل ڈگری تو آپ کا علم ہے۔ خدا اس میں مزید اضافہ کرے۔ بعض نااہلوں کی وجہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بہت بدنام ہوگئی ہے۔ آپ کے مقالے کی اشاعت سے اس ڈگری کی سابقہ عزت بحال ہوگی۔☆۴۹

''تخلیقی ادب'' کا غلام عباس نمبر ان شاء اللہ اسی سال شائع ہوگا۔ یہ بہت پہلے چھپ جاتا، مگر اس دوران میں غلام عباس مرحوم کے ذاتی کاغذات کا ایک حصہ مجھے مل گیا۔ اس میں بہت سی کام کی چیزیں ہیں۔ اب یہ سات آٹھ سو صفحات کا نمبر بن جائے گا۔☆۵۰ آپ اس کے لیے ضرور کچھ لکھیے۔ لیکن اس سے پہلے عام شمارے کے لیے۔ یہ شمارہ جلد شائع ہوگا۔ اس میں ایک گوشہ فیضؔ کے لیے مخصوص کیا ہے۔ آپ کے لیے ایک موضوع سوجھا ہے، ''فیض کی نثر'' — مضامین، خطوط اور دیگر تحریریں — اس موضوع پر اب تک کسی نے جم کر نہیں لکھا۔ اگر آپ توجہ فرمائیں تو ایک اچھا مقالہ مجھے مل سکتا ہے۔

پچھلے دنوں صابر کلوری صاحب آئے تھے۔ وہ آپ کے لیے عندلیب شادانی (از نظیر صدیقی) لے گئے ہیں۔ صدیقی صاحب کی غزل اور خطوط والی کتابیں ملتان سے کسی نے شائع کی ہیں۔

مکتبہ کی طرف سے اس وقت چودہ کتابوں پر کام ہو رہا ہے۔ آٹھ دس کتابیں تو پریس میں ہیں۔ ابوالفضل صدیقی کے تین افسانوی مجموعے، ن م راشد پر جمیل جالبی صاحب کی کتاب، منٹو پر ممتاز شیریں کی کتاب، عسکری کے افسانے ایک ہی جلد میں، ڈی ایچ لارنس کے تراجم از مظفر علی سید۔ اسی طرح کی اور بھی کئی کام کی کتابیں۔ آپ کو مکتبۂ اسلوب کی ہر کتاب بھیجی جاتی ہے۔ پھر بھی فہرست دیکھ لیجیے (''تخلیقی ادب'' میں) اگر کوئی کتاب آپ کے پاس نہ ہو تو بھجوا دوں گا۔

شمیم احمد صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ دو روز قبل ہی آئے تھے۔ پچھلے دنوں وہ بیمار تھے۔ اب ٹھیک ہیں۔ اُن کے قلم کی برش کا ایک خاص مزاج ہے۔ اب اس عمر میں اس میں تبدیلی کیسے ہوسکتی ہے؟

آپ کے کالج کے رسالے مجلّہ ''تحقیق'' اور اورینٹل کالج میگزین مجھے نہیں مل رہے۔ توجہ فرمائیے۔ سنا ہے کہ اورینٹل کالج میگزین کا کوئی ایسا شمارہ شائع ہوا ہے جس میں ''ہمایوں'' کا اشاریہ ہے۔ یہ مجھے چاہیے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب کا ترکی سے خط آیا تھا۔ انھوں نے اپنا پتا نہیں لکھا۔ اس لیے جواب نہیں دے سکا۔ اگر آپ کو اُن کا پتا معلوم ہو تو مطلع فرمائیے۔

☆۴۹۔ میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ، خواجہ صاحب کا ارشاد درست نکلا۔ مقالہ ''عبدالماجد دریابادی...... احوال و آثار'' کے زیرِ عنوان شائع ہوا، اسے پورے برعظیم میں عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اس پر انگریزی اور اُردو میں متعدد عالمانہ مقالات اور تبصرے شائع ہوئے۔

☆۵۰۔ افسوس یہ خاص نمبر شائع نہ ہوسکا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۸۔۲۔۸۷ء

☆

(۲۷)

برادرِ مکرم، سلام مسنون

امجد طفیل صاحب کے ذریعے گرامی نامہ ملا اور اورینٹل کالج کا پرچہ۔ ممنون ہوں۔

امجد صاحب کے لیے عالی صاحب سے بات کروں گا، مگر ''جنگ'' والوں سے کسی نیکی کی توقع ذرا کم ہی ہے۔ بہ ہرحال اللہ مالک ہے۔

فیض کی نثر پر نہیں تو شاعری پر ہی لکھیے۔ گوشۂ فیض میں آپ کی شمولیت ضروری ہے۔ اس گوشے کے لیے بہت سی اچھی اور نادر تحریریں جمع ہو رہی ہیں، ۴۰۔۵۰ غیر مطبوعہ خطوط بھی مل گئے ہیں۔ ''ہمایوں'' کے ستمبر ۲۹ء کے شمارے میں فیض کا ایک مضمون ہے (مشرقی لٹریچر مغرب میں کیوں کر پہنچا) اگر اس کا عکس آپ کے ذریعے مل جائے تو سبحان اللہ☆۵۱۔ یہ اشاریہ شائع کر کے آپ کے کالج نے بڑا کام کیا ہے۔ نہایت مفید چیز ہے مگر بنیادی کام کرنے والی طالبات کے نام اگر سرورق پر ہوتے تو اچھا تھا۔ بعض جگہ عنوانات مبہم ہیں۔ مثلاً ''لاجواب شخصیت'' عنوان ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس کی شخصیت؟

''تخلیقی ادب'' نمبر ۳، نمبر ۴ میں آپ کی جو تحریریں شائع ہوئی تھیں، اُن کے ضمن میں ایک حقیر رقم کا چیک ارسالِ خدمت ہے۔ یہ معاوضہ نہیں، اعزازیہ ہے، قبول فرمائیے۔ مکتبۂ اسلوب کی اس وقت سات کتابیں پریس میں ہیں، اور اتنی ہی تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں۔

میں خیریت سے ہوں۔ آج کل اپنے مضامین کا مجموعہ ''تحقیق نامہ'' کے نام سے مرتب کر رہا ہوں☆۵۲ منتخب مضامین ہیں، پھر بھی ضخامت پانچ سو صفحات تک پہنچ گئی ہے۔ سوچا ہے کہ اس سال دو تین اپنی اور والد مرحوم کی کتابیں بھی شائع کر دی جائیں۔

خدا کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۲۸۔۲۔۸۶ء

☆

☆۵۱۔ خواجہ صاحب کو گمان تھا کہ یہ تحریر فیض احمد فیض کی ہے۔ اگلے خط میں خواجہ صاحب صحیح صورت حال سے آگاہ ہو گئے تھے۔

☆۵۲۔ خواجہ صاحب کے عالمانہ اسلوبِ تحقیق کے حامل یہ مضامین پاکستان و ہندوستان سے ایک ساتھ شائع ہوئے۔ پاکستان میں انھیں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی نے شائع کیا۔

(۲۸)

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ فیض احمد کے مضمون کا فوٹو اسٹیٹ آپ نے جس سرعت سے بھجوایا ہے، اُس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں! کاش آپ فوٹو اسٹیٹ کرانے سے پہلے یہ سوال کرتے کہ کیا مترجم فیض احمد فیض ہے؟ تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ ۱۹۲۹ء میں تو فیض صاحب نے مرے کالج سے انٹر کا امتحان پاس کیا تھا۔ ایم اے او کالج میں پروفیسری کا زمانہ تو بہت بعد کا ہے۔ بہ ہر حال یہ مضمون اس لائق ہے کہ ''قومی زبان'' جیسے کسی رسالے میں اسے دوبارہ چھپوا دیا جائے۔

فیض کی شاعری پر آپ مضمون ضرور لکھیے۔ وقت کی کوئی قید نہیں۔ یعنی ڈیڑھ دو ماہ میں لکھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ تاخیر ہوئی تو دشواری ہوگی۔ رسالے کی کتابت گکھڑ میں ہوتی ہے، پروف لاہور میں پڑھے جاتے ہیں، چھپتا کراچی میں ہے۔ ان مقامات آہ و فغاں کو نظر میں رکھیے۔

خلیق انجم صاحب یہاں آئے تھے تو کچھ لوگوں کو وہ کتاب تقسیم کر گئے تھے۔ چند نسخے مجھے بھی اُنھوں نے دیے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ کتاب کسی کو پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس قسم کے کام چوں کہ متعلقہ اشخاص کے ایما پر ہوتے ہیں، اس لیے ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے بھی اس قسم کے لوگوں میں شمار نہ کر لیا جائے۔ یقین کیجیے اگر اس کتاب کی اشاعت کا مجھے پہلے سے علم ہو جاتا تو میں اسے روک دیتا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح میں نے اپنے ''اعزاز'' میں منعقد ہونے والی درجنوں تقاریب سے کنارہ کشی اختیار کی۔ بہ ہر حال آپ کو ایک نسخہ اگلے چند دنوں میں مل جائے گا۔ اسے ارمغانِ محبت سمجھ کر دیکھیے گا۔ میں ہندوستانی دوستوں کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اظہارِ محبت کا ایسا طریقہ نکالا جس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں یعنی کسی پاکستانی کو اس انداز سے نوازا گیا ہوں۔[☆۵۳]

پچھلے دنوں ترقی پسندی کے نام پر تخریب پسندی کا جو اجتماع ہوا، اُس میں اردو اور پنجاب کے خلاف پر جوش تقریریں کی گئیں۔ اس اجتماع کا ادب سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ افسوس کہ پاکستان میں پاکستان کے بنیادی نظریات کے خلاف بولنے اور عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے۔

تازہ ''نئی نسلیں'' میرے پاس ہے۔ یہ انجم نعیم صاحب نے مجھے علی گڑھ ہی میں دیا تھا۔ بعض اور لوگوں کو بھی اُنھوں نے (کراچی میں) بھجوایا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی بیماری کی خبر اخباروں میں چھپی تھی، بے حد افسوس ہوا۔ خدا اُنھیں صحتِ کُلی سے نوازے۔ اگر آپ اُن کی عیادت کے لیے جائیں تو میری طرف سے بھی پرسش

☆۵۳۔ مشفق خواجہ ۱۹۸۵ء کے اواخر میں ہندوستان گئے تھے۔ ان کے چاہنے والوں نے اسی دوران مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے زیر اہتمام ''مشفق خواجہ — ایک مطالعہ'' کے زیر عنوان ایک ارمغان شائع کیا تھا۔ خواجہ صاحب کے اعزاز میں متعدد تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ انھوں نے اپنی بے نیازی اور درویشانہ مزاج کے پیش نظر ان میں جانے سے معذرت کی تھی۔

احوال فرما لیجیے گا۔

ہر خط میں ایک آدھ زحمت ضرور دیتا ہوں۔ میں نے علی گڑھ یونی ورسٹی میں بابائے اُردو کے نام پر پاکستانی مطبوعات کا شعبہ قائم کرایا تھا۔ اس کے لیے کتابیں بھیجنے کی ذمہ داری میری ہے۔ اب تک پانچ سو سے زیادہ کتابیں بھیج چکا ہوں۔ اب ایسا ہی ایک شعبہ ابنِ انشا مرحوم کے نام پر انجمن ترقیِ اُردو دہلی میں قائم کرایا ہے۔ ان دونوں اداروں نے ان سائی کلو پیڈیا آف اسلام (اُردو) کی فرمائش کی ہے۔ یہ بڑی مہنگی فرمائش ہے۔ اسے پورا کرنے کا ذریعہ پیدا ہوگیا ہے۔ فاران کلب کے عبدالرحمن چھاپرا صاحب میرے کرم فرما ہیں۔ اُنھوں نے فاران کلب کی طرف سے تحفتہً ایک ایک سیٹ مذکورہ اداروں کو بھیجنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ میں نے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کو خط لکھا تھا کہ وہ فاران کلب کراچی کے نام دو سیٹوں کا بل میرے پتے پر بھجوا دیں تاکہ رقم بھیج کر یہ سیٹ منگوا لیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے میرا خط دیکھا ہی نہ ہوگا۔ اب آپ زحمت کر کے ان سائی کلو پیڈیا کے دفتر سے بل میرے پتے پر بھجوا دیجیے۔ علمی اداروں کو پچاس فی صد رعایت ملتی ہے۔ بل اس رعایت کے ساتھ ہونا چاہیے۔

میرے پاس کچھ جلدیں کم ہیں۔ تفصیل [illegible] کاغذ پر لکھ رہا ہوں۔ ان کا بل آمنہ مشفق، لیکچرار سرسید گورنمنٹ کالج کراچی کے نام بھجوا دیجیے۔ ان [illegible] ے نام اس لیے کہ کالجوں کے اساتذہ کو پچاس فی صد رعایت ملتی ہے۔

اقبال ایوارڈ کی میٹنگ شاید اسی مہینے ہوگی۔ تب لاہور آؤں گا۔ گزشتہ مرتبہ کی طرح اس مرتبہ بھی زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزرے گا۔

جو بات شروع میں لکھنی چاہیے تھی، وہ اب لکھ رہا ہوں۔ گھر میں ایک فرد کے اضافے پر ہم دونوں کی طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔☆۵۴ میری دعا ہے کہ نومولود کی ذات اپنے والدین، بہنوں بھائیوں اور دیگر اہلِ خانہ کے لیے خیر و برکت کا باعث ہو۔ آمین۔

خدا کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ

میرے پاس ان سائی کلو پیڈیا آف اسلام (اُردو) کی مندرجہ ذیل جلدیں ہیں۔ ۲، ۳، ۵، ۹ تا ۱۳۔ ۱۳/۱، ۱۵، ۱/۱۶، ۲/۱۶، ۱/۱۷۔ ان جلدوں کے سوا جس قدر جلدیں دستیاب ہوں، اُن کا بل آمنہ مشفق، لیکچرار شعبۂ اُردو، سرسید گورنمنٹ کالج کراچی کے نام میرے پتے پر بھجوا دیجیے۔ رعایت ۵۰ فی صد کے ساتھ۔

☆۵۴۔ بیٹے عثمان نوید کی ولادت کی طرف اشارہ ہے۔ عثمان ۵/ مارچ ۱۹۸۶ء کو پیدا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب اپنے خطوط میں بالعموم تاریخ و سن کا اہتمام کرتے تھے مگر یہ خط بدون تاریخ و سنہ ہے۔ خط پر کراچی پوسٹ آفس کی مہر ۱۳/ یا ۱۸/ مارچ پڑھی جاتی ہے۔ گویا یہ خط انھی تاریخوں میں ۱۹۸۶ء میں لکھا گیا ہوگا۔

(۲۹)

برادرِ محترم و مکرم، سلامِ مسنون

گرامی نامہ ملا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔

صورتِ حال یہ ہے کہ مخزوں مراد آبادی کا ترجمہ نامکمل ہے۔ ڈاکٹر ثروت علی کا ترجمہ بے مزہ ہے۔ اس میں اغلاط بہت ہیں۔ پھر انھوں نے وہ اشعار حذف کردیے ہیں جو غالب نے خواتین کی تعریف میں لکھے تھے۔ اس سفرنامے میں حواشی کی بہت ضرورت ہے جو بہت آسانی سے لکھے جاسکتے ہیں مگر ڈاکٹر ثروت علی نے توجہ نہیں کی۔ چوں کہ یہ بہت اہم سفرنامہ ہے اس لیے اس کے ایک اچھے ترجمے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ثروت علی کا ترجمہ ان شاء اللہ عید کے بعد پوسٹ کردوں گا۔[☆۵۵]

"شگرف نامۂ ولایت[☆۵۶]" کا ترجمہ اردو شائع ہو چکا ہے۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے کوئی دس سال پہلے شائع کیا تھا۔ یہ ترجمہ بھی بہت خراب ہے۔ چوں کہ یہ برصغیر کا پہلا سفرنامہ ہے اس لیے بہت اہم ہے۔ اس کو بھی از سرِ ترجمہ کر کے شائع کرنا چاہیے۔ یہ بعد میں کیجیے گا۔

بنگالی کے خان بہادر عبداللطیف نے انگریزی میں اپنے حالات لکھے تھے جو "آٹو بائیوگرافی" کے نام سے چھپے تھے۔ کیا یہ کتاب پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں ہے؟

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ جولائی میں کراچی آرہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ غریب خانے پر ہی قیام فرمائیں گے۔ پہلے سے اطلاع کردیجیے گا کہ میں اسٹیشن یا ایئرپورٹ پر استقبال کے لیے حاضر ہوسکوں۔

انجمن ترقیِ اردو بورڈ کے لیے ڈاکٹر اکرام شاہ صاحب نے کتابیں بھیجیں نہ سراج منیر صاحب نے۔ ان دونوں کو یاد دہانی کرا دیجیے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے مجلس اور بزمِ اقبال کی مطبوعات بھیج دیں۔ خدا کرے آپ مع اہلِ خانہ خیریت سے ہوں۔

ایک ضروری بات رہ گئی۔ پروفیسر ممتاز حسین اردو کے نئے نقادوں پر ایک مقالہ لکھ رہے ہیں۔ وہ آپ کی کتاب کے خواہاں ہیں۔ کیا آپ انھیں ایک نسخہ بھیج سکتے ہیں۔ ان کا پتا ہے:

B-215، بلاک 10، فیڈرل بی ایریا، کراچی 38۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲-۶-۸۶ء

☆

☆۵۵۔ خواجہ صاحب کا اشارہ ابوطالب اصفہانی کے سفرنامے "مسیر طالبی فی بلاد افرنجی" کی طرف ہے۔ خواجہ صاحب کی خواہش تھی کہ میں اس فارسی سفرنامے کا اردو میں ترجمہ کردوں۔ افسوس میں اس اہم کام کے لیے وقت نہ نکال پایا۔

☆۵۶۔ یہ سفرنامہ اعتصام الدین کے قلم سے نکلا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے "عجائبات فرنگ" (۱۹۸۳ء) کا مقدمہ (از قلم راقم)۔

(۳۰)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

پہلے گرامی نامہ ملا اور پھر رسالے اور مقالے کے عکس۔ ان عنایات کے لیے تہ دل سے ممنون ہوں۔ چلتے وقت مٹھائی کے ڈبے عنایت فرما کر آپ نے مجھے بے حد شرمندہ کیا۔ جو کام مجھے کرنا چاہیے تھا وہ آپ نے کیا۔ آپ کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا، خصوصاً چوکھنڈی، دہلی اور ہالے جی کی سیر[☆۵۷] کاش ہمارے پاس کوئی مضبوط کار ہوتی تو ٹھٹھہ کی سیر بھی ہو جاتی۔ یہ دیکھنے کی جگہ ہے۔ اس شہر کی گلیوں میں امیر خسرو، طالب آملی، سرمد اور آزاد بلگرامی جیسے اکابر گھوم چکے ہیں۔ ہم آپ بھی گھوم لیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ آئندہ جب آپ تشریف لائیں گے تو اس شہر کی سیر ضرور ہوگی۔

اقبال پر جو مضامین اُن کی زندگی میں لکھے گئے تھے، اُن کے تراشے میں نے نکال لیے ہیں۔ اب اُن رسالوں کو تلاش کر رہا ہوں جن میں مزید مضامین موجود ہیں ("نقیب" بدایوں وغیرہ) ان شاء اللہ یہ سب چیزیں چند روز میں ارسال کر دوں گا۔ کیا سبطِ حسن کا مضمون آپ کے پاس ہے؟ یہ پہلے روزنامہ "پیام" میں چھپا تھا اور پھر "نیا ادب" میں۔ اگر نہ ہو تو یہ بھی بھیج دوں گا[☆۵۸]

مولانا ابو سلمان صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی ہوگی۔ وہ آج کل آپ ہی کے شہر میں ہیں۔ آپ ایک تولیہ بھول گئے تھے۔ یہ میں نے مولانا صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔ اگر نہ ملا ہو تو مانگ لیجیے۔ کہیں وہ اسے مولانا ابوالکلام آزاد کا تولیہ سمجھ کر اپنے استعمال میں نہ لے آئیں۔

"دید و شنید" پر آپ کے مضمون کا انتظار ہے۔ اسے اس کتاب کے ساتھ بہ طور دیباچہ بھی شائع کیا جائے گا[☆۵۹]

اس کا پیشگی شکریہ کہ آپ کو میرے باقی کام یاد ہیں۔

خدا کرے اب بھابی صاحبہ بالکل صحت یاب ہو گئی ہوں۔ ہم دونوں کی طرف سے مزاج پرسی کر لیجیے۔ ستمبر میں اسلام آباد کا پروگرام تو یقینی ہے۔ لاہور کے بارے میں ابھی فیصلہ نہیں کیا۔ ظاہر ہے بیگم ساتھ ہوں گی۔ "مال عرب پیشِ عرب" پر عمل کرتا ہوں۔ استاد ذوق بھی اسی پر عمل کرتے تھے۔

میں حضوری میں رہوں اُس کی نہ کس طرح مدام
ہے یہ مشہور مثل مال عرب پیش عرب

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

☆۵۷۔ اس ناقابلِ فراموش اور یادگار سفر میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کا بھی ساتھ رہا۔

☆۵۸۔ یہ مضامین بعض اور اہم مضامین کے ساتھ خواجہ صاحب کی تحریک پر "نقدِ اقبال ۔ حیاتِ اقبال میں" کے زیرِ عنوان بزمِ اقبال لاہور سے شائع ہوئے۔ سنہ اشاعت ۱۹۹۲۔

☆۵۹۔ سید رئیس احمد جعفری کے خاکوں کے مجموعے "دید و شنید" پر میں نے خواجہ صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو اس کتاب کی طبع ثانی کا مقدمہ بنا۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۸۔۸۔۸۶ء

☆

(۳۱)

حضرتِ من، سلام مسنون

کل مضمون ملا اور آج جعفری مرحوم پر مقالے کا عکس۔ آپ کا شکریہ کیوں ادا کروں، خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے آپ کی صورت میں مجھے ایک بہت بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ اہلِ ثروت مال پر زکوٰۃ دیتے ہیں اور آپ اپنے وقت پر۔ اور یہ وقت میرے کام آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ جس طرح میری جا و بے جا فرمائشوں کو پورا کرتے ہیں، اُس سے آپ کی اعلیٰ ظرفی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میری کم ظرفی دیکھیے کہ ہر وقت زحمت دینے کے لیے تیار رہتا ہوں۔

دیباچہ آپ نے بہت عمدہ لکھا ہے، بلکہ یہ کہوں گا کہ آپ نے حق ادا کر دیا ہے۔ جعفری مرحوم کی خوش قسمتی کہ انھیں آپ جیسا صاحب نظر نقاد ملا۔ جعفری پر درجنوں مضامین لکھے گئے ہیں، لیکن ایسا بھرپور مضمون کسی نے نہیں لکھا۔☆۶۰

جالبی صاحب عرصہ ہوا، رائے بھیج چکے ہیں۔ ذرا وہاں معلوم کیجیے۔ دوسرا خط ڈاکٹر ہاشمی صاحب کے لیے ہے۔

خدا کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۱۔۱۰۔۸۶ء

☆

(۳۲)

برادرِ مکرم، سلام مسنون

بے حد معذرت خواہ ہوں کہ ایک عرصے سے آپ کو خط نہیں لکھا۔ اس دوران میں پریشانیوں کا دائرہ وسیع ہوتا رہا۔ ۲۳ر مارچ کو آمنہ کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا۔ اس صدمے کی تاب نہ لا کر کم مئی کو اُن کی والدہ بھی رحلت فرما گئیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دو سانحوں کے بعد ہم لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔ اس دوران میں کالم بھی وہی چھپے جو پہلے کے لکھے رکھے تھے۔ کوئی کام کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ بھائی صاحب کی وفات پر آپ کا تعزیت نامہ مل گیا تھا۔ اس حرفِ تسلّی کا بے حد شکریہ۔

اس دوران کسی نہ کسی عنوان آپ یاد آتے رہے۔ ایک مرتبہ تو شمیم احمد صاحب نے وہ خط

☆۶۰۔ خواجہ صاحب نے اس طرح کی خُردنوازی کئی مواقع پر فرمائی۔

دکھایا جو انھوں نے آپ کو لکھا تھا۔ پھر ایک دوست رضوان عنایتی نے اپنے ایک خط کی نقل بھیجی جو انھوں نے آپ کے نام لکھا تھا۔

آپ کو اور رفیع الدین ہاشمی صاحب کو کراچی بلانے کا ارادہ ہے۔ جون کے آخر یا جولائی کے شروع میں۔ مقتدرہ نے ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتاب ''اُردو داستان'' شائع کی ہے۔ مقتدرہ کی طرف سے رونمائی کا جلسہ ہوگا۔☆۶۱ اگر آپ دونوں آمادہ ہوں تو سلسلہ جنبانی کی جائے۔ اس موقعے پر ٹھٹھہ کی سیر کا ارادہ بھی ہے۔☆۶۲

''میر طالبی'' کا کام کہاں تک پہنچا؟ امید ہے آپ اس سے غافل نہیں ہوں گے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۷۔۵۔۸۷ء

☆

(۳۳)

حضرتِ من، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا، ''جستجو'' کا دوسرا ایڈیشن ملا۔ بے حد ممنون ہوں۔ خوشی کی بات ہے کہ کسی تنقیدی کتاب کا دوسرا ایڈیشن مصنف اور فلیپ نگار کی زندگی میں شائع ہوا۔ کتاب اچھی چھپی ہے۔

اس بات کی بھی بے حد خوشی ہے کہ آپ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ تقریب تو ایک بہانہ ہے، اصل مقصد آپ لوگوں کی ملاقات ہے۔ ہاشمی صاحب نے لکھا ہے، آپ ہوائی جہاز میں سفر کرنے سے ڈرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ بہ حیثیت نقاد آپ اچھے اچھوں سے نہیں ڈرتے بلکہ انھیں ڈراتے ہیں اور بہ حیثیت مسافر کے ہوائی سفر سے ڈرتے ہیں۔ میرا خیال ہے اب کے آپ ہمت کر ہی لیں۔ اس کے بعد آپ کے دل سے خوف جاتا رہے گا اور پی آئی اے والوں کے دل میں پیدا ہو جائے گا۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتاب کی تقریب ۱۲؍ جولائی کو ہے۔ آپ ۱۱؍ کو آ جائیے۔ ۱۱؍ کو میرزا ادیب کے ساتھ شام منائی جا رہی ہے۔ آپ اس میں بھی شریک ہو سکیں گے۔ آپ دونوں کا قیام نیپا کے گیسٹ ہاؤس میں ہوگا۔ تقریب بھی اسی جگہ ہے۔ نیپا چورنگی، گلشنِ اقبال، یونی ورسٹی روڈ پر ایک مشہور جگہ ہے۔

☆۶۱۔ مجھے اس تقریب میں رونمائی کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ تقریب رونمائی نیپا کراچی کے ہال میں منعقد ہوئی۔ دیگر پڑھنے والوں میں ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر حنیف فوق کے نام یاد آ رہے ہیں۔

☆۶۲۔ ٹھٹھہ کی سیر اس سفر کا خالص منافع تھا۔ میرزا ادیب، ڈاکٹر انور سدید، رضا کاظمی، تقی حسین خسرو اور طاہر مسعود اس سفر میں ہمارے ہمراہ تھے۔ اس یادگار سفر کے بعد خواجہ صاحب نے اپنا ایک دلچسپ کالم مکلی کے قبرستان میں ''انشائیے کی تدفین'' لکھا تھا جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دیکھیے ''خامہ بگوش کے قلم سے'' (مرتبہ مظفر علی سید)، ص ۲۶۸۔۲۷۱۔

یہیں نیپا کا گیسٹ ہاؤس ہے۔ آپ اپنی آمد کی اطلاع دے دیجیے گا میں ایئر پورٹ یا ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا۔

آپ لوگوں کی آمد پر پروگرام تو کئی ہوں گے، ایک خاص پروگرام یہ ہے کہ ۱۲؍ جولائی کو ہم لوگ دیبل اور ٹھٹھہ کی سیر کریں گے۔

''اردو داستان'' پر آپ مختصر سا مضمون ہی لکھیے گا۔ جلسے میں مقررین کی تعداد خاصی زیادہ ہے، اس لیے اختصار سے کام لینا ہی مناسب ہوگا۔☆۶۳

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۵-۶-۸۷ء

☆

(۳۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ بے حد شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کے پہلے گرامی نامے کا بھی جواب نہیں دیا۔ گزشتہ ایک ماہ میں کچھ گھریلو قسم کی ایسی مصروفیات رہیں کہ میں کسی اور طرف توجہ نہیں کر سکا۔ میرا چھوٹا بھائی کئی سال کے بعد امریکا سے آیا تھا☆۶۴ بس تمام وقت اُس کے ساتھ گزرا اور جو وقت بچتا تھا آپ کے ساتھ گزرتا تھا، یعنی آپ کا مقالہ پیشِ نظر رہتا تھا۔ رفتار سست تھی، لیکن ایک ایک لفظ کو محسوس کر کے پڑھا۔ ایک چوتھائی باقی رہ گیا ہے۔ ان شاء اللہ اگلے چند دنوں میں یہ بھی پڑھ لوں گا اور اس بارے میں مفصل خط لکھوں گا۔ فی الحال صرف اتنا عرض کروں گا کہ یہ پی ایچ ڈی کا روایتی مقالہ نہیں ہے۔ صحیح معنوں میں ایک علمی کام ہے۔ مولانا دریا بادی خوش قسمت ہیں کہ انھیں آپ جیسا صاحب فکر و نظر سوانح نگار اور مبصر ملا۔

کیا ہی اچھا ہو اگر آپ جمیل الدین عالی صاحب کے نام ایک خط لکھ کر میرے پاس بھیج دیں کہ اس مقالے کو انجمن کی طرف سے شائع کر دیا جائے۔ انجمن سے اگرچہ ''علما'' کے بارے میں کتابیں نہیں چھپتیں مگر میں کوئی گنجائش نکالنے کی کوشش کروں گا۔ ضابطے کی کارروائی کے لیے عالی صاحب کے نام خط کا آنا ضروری ہے۔ رائے کے لیے مقالہ میرے پاس ہی آئے گا۔

نفیس اکیڈمی کے طارق اقبال صاحب کتاب میلے میں مصروف ہیں، اُن سے متعدد مرتبہ

☆۶۳۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتاب ''اردو داستان'' پر میرا مضمون اولاً ''قومی زبان'' میں شائع ہوا۔ بعد ازاں میری تالیف ''معاصر اردو ادب'' میں شامل ہوا۔ اس مضمون میں بخاری مرحوم کی بعض مزعومہ اولیات کو چیلنج کیا گیا تھا۔

☆۶۴۔ مراد ہیں راشد خواجہ۔

رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر ہاتھ نہ آئے۔ جوں ہی کوئی بات ہوگی، عرض کروں گا۔

''اوراق'' والوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ اچھا ہوا کہ آپ سنگسار کرنے والوں میں شامل نہیں ہوئے۔ میرزا ادیب صاحب نے غضب کردیا۔ آپ کے بارے میں ایک واہیات قسم کا جملہ لکھ دیا اور میرے بارے میں مضمون کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھ کر تکلیف ہوئی۔ ہوا یہ کہ پچھلے دنوں جب وہ یہاں آئے تھے تو میں نے اُن سے کہا تھا کہ آپ کے تمام خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ انھیں مجموعے کی صورت میں چھپواؤں گا۔ لوگ انھیں پڑھیں گے تو آپ پر ہنسیں گے اور مجھ پر روئیں گے۔ اس لیے کہ آپ نے مزے مزے کی باتیں لکھی ہیں اور مجھے چالیس برس تک مسلسل یہ باتیں پڑھنی پڑی ہیں۔ نہ جانے اُنھوں نے اس سے کیا نتیجہ نکالا۔

طاہر مسعود سنگاپور اور بنکاک میں ہنی مون منا کر کل ہی واپس آئے ہیں۔ اُن کا فون آیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ دونوں شہر تو شادی سے پہلے دیکھنے کے ہیں۔ شادی کے بعد تو ویسا ہی ہے جیسے جنت میں کوئی اپنے گھر سے دال روٹی ساتھ لے کر جائے۔

آج کل مفتی محمد رضا فرنگی محلی یہاں مقیم ہیں۔ لکھنؤ میں ان سے ایک مختصر ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں تفصیلی ملاقاتوں کا موقع ملا۔ صاحبِ علم بھی ہیں اور خوش مزاج بھی۔ یہ اپنے ایک عزیز کے ہاں مقیم ہیں۔ ان عزیز کے پاس بہت عمدہ خاندانی کتب خانہ ہے۔ کتابیں ضائع ہونے کا امکان ہے۔ مفتی صاحب نے فرمایا اپنے کام کی کتابیں آپ لے جائیے۔ ساٹھ ستر کتابیں میں نے انتخاب کیں۔ ان میں سے بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ اُنھیں ایک عرصے سے دیکھنے کی خواہش تھی، لیکن کسی جگہ دستیاب نہ ہوئی تھیں، مثلاً ''تاریخ ڈھاکا''، ''تاریخِ بنارس'' اور بعض قدیم شعرا کے دواوین۔

اس اطلاع سے بے حد خوشی ہوئی کہ عزیزی عمر سلمہ اب بالکل صحت یاب ہو چکے ہیں۔[☆۶۵] خدا انھیں اور آپ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔

طاہر مسعود کی بیوی نواب صدیق حسن خان کے پوتے کی پوتی ہیں۔ میں نے ان دونوں کے سامنے جب نواب صاحب کے فضائل و مناقب بیان کیے تو صاحب زادی بہت خوش ہوئیں کہ وہ ایک بڑے آدمی کی اولاد سے ہیں۔ طاہر مسعود حیران ہوا کہ وہ کہاں نکل آیا کہ جس علم و فضل کا میں نے تذکرہ کیا تھا وہ اس خاندان سے اس طرح رخصت ہو چکا ہے جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ ویسے طاہر مسعود بہت خوش ہیں کہ اس عمر میں آدمی چار چھ مہینے تو شادی کے بعد خوش رہتا ہی ہے۔

آمنہ کی بہن کا وہی حال ہے، بلکہ پہلے سے بھی خراب۔ اس وجہ سے آمنہ بہت پریشان رہتی ہیں۔[☆۶۶] خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

☆۶۵۔ میرا بڑا بیٹا عمر فاروق شاید ان دنوں تپ میعادی میں مبتلا تھا۔ خواجہ صاحب اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔

مشفق خواجہ ۱۷۔۱۔۸۸ء

☆

(۳۵)

برادرِ مکرم، سلام مسنون

سخت شرمندہ ہوں کہ یہ خط تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔ گزشتہ پندرہ دن نہایت کرب میں گزرے۔ اب کے فسادات خاص ہمارے محلے میں ہوئے۔ کرفیو سختی سے لگایا گیا۔ کل سے حالات بہتر ہیں لیکن رات دس بجے سے صبح چھ بجے تک کی پابندی ہے۔ اسی دوران میں برادرم اکرام چغتائی صاحب ترکی سے واپس آئے۔ انھیں ایرپورٹ سے گھر لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حمزہ فاروقی سے درخواست کی کہ وہ چغتائی صاحب کو ''وصول'' کریں، اپنی تحویل میں رکھیں اور شام کو روانہ کردیں۔ انھوں نے ازراہِ کرم ایسا ہی کیا۔

آپ کا مقالہ پڑھ لیا۔ اپنی سابقہ رائے پر کوئی اضافہ نہیں کروں گا کہ آپ نے جس طرح محنت کی ہے، ایسی اور اتنی محنت آج کل کوئی نہیں کرتا۔ میں نے اس سے استفادہ کیا اور میری معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ میں نے کہیں کہیں اپنی رائے پنسل سے مقابل کے صفحات پر لکھ دی ہے۔ بعض جگہ املا کی اغلاط نظر آئیں، پنسل ہی سے اُن کی نشان دہی کردی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی میں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جسے دیکھ کر آپ میری ''دقتِ نظر'' کی داد دیں۔ آپ نے داد دینے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ فرمایئے یہ مقالہ میں ڈاک سے بھیجوں یا کسی آنے جانے والے کا انتظار کروں تاکہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ آپ کی نظر سے گزر جائے۔

میں نے ایک خط پچھلے مہینے لکھا تھا، اُس کا جواب نہیں آیا۔

نفیس اکیڈمی کے طارق سلیم صاحب سے بات ہوئی۔ انھوں نے کہا ہے کہ اُن کے پاس کاتب ملازم ہیں، اس لیے باہر سے کتابت کرانا مہنگا پڑے گا۔ اُن کا کہنا ہے کہ آپ مسودہ بھیج دیجیے، کتابت آپ کے حسب منشا ہوگی اور اس کے پروف آپ کے ملاحظے کے لیے بھیج دیے جائیں گے۔ میری رائے میں یہی مناسب ہوگا۔ آپ اپنی پہلی فرصت میں مسودہ ارسال فرمایئے۔ اگر کچھ کام باقی ہو تو جتنے مضامین تیار ہیں، وہی بھیج دیجیے تاکہ کتابت شروع کرادی جائے۔ ☆۶۷ یہی پیغام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے لیے ہے۔ ویسے میں انھیں الگ خط بھی لکھ رہا ہوں۔

مکتبۂ اسلوب کی دو نئی کتابیں آپ کی خدمت میں ارسال ہیں۔ ''صدیوں کی زنجیر'' رضیہ فصیح احمد

☆۶۶۔ خواجہ صاحب کی خواہر نسبتی کسی کالج میں فارسی ادبیات کی استاد تھیں۔ ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں ایک مدت سے صاحبِ فراش ہیں مگر بڑی باہمت اور حوصلہ مند۔

کا ناول ہے اور آپ کی توجہ کا خاص مستحق۔ دوسری کتاب ڈاکٹر سہیل بخاری کی "اقبال: ایک صوفی شاعر" ہے۔ اس کے دو نسخے آپ کو ملیں گے، ایک ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو دے دیجیے گا۔

خواجہ حسن نظامی ہفت روزہ "روزنامچہ" شائع کرتے تھے۔ اس کے ایک شمارے میں مولانا دریا بادی کے بارے میں ایک دل چسپ چیز نظر آئی۔ یہ آپ کی نذر ہے۔ افسوس کہ اس سے پہلے اور بعد کے شمارے ہاتھ نہیں آئے۔

میں اپنے پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ "تخلیقی ادب" کا غلام عباس نمبر نکالنے کا ارادہ ہے۔ کچھ کام پہلے کا کیا رکھا ہے، باقی اگلے دو ایک مہینوں میں کرلوں گا۔ اس میں آپ کا کوئی مضمون ضرور ہونا چاہیے۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۶۔۲۔۸۸ء

☆

(۳۶)

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا، ممنون ہوں۔ رشک آتا ہے آپ پر کہ سیر و تفریح کے مواقع خوب ملتے ہیں۔ میں نے تو سوات کا صرف نام ہی سنا ہے۔ شعبۂ تعلیم میں ہونے کا یہی تو فائدہ ہے کہ تعلیم کے سوا سب چیزوں سے تعلق رہتا ہے (میں نے سوا لکھا ہے اسے علاوہ کے معنوں میں نہ لیجیے گا)۔

سوچا تھا کہ آپ کا مقالہ☆۶۸ دستی بھیجوں گا لیکن کوئی ایسا شخص نہ ملا۔ مجبوراً ڈاک سے بھیج رہا ہوں۔ اس کی وصولی کی فوراً اطلاع دیجیے گا۔ اس میں، میں نے کہیں کہیں پنسل سے نشانات لگائے ہیں تاکہ پڑھ کر انھیں مٹایا جاسکے۔ دوران تحریر جو باتیں ذہن میں آتی گئیں لکھتا گیا۔ یہ محض ایک آوارہ خواں کی باتیں ہیں۔ اس لیے آپ کو حق حاصل ہے کہ انھیں غلطی ہائے مضامین میں شمار کرلیں۔ کہیں کہیں املا کے بارے میں بھی کچھ عرض کیا ہے۔ میں نے اپنے نشانات کو دوبارہ نہیں دیکھا کہ کہیں میں خود ہی نہ مٹا دوں۔ اس لیے یہ زحمت آپ ہی کو فرمانی ہوگی۔

آپ کے ذخیرۂ الفاظ پر مجھے رشک آیا، چوں کہ آپ کا ادبیات کا مطالعہ بھی وسیع ہے اس لیے آپ الفاظ کے معاملے میں باثروت ہیں۔ بعض تراکیب بھی خوب ہیں۔ ایک ترکیب "سراب گردی" مجھے بہت پسند آئی ہے۔ اس عنوان سے ترقی پسند تحریک کی تاریخ لکھی جائے تو کیسا رہے؟ یہ ترکیب

☆۶۷۔ اشارہ "نقد اقبال۔ حیات اقبال میں" کی جانب ہے جسے شائع کرنے کی پیش کش نفیس اکیڈمی کراچی نے کی تھی تاہم خاصی تاخیر ہوجانے کے باعث میں نے اسے بزم اقبال لاہور سے شائع کرایا۔ تاخیر میری جانب سے تھی۔ ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس کی کمپوزنگ اور تصحیح وغیرہ کے معاملات کی میں براہ راست نگرانی کرسکوں گا۔

☆۶۸۔ مقالہ پی ایچ ڈی۔

آپ نے خود وضع فرمائی ہے یا مولانا ماجد کا عطیہ ہے؟

"مراۃ الشعر" کے نئے ایڈیشن کے ناشر کا سراغ میں نے لگا لیا ہے اس لیے اب آپ یہ کتاب حاصل کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ "مراۃ الشعر" پر جب آپ اتنی محنت کر رہے ہیں تو پھر اس پر آپ حواشی بھی کیوں نہ لکھ دیں (بشرطے کہ ضرورت ہو) ایسی صورت میں آپ محض مقدمہ نگار ہی نہ رہیں گے، مرتب بھی بن جائیں گے۔☆۶۹

اگر آپ نے حواشی لکھے تو پھر کتاب کو از سرِ نو کتابت کرانا ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔ کتاب کی طباعت میں دیر تو ہوگی مگر کام اچھا ہو جائے گا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے "یادِ ایام"☆۷۰ کی تدوین میں خاصی تاخیر کر دی۔ آپ ذرا انھیں یاد دلاتے رہیے۔

نفیس اکیڈمی والوں کا کام کہاں تک پہنچا۔ آپ تو کتابت کے لیے مضامین بھیجنے والے تھے۔

عیش برنی نے مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ آپ اُن کے تعاقب میں رہیے۔ کرم ہوگا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۸۔۳۔۸۸ء

☆

(۳۷)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

گرامی نامہ ملا، ممنون ہوں۔ آپ کی بھابی بھی خدا کے فضل سے اب بالکل اچھی ہیں۔ ایک مہینہ پریشانی میں گزرا۔ اب وہ اس لائق ہیں کہ دوسروں کو پریشان کر سکیں۔ وہ بھابی صاحبہ کی اور آپ کی شکر گزار ہیں کہ آپ نے اُن کی بیماری پر تشویش کا اظہار کیا۔ اس بیماری کے دوران مجھے احساس ہوا کہ بیوی کو بھی خدا کی نعمتوں میں شمار کرنا چاہیے۔ اسی لیے میں نے اُن کو حوصلہ دلانے کے لیے یہاں تک کہا کہ آپ تو باہر سے جلی ہیں، مجھے دیکھیے کہ اندر سے جل کر خاک ہو چکا ہوں مگر ہر وقت خوش رہتا ہوں۔☆۷۱

حادثہ باورچی خانے میں پیش آیا تھا۔ سوپ کا دیگچہ خدا جانے کیسے پھسل کر اُن پر جا گرا اور

☆۶۹۔ مراۃ الشعر (عبدالرحمٰن) کے بارے میں خواجہ صاحب بجا طور پر بڑی اچھی رائے رکھتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ نقد ادب و شعر کی یہ کتاب دوبارہ حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع ہو۔ افسوس کہ اور بہت سے علمی کاموں کی طرح یہ بھی ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

☆۷۰۔ عبدالرزاق کانپوری کی آپ بیتی۔ خواجہ صاحب کے ایما پر ہاشمی صاحب نے اس کی تدوین کا بیڑہ اٹھایا تھا مگر افسوس یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ پایا۔

بائیں ٹانگ گھٹنے سے پیر تک جل گئی اور وہ بھی اس طرح کہ کھال علاحدہ ہوگئی۔ اب وہ باورچی خانے سے اس حد تک خوف زدہ ہوگئی ہیں کہ دونوں وقت کا کھانا ہوٹل میں کھانے پر اصرار کرتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ صرف باورچی خانے سے خوف زدہ ہوئی ہیں، اگر گھر سے خوف زدہ ہوجاتیں تو پھر طعام کے ساتھ قیام بھی ہوٹل ہی میں ہوتا۔

کراچی کے حالات کی وجہ سے رسالے کو ماہنامہ کرنے کی تجویز فی الحال ملتوی کردی ہے۔ جس شہر میں ہر مہینے پندرہ روز کرفیو نافذ رہے، وہاں کوئی کام ہوتو کیسے؟ اب توجہ غلام عباس نمبر پر ہے، جس کے لیے لکھنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا۔ مگر اب آپ کے وعدوں پر کہاں تک زندہ رہوں؟

''مراۃ الشعر'' پر آپ ایسا کام کردیں جو یادگار رہے۔ ''زمان'' کی کوئی قید نہیں، اپنی سہولت سے کام کیجیے۔ البتہ ''مکان'' کی قید رہے گی کہ میں یہ کتاب اسی دنیا میں چھاپنا چاہتا ہوں۔

میں نے عزیزی طاہر مسعود کو بتایا تھا کہ آپ نے انھیں خواب میں دیکھا ہے۔ وہ عزیز بے حد شرمندہ ہوا کہ مولویوں کے خواب میں آنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس خواب کا کفارہ کس پر واجب ہے۔ آپ پر یا عزیز موصوف پر۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ ملاقات ہوتو میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔ حمزہ فاروقی کی کتاب ''حیات اقبال کے چند مخفی گوشے'' چھپ گئی ہے۔ کیا آپ کی نظر سے گزری؟ حمزہ حج پر گئے ہیں۔

اگست میں اقبال ایوارڈ کے سلسلے میں شاید لاہور آؤں۔ اب کے ایک دن لاہور کی تاریخی عمارات کے لیے وقف ہوگا۔ بشرطے کہ آپ ساتھ دیں۔ خدا کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۱۔۷۔۸۸ء

☆

(۳۸)

برادرِ مکرم، سلام مسنون

ملک اختر صاحب[۲] کی کتاب ''اقبال'' ملی۔ بے حد ممنون ہوں۔ موصوف نے میرے مقالے علم الاقتصاد'' کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ محض انتقامی کارروائی ہے۔ تاریخ ادب پر میرے کالم نے جو

۔ حقیقت ایسی ہی تھی۔ سبکِ ہندی میں پیرے ہوئے کسی شاعر کا کیا کمال کا شعر ہے:

ظاہر ہمہ سرسبز و درونش ہمہ خون است
از فطرتِ ما برگِ حنا را کہ خبر کرد

۲۔ مراد ڈاکٹر ملک حسن اختر سے ہے جن کی ''تاریخ ادب اردو'' کا خواجہ صاحب نے (اور بعد ازاں میں نے) بے لاگ کیا تھا۔ افسوس خواجہ صاحب کا یہ کالم ان کے کسی انتخاب میں جگہ نہ پاسکا۔

آگ لگائی تھی، وہ ابھی بجھی نہیں ہے۔ میں اُن کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ۳۱ برس پہلے کے میرے مقالے کی غلطیوں کی نشان دہی اب کی۔ شاید اس عرصے میں وہ بالغ ہونے کا انتظار کرتے رہے، لیکن یہ مرحلہ اب بھی نہیں آیا۔ میرا مقالہ ''علم الاقتصاد'' پر پہلا مقالہ تھا۔ اُس وقت جو کچھ دستیاب ہوا تھا، اُس سے استفادہ کیا تھا۔ ملک صاحب کے مقالے میں دو چار کام کی باتیں ہیں لیکن زیادہ تر فضول کے اعتراضات ہیں۔

یہ دل چسپ بات ہے کہ آج یہ کتاب ملی اور کل ہی میں نے اُن کی کتاب ''ایہام گوئی کی تحریک'' ختم کی ہے۔ نہایت دل چسپ کتاب ہے۔ اب کے کالم اسی پر آئے گا۔ ملک صاحب سے اس قسم کے تعلقات باقی رہنے چاہییں۔ اقبال والی کتاب کی حماقتوں پر میں کچھ نہیں لکھوں گا کہ کہیں اسے انتقامی کارروائی نہ سمجھا جائے۔

۸ر کو اقبال ایوارڈ کی میٹنگ ہے۔ میں سات کی شام کو لاہور پہنچوں گا۔ آمد کا وقت اور قیام کی جگہ سہیل عمر صاحب آپ کو بتا دیں گے۔ ۷ر کی شام اور نصف رات آپ میرے ساتھ گزاریں گے۔ ۱۲ر ستمبر کی شام کو میری واپسی ہوگی۔ حسبِ معمول زیادہ وقت آپ ہی کے ساتھ گزرے گا۔ آپ نے اپنی عمرِ عزیز اپنی مرضی سے ضائع کی، یہ چند دن میری خاطر ضائع کر لیجیے۔ ان لوگوں سے ملاقات کرنی ہے: سیف الدین سیف، صفدر میر، منیر نیازی، عبداللہ ملک۔ وجہ یہ ہے کہ ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ باقی ملاقاتیوں کی فہرست ساتھ لاؤں گا۔ اگر مذکورہ حضرات سے آپ ملاقات کا وقت لے لیں تو سبحان اللہ۔ کم از کم ان کی قیام گاہوں کے پتے تو حاصل کر رکھیے۔ ایک دن، امکان ہے کہ سرگودھا جاؤں۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے تاکہ دبستانِ سرگودھا کے لیے آپ کے دل میں بھی نرم گوشہ پیدا ہو۔ اتنی بہت سی فرمائشوں کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ ۷ر سے ۱۱ر تک لاہور سے باہر رہنے کا پروگرام بنا لیں۔ باقی باتیں بوقتِ ملاقات۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۔۹۔۸۸ء

☆

(۳۹)

حضرتِ من، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا اور کتاب بھی ملی۔ ان عنایات کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میں پچھلے دنوں کھانسی، نزلے، زکام اور بخار جیسی امراضِ خبیثہ میں مبتلا رہا۔ اس پر مہمانوں کی یلغار، غرض کہ اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر نبرد آزمائی رہی۔ اب خدا کا شکر ہے کہ بہت بہتر ہوں اور معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف ہوں۔

اقبال کا مقالہ ۲۳-۷ آپ نے جس طرح پیش کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ اب عمر

کے اعتبار سے نہ سہی، علم کے اعتبار سے بزرگ بن چکے ہیں۔ میں نے آپ کے دیباچے سے اور حواشی سے بہت کچھ حاصل کیا۔ خدا آپ کو نظرِ بد سے بچائے اور آپ اس قسم کے کاموں سے مجھ جیسے تشنہ کاموں کو سیراب کرتے رہیں۔ اب میں کسی فکری موضوع پر آپ کی ایک مستقل تصنیف کے انتظار میں ہوں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ''نقدِ اقبال، حیاتِ اقبال میں'' میں مکمل ہو گئی ہے۔ کاش آپ کراچی کی بیدل لائبریری کو بھی دیکھ لیتے۔ وہاں رسالوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ خیر اس کتاب کی دوسری جلد بھی تو مرتب ہو سکتی ہے۔

یہاں ایک صاحب (ظہیر احمد تاج) نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اقبال کو کافر ثابت کیا ہے۔ یہ کتاب چھپی نہیں۔ فوٹو اسٹیٹ کی صورت میں موصوف فروخت کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو اس کتاب کی ضرورت ہو تو میں اپنا نسخہ بھجوا دوں گا۔ اپنے لیے، ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے لیے اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے لیے عکس بنوا لیجیے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۷۔۱۔۸۹ء

☆

(۴۰)

برادرِ مکرم و عزیز، سلام مسنون

جب سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب یہاں سے گئے ہیں، آپ نے کوئی خط نہیں لکھا۔ انھوں نے اپنے قیام کے تلخ تجربات بیان کیے ہوں گے، بے آرامی کی تفصیلات سنائی ہوں گی، آپ نے سوچا ہوگا کہ ایسے آدمی کو کیا خط لکھا جائے جو مہمان کو گھر بلا کر خود مہمان بن جائے اور مہمان کو میزبان تصور کرے۔ یہ صحیح ہے کہ ہاشمی صاحب کے ساتھ میرے ہاں ویسا ہی سلوک کیا گیا جیسا جماعتِ اسلامی والے اپنے مخالفین سے کرتے ہیں، لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اُن کے قیام سے چند روز ہنسی خوشی گزر گئے۔ خوشی اس کی کہ اُن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہنسی اس پر آئی کہ وہ تحقیقی کام اس طرح کرتے رہے جیسے ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ میرے کتب خانے کی کتابوں کو انھوں نے اس طرح دیکھا جس طرح واجد علی شاہ اختر اپنی چار سو بے ناکا حیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے دیکھا کرتا تھا۔ کاش آپ

☆۳۷۔ میں نے ۱۹۸۶ء میں پہلی بار اقبال کا ایک معرکہ آرا مقالہ "Bedil in the Light of Bergson" جو دست نوشت تھا اور اقبال میوزیم میں محفوظ تھا، اپنے حواشی و تعلیقات کے ساتھ اقبال ریویو لاہور میں شائع کیا تھا۔ بعد ازاں اس کا اردو ترجمہ، اصل انگریزی متن، اس کی بازنوشت مع مزید حواشی و تعلیقات کے کتابی صورت میں شائع کیا۔ الحمد اللہ میرے اس تدوینی کام کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اولین داد حضرتِ خواجہ کے دربار سے ملی۔ یہ تدوینی کاوش اب سے کئی برس پہلے ایک ایرانی اسکالر نے فارسی میں ترجمہ کر کے شائع کر دی تھی۔ عنوان تھا ''مطالعۂ بیدل در پرتو اندیشہ ھاے برگسوں''۔

بھی ہوتے تو وقت اور بھی اچھا گزرتا۔

آج کی ڈاک سے ڈاکٹر ہاشمی صاحب کے نام ایک پیکٹ بھیجا ہے۔ اس میں ایک کتاب ''مکالمات جوش و راغب'' آپ کے لیے ہے۔ یہ نہایت زہریلی کتاب ہے۔ اسلام اور آنحضرتؐ کے بارے میں نہایت دریدہ دہنی سے کام لیا گیا ہے۔ میں نے کچھ جگہ سرخ قلم سے نشان لگائے ہیں۔ آپ پوری کتاب پڑھ ڈالیے اور اس پر ایک مضمون لکھ کر ''نوائے وقت'' یا کسی اور اخبار میں چھپوائیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے کہیے کہ وہ اس کا عکس اپنے لیے بنوالیں اور اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر صاحب اس کے دو عکس بنوالیں۔ ایک عطاء الحق قاسمی صاحب کو دے دیں۔ قاسمی صاحب سے آپ خود بات کیجیے۔ اس کا ایک نسخہ رفیق ڈوگر صاحب کے پاس بھی ہے۔ یہ کتاب بازار میں نہیں ملتی۔ راغب صاحب خفیہ طریقے سے فروخت کرتے ہیں تاکہ قیمت پوری ملے۔

جناب آپ نے یونیورسل کے شبیر احمد خان صاحب سے بات نہیں کی۔ اب تو سات مہینے سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اُن کی طرف =/۸۹۳۳ روپے کی رقم ہے، اگر وہ ہزار روپیہ مہینہ بھی ادا کرتے تو حساب بے باق ہو چکا ہوتا۔ اُن سے کہیے کہ علی الحساب ہی سہی، کچھ تو بھیجیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۷۔۴۔۸۹ء

☆

(۴۱)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا، بے حد ممنون ہوں۔ یہ خط بلا تاریخ ہے۔ اس کے مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ نے عید سے بہت پہلے لکھا تھا۔ عید کی وجہ سے ڈاک کے نظام میں خاصی گڑبڑ ہوئی ہے لاکھوں خط جنرل پوسٹ آفس میں ڈھیروں کی صورت میں پڑے ہیں۔

کتاب ''مکالمات جوش و راغب'' چور بازار سے ملتی ہے۔ اسلام کے خلاف لکھ کر یہ لوگ پیسا کما رہے ہیں۔ میں نے بمشکل دو نسخے حاصل کیے تھے۔ ایک ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بھیج دیا۔ ارادہ تھا کہ آپ کے لیے الگ حاصل کروں گا مگر نہ ملا۔ اب میں نے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے کہا ہے کہ وہ اس کا عکس آپ کے لیے بنوا دیں۔ آپ اُن سے مل لیجیے۔ اس کتاب کے خلاف لکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس شخص کی دیدہ دلیری دیکھیے کہ اس نے ''تکبیر'' کو ازالۂ حیثیت عرفی کا نوٹس بھجوایا ہے۔ گویا اسلام اور آنحضرتؐ کے خلاف لکھنا جرم نہیں (نعوذ باللہ) راغب مراد آبادی کے خلاف لکھنا جرم ہے۔ اس ظالم نے پوری کتاب اپنے خط میں شائع کی ہے۔ گویا ''بکف چراغ دارد'' والا معاملہ ہے۔

آپ کی کتاب پروفیسر ممتاز حسین اور صہبا لکھنوی کو مل گئی ہے۔ ڈاکٹر عقیل کو نہیں ملی۔ صہبا لکھنوی نے کہا کہ میں کسی کو رسید نہیں بھیجتا۔ ممتاز حسین صاحب شاید اس کی رسید بھیجیں گے۔ اُن کی کتاب (حالی) آپ کے لیے حاصل کر کے جلد ہی بھیجوں گا۔

شبیر صاحب نے عید سے ایک روز پہلے یا چار چھ روز بعد کا وعدہ تو کیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سی عید۔ آپ اُن سے جب بھی ملیے، وعدہ یا دولاتے رہیے۔ یہ لوگ اگر وعدے کی پابندی کریں تو بیمار پڑ جاتے ہیں۔ مکتبہ کے ڈوبنے کی وجہ یہی ہے کہ ڈیڑھ لاکھ کی رقم کتب فروشوں پر واجب ہے جسے وہ شیرِ مادر سمجھ کر جزوِ بدن بنا چکے ہیں۔

شافع قدوائی کی وہ کتاب مل گئی جو انھوں نے اپنے چچا کے لیے بھیجی تھی۔ شافع قدوائی☆۷۴ بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے اور بہت اچھا لکھتا ہے۔ علی گڑھ میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

آمنہ سلام لکھوا رہی ہیں، ہم دونوں کی طرف سے گھر میں آداب۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۹۔۵۔۸۹ء

☆

(۴۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ آپ کی ایک شاگرد لے کر آئی تھیں☆۷۵ اُن کے ساتھ اُن کے والد احسن صاحب بھی تھے۔ اشرف صبوحی کے سلسلے میں، میں نے بعض لوگوں سے فون پر بات کر کے ان کی ملاقات کا طے کرا دیا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر مختار الدین احمد کی وجہ سے بڑی رونق رہی۔ لاہور میں بھی انھوں نے چند دن گزارے۔ آپ سے ملاقات ہوئی؟

آج ہی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا مکہ مکرمہ سے خط آیا ہے۔ اُن کا کرم کہ انھوں نے مجھے یاد کیا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر مجھے کوئی یاد کرے۔

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے فون پر بتایا تھا کہ انھوں نے میری مرتبہ کتاب اقبال کے خلاف

☆۷۴۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نواسے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ ابلاغیات میں استاد ہیں۔ بہت عمدہ نقاد۔ لکھنؤ اور علی گڑھ میں میری ان کی متعدد ملاقاتیں رہیں۔

☆۷۵۔ میری ایک شاگرد سامیہ احسن میری نگرانی میں اشرف صبوحی پر ایم اے کا مقالہ تحریر کر رہی تھیں۔ خواجہ صاحب نے اپنی روایت کو نبھاتے ہوئے ان کی بھرپور رہ نمائی فرمائی۔ سامیہ احسن نے یہ مقالہ ''اشرف صبوحی... حیات اور ادبی کارنامے'' کے زیرِ عنوان لکھا اور بہت خوب لکھا۔

ایک لچر مضمون پڑھا ہے۔ پھر آپ نے بھی خط میں اس کا ذکر کیا۔ یہ کیسے لوگ ہیں کہ میری اصلاح کے لیے مضمون لکھتے ہیں اور مجھی کو نہیں بھیجتے۔ اگر ممکن ہو تو آپ یہ مضمون مجھے بجھوا دیجیے۔ دیکھوں تو سہی کہ موصوف نے دل کا غبار کس انداز سے نکالا ہے۔☆۷۶ ڈاکٹر انور سدید نے مجھے خط لکھا تھا کہ موصوف کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ مجھے افسوس ہوا۔ خدا انھیں صحت دے جسمانی بھی اور ذہنی بھی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۹۔۷۔۸۹ء

☆

(۴۳)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

اُس دن فون پر بات کیا ہوئی کہ ساعت اب تک نشے میں ہے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس چلے جایا کیجیے اور مجھ سے بات کرلیا کیجیے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا خط آیا ہے، حادثے کی تفصیل معلوم ہوئی۔ خدا انھیں جلد از جلد صحت یاب کرے۔ ایسے نفیس آدمی میں نے کم دیکھے ہیں۔ اُن کے لیے میرے دل میں جو محبت ہے، اُس کا اندازہ خود مجھے حادثے کی خبر سن کر ہوا۔ بے حد پریشانی ہوئی۔ جسمانی اعتبار سے تو وہ پہلے ہی لاغر مراد آبادی ہیں، اُن کے لیے تو ہوا کا تیز جھونکا بھی برداشت کرنا مشکل ہے، یہ اللہ کا خاص کرم ہے کہ وہ اتنا بڑا حادثہ سہہ گئے۔☆۷۷

دسمبر کے آخری ہفتے میں میرے بھتیجے کی شادی ہے۔ ولیمہ لاہور میں ہوگا۔ دسمبر کا آخری ہفتہ لاہور میں گزرے گا۔ شادی کی مصروفیت ایک دن کی ہوگی، باقی دن آپ کے ساتھ گزریں گے۔ پیشگی نوٹس دے رہا ہوں تاکہ آپ اپنے مصروف اوقات میں فضولیات کی گنجائش نکال سکیں۔

آج کل میں اپنے مقالات کی نظرِ ثانی کر رہا ہوں۔ بس یہ سمجھیے کہ تمام مقالات ازسرِ نو لکھ رہا ہوں۔ کام سمٹنے سے زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔ ''خوش معرکۂ زیبا'' کا مقدمہ آج کل زیرِ قلم ہے۔ نئے مسودے کو مطبوعہ متن سے کوئی نسبت نہیں رہی۔ بے شمار تبدیلیاں کی ہیں۔ اس مقدمے کے سلسلے میں آپ کو دو زحمتیں دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ سعادت خان ناصر کی تصنیف ''قصۂ اگر گل''، خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب نے مرتب کی تھی

☆۷۶۔ اشارہ ملک حسن اختر کے مضمون کی طرف ہے۔ مرحوم، مشفق خواجہ کی مخالفت کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے تھے۔

☆۷۷۔ یادش بخیر ان دنوں ہاشمی صاحب کے پاس ایک عدد موٹر سائیکل تھی۔ کسی گاڑی کے ساتھ ان کی موٹر سائیکل کا تصادم ہوا۔ انھیں خاصی چوٹیں آئیں۔ کئی ہفتے صاحبِ فراش رہے۔ اس حادثے کے بعد موٹر سائیکل کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

اور مجلس نے اسے شائع کیا تھا۔ داؤدی صاحب نے اس کا متن دو نولکشوری نسخوں سے مرتب کیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ یہ دونوں نسخے جو ۱۸۷۳ء اور ۱۹۲۶ء کے چھپے ہوئے ہیں، مجلس ترقی ادب کے کتب خانے میں ہیں۔ اگر نہ ہوں تو داؤدی صاحب سے معلوم کیجیے کہ کہاں ہیں۔ مجھے ان دونوں نسخوں کے ابتدا اور آخر کے دو دو صفحوں کے عکس درکار ہیں۔ مجلس کی لائبریری سے انھیں لیجیے اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے دفتر میں جو فوٹو اسٹیٹ مشین رکھی ہے، اُس کو کام میں لائیے۔

۲۔ مذکورہ کتاب کا کوئی نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری یا کسی اور کتب خانے میں ہو تو مطلع فرمائیے۔

۳۔ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں ''داستانِ اگر گل'' کے دو قلمی نسخے ہیں۔

ا) نمبر ۱۸۳۲/ ۴۸۵۲ (شیرانی کلیکشن میں)

ب) ۹-S-۸۵۳۸ (آذر کلیکشن)

یہ نسخے فارسی میں ہیں اور ان کا دوسرا نام ''قصۃ الجواہر'' بھی ہے۔ ازراہِ کرم انھیں دیکھ کر بتائیے کہ یہ دونوں الگ الگ داستانیں ہیں یا ایک ہی داستان کے دو نسخے ہیں؟ آپ کا جواب آنے پر فیصلہ کروں گا کہ ان سے استفادہ کس طرح کیا جائے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان دونوں قلمی نسخوں کے شروع اور آخر کے ۸-۸ صفحوں کے عکس مل جائیں؟☆۸۷

آپ کو بتایا تھا کہ مکتبۂ اسلوب میں نے بند کر دیا ہے۔ بیش تر کتابیں (کتابت شدہ) نفیس اکیڈمی کو دے دی ہیں۔ کراچی کے حالات میں اس قسم کا کام کرنا ممکن نہیں۔

میں اور آپ کی بھابی دونوں خیریت سے ہیں۔ خدا کرے آپ اور تمام اہلِ خانہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۳۰-۹-۸۹ء

☆

(۴۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا گرامی نامہ مل گیا تھا جس میں آپ نے مارچ کے آخر تک توجہ فرمانے کی خوش خبری سنائی تھی۔ میرے خیال میں آپ کو عکس بنوانے میں زحمت ہو رہی ہوگی۔ لہٰذا آپ دونوں مخطوطوں کے صرف شروع اور آخر کے ۴-۴ صفحات کے عکس بنوا لیجیے۔ آپ یقین کیجیے کتاب کی طباعت محض اس کام کی وجہ سے التوا میں ہے۔

۸۷۔ میں نے ان دونوں قلمی نسخوں کے اوّل و آخر صفحات کے عکس خواجہ صاحب کو بھجوا دیے تھے۔

اور سنایئے کیا حالات ہیں۔ جعفر بلوچ کی تقریبِ رونمائی کی تصویر دیکھی۔ آپ تقریر فرما رہے تھے۔ چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریر اچھی تھی (آپ کے چہرے کے نہیں، جعفر بلوچ کے چہرے کے)۔ ڈاکٹر وحید قریشی البتہ ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے بیگار میں پکڑے گئے ہوں۔

یہاں کے حالات بدستور ہیں۔ گولی اور بندوق کی سیاست اپنے عروج پر ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ دعا کیجیے۔ لیکن دعا سے پہلے میرے خط کا جواب دیجیے۔

کبھی کبھی ڈاکٹر وحید قریشی کے دفتر چلے جایا کیجیے۔ وہاں سے فون کرلیا کیجیے۔ مظفر علی سید صاحب سے آپ جان کے زیاں کا خیال کیے بغیر ملیے۔ ۱۹۸۹ء کا پورا سال میں نے ان کے ساتھ گزارا۔ اُن سے بہت کچھ حاصل کیا۔ سیّد صاحب بڑے فراخ دل ہیں۔ اپنے علم سے خود فائدہ نہیں اُٹھاتے، دوسرے ہی اُٹھاتے ہیں۔ ملاقات ہوتو میرا سلام کہیے اور وہ شعر بھی سنا دیجیے جو میں نے آپ کو لکھ بھیجا تھا۔☆۷۹

خدا کرے آپ مع اہلِ خانہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۸۔۴۔۹۰ء

☆

(۴۵)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب کو دو بجے کے قریب گھر پہنچا۔ رات کا باقی ماندہ حصہ ڈاک دیکھنے میں گزارا۔ جمعہ کے روز مکمل آرام کیا اور آج صبح سے میز پر اس طرح بیٹھا ہوں جیسے گزشتہ پندرہ روز لاہور میں نہیں گزارے کوئی طویل خواب دیکھا ہے۔ خوب صورت خواب میں نے ذرا کم ہی دیکھے ہیں۔ یہ خواب آپ کی وجہ سے اس لائق ہے کہ اسے ٹیپو سلطان کے خوابوں کی طرح محفوظ کرلیا جائے۔ میں اگر سر سے پیر تک زبان بن جاؤں تو بھی آپ کے لطف و کرم کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ یہ کام اُسی طرح ناممکن ہے جس طرح سر سے پیر تک زبان بن جانا۔ بہ ہر حال میں بے حد خوش ہوں کہ بے فکری کے چند روز آپ کے ساتھ گزارے۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ آپ نے خدا کے ایک گنہگار بندے کو خوش رکھا۔

کراچی سے روانگی کے وقت میں نے اُن کاموں کی ایک فہرست تیار کی تھی جو لاہور میں انجام دینے تھے۔ آج صبح وہ فہرست دیکھی تو معلوم ہوا کہ کوئی بھی کام انجام نہ دیا جاسکا۔ اب اس فہرست کو آئندہ کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں۔ بہ ہرحال یہ بھی غنیمت ہے کہ چلتے وقت گرامی کی بیاضوں کی زیارت

۷۹۔ خواجہ صاحب نے مجھے یہ شعر ۲۷ فروری ۱۹۹۰ء کو بھیجا تھا۔ شعر یہ تھا:

سلام بھی ہے زمانے میں اور دعا بھی ہے
ہمارے یار نے قاصد سے کچھ کہا بھی ہے

ہوگئی۔ اب ان کے عکس بنوانے کا اہتمام کیجیے۔ میں ہی نہیں، مولانا گرامی کی روح بھی آپ کی ممنون ہوگی[☆۸۰] میں انجم رحمانی صاحب کو میوزیم کے پتے پر خط لکھ رہا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں مدد فرمائیں۔ میوزیم میں دو اور چیزیں بھی میرے کام کی ہیں۔ ان کے عکس مطلوب ہیں۔ ایک تو یگانہ اور مرزا فہیم بیگ چغتائی کے خطوط جو تعداد میں چار پانچ سے زیادہ نہیں ہیں۔ میوزیم کی مطبوعہ فہرست میں ان کا حوالہ موجود ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک نے ''انقلاب'' ۱۹۴۵ء کے کسی شمارے میں اپنے کالم ''حرف و حکایت'' میں یگانہ کے خلاف لکھا تھا۔ شاید ایک یا دو کالم تھے۔ یگانہ نے ۷/ اگست ۴۵ء کے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے۔ قیاس ہے کہ جولائی کے کسی شمارے میں یہ کالم چھپا ہوگا۔ احتیاطاً آگے پیچھے کے کچھ اور شمارے بھی دیکھ لیجیے۔ اس کا عکس بھی درکار ہے۔

اب کچھ اور گزارشات:

۱) امید ہے سنگِ میل والوں سے نشان شدہ فہرست آپ نے لے لی ہوگی۔

۲) ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں میری کتابوں کی جو پیٹی رکھی ہے اُس کے لیے آج آپ نے یاد دہانی کرا دی ہوگی۔ اس پیٹی کو ادارے والے گڈز ٹرانسپورٹ سے بھیجیں گے۔ اس کی بلٹی آپ اُن سے لے لیجیے۔ بلٹی اور سنگِ میل کی فہرست بذریعہ رجسٹری پوسٹ کر دیجیے۔

۳) میاں چیمبرز میں جس دکان میں یکم کی شام کو ہم دونوں محمد سلیم الرحمٰن صاحب سے ملے تھے، اُس دکان کا نام میں بھول گیا ہوں۔ پورا پتا لکھ بھیجیں اور دکان کے مالک کا نام بھی۔ وہی صاحب جو آپ کو ''نے'' سنوائیں گے۔

''اردو'' غالب نمبر، نسخۂ برلن دیوانِ غالب اور نامہ ہای فارسی غالب چند روز بعد میں بھیجوں گا کیوں کہ انھیں تلاش کرنا ہے۔[☆۸۱] فی الحال آپ کی دلچسپی کی چار کتابیں بذریعہ رجسٹری پوسٹ کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر نور الحسن نقوی کی کتاب آج ہی موصول ہوئی ہے۔ اس پر اگر آپ چند سطریں بطور تبصرہ کہیں لکھ دیں تو یہ کتاب ہم دونوں پر حلال ہو جائے گی۔ بصورتِ دیگر آپ جانتے ہی ہیں کہ کیا ہوگا۔

سنگِ میل والی فہرست اور بلٹی کے ساتھ اس خط کے جواب سے جلد نوازیے۔ آپ کی بھابی، آپ کی بیگم صاحبہ اور بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں ہم دونوں کا سلام اور بچوں کے لیے پیار اور دعائیں۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۳۔۱۱۔۹۰ء

☆

☆۸۰۔ خواجہ صاحب کو ان بیاضوں کے عکس خود انجم صاحب نے فراہم کر دیے تھے۔ ان بیاضوں کے مطالعے کے بعد خواجہ صاحب ''کلیاتِ گرامی'' (مطبوعہ پیکیجز لمیٹڈ) کو ناقابلِ اعتبار سمجھنے لگے تھے کیوں کہ اس میں ان کے خیال میں متعدد متنی اغلاط تھیں۔

☆۸۱۔ خواجہ صاحب کی عنایت سے ''اردو'' کا غالب نمبر اور ''نامہ ہاے فارسی غالب'' مل گئے تھے۔ نسخۂ برلن شاید وہ تلاش نہ کر پائے اور یوں میں اس سے محروم رہا۔

(۳۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

بالغ تو خیر آپ پہلے ہی تھے، اب ماشاء اللہ ''بالغ نظر'' بھی ہوگئے ہیں۔ اسی لیے تو آپ نے لکھا ہے کہ - ''اس مرتبہ آپ کے لیے خاصی ناراضی کا سبب بنتا رہا'' - حیرت ہے کہ آپ نے یہ بات کیوں لکھی اور اس کے ساتھ ہی معذرت بھی پیش کی ہے۔ حضرت! ایسی باتیں آپ اُن لوگوں سے کیا کیجیے جن سے آپ کے ''جماعتی'' تعلقات ہوں۔ میں تو آپ کی اُنھی اداؤں کا شہید ہوں جن کے لیے آپ معذرت پیش کررہے ہیں۔ آپ کی خوش طبعی ہی تو مجھے آپ کے قریب لائی ہے ورنہ آپ کا تقویٰ کوئی ایسی نایاب شے نہیں جو کسی اور کے پاس نہ ہو۔ ''اہلِ مدرسہ'' میں ایک آپ ہی تو میرے کام کے ہیں۔ آپ سے جو تعلقِ خاطر ہے وہ رسمیات سے ماورا ہے۔ ہاں آپ سے شکایت ہے اور وہ یہ کہ آپ نے یہاں بہت کم وقت گزارا۔ کم از کم ایک ہفتہ آپ کو یہاں رہنا چاہیے تھا۔ آپ آئے تو میں خوش ہوا لیکن آپ کے جانے کے بعد اس سے کہیں زیادہ اداس ہوگیا۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ مجھ ''وصالی'' کو ''فراقی'' بنا دیا! آپ نے تو خیالی معذرت پیش کی ہے، میں حقیقی معذرت پیش کرتا ہوں کہ آپ کو وہ آرام نہ مل سکا جو ملنا چاہیے تھا۔ رات گرمی میں گزارنی پڑی۔ اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ آپ اپنے آپ کو میزبان تصور کیجیے اور مجھے مہمان تاکہ آپ کو اندازہ ہوسکے کہ اس خانہ بے تکلف میں جو زحمت آپ کو ہوئی اُس سے کہیں زیادہ زحمتیں میں اُٹھا رہا ہوں اور وہ بھی سال ہا سال سے۔ میں نے کبھی ایک شعر کہا تھا:

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اُسے بھی دیکھو جو اِک عمر یاں گزار گیا

انجم رحمانی صاحب آج کل کراچی میں تشریف رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے بڑا کرم کیا کہ گرامی کی دونوں بیاضوں کا عکس ساتھ لیتے آئے۔ ان بیاضوں کو ابھی سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ گرامی نے اپنے کلام میں خاصی ترامیم کی ہیں۔ ایک بیاض میرے پاس پہلے سے ہے، وہ زیادہ اہم ہے۔ اُس میں غیر مطبوعہ کلام بھی ہے اور کچھ اردو نثر کے نمونے بھی ہیں۔ ہجویات بھی ہیں۔ دو ہجویات آپ بھی سنیے صرف ایک ایک شعر میں ''ممدوحین'' کا کام تمام کردیا ہے۔ مولانا شبلی سے ناراض ہوئے تو کہا:

ایں ہمہ فتنہ آں ہمہ ارشاد
شبلیِ ہند و شبلیِ بغداد

حیدر آباد دکن میں کوئی عماد جنگ تھے۔ پستہ قد مگر کسی بہت بڑے عہدے پر فائز۔ اُن کے بارے میں گرامی فرماتے ہیں:

کوتاہ قد و بلند پایہ

امروز عماد جنگ و خایہ

طاہر مسعود صاحب نے "خبیثِ تہی دست" کی اچھی خبر لی ہے[۸۲] (تکبیر کے تازہ شمارے میں)۔ کتابوں کا پیکٹ مل گیا ہے۔ شکریہ۔

آپ کے علاقے کا پوسٹ کوڈ ۵۴۰۰۰ ہے۔ آپ اپنے گھر کے پتے کے ساتھ یہ نمبر ضرور لکھیے۔ اس سے خط جلد ملتا ہے۔

معذرت خواہ ہوں کہ خط میں کاٹ چھانٹ بہت ہوئی ہے۔ اس دوران میں کئی فون آئے لہٰذا کچھ کا کچھ لکھ گیا۔ لکھنے کے بعد خط کو پڑھا تو اپنی غلط نویسی کا اندازہ ہوا۔ (اس سطر کا آغاز کرتے وقت بھی ایک فون آ گیا۔)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کی خدمت میں سلام۔ انھوں نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۳۔۷۔۹۱ء

☆

(۴۷)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۲۱ر اکتوبر موصول ہوا، ممنون ہوں۔ انٹرویو کا تراشہ مل گیا ہے، لیکن ابھی پڑھا نہیں۔ جس روز اپنے آپ کو کسی جرم پر سزا دینے کا ارادہ ہوگا تو اسے پڑھوں گا... شاید آپ کو یقین نہیں آئے، اپنے بارے میں کوئی چیز پڑھنے کو کبھی جی نہیں چاہا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے میرے بارے میں جو کتاب دہلی سے شائع کی تھی چھ سال ہو گئے، آج تک اسے کھول کر نہیں دیکھا۔

عالمی اردو کانفرنس کے بارے میں آپ نے جو اطلاع دی ہے، وہ اس لیے حیرت ناک ہے کہ محمد علی کو اردو سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے حالاں کہ وہ فلموں میں اپنے ہیبت ناک مکالموں کے ذریعے اردو کو نقصان پہنچاتا رہا ہے۔ اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ اُس کی سربراہی میں بڑے بڑے ادیب کام کریں گے۔ یہ تو اردو کانفرنس ہے، یہ لوگ تو محمد علی کی دعوت پر فلموں میں بھی کام کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ محمد علی اردو کانفرنس منعقد کرنے کی بجائے کوئی ایسی فلم بنا ڈالے جس میں وہ تمام لوگ اداکاری کے جوہر دکھائیں جنھیں عالمی اردو کانفرنس میں اپنے بے ہنری کے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔

ادھر میں کوشش کر رہا ہوں کہ انجمن ترقیِ اردو ڈھنگ کے کام کرے۔ انجمن کے لیے ایک علمی پروگرام مرتب کر رہا ہوں۔ اس میں تراجم کا کام بھی ہوگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ۱۵۔۲۰ ایسی کتابوں

☆۸۲۔ اب کچھ یاد نہیں پڑتا کہ یہ ذات شریف کون تھے۔

کی فہرست بنا دیں جنھیں اردو میں منتقل کرنا بہت ضروری ہے۔ کتابیں ایسی ہوں کہ اُن کا امہات کتب میں شمار ہو سکے۔ علمی، ادبی، تاریخی (سائنس کے علاوہ) کسی بھی موضوع پر عہد آفریں کتابوں کا انتخاب کرا دیجیے۔ فی الحال انگریزی اور فارسی کتابوں کے نام لکھیے۔ دوسری زبانوں کی کتابوں سے ترجمہ کرانے میں بہت دشواریاں ہیں۔ مترجمین میں آپ بھی شامل ہوں گے لہٰذا فہرست میں ایسی دو چار کتابیں بھی شامل کیجیے جن کا ترجمہ کرنے میں آپ کو دلچسپی ہو۔☆۸۳

میری کتاب ''تحقیق نامہ'' خدا خدا کر کے پریس پہنچ چکی ہے۔ ۵ر نومبر تک چھپ جائے گی۔ ناشر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ہے لیکن میں اپنی نگرانی میں چھپوا رہا ہوں تا کہ یہ کم از کم کتابت کی غلطیوں سے پاک ہو۔

''تاریخ یوسفی'' کے لیے شانتی رنجن صاحب کو بھی خط لکھا ہے کہ شروع اور آخر کے پانچ پانچ صفحات کا عکس بھجوا دیں۔ سنا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی والے کسی مخطوطے کی مکمل نقل نہیں دیتے۔ ڈاکٹر مختار الدین اپنے ذرائع سے مائیکروفلم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

عصمت چغتائی کے انتقال کی خبر آپ نے سن لی ہوگی۔ افسوس ہوا۔ اس سے زیادہ افسوس اس پر ہوا کہ انھیں نذر آتش کر دیا گیا۔

خدا کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔

میں شاید نومبر میں لاہور آؤں۔ آپ کے علاقے کا کوڈ نمبر ۵۴۰۰۰ ہے۔ گھر کے پتے کے ساتھ ضرور لکھا کیجیے۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۷۔۱۰۔۹۱ء

☆

(۴۸)

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا، ممنون ہوں۔ یہ جان کر اطمینان ہوا کہ دوا آپ کو مل گئی۔ یہ دوا مرہم کی صورت میں کہیں دستیاب نہیں ہوئی۔ اب ایک صاحب لندن گئے ہیں۔ دو چار روز بعد اُن کی واپسی ہوگی۔ اُن سے بھی کہا ہے کہ وہ اس دوا کو تلاش کریں۔ ویسے اب بچے کی آنکھ کی حالت کیا ہے؟ خدا کرے کہ وہ اب تک بالکل صحت یاب ہو چکا ہو۔

میرے پاس ''معاصر'' کا شمارہ نمبر ۱۴ ہے۔ ''معاصر'' اور ''تحریر'' کے کچھ پرچے جمیل جالبی

☆۸۳۔ یہ کام انجمن تو بوجوہ نہ کر سکی البتہ بعد ازاں مقتدرہ قومی زبان نے بعض امہات کتب کے اردو تراجم شائع کیے۔ ان تراجم کے شائع ہونے میں خواجہ صاحب کی پرزور تحریک بھی شامل تھی۔ میں نے ان کے ارشاد کے بموجب ایک مفصل فہرست تیار کر کے انھیں بھجوا دی تھی۔

صاحب نے کئی سال پہلے مجھ سے لیے تھے اور اب وہ اُن کی کتابوں میں ''ذم'' ہو چکے ہیں۔ وہ انھیں تلاش کرتے ہیں مگر نہیں ملتے۔ اگر شمارہ نمبر۱۴ بھی ''مذموم'' رسالوں میں شامل ہوا تو آپ سے معذرت، بصورتِ دیگر جلد ہی اس کا عکس بھیج دوں گا۔ قاضی عبدالودود کا یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ ☆۸۴ اُن کے مقالات کی جلد اوّل ابھی تک چھپی ہے، اُس میں بھی یہ شامل نہیں ہے۔ قاضی صاحب، مولوی عبدالحق کے پہلے بڑے مداح تھے، اپنے رسالے ''معیار'' میں انھوں نے مولوی صاحب کی پورے صفحے کی رنگین تصویر چھاپی تھی اور ایک تعریفی نوٹ بھی لکھا تھا لیکن پھر وہ بعض وجوہ سے مولوی صاحب کے خلاف ہوگئے۔ اس مقالے کے بین السطور میں یہی مخالفت کارفرما ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس کا جواب لکھنا شروع کیا تھا۔ ''قومی زبان'' میں ایک یا دو قسطیں میں نے چھاپی تھیں کہ مولوی عبدالحق نے منع کردیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے آپ کی کتاب ابھی تک شائع نہیں کی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے بہ یک وقت درجنوں کتابوں کو ''زیرِ طبع'' ڈال رکھا ہے۔ آپ کے ساتھ تو جو سلوک ہو رہا ہے، اپنی نیاز مندی کی بنا پر آپ اُس کے مستحق ہیں، لیکن میرے ساتھ جو سلوک ہوا ہے، وہ مثالی ہے۔ مجھ سے اُنھوں نے کہا، ''تحقیق نامہ'' آپ وہیں چھپوا لیجیے جو خرچ ہوگا بھیج دیا جائے گا۔ کتاب چھپوا کر بھجوا دی گئی، اس پر تقریباً ۳۶ ہزار خرچ ہوئے، پریس، کاتب اور کاغذ وغیرہ کی رسیدیں نومبر کے شروع میں بھجوا دیں۔ فون پر بات ہوتی ہے اور میں رقم کا مطالبہ کرتا ہوں تو جواب ملتا ہے، آپ کو پیسے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن میں تو اس صورتِ حال کو گوارا کرسکتا ہوں، اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کی نیت بخیر ہے، بس ذرا منصوبہ بندی کرنے میں وہ ڈھیلے ہیں۔ ایک ایک وقت میں بیسیوں کتابوں پر کام ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بیسیوں کتابیں ''زیرِ طبع'' رہ جاتی ہیں... ہاں مزید لطیفہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے میں نے اپنی کتاب کے ایک سو نسخے خریدے۔ اُن کا بل تقاضے کے خط کے ساتھ فوراً وصول ہوگیا۔ لیکن ایسی باتوں سے ڈاکٹر صاحب کی محبت میرے دل میں کم نہیں ہوتی، بڑھتی ہے۔ خدا انھیں صحت دے اور درازیِ عمر۔ ڈاکٹر صاحب کی کسی بات کا آپ برا نہ مانا کیجیے۔ اگر آپ کی کتاب وہ کسی اور کے نام سے بھی چھاپ دیں تو مجھے اس میں بھی آپ ہی کا کوئی فائدہ ہوگا۔

دوسرا خط امجد طفیل صاحب کے لیے ہے۔☆۸۵ مجھے اُن کا پتا معلوم نہیں۔ ازراہِ کرم انھیں بھجوا دیجیے۔ خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱-۲-۹۲ء

☆

☆۸۴۔ ''معاصر'' (پٹنہ) میں شائع ہونے والی یہ تین قسطیں اب ''مولوی عبدالحق بحیثیت محقق'' کے زیرِ عنوان شائع ہو چکی ہیں۔

☆۸۵۔ غالباً یہ وہی خط تھا جس میں امجد طفیل کی قرۃ العین حیدر پر تالیف کی خوب داد دی گئی تھی۔

(۴۹)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

یہ جان کر اطمینان ہوا کہ عزیزی عثمان نوید سلمہ☆۸۶ کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ دعا ہے کہ اُسے جلد از جلد صحت کلّی عطا ہو۔ آمین

آپ کے خط کا جواب تاخیر سے دینے کا سبب یہ ہے کہ "معاصر" کا شمارہ نمبر ۱۴ تلاش کرنے میں وقت ہوئی۔ میرے تمام رسالے ترتیب کے ساتھ رکھے ہیں اور بغیر کسی دقت کے مل جاتے ہیں۔ ہوا یہ کہ سائز چھوٹا ہونے کی وجہ سے معاصر کے دو تین رسالے شیلف کے پیچھے گر گئے۔ کل صفائی میں یہ دستیاب ہوئے۔ انھیں میں شمارہ نمبر ۱۴ بھی تھا۔ مطلوبہ مضمون کا عکس پیش کر رہا ہوں۔ مولوی عبدالحق پر آج کل کیا کام پیشِ نظر ہے؟

ڈاکٹر وحید قریشی سے کسی نے "لگائی بجھائی" کی تھی، آپ کا خط آنے کے بعد میں نے انھیں پوری بات بتائی، وہ مطمئن ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب دل کے بہت اچھے ہیں، ہر معاملے کے پکے ہیں بس ذرا کانوں کے کچے ہیں۔ بابائے اردو میں بھی یہ کمزوری تھی۔ لہٰذا اس معاملے کو رفت و گزشت سمجھیے۔ ڈاکٹر صاحب سے کسی وقت جا کر مل لیجیے گا☆۸۷

گلیم پوش کی "تاریخ یوسفی" کے لیے میں نے ڈاکٹر مختار الدین صاحب کو لکھا تھا، کل ہی اُن کا خط آیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ضروری کارروائی کر رہے ہیں۔

کراچی کے ایک شاعر/افسانہ نگار صغیر ملال تھے۔ ۲۶ر جنوری کو عین جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی پانچ چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر کراچی کے اخباروں کے ادبی صفحات پر اس جواں مرگ کی موت کی خبر بھی شائع نہیں کی گئی۔ محض اس لیے کہ وہ اُن لوگوں کا منظورِ نظر نہیں تھا جو اخباروں کے ادبی صفحات مرتب کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا مجھے بے حد افسوس ہوا اور میں نے طے کیا کہ "غالب" یا کسی اور رسالے میں مرحوم کے بارے میں ایک گوشہ شائع کیا جائے۔ کئی دوستوں کو مضمون لکھنے کی زحمت دے رہا ہوں، ظاہر ہے کہ آپ زحمت اُٹھانے والوں میں سرِفہرست ہیں لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ آپ صرف میری وجہ سے مضمون لکھیں۔ آپ مرحوم کی کتابیں پڑھ لیں، اگر ان میں کوئی خوبی نظر آئے تو مضمون لکھیے ۔ اب آپ یہ بتائیے کہ کیا مرحوم کی کوئی کتاب آپ کے پاس ہے؟ میں ساری کتابیں پیش کر سکتا ہوں۔ اس ضمن میں، میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

میں حسبِ معمول اپنے کاموں میں خوش ہوں۔ زندگی، خدا کا شکر ہے کہ مزے سے گزر رہی

☆۸۶۔ میرا چھوٹا بیٹا جو بیماریِ چشم میں مبتلا ہو کر میو اسپتال میں داخل تھا۔

☆۸۷۔ مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری میں یوم غالب کے حوالے سے ایک تقریب میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے میں نے بڑے ادب و احترام سے ڈاکٹر وحید قریشی سے خفیف سا اختلاف کیا تھا۔ یار لوگ اسے لے اُڑے جس سے قدرتاً وحید قریشی صاحب کو مجھ سے شکایت پیدا ہوئی۔

ہیں۔ صبح اُٹھتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے پہلی مرتبہ دنیا میں آیا ہوں۔ اتنا خوش ہوتا ہوں کہ اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے۔

کیا آپ نے ''آبِ گُم'' پڑھ لی؟ اس سلسلے میں آپ کی رائے جاننے کا مشتاق ہوں۔

سید صاحب کا تبصرہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ آپ کا خط آنے کے بعد اس کا فوٹو اسٹیٹ حاصل کیا۔ سید صاحب کو سات خون معاف ہیں، وہ جو چاہیں لکھیں لیکن جس ''قاری'' کی ہم دردی میں اُنھوں نے لکھا ہے، معلوم نہیں وہ کون ہے؟ میں نے کوئی ناول تو لکھا نہیں جو قاری سے ہم دردی کی گنجائش ہو۔ بعض دفعہ تبصروں میں ''توازن'' برقرار رکھنے کے لیے اس قسم کی ایک آدھ بات لکھ دی جاتی ہے۔ سید صاحب نے بھی توازن برقرار رکھا ہے۔ خدا اُنھیں خوش رکھے۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۸-۳-۹۲ء

☆

(۵۰)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

مکتوبِ گرامی ڈاکٹر محمد علی صاحب[☆۸۸] کے ذریعے ملا۔ اب تو آپ اُسی وقت خط لکھتے ہیں جب آپ کے کسی شاگرد یا استاد کو کراچی آنا ہوتا ہے۔ اگر آنے والے کے پاس آپ کا خط نہ ہو تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ شخص آپ کا شاگرد ہے یا استاد۔ بہ ہر حال میں ممنون ہوں کہ آپ کسی نہ کسی بہانے مجھے یاد رکھتے ہیں۔ پہلے آپ کے شاگرد کامران آئے۔ اسٹیشن سے سیدھے۔ ایسا تو میں نے خود بھی کبھی نہیں کیا۔ کراچی سے باہر جاتا ہوں تو ایئر پورٹ سے سیدھا کسی بھائی کے گھر جاتا ہوں۔ کچھ دیر آرام کرتا ہوں اور جب ناگفتہ بہ حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے تو گھر آتا ہوں۔ کامران صاحب سے میں نے کہا کہ اس گھر میں ٹھہرنا بہت بڑا جہاد ہے، جہاں خود مجھے تکلیف سے رہنا پڑتا ہو، وہاں آپ کا کیا حال ہوگا۔ کہنے لگے، سفر میں تکالیف تو ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے معاون کو بلایا اور کہا کہ تم خود کتابوں کا تکیہ بنا کر سو جاؤ، اور اپنا بستر ان کے حوالے کر دو۔ کامران صاحب نے دو راتیں میرے ہاں بسر کیں اور پھر بھاگ گئے۔ کم حوصلہ تھے۔ اس لیے حالات کی تاب نہ لا سکے۔[☆۸۹]

استادِ گرامی گزشتہ جمعہ کو اپنی بیگم اور بچی کے ساتھ تشریف لائے۔ تین چار گھنٹے میرے پاس

☆۸۸۔ اسلامیہ کالج لاہور میں میرے معاشیات کے استاد۔ مجھ پر اب تک مہربان ہیں۔ ڈاکٹر نہیں ہیں۔

☆۸۹۔ میرے شاگرد، اب ڈاکٹر محمد کامران۔ ان دنوں پروفیسر احمد علی پر میری نگرانی میں ایم اے کا مقالہ لکھ رہے تھے۔ آج کل اورینٹل کالج کے شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

بیٹھے۔ آنے جانے والوں سے بھی ملتے رہے۔ بہت عمدہ آدمی ہیں۔ ایران کے بارے میں انھوں نے بہت سی معلومات فراہم کیں۔ ایسی معلوماتی گفتگو تو ایران کے صدر رفسنجانی بھی نہیں کرتے۔ ان کا جو کام تھا وہ میں نے ٹیلی فون پر کرا دیا۔ ہمدرد کا کتب خانہ جمعہ اور ہفتہ کو بند ہوتا ہے اس لیے میں نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا کہ اپنے گھر پر ملاقات کا وقت دے دیں۔ استادِ گرامی کی بیگم صاحبہ بھی ماشاء اللہ بہت نستعلیق خاتون ہیں۔ یہ میرے لیے ایک بہت خوب صورت طغریٰ اور بہت سے مزے دار بسکٹ لے کر آئیں۔ ملاقات ہو تو استادِ گرامی سے کہہ دیجیے گا کہ بسکٹ ختم ہو چکے ہیں اور اب طغرے پر گزارا ہے۔ ایک بڑی اچھی بات یہ ہوئی کہ استادِ گرامی نے سستے داموں ایرانی کتابیں فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ایک کتاب کا نام پرچی پر لکھ دیا ہے۔ یہ انھیں پہنچا دیجیے۔ استادِ گرامی سے ملاقات کر کے واقعی خوشی ہوئی۔ آپ کے علم سے تو میں واقف تھا، اب علم کا ماخذ بھی معلوم ہو گیا!

لاہور آنے کا پروگرام سہیل عمر صاحب کی مرضی کے مطابق بنے گا۔ کئی مہینوں سے وہ کہہ رہے ہیں کہ اس مہینے بلاؤں گا۔ معلوم نہیں کب بلائیں گے۔ اُن سے کہیے اگر اقبال ایوارڈ کی میٹنگ نہیں ہو رہی تو کسی عزیز کی شادی پر ہی بلا لیجیے، بشرطے کہ دعوت نامہ پی آئی اے کے ٹکٹ کی پشت پر چھپا ہو۔ وہ بلائیں گے تو پھر ان شاء اللہ آپ کا وقت جی بھر کے ضائع کروں گا۔ اب کے آپ کے ساتھ لاہور کی تاریخی عمارات دیکھنے کا بھی ارادہ ہے۔ چند بزرگ ادیبوں سے بھی ملنا ہے جن کی فہرست پہلے سے بھیج دوں گا۔ جعفر بلوچ صاحب سے ایک عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی اُن کو بزرگوں میں تو نہیں، تاریخی عمارتوں میں شامل سمجھیے۔

اکرام چغتائی کہاں ہیں؟ ایک عرصے سے ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ مجھے تو یہ اُسی وقت یاد کرتے ہیں جب ان کا ڈائریکٹر ان پر عتاب نازل کرتا ہے۔ میں نے دو تین خط لکھے، انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اشفاق احمد ہی کو خط لکھنا پڑے گا کہ اکرام چغتائی کو ایک نوٹس جاری کریں کہ وہ دفتر میں بیٹھ کر اپنا ذاتی کام کیوں کرتے ہیں۔ اس کے بعد درد دل سنانے کے لیے لازماً چغتائی صاحب مجھے خط لکھیں گے۔ ۹۰ء کے آخر میں جب میں لاہور گیا تھا اور کشور ناہید سے ملاقات ہوئی تھی تو انھوں نے مجھ سے اکرام چغتائی کی یہی شکایت کی تھی کہ یہ دفتر میں اپنا ذاتی کام کرتے ہیں۔ میں نے اکرام چغتائی کے دفاع میں کہا تھا کہ وہ اُن بزرگوں سے تو اچھے ہیں جو دفتر میں کچھ نہیں کرتے۔ دفتر کا کام بھی نہیں کرتے اور اپنا کام بھی نہیں کرتے۔ اس پر کشور ناہید نے کہا تھا کہ یہ دفتر ہے یتیم خانہ نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا، ہاں اشفاق احمد کے زمانے میں یہ یتیم خانہ تھا، اب تو زنان خانہ ہے۔ ویسے اکرام چغتائی پر رحم آتا ہے کہ اس پر اللہ کا عذاب کبھی کشور ناہید کی صورت میں نازل ہوتا ہے اور کبھی اشفاق احمد کی صورت میں۔ کشور ناہید پر یاد آیا کہ ان کا پتا درکار ہے۔ ازراہِ کرم فون کر کے ڈاک کا پتا معلوم کر لیجیے۔

یہاں تک خط لکھ کر خیال آیا کہ اب تک صرف دو کاموں کے لیے لکھا ہے۔ محمد علی صاحب کو چٹ پنجابی ہے اور کشور ناہید کا پتا معلوم کرنا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے کاموں سے آپ کا کیا بھلا ہوگا۔ ایک بڑا کام آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اگر آپ نے یہ کام کر دیا تو تا زندگی ممنون رہوں گا۔ صلاح الدین محمود صاحب نے مجھے فون کیے اور خط لکھے کہ انھیں چند روز کے لیے ان دو کتابوں کی ضرورت ہے: (۱) رسالہ "عصری آگہی" دہلی کا بیدی نمبر (۲) بیدی پر وارث علوی کی کتاب۔ میں نے ۱۲؍ مارچ ۹۱ء کو یہ کتابیں اُن کو بھیج دیں۔[۹۰] ایک کتاب محمد سلیم الرحمٰن صاحب کے پاس تھی، میں نے سلیم الرحمٰن صاحب سے کہا کہ وہ بھی صلاح الدین محمود صاحب کو دے دیں تا کہ تینوں کتابیں اکٹھی واپس آجائیں۔ "چند روز" کے وعدے کو پورا ڈیڑھ سال گزر چکا ہے۔ کئی خط لکھ چکا ہوں مگر حضرت جواب دیتے ہیں نہ کتابیں بھیجتے ہیں۔ آپ ان سے مل کر میری تینوں کتابیں کسی طرح حاصل کیجیے اور اپنے پاس رکھ لیجیے۔ میں لاہور آؤں گا تو آپ سے لے لوں گا۔ آپ اس بدعہدی اور بداخلاقی کا سبب بھی معلوم کر لیجیے گا۔ حیرت ہے کہ کیسے کیسے نستعلیق لوگ، بقولِ شاعر، نستعلیق کا لام ثابت ہوتے ہیں... لام نستعلیق کا ہے اُس بتِ کافر کی زلف!

میں آج کل خوب مزے سے روز و شب بسر کر رہا ہوں۔ اپنے بکھرے ہوئے کاموں کو سمیٹنے کی مہم میں مصروف ہوں۔ کالموں کے انتخاب کی نظرِ ثانی مکمل کر چکا ہوں۔ یگانہ کی کلیات کے حواشی لکھ رہا ہوں۔ ساتھ ساتھ کچھ غیر مطبوعہ مقالات کی نوک پلک بھی درست کرتا جا رہا ہوں۔ یہ سال مطالعے کے لیے عہدِ مغلیہ کی تاریخ کے لیے مخصوص کیا ہے۔ اورنگ زیب کے بعد کے نام نہاد مغلوں پر زیادہ توجہ دی ہے کہ یہی اُردو شاعری کے آغاز کا زمانہ ہے۔ اس تاریخ کو پڑھ کر پروفیسر علم الدین سالک کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہماری تاریخ کیا ہے، قصاب کی دکان ہے! تین چار دن ہوئے طاہر مسعود کا فون آیا، اُنھوں نے پوچھا کہ آج کل کیا مصروفیت ہے؟ میں نے کہا کہ روزانہ تین چار گھنٹے قصاب کی دکان پر بیٹھتا ہوں۔ بہت حیران ہوئے، سمجھے کہ میں سٹھیا گیا ہوں (سٹھیانے میں ابھی تین سال باقی ہیں)۔ جب میں نے انھیں اس جملے کا مطلب بتایا تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے، میں بھی مغلوں کی تاریخ پڑھوں گا، مجھے سنسنی خیز کتابیں پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ میں نے انھیں یہ سنسنی خیز واقعہ سنایا کہ ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کی آنکھیں نکالیں تو پہلے اُن میں نمک ڈالا اور پھر لیموں کا رس نچوڑا، تو انھیں یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

اچھا جناب، ورق تمام ہوا، باقی مدح آپ کا جواب آنے پر۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۷۔۹۔۹۲ء

---

[۹۰]۔ صلاح الدین محمود غالباً ان دنوں بیدی کی کلیات پر کام کر رہے تھے۔

☆

(۵۱)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آج اقبال اکیڈمی سے اطلاع آئی ہے کہ اقبال ایوارڈ کی میٹنگ ۱۵ر جنوری کو ہوگی۔ میں ۱۴ر کو لاہور پہنچ جاؤں گا۔ سہیل عمر صاحب سے معلوم کر لیجیے کہ میں کہاں ٹھہروں گا۔ اُسی روز آپ سے ملاقات ہونی چاہیے۔ میری خواہش ہے کہ لاہور میں سب سے پہلے آپ کی صورت زیبا نظر آئے تاکہ میرا قیام خوش گوار رہے۔ میں لاہور میں جتنے دن بھی رہوں گا، آپ کو میرے ساتھ وقت گزارنا ہوگا، لہٰذا گھر والوں سے چند روز کے لیے آوارہ گردی کی پیشگی اجازت لے رکھیے۔ جعفر بلوچ صاحب مع کھجوروں کے دستیاب ہو جائیں تو سبحان اللہ۔ میں تو اُن کی کھجوروں میں اٹک کر رہ گیا ہوں۔ سبحان اللہ کیسی خوش ذائقہ کھجوریں تھیں۔☆۹۱

اب کے فیاض محمود، سیف الدین سیف، رحمان مذنب (بقول شخصے منٹو سے بڑا افسانہ نگار) عبداللہ ملک اور حبیب جالب کی تصویریں ضرور کھینچنی ہیں۔ سلمان باقر سے بھی ملنا ہے اور اسلم کمال سے بھی۔

اکرام چغتائی سے اب کے نہیں ملنا، لہٰذا اُنھیں ہرگز نہ بتائیے گا کہ میں لاہور آرہا ہوں۔ میں نے انھیں کئی خط لکھے مگر حضرت نے جواب نہیں دیا۔ ان کی سزا یہی ہے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ اردو کا یہ قدآور محقق صرف قدآور رہ جائے۔

ایک مرتبہ ساقی فاروقی نے مجھے لکھا کہ میں کراچی آرہا ہوں، سب دوستوں کو اطلاع کردو۔ میں نے جواب دیا کہ یہ مناسب نہیں، اگر اطلاع کردی تو سب کراچی سے بھاگ جائیں گے۔ ڈرتا ہوں کہ اتنی بہت سی فرمائشوں کی وجہ سے آپ بھی میرے ساتھ یہی سلوک نہ کریں۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۱۹۹۲ء کا آخری دن

☆

(۵۲)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی خوش گوار یادوں کے ساتھ میں پرسوں صبح تین بجے کے

☆۹۱۔ یہ محض برائے وزن بیت ہے ورنہ خواجہ صاحب اپنی غیر معمولی احتیاط کے پیش نظر کسی میٹھی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ جعفر بلوچ کا ارمغان شیریں اپنے نیاز مندوں میں بانٹ دیتے تھے۔

قریب کراچی واپس آ گیا۔ جہاز میں ایئر ہوسٹس نے نئے سال کی مبارک باد دی۔ ایئر پورٹ پر جہاز پون بجے کے قریب اترا۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے تین بج گئے۔ لاہور میں وقت بہت آرام سے گزرا۔ ظاہر ہے کہ میرا، ورنہ آپ کو تو خاصی زحمت اُٹھانی پڑی۔ میں آپ کا شکریہ کیا ادا کروں گا کہ آپ کے التفات بے پایاں کے مقابلے پر شکریہ نہایت معمولی چیز ہے۔ جو سلوک آپ نے میرے ساتھ کیا، وہی آپ کی بیگم صاحبہ نے آمنہ کے ساتھ کیا۔ گویا، ہم دونوں آپ دونوں کے حسنِ سلوک کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔

آپ نے ایک کاغذ پر کچھ نکات لکھے تھے۔ وہ کاغذ میں نے اپنے سامنے رکھ لیا ہے۔ دو کام فوراً کر دیے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے انھوں نے ایک مہینے کی چھٹی لے رکھی ہے۔ انھوں نے آپ کی کتاب پر ریڈیو کے لیے تبصرہ کر دیا ہے جو ۱۰ر جنوری کو صبح ساڑھے سات بجے کراچی سے نشر ہوگا۔[☆۹۲] اس تبصرے کی نقل وہ آپ کو ایک دو روز میں بھیج دیں گے۔ دوسرا کام یہ کہ تبسم کاشمیری کی کتاب تلاش کر لی ہے جو اس خط کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی جلیل قدوائی صاحب کی کتاب کے دو نسخے بھی ہیں۔ ایک آپ کے لیے اور دوسرا ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے لیے۔ جعفر بلوچ صاحب کے لیے بعد میں بھیجوں گا کہ اس وقت میرے پاس یہی دو نسخے تھے۔ باقی چیزیں بعد میں بھیجوں گا، کیوں کہ پہلے اُنھیں تلاش کرنا ہے۔

لاہور سے جو کتابیں میں نے ڈاک سے بھیجی تھیں، وہ یہاں پہنچ گئی ہیں۔ میری عدم موجودگی میں جو ڈاک آئی، اُس میں بھی ہندوستان سے بہت سی اچھی اچھی کتابیں میری منتظر تھیں۔ مثلاً آل احمد سرور کی نئی بلکہ تازہ ترین کتاب ''دانشورِ اقبال'' جس پر سال طباعت ۱۹۹۴ء درج ہے۔ یہ سرور صاحب کے ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۰ء تک کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر ثریا حسین کی نئی کتاب ''سر سید احمد خاں اور اُن کا عہد'' بھی ملی ہے جو حال ہی میں چھپی ہے۔ ابھی اس کی صرف ورق گردانی کی ہے، یہ اچھی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ چند کتابیں خدا بخش لائبریری پٹنہ سے بھی آئی ہیں۔

امید ہے آپ اس جمعہ کو بیگم کرنل خواجہ عبدالرشید سے ضرور ملیں گے۔ لاہور میں آپ سے اس سلسلے میں جو گفتگو ہوئی تھی، مجھے یقین ہے آپ اُس کے مطابق ضرور عمل کریں گے۔ اُن کی کتابوں کے تحفظ کی کوئی صورت نکالیے، اس طرح بیگم صاحبہ کی ایک ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔[☆۹۳]

آپ لوگوں نے جلیل قدوائی صاحب سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا، ضرور مل لیجیے۔ وہ یادگارِ زمانہ لوگوں میں سے ہیں اور لوگوں سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں اُن کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ افسردہ خاطر ہیں اور لکھنے کی طرف مائل نہیں ہو رہے۔ دورانِ ملاقات اُن سے کہیے کہ

☆۹۲۔ ''عبدالماجد دریابادی ... احوال و آثار'' پر یہ تبصرہ بعد ازاں کسی مجلے میں بھی شائع ہوا۔

☆۹۳۔ افسوس کوشش بسیار کے باوجود میں دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے اربابِ اختیار کو ان نادر کتب کی خرید پر آمادہ نہ کر سکا۔ بالآخر یہ کتابیں محترم مسعود محمود جھنڈیر نے اپنی لائبریری کے لیے خرید لیں۔

وہ "حیاتِ مستعار" کا باقی حصہ قلم بند کر ڈالیں۔ ☆۹۴

جعفر بلوچ صاحب نے بھی میرے ساتھ خاصا وقت صرف کیا۔ اُن کے قہقہے اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اُن کی صحت کی طرف سے مجھے بے حد تشویش ہے۔ وہ پرہیز بالکل نہیں کرتے۔ آپ اُن کی نگرانی کیجیے کہ وہ کوئی میٹھی چیز نہ کھائیں ورنہ اس بے احتیاطی کا نتیجہ (خدا نہ کرے) بہت سنگین ہوگا۔ اُن کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ میں اُنھیں ایک مفصل خط لکھوں گا اور ساتھ ہی غذا سے متعلق ایک ہدایت نامہ بھی بھیجوں گا۔

میرے برادر بزرگ خواجہ عبدالقدیر صاحب کے لیے انسائی کلوپیڈیا کا انتظام ضرور کردیجیے گا۔ جب کام ہوجائے تو اُنھیں فون کردیجیے گا۔

کل کی ڈاک سے احمد ندیم قاسمی صاحب کا ایک خط ملا ہے جو اُنھوں نے ۲۹ر دسمبر کو لکھا تھا۔ اس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ میں شاید مصروفیت کی وجہ سے اُن سے دوبارہ نہیں ملا۔ یہ خط شاید اُنھوں نے اُس وقت لکھا جب میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس خط میں اُنھوں نے ساقی فاروقی کی ایک غزل کے کچھ ناموزوں مصرعوں کے بارے میں میری رائے پوچھی ہے۔ اُن کے خط اور اپنے جواب کا عکس بھیج رہا ہوں۔ ان کو پڑھ کر اپنی رائے لکھیے کہ آپ کو بھی عروض سے دلچسپی ہے اور فیض کے کلام میں آپ نے عروض کی غلطیاں دریافت کر رکھی ہیں۔

محمد سلیم الرحمٰن صاحب سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا اور اب جو ایسا ہوا ہے تو سخت شرمندہ ہوں۔ اُنھیں معذرت کا خط لکھ رہا ہوں۔ اظہر جاوید صاحب سے بھی نہ ملنے کا افسوس ہے۔ ایک دو مرتبہ اُنھیں فون کیا تھا، مگر وہ دفتر میں موجود نہ تھے۔ امید تھی کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں وہ ملیں گے مگر وہ وہاں بھی نہیں آئے۔

ایک لطیفہ سنیے۔ لاہور کی عمران بیکری سے جو اعلا، بسکٹ آپ جیسے کرم فرماؤں کے ذریعے منگواتا رہا ہوں، ان کے بارے میں انکشاف ہوا ہے کہ ان [illegible] چینی استعمال کی جاتی ہے۔ یہ بات مجھے بیکری کے مالک نے بتائی اور ایسے وقت جب کہ میں چار [illegible]ٹ خرید چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بسکٹ میرے استعمال کے لائق نہیں۔ یہ ویسے ہی بسکٹ ہیں جیسے عام بسکٹ ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ بات اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آئندہ ان بسکٹوں کی مجھے ضرورت نہیں ہوگی۔ جو ساتھ لے کر آیا ہوں، اب وہ اُن لوگوں کو کھلاؤں گا جو میرے لیے یہ بسکٹ لاتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بتا دیجیے گا کہ وہ بھی ان بسکٹوں کا استعمال ترک کردیں۔

آپ خط لکھنے میں تساہل سے کام لیتے ہیں مگر اس خط کا جواب فوراً لکھیے گا۔ محمد امین زبیری

☆۹۴۔ جلیل قدوائی مرحوم کی آپ بیتی جس کا محض ایک حصہ مکتبۂ اسلوب نے شائع کیا چوں کہ یہی ایک حصہ اس وقت تک لکھا گیا تھا۔ میری نگرانی میں محترمہ افلین بٹ نے قدوائی صاحب پر ایم اے کا بڑا عمدہ مقالہ تحریر کیا تھا۔ سنہ تکمیل ۱۹۸۹ء

کے نام کے خطوں کی فہرست بھی بھیج دیجیے تاکہ میں اپنے پاس موجود خطوں سے ان کا مقابلہ کر سکوں۔[☆۹۵]

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۳۔۱۔۹۳ء

☆

(۵۳)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

چغتائی صاحب کے آنے کی خوشی اُس وقت دوبالا ہوگئی جب اُنھوں نے مولانا دریابادی پر آپ کی کتاب مجھے دی۔ دل خوش ہوا اور طباعت کے حسن سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ چلیے دیر آید درست آید۔ اس کتاب کی اشاعت کو میں آپ کی زندگی کا ایک اہم سنگِ میل سمجھتا ہوں۔ اب لوگوں کو صحیح طور پر اندازہ ہوگا کہ خدا نے آپ کو فکر و نظر کی کیسی رفعتوں سے نوازا ہے۔ جہاں تک پی ایچ ڈی کے مقالوں کا تعلق ہے، میں اسے اس باغ کا گلِ سر سبد سمجھتا ہوں۔

مولانا ابو سلمان صاحب کا نسخہ اُن کو بھجوا دیا ہے لیکن مولانا کو کتابیں پڑھنے سے نہیں لکھنے سے دلچسپی ہے۔ جتنی دیر میں وہ آپ کی کتاب پڑھیں گے اتنی دیر میں وہ اسی ضخامت کی دو کتابیں لکھ لیں گے۔ بہ ہر حال مولانا اُن لوگوں سے بدرجہا بہتر ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کا خط آیا ہے کہ بالآخر کلکتے سے آپ کی مطلوبہ کتاب کا عکس اُن تک پہنچ گیا ہے جسے وہ ڈاک سے بھجوا رہے ہیں۔ دو چار دن میں یہ عکس مل جائے گا تو فوراً آپ کو بھیج دوں گا مگر ڈاکٹر صاحب نے یہ بدخبری بھی سنائی ہے کہ عکس پوری کتاب کا نہیں صرف نصفِ اول کا ہے۔ لائبریری کا اصول ہے کہ کسی کتاب کا مکمل عکس کسی کو نہیں دیا جاتا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھا ہے کہ یہ تو ویسی ہی بات ہے کہ جیسے شبِ وصال یہ پابندی - باقی جملہ آپ خود مکمل کر لیجیے کہ آپ ایسے معاملات میں مجھ سے بہتر واقفیت رکھتے ہیں۔ آپ عکس دیکھ لیجیے، اگر یہ آپ کے کام کا نکلا تو نصف آخر کسی دوسرے ذریعے سے منگوا دوں گا۔[☆۹۶]

میں نے آپ کی کتاب کے چند نسخے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے منگوائے تھے۔ ''جنگ'' کراچی میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ ''جنگ'' والے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو تبصرے بھیجتے ہیں۔ اُن کے پاس دیکھ لیجیے۔ اگر نہ ہو تو پھر مجھے غلط یاد رہا ہوگا۔ تبصرہ شائع نہیں ہوا، عنقریب شائع ہوگا۔ ''ڈان'' میں تبصرہ آنے والا ہے۔ نظیر صدیقی بھی انگریزی کے کسی اخبار میں لکھیں گے۔ ان شاء اللہ اس پر مفصل تبصرہ

☆۹۵۔ میرے پاس محمد امین زبیری اور ہاشمی فرید آبادی کے نام مولوی عبدالحق کے خطوط خاصی تعداد میں ہیں جنھیں بشرطِ فرصت مرتب کروں گا۔ ان کی فہرست بالآخر خواجہ صاحب کو روانہ کر دی تھی۔

☆۹۶۔ اشارہ ''تاریخ یوسفی'' (کمبل پوش / کلیم پوش) کے فارسی متن کی جانب ہے۔

''قومی زبان'' میں شائع کراؤں گا۔ اگر وہاں کسی نے لکھا ہو تو بھجوا دیجیے۔

آپ اپنے مقالے کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ کو بھجوانا چاہتے ہوں تو ارسال کر دیجیے۔ ایک صاحب جانے والے ہیں، اُن کے ہاتھ بھیج سکتا ہوں۔ ویسے اس لائبریری میں آپ کی کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب اس لائبریری میں پہنچی اور پورے ہندوستان کو خبر ہوگئی۔

اکرام چغتائی صاحب پرسوں دوپہر کو میرے ہاں سے چلے گئے۔ رات وہ اپنے ایک عزیز کے ہاں رہے اور دوسرے روز (یعنی کل) یورپ روانہ ہوگئے۔ جمعہ کو وہ میرے ہاں آئے تھے۔ اگرچہ زیادہ تر اپنے کاموں کے سلسلے میں گھومتے رہے لیکن تین طویل نشستیں میرے ساتھ رہیں۔ دنیا بھر کی باتیں ہوئیں۔ ماشاء اللہ یورپ کی زندگی کے ہر پہلو سے عملی واقفیت رکھتے ہیں۔ ایسے ایسے تجربات و مشاہدات سے مستفید کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ ان شاء اللہ بوقتِ ملاقات عرض کروں گا۔

اب کے اگست میں یومِ مولوی عبدالحق کے موقعے پر امکان ہے کہ آپ کو اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو مدعو کیا جائے، البذا آپ دونوں اپنے اپنے لیے موضوعات کا انتخاب کر رکھیے۔

طاہر مسعود اور آصف فرخی سے ٹیلی فون پر بات چیت رہتی ہے۔ دونوں خیریت سے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۶-۶-۹۳ء

☆

(۵۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

سب سے پہلے تو اس کی معذرت کہ خط کا جواب تاخیر سے دے رہا ہوں۔ وجہ کوئی خاص نہیں، اس لمحے کی تلاش میں تھا کہ آپ سے سکون سے باتیں کرسکوں۔ خدا خدا کر کے یہ لمحہ ہاتھ آیا ہے تو در دولت پر دستک دے رہا ہوں۔ سب سے پہلے اس کی مبارک باد کہ آپ نے گاڑی خرید لی۔ خدا کا شکر ہے کہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے کا دور ختم ہوا اور میں بھی جب لاہور آؤں گا تو مجھے بار بار اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بلکہ کار کی وجہ سے مزید گناہوں کے ارتکاب کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ موٹر سائیکل کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ چلانے والا اپنے آپ کو ہر وقت سولی پر لٹکا ہوا محسوس کرتا ہے، اب آپ کے راستے میں آنے والے لوگ ایسا محسوس کریں گے۔ ہم دونوں کی طرف سے بھابی صاحبہ کی خدمت میں بھی مبارک باد پیش کر دیجیے۔

بے حد شکریہ کہ آپ نے ''غالب شکن'' کے باقی دو صفحے بھی عنایت فرما دیے۔ اب ایک کام رہ گیا ہے کہ یگانہ کا مجموعہ ''گنجینہ'' کب چھپا تھا، ۴۷ء میں یا ۴۸ء میں۔ میں جب دسمبر میں لاہور آؤں گا

تو آپ کے ساتھ محکمہ اطلاعات (پریس برانچ) میں جا کر وہ رجسٹر دیکھوں گا جس میں ہر چھپنے والی کتاب کا اندراج ہوتا تھا۔ ''گنجینہ'' قومی دارالاشاعت وائی ایم سی اے بلڈنگ لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ سرورق پر بھی یہ لکھا ہے ''کوآپریٹو پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور میں چھپی اور محمد کلیم اللہ پرنٹر و پبلشر نے پروگریسو بک کلب لاہور سے شائع کیا'' — ان حوالوں سے بھی شاید سالِ طباعت معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

''تاریخ یوسفی'' کے باقی ماندہ حصے کے لیے شانتی انجن بھنا چاریہ کو خط لکھ دیا ہے۔ امید ہے وہ جلد ہی یہ کام کر دیں گے۔ قطعہ تاریخ تصنیف کی موجودگی کی وجہ سے میرا ابھی یہی خیال ہے کہ اصل فارسی ہے اور ترجمہ اردو۔ لیکن یہ ترجمہ مصنف ہی کا ہوسکتا ہے کیوں کہ وہی اتنی آزادی یا آزادہ روی سے کام لے سکتا ہے۔ کیا عمدہ مترجم ہے کہ اپنے نام کے جزو (کمبل پوش) کا بھی ترجمہ کر دیا۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ فارسی نثر روکھی پھیکی ہے لیکن اردو نثر تخلیقی شان رکھتی ہے۔ یہ ہر حال فیصلہ آپ کو کرنا ہے اور ان شاء اللہ آپ ہی کا فیصلہ درست ہوگا۔

آپ کی کتاب پر ایک اور تبصرہ نظیر صدیقی کا شائع ہوا ہے مگر افسوس کہ انھوں نے کتاب کے مقصد کو سمجھے بغیر روا روی میں تبصرہ کیا ہے۔☆۹۷ میری اس سلسلے میں اُن سے خاصی بحث ہوئی، آخر وہ یہ بات مان گئے کہ انھوں نے کتاب کا حق ادا نہیں کیا۔ یہ تبصرہ بھیج رہا ہوں۔ اگر زحمت نہ ہو تو اس کا عکس ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو دے دیجیے تاکہ اُن کے ریکارڈ میں رہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ استنبول جا رہے ہیں۔☆۹۸ کیا سلسلہ ہے؟ اکرام چغتائی کی طرح یہ سفر ''غبارِ خاطر'' کے اخراج کے لیے ہے یا کوئی علمی معاملہ ہے؟ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ براستہ کراچی جائیں اور واپس آئیں۔ اس طرح میرا بھی بھلا ہو جائے گا۔ یوم بابائے اردو پر آپ کو اور ہاشمی صاحب کو بلانے کا پروگرام تھا، لیکن میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ آپ دونوں کو اگلے سال زحمت دی جائے اور اس سال ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو مدعو کیا جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ دونوں سے کراچی میں ملاقات کی صورت پیدا نہ ہوگی۔

ارمغانِ علمی☆۹۹ کے لیے جو خط حال ہی میں لکھے تھے، اُن کے نتیجے میں دو مضمون موصول ہوئے ہیں۔ یہ بھیج رہا ہوں۔ ہاشمی صاحب تو ایبٹ آباد میں ہوں گے۔ وہ آئیں تو انھیں دے دیجیے گا۔

☆۹۷۔ ''نقدِ اقبال... حیاتِ اقبال میں'' پر نظیر صدیقی کے تبصرے کی جانب اشارہ ہے۔

☆۹۸۔ ایسا یاد پڑتا ہے کہ اس زمانے میں عالمی رابطہ ادبِ اسلامی (بانی مولانا علی میاں) نے ایک بین الاقوامی سیمینار کا استنبول میں اہتمام کیا تھا۔ مجھے بھی بحیثیت رکن اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوگ پڑا کہ میں اس سیمینار میں شرکت کے لیے نہ جا سکا۔

☆۹۹۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے اعزاز میں مرتب ہونے والے اس ''ارمغانِ علمی'' کے محرک متحرک بھی حضرت خواجہ ہی تھے۔ متعدد مضامین انھی کی کوشش سے فراہم ہوئے مگر یہ گوارا نہ فرمایا کہ مرتبین میں ان کا نام آئے۔ ایثار پیشگی کی ایسی مثالیں اب نایاب کے حدود میں داخل ہیں۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۹۔۷۔۹۳ء

☆

(۵۵)

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

دس بارہ روز ہوئے کہ آپ سے فون پر بات ہوئی تھی اور آپ نے فرمایا تھا کہ فوراً میرے خط کا جواب لکھیں گے۔ فوراً سے مراد اگر ایک ڈیڑھ مہینہ ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اب تک آپ کا خط آ جانا چاہیے تھا۔ پروفیسر لطیف اللہ صاحب کو بھی شکایت ہے کہ انھوں نے آپ کو مضامین کے عکس بھیجے اور آپ نے وصولی کی اطلاع نہیں دی۔

ادھر ایک یہ لطیفہ ہوا کہ میں نے آپ کی کار کی خریداری کی تاریخ لکھ ڈالی۔ موٹر سائیکل کو بیچنے اور کار کو خریدنے کے لیے اس سے بہتر تاریخ نہیں ہو سکتی۔ خرے بفروختم کارے خریدم۔ لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ اس کے عدد ۳۲۲۳ ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر تاریخ کو تخرجہ سے کام لیتے ہیں۔ ان اعداد میں سے ۱۲۳۰ عدد کم کیے جائیں تو ۱۹۹۳ء برآمد ہوتا ہے لہٰذا میں نے "سرمست عشق" سے اعداد کم کر کے یہ قطعہ لکھا:

خر عیسیٰ رفیق راہ تحسیں ۔۔۔ سواری اس پہ وہ کرتے تھے پیہم
عجب سرمست عشق رہ گزر تھا ۔۔۔ فراقی وصل سے اُس کے تھے خرم
پچھا سرمست عشق اُن سے تو بولے ۔۔۔ خرے بفروختم کارے خریدم

۱۲۳۰   ۳۲۲۳

۳۲۲۳
۱۲۳۰ -
۱۹۹۳

اس قسم کی فضولیات کے ماہر جعفر بلوچ ہیں، لہٰذا انھیں یہ قطعہ ضرور دکھائیے اور کہیے کہ وہ اس مادۂ تاریخ کو ذرا بہتر طور پر منظوم کر دیں۔ میں نے اس پر محنت نہیں کی، قلم برداشتہ یہ تین شعر لکھ دیے ہیں۔

میرے فون نمبر بدل گئے ہیں۔ دونوں نمبروں کے شروع میں ایک ۶ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب یہ نمبر یوں ہیں:

۶۶۱۰۶۳۸

۶۶۱۱۲۳۵

ازراہِ کرم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو ابھی فون کر کے بتا دیجیے۔ مظفر علی سید اور پروفیسر محمد اسلم صاحب کو بھی اگر آپ بتا سکیں تو کرم ہوگا۔ پروفیسر محمد اسلم صاحب کا نمبر مجھے بھی لکھیے۔

ڈاکٹر مختار الدین صاحب ۷ر اگست کو کراچی تشریف لائے تھے۔ کل صبح لاہور تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں اُن کا قیام پروفیسر محمد اسلم صاحب کے ہاں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ یہ دن بہت یادگار گزرے۔ اُن سے مل کر اور اُن کی باتیں سن کر خوشی ہوتی ہے۔ آپ ان سے ضرور ملیے گا۔

اور کیا حالات ہیں؟ کیا کام ہو رہا ہے؟ مفصل خط لکھیے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کہاں ہیں؟

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۹۔۸۔۹۳ء

☆

(۵۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

یہ خط مجھے بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا، لیکن ہوا یہ کہ آپ سے رخصت ہو کر ۳۰ر اکتوبر کی رات کو کراچی پہنچا اور ۳۱ر کی صبح کو آپ کی بھابی کے چھوٹے بھائی ٹریفک کے ایک حادثے میں شدید زخمی ہوگئے۔ تین دن وہ بے ہوش رہے۔ سر پر چوٹ آئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ رُو بہ صحت ہیں۔ یہ سارے دن اسی پریشانی میں گزرے۔ آپ کی بھابی تو ۲۴ر گھنٹے اسپتال میں رہتی تھیں اور میں بھی زیادہ وقت وہیں گزارتا تھا۔ اب وہ گھر آ گئے ہیں۔

آپ نے اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے بڑا کرم کیا کہ بہاول پور تشریف لائے، البتہ اس کا افسوس رہا کہ بہت کم وقت کے لیے آپ تشریف لائے۔ کاش بہاول پور میں قیام کا سارا عرصہ آپ کے ساتھ گزرتا۔ بہ ہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ یک جائی کے کچھ لمحے تو میسر آگئے۔ آپ کی قربت میرے لیے کئی وجوہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ سے مل کر دل خوش ہو جاتا ہے، ایسا محسوس ہوتا رہے جیسے کوئی نعمت ہاتھ آ گئی ہو۔ دوسرے آپ سے ہم سخنی فائدے سے ''بھرپور'' ہوتی ہے۔ آپ مذاق میں بھی ایسی ایسی باتیں کر جاتے ہیں کہ ''ہم سخن'' بہت کچھ حاصل کرتا ہے۔ تیسرے جماعتیوں کے درمیان رہنے کے باوجود آپ یبوست سے اتنے ہی دور ہیں جتنے جماعت والے خوش ذوقی سے۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ آپ مجھے خوش رکھتے ہیں۔

اس سفر میں ایک فائدہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو عالمِ خواب میں دیکھ لیا۔ لوگ بستر پر دراز ہوتے ہیں، ہاشمی صاحب مختصر ہو کر پانچ کا ہندسہ بن جاتے ہیں۔ شاید وہ علامہ اقبال کے لیے بستر پر جگہ چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ خواب (میں) آئیں تو انھیں ٹھیک طرح سے بیٹھنے یا لیٹنے کی

جگہ مل جائے۔

جعفر بلوچ صاحب نے مضمون بھیجا تھا میں نے اُس کی رسید میں خط لکھا۔ یہ خط واپس آ گیا ہے۔ بند لفافہ منسلک ہے۔ ازراہِ کرم بلوچ صاحب تک پہنچا دیجیے۔ خط کے واپس آنے کا سبب معلوم نہ ہوسکا۔ شاید یہ کاغذ جعفر صاحب کی آتش نفسی کے خوف سے واپس آ گیا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا سفرنامہ پڑھ رہا ہوں۔ ان شاء اللہ اگلے چند روز میں اُنھیں خط لکھوں گا۔ ان کا یورپ جانا محض کفرانِ نعمت کے لیے تھا۔ سوائے اینی میری شمیل کے اُنھوں نے کسی خاتون سے بات ہی نہیں کی اور شمیل بھی اب عمر کی اُس منزل میں ہیں جہاں انسان تذکیر و تانیث کے جھگڑے سے پاک ہوجاتا ہے۔ ہاشمی صاحب کی خشک دامنی پر افسوس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے کسی چہرے کو بری نظر سے تو کیا، اچھی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ اگر یہ مرزا منور صاحب اور سہیل عمر صاحب کی بجائے میرے اور آپ کے ساتھ ہوتے تو ان کے دامنِ تقدس پر محرومی کا داغ نہ ہوتا۔ بہ ہرحال یہ بھی غنیمت ہے کہ اُن کا دامنِ تقدس بے داغ نہیں رہا۔

آپ نے اپنے پچھلے خط میں جون ایلیا کے کسی انٹرویو کا ذکر کیا تھا۔ میں اسے پڑھنا چاہتا ہوں۔ امید ہے طاہر مسعود صاحب سے ملاقات ہوئی ہوگی۔

خدا کرے آپ مع اہلِ خانہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۴-۱۱-۹۳ء

☆

(۵۷)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

کل ہی ایک لفافہ پوسٹ کیا ہے۔ آج ایک ضروری کام سے پھر لکھ رہا ہوں۔ میں نے شاید بہاول پور میں آپ کو بتایا تھا کہ اکرام چغتائی صاحب کمبل پوش کے سفرنامے کا پہلا ایڈیشن بصورتِ عکس لائے ہیں نیز ''اردو اخبار'' میں اس کی جو قسطیں شائع ہوئی تھیں وہ بھی اُن کے پاس ہیں۔ کمبل پوش کے بارے میں کچھ ضروری اور نئی معلومات بھی لائے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ وہ آپ کو ان چیزوں سے استفادہ کرنے کا موقع دیں۔ میں نے اُن کو یہ بھی بتایا تھا کہ فارسی متن کا عکس مل گیا ہے جو میں نے تحسین صاحب کو بھیج دیا ہے۔ آج اکرام چغتائی صاحب کا خط آیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

> تحسین فراقی صاحب کو آپ نے ''تاریخ یوسفی'' کا فارسی متن ارسال کردیا۔ میری خواہش تو ہے کہ میں اسے ایک نظر دیکھوں، لیکن اُن سے کہہ نہیں سکتا۔ اگر آپ کے توسط سے میری خواہش کی تکمیل ہوجائے تو شکر گزار ہوں گا۔

حیرت ہے کہ وہ آپ سے کیوں نہیں کہہ سکتے۔ میں نے جواباً انھیں لکھا ہے:

تحسین فراقی صاحب کو میں خط لکھوں گا کہ وہ تاریخ یوسفی آپ کو دکھا دیں۔
تحسین صاحب بہت فراخ دل ہیں اور پھر اس میں اُن کا فائدہ بھی ہے کہ آپ کمبل پوش کے بارے میں انھیں نادر معلومات فراہم کریں گے۔

اکرام چغتائی مجھے بے حد عزیز ہیں، بس ایک ہی اُن میں گڑبڑ کی بات ہے کہ علمی معاملات میں بخیل ہیں۔ آسانی سے کسی کی مدد نہیں کرتے۔ کسی طرح انھیں رام کیجیے اور کمبل پوش کے بارے میں اُن کے پاس جو کچھ ہے اُس سے استفادہ کیجیے[☆۱۰۰]

بس یہی عرض کرنا تھا۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۶۔۱۱۔۹۳ء

☆

(۵۸)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

خط لکھنے میں آپ تو کوتاہ قلم تھے ہی، مجھ پر بھی آپ کا سایہ پڑ گیا۔ مارچ کے تیسرے ہفتے میں اسلام آباد گیا، ۲۹؍ مارچ کو واپس آ گیا۔ ایک تو طبیعت ناساز رہی، اُس پر خامہ بگوشی کا بار، نتیجہ یہ کہ اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا کہ پنجاب پبلک لائبریری کی فہارسِ مخطوطات ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے ذریعے مل گئی تھیں۔ اسلام آباد میں بہت اچھا وقت گزرا۔ ایک ایک دن حسن ابدال، جہلم اور مری بھوربن میں بھی گزارا۔ جہلم، جلیل قدوائی صاحب سے ملنے گیا تھا۔ وہاں وہ اپنے بیٹے بریگیڈیئر خالد قدوائی کے ساتھ مقیم تھے۔

محمد صلاح الدین صاحب کے مسلسل اصرار پر بالآخر مجھے خامہ بگوشیوں کی طرف لوٹنا پڑا۔ دل اس کام سے اکتا چکا ہے مگر اب اسی اکتائے ہوئے دل کے ساتھ یہ کام کرنا ہوگا۔ صابر کلوری صاحب آج کل یہاں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ میں نے کالم میں — کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ اُس شخص کا نام بھول گئے جو زیادتی کا شکار ہوا۔ آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟

حمید نسیم صاحب کی نئی کتاب (اقبال) آپ کو بھیجی گئی تھی۔ آپ نے انھیں وصولی کا خط نہ لکھا ہو تو لکھ دیجیے اور اگر موقع ملے تو اس پر تبصرہ بھی کر دیجیے۔ اس کتاب کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ کتاب میں کتابت کی خاصی غلطیاں ہیں۔ حمید نسیم صاحب نے اس کا غلط نامہ تیار کر کے

☆☆۱۰۰۔ افسوس اکرام چغتائی صاحب کے لائے ہوئے اس پہلے ایڈیشن سے استفادہ ممکن نہ ہوا۔ پچھلے برس چغتائی صاحب نے اسے مرتب کر کے شائع کر دیا (۲۰۰۲ء) مگر بازنوشتہ متن اور اصل متن متعدد مقامات پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں۔

دیا تھا، اس کا عکس بھیج رہا ہوں۔ اپنے نسخے کو درست کر لیجیے ۔ وزیر آغا کے بارے میں ساقی فاروقی کا مضمون آپ نے پڑھا؟ کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے دوبارہ تبصرہ بھیج دیا تھا، کیا یہ مل گیا ہے؟'' جہات اقبال'' [☆۱۰۱] پر ''جنگ'' میں تبصرہ شائع ہوا تھا، کیا آپ کی نظر سے گزرا؟ بزم اقبال کے دفتر میں اس کا تراشہ ہوگا۔ میں نے بھی آپ کو بھیجنے کے لیے تراشہ رکھ لیا تھا، مگر نہیں مل رہا۔ کاغذات میں کہیں دب گیا ہے۔ مل جائے گا تو بھیج دوں گا۔

جوش ملیح آبادی کے خطوں کا ایک مجموعہ یہاں شائع ہوتے ہی زیر زمین چلا گیا ہے۔ اس کے نمونے کے چند صفحات کا عکس بھیج رہا ہوں۔ عبرت کے لیے، دیکھ لیجیے پاکستان میں کیسی کیسی چیزیں چھپ رہی ہیں۔[☆۱۰۲]

جعفر بلوچ صاحب نے کالم پر ایک خوب صورت نظم لکھی ہے۔ آپ نے سنی ہوگی۔ انھیں شکریے کا خط آج ہی لکھا ہے۔ وہ غذا کے سلسلے میں پرہیز کر رہے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلے میں آپ اُن پر نظر رکھیے بلکہ اُن کے گھر جا کر گھر والوں کو بھی سمجھائیے کہ اُن کی غذا کا خاص خیال رکھا جائے۔ جوش والے صفحات انھیں بھی پڑھوا دیجیے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ اردو کتنی زرخیز زبان ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین صاحب کے بزمِ اقبال میں آجانے سے جریدے کی ادارت بدستور آپ کے پاس رہے گی یا کوئی دوسری صورت پیدا ہوگی ۔ سنا ہے آپ یونی ورسٹی سینٹ کا الیکشن لڑ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ایک دن آپ قومی سینٹ میں بھی پہنچ جائیں، پھر ڈاکٹر تحسین فراقی کے لیے علمی کام کون کرے گا؟

خدا کرے عزیزی عمر فاروق اب بالکل صحت مند ہو چکا ہو۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۱۹۔۴۔۹۴ء

☆

(۵۹)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا خط مل گیا تھا۔ اس انتظار میں رہا کہ ''سیارہ'' مل جائے تو خط لکھوں۔ چند روز ہوئے یہ ملا ہے۔ سب سے پہلے آپ کا مضمون پڑھا۔ مجھے یہ تو اندازہ تھا کہ مکاتیب اقبال کی تدوین کا کام اُس توجہ سے نہیں ہوا جس کا یہ مستحق ہے لیکن اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ صورتِ حال ایسی خراب ہوگی۔ آپ نے تبصرے کا حق ادا کر دیا۔ جی خوش ہوا اور آپ کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔

☆۱۰۱۔ اقبال پر میرے تنقیدی مضامین کا مجموعہ (۱۹۹۳ء)، شائع کردہ بزم اقبال لاہور۔

☆۱۰۲۔ مکاتیب کا یہ مجموعہ نہایت لغو اور جوش صاحب کی شخصیت کی تصغیر کا آئینہ تھا۔

(معاف کیجیے گا دو سطریں لکھنے کے بعد بال پوائنٹ خشک ہو گیا۔ اب نئے بال پوائنٹ سے لکھ رہا ہوں، اس لیے روشنائی مدھم ہے۔) البتہ ایک بات کی آپ سے توقع نہ تھی اور وہ یہ کہ آپ نے جا بجا غصے کا اظہار کیا ہے اور بعض جگہ نہایت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں اور یہ بھی صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ یہ کام برنی صاحب کا نہیں، دوسروں کا ہے۔ اگر آپ ہاتھ ذرا ہلکا رکھتے تو بہتر تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس کتاب کا مسودہ اقبال اکیڈیمی میں چھپنے کے لیے آیا تھا۔ جس کمیٹی نے اس پر غور کیا تھا، اُس میں ڈاکٹر ہاشمی اور شاید آپ بھی تھے۔ میں نے اُسی وقت عرض کر دیا تھا کہ اس کام کو نظرِ ثانی کے بغیر شائع نہ کیا جائے لیکن سرسری نظر میں وہ باتیں سامنے نہ آسکی تھیں جو آپ کے عالمانہ مضمون سے سامنے آئیں۔ برنی صاحب کا جو ردِ عمل ہو، اس سے مجھے ضرور مطلع کیجیے گا۔[☆☆۱۰۳]

(اب میں تیسرا قلم استعمال کر رہا ہوں جس کا رنگ مختلف ہے۔)

کمبل پوش کے مخطوطہ کلکتہ کے بقیہ صفحات حاصل کرنے کی ایک صورت نکل آئی ہے۔ مطلع فرمایئے کہ آپ کے عکس میں کتنے صفحے کم ہیں۔ آپ کا جواب آنے پر کلکتہ خط لکھوں گا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو ایک مفصل خط لکھا تھا، کچھ چیزوں کے عکس بھیجے تھے۔ حیرت ہے کہ اُنھوں نے جواب نہیں دیا۔ شاید جماعتی مصروفیات زیادہ ہو گئی ہیں اس لیے غیر جماعتی لوگوں کی طرف توجہ نہیں رہی۔ ملاقات ہو تو کہیے کہ میں اُن کے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔

برادرم جعفر بلوچ سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہیے۔ اُنھوں نے خامہ بگوش کے بارے میں یک خوب صورت نظم لکھی تھی مگر میں اسے چھاپنے کی کوئی صورت نہیں نکال سکا۔ ویسے بھی ''تکبیر'' میں س کی اشاعت کی گنجائش نہ نکل سکے (گی)۔ کوشش کروں گا کہ اسے کسی کالم میں استعمال کر لوں۔

میرے حالات حسبِ معمول ہیں۔ آج کل یگانہ کے سلسلے میں پرانے رسائل دیکھ رہا ہوں۔ لامہ اقبال کے بارے میں بھی آپ کے کام کی کچھ چیزیں مل رہی ہیں۔ نوٹ کرتا جا رہا ہوں۔ یگانہ کی کتاب ''چراغِ سخن'' کا پہلا ایڈیشن اب تک نہیں مل سکا۔ شاید یہ کتاب بھی آپ ہی کے ذریعے دستیاب ہو۔

پچھلے دنوں ساقی فاروقی کی ایک غزل کی بحر کے سلسلے میں احمد ندیم قاسمی اور ساقی سے خط و کتابت ہوئی تھی۔ ساقی ان تمام خطوں کو ''معاصر'' میں چھپوا رہا ہے۔ اس بحث کو دیکھ کر اپنی رائے ضرور ہیے گا۔ عروض سے چوں کہ آپ کو دلچسپی ہے اس لیے آپ کی رائے میرے لیے بہت اہم ہوگی۔

۱۰۳۶۔ مظفر حسین برنی صاحب مرتب کلیات مکاتیب اقبال کا ردِ عمل ۲۰۰۰ء میں اس وقت سامنے آیا جب میں غالب انسٹی ٹ کی دعوت پر بین الاقوامی سمینار میں شرکت کے لیے دلی گیا۔ اس سے پہلے برنی صاحب سے چند خطوط کا تبادلہ اور لی ہی میں ۱۹۹۷ء میں ایک بھرپور ملاقات ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے یہ قیاس کرتے ہوئے کہ وہ مجھے نہیں جانتے، برنی احب سے فرمایا، ''ان سے ملیے، یہ تحسین فراقی ہیں، لاہور سے آئے ہیں۔'' برنی صاحب نے فرمایا، ''ہاں انھیں کون نہیں انتا۔'' یہ فرمایا اور کمال بے اعتنائی سے منھ موڑ لیا۔ مزید ایک حرف بھی نہ کہا۔

خدا کرے آپ مع اہلِ خانہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۱۔۶۔۹۴ء

☆

(۶۰)

برادرِ مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا خط مل گیا تھا، جوشؔ کے خطوط سے متعلق رسالہ تلاش کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا، اس لیے فوراً جواب نہ دے سکا، ان خطوط کے عکس منسلک ہیں۔

مولوی عبدالحق کے خطوں کے بارے میں آپ سے بات ہوگئی تھی کہ آپ کے پاس جو خط ہیں وہ سب غیر مطبوعہ ہیں۔ خطوطِ عبدالحق (قدوائی) اور اردوئے معلّیٰ احتیاطاً دیکھ لیجیے شاید ایک آدھ خط چھپ گیا ہو۔ آپ انھیں مرتب کر کے بھیج دیجیے تو رسالہ غالبؔ میں ان کی اشاعت فوری طور پر ہو سکتی ہے۔ کرنل رشید والے خطوط کی طرف بھی توجہ فرمائیے۔☆۱۰۴

کالموں کی وجہ سے عام لوگ جہاں خوش ہوتے ہیں، وہیں وہ لوگ ناراض ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں کچھ لکھا جائے۔ اسلوب احمد انصاری اور ڈاکٹر خلیق انجم جیسے لوگ بھی ناراض ہوگئے۔ بڑی مشکل سے انھیں منایا گیا۔ ان سے بڑی دل چسپ خط و کتابت ہوئی ہے۔ آپ کبھی آئیں گے تو دکھاؤں گا۔ خلیق انجم صاحب کے ساتھ تو بڑی زیادتی ہوئی۔ پہلے تو اس کالم کا فوٹو اسٹیٹ تقسیم کیا گیا اور پھر اسے دو تین اخباروں میں حاشیہ آرائیوں کے ساتھ چھپوایا گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہندوستان میں خلیق انجم صاحب کے مخالفین اتنی بڑی تعداد میں ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں اُن کے بارے میں ہرگز نہ لکھتا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ خلیق انجم سے متعلق کالم سے خوش ہو کر مظہر امام صاحب☆۱۰۵ نے مجھے خط لکھا اور ساتھ ہی اپنی کتاب بھی بھیجی۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ آپ کی کتاب پر کالم ضرور لکھوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ آپ ناراض نہ ہوں مگر جو ہونا تھا وہی ہوا یعنی ناراض ہوگئے۔

آپ کا ہندوستان جانا تو اب کئی مہینے کے لیے موقوف ہوگیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ طاعون کی وجہ سے اگلے چھ ماہ میں حالات معمول پر آسکیں گے۔ اب تو ڈاک بھی نہیں آئے گی۔ اس کا بے حد افسوس ہے کہ اب وہاں کی مطبوعات دیکھنے کو نہیں ملیں گی۔ میرے کالم جو طباعت کے لیے بالکل تیار ہیں، وہ اس انتظار میں رکھے تھے کہ کوئی آنے جانے والا ہو تو اُس کے ہاتھ بھیجوں گا، اب اس کا امکان بھی نہیں رہا۔

☆۱۰۴۔ کرنل خواجہ عبدالرشید کے نام متعدد مشاہیر کے خطوط جن میں خود مشفق خواجہ کے خطوط بھی ہیں، میرے پاس ہیں اور میں انھیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

☆۱۰۵۔ ہندوستان کے معروف شاعر اور تنقید نگار۔

آپ سے ملاقات کی صورت ان شاء اللہ اگلے سال کے شروع میں پیدا ہوگی۔ اقبال ایوارڈ کی میٹنگ ہی میں آؤں گا تاکہ طعام و قیام کا معقول بندوبست ہوسکے۔

''تنقیدِ اقبال۔ حیاتِ اقبال میں'' کے سلسلے کی کچھ اور چیزیں ملی ہیں (آج کل یگانہ کے سلسلے میں پرانے رسالے دیکھ رہا ہوں) انھیں نشان زد کرکے رکھتا جارہا ہوں۔

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ''کلیاتِ یگانہ'' کی کمپوزنگ شروع کرادی ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر صاحب کا کیا حال ہے؟ آپ کی سرپرستی میں وہ یقیناً خوش ہوں گے۔ البتہ اُن کی خوش حالی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اچھی خاصی تنخواہ اور مراعات چھوڑ کر یونی ورسٹی میں آگئے۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگیا ہوگا۔ میرا ایک شعر ہے:

ہم ایسے کون سے آسودہ حال تھے پہلے
جو اب شکایتِ غم ہائے روزگار کریں

اُن کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ وہ پہلے واقعی آسودہ حال تھے۔

اِدھر بہت سی اچھی اچھی کتابیں آئی ہیں۔ پطرس بخاری کے یونائیٹڈ نیشنز سے تعلق پر ڈاکٹر انور دل کی کتاب On this Earth Together حال ہی میں شائع ہوئی۔ بڑی معلوماتی کتاب ہے۔ پروفیسر مشیر الحق مرحوم کے بارے میں بھی مضامین کا ایک نہایت عمدہ مجموعہ آیا ہے۔ محمد سلیم الرحمن نے ''رباعیاتِ سرمد'' کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ تو آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔[☆۱۰۶]

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۴۔۱۰۔۹۴ء

☆

(۶۱)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

بہت دنوں سے آپ کا خط نہیں آیا۔ بھابی صاحبہ کے والد مرحوم کی تعزیت کا خط لکھا تھا، امید ہے ملا ہوگا۔ اگر نہ ملا ہو تو ہم دونوں کی طرف سے بھابی صاحبہ کی خدمت میں دلی تعزیت پیش کردیجیے۔ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

''معاصر'' کا تازہ شمارہ مل گیا ہوگا۔ اس میں احمد ندیم قاسمی اور ساقی فاروقی سے میری خط کتابت شائع ہوئی ہے، جو ساقی کی ایک غزل کے بارے میں ہے۔ یہ تمام ذاتی خط ہیں اور انھیں اس صورت میں شائع نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن قاسمی صاحب کی شہ پر ساقی نے انھیں چھپوا دیا ہے۔ آپ ان

☆۱۰۶۔ ''رباعیاتِ سرمد'' کا اردو ترجمہ میری نظر سے گزر چکا تھا۔ میرا احساس ہے کہ محمد سلیم الرحمن بہ وجوہ اس ترجمے پر اتنی محنت نہ کرسکے جتنی مطلوب تھی۔

خطوں کو پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ ساقی کا موقف کس قدر غلط ہے۔ مجھے اپنے ایک خط کے صرف ایک پیراگراف پر ندامت ہے جو ساقی کے اس شعر:

میں نے ہزار بار برہنہ کیا اُسے
یہ معجزہ خیال کی پرواز میں ہوا

کے حوالے سے قدرے فحش ہے۔ چوں کہ میرے علم میں نہیں تھا کہ یہ خط چھپیں گے☆۱۰۷ لہٰذا میں اس شعر پر بے تکلفانہ تبصرہ نہ کرتا۔ ساقی نے ایک چالاکی یہ کی کہ قاسمی صاحب کو لکھا کہ مشفق نے شکست تسلیم کرلی ہے۔ قاسمی صاحب ڈر گئے اور فوراً ساقی کو لکھا کہ وہ بھی شکست تسلیم کرتے ہیں بلکہ شکست میں مجھے بھی شریک کرلیا۔ جب مجھے اس کا علم ساقی کے خط کے ذریعے ہوا تو میں نے قاسمی صاحب کو لکھا کہ آپ کے ساتھ شکست میں شریک ہونا اعزاز کی بات ہے مگر میں اپنے موقف پر قائم ہوں۔ اسی وجہ سے قاسمی صاحب کے خط میں ایک حاشیے میں وضاحت کی گئی ہے کہ مشفق خواجہ اس شکست میں شریک نہیں ہیں۔ آپ یہ ساری خط کتابت پڑھ لیجیے۔ آپ کے تاثرات جاننا چاہوں گا۔

دو ماہ سے ہندوستان کی ڈاک طاعون کی وجہ سے بند تھی۔ اب کھلی ہے تو بہت سی کام کی چیزیں آئی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی ''شعرِ شور انگیز'' کی چوتھی جلد بھی آ گئی ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے اپنی کتاب ''اقبال کی تیرہ نظمیں'' کو نئی صورت میں اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کا نام اب ''اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں'' ہے۔ رسالوں میں ''سوغات'' کا نیا شمارہ آیا ہے جس میں بہت سی کام کی تحریریں ہیں۔

پروفیسر فروغ احمد کی وفات کا بے حد افسوس ہوا۔ جب یہ کراچی میں تھے اور پاشا رحمان کے گھر میں مقیم تھے تو ان سے دو تین مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ لاہور جب بھی گیا اُن سے ملنے کا سوچ کر گیا، لیکن بدقسمتی سے ملاقات نہ ہوسکی۔ حق مغفرت کرے، بہت اچھے آدمی تھے۔

آج کل انتظار حسین صاحب کراچی میں ہیں۔ رات ڈاکٹر اسلم فرخی کے ہاں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ کل اور پرسوں بھی ملاقاتیں ہوں گی۔

مظفر علی سید صاحب سے کبھی ملاقات ہوتی ہے یا نہیں؟ اُن کی کتاب ''تنقید کی آزادی'' نظر سے گزری یا نہیں۔ مکتبہ جامعہ دہلی کا رسالہ ''کتاب نما'' کیا آپ کے پاس آتا ہے؟

یہاں کے حالات بدستور ہیں۔ جعفر بلوچ صاحب کا کیا حال ہے؟ ملاقات ہو تو سلام کہیے۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۹۔۱۱۔۹۴ء

☆۱۰۷۔ یہاں ''ورنہ'' کا محل تھا۔ خواجہ صاحب قلم برداشتہ لکھ گئے۔

☆

(۶۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

اب کے آپ کو خط لکھنے میں دیر ہوگئی۔ اگرچہ آپ کا کوئی خط جواب طلب نہیں تھا لیکن آپ کو خط لکھنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ گویا آپ کو خط نہ لکھ کر میں نے اپنا ہی نقصان کیا۔ دراصل پچھلے دنوں بہت سے فضول کام کرنے پڑے۔ ''غالب'' اور ''اردو''، دونوں رسالوں کا خاصا کام تھا۔ البتہ ایک کام فضول نہیں تھا اور وہ ممتاز حسن (مرحوم) کے مضامین کی ترتیب۔ یہ مجموعہ ان شاء اللہ جلد ہی چھپے گا۔ اس پر مستزاد ''کلیاتِ یگانہ'' کے پروف۔ کئی کئی پروف دیکھنے پڑے۔

جی ہاں کالموں کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔☆۱۰۸ اس کے صرف دو نسخے موصول ہوئے ہیں، ایک مصنف کے لیے اور ایک مرتب کے لیے۔ مزید نسخے آنے ہی والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں، وہ پورے برصغیر کے صرف ایک درجن افراد کے لیے ہوتا ہے۔ اس فہرست میں آپ کا دوسرا نمبر ہے۔ پہلے نمبر پر میں خود ہوں۔ کتاب کا دیباچہ میں نے اپنے ایک کالم میں نقل کردیا تھا۔ امید ہے نظر سے گزرا ہوگا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کتاب میں یہی ایک چیز نئی ہوگی۔ ایسا نہیں ہے، اس میں شامل کالموں میں، میں نے اتنی تبدیلیاں کی ہیں کہ بعض کالم بالکل ''نئے'' ہوگئے ہیں۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ کتاب آپ کو ملے تو اسے ضرور پڑھیے گا۔ یہ کہہ کر طاقِ نسیاں پر نہ رکھیے گا کہ یہ سارے کالم تو پہلے کے پڑھے ہوئے ہیں۔

ہاں جناب یہ کیا ہوا، بزمِ اقبال کے رسالے سے آپ کا نام غائب ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سے کوئی جھگڑا ہوگیا کیا؟ ویسے ڈاکٹر وحید قریشی نے بہت پہلے اس کی پیش گوئی کردی تھی۔ ڈاکٹر قریشی واقعی ولی اللہ ہیں۔☆۱۰۹

کشور ناہید کی آپ بیتی پر لکھ کر تو میں خاصا نقصان میں رہا۔☆۱۱۰ ہر شخص مجھ سے اُس کی کتاب مانگتا ہے۔ بعض کو فوٹو اسٹیٹ بنوا کردینے پڑے۔ آخر یہی کہنا پڑا کہ کتاب ایک صاحب کو پڑھنے

☆۱۰۸۔ یعنی ''خامہ بگوش کے قلم سے''۔ یہ مجموعہ ستمبر ۱۹۹۵ء میں کوآپرا بک شاپ کراچی سے شائع ہوا۔ دیباچے کا عنوان خواجہ صاحب نے ''غلط نامہ'' رکھا تھا۔

☆۱۰۹۔ میرے علاحدہ کردیے جانے کی بڑی وجہ میرے قیاس میں یہ تھی کہ پرچے کے مشمولات کے ضمن میں مجھے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا، مثلاً ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کا انگریزی متن ڈاکٹر صاحب نے اس دعوے کے ساتھ شائع کیا تھا کہ یہ اب تک کا مستند ترین متن ہے۔ اس ''مستند ترین متن'' میں بعض ایسی افسوس ناک غلطیاں بھی راہ پا گئی تھیں جو قبل ازیں کے مطبوعہ متون میں نہیں تھیں۔ میں نے اس طرح کے امور کی نشان دہی کرنا ضروری سمجھا کہ بطور معاون مدیر اس پرچے پر میرا نام بھی چھپتا تھا۔ یہ باتیں ڈاکٹر غلام حسین صاحب کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں لہٰذا: ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو، کا فیصلہ کرلیا گیا اور اگلے پرچے سے میرا نام بغیر مجھے اطلاع دیے حذف فرما دیا گیا۔

☆۱۱۰۔ یہ کالم مشفق خواجہ کی کتاب ''سخن در سخن'' (اپریل ۲۰۰۴ء) میں ''کشور ناہید کی یادوں کی برات'' کے زیرِ عنوان شائع ہوا۔

کے لیے دی تھی، مگر انھوں نے پڑھنے کی بجائے اسے کھالیا۔ گویا کتاب نہ ہوئی مضغہ ہوگئی۔ سنا ہے محترمہ کالموں کی وجہ سے سخت ناراض ہیں، حالاں کہ میں نے نہایت ''نرم'' کالم لکھے ہیں، اگر ناراض ہی کرنا ہوتا تو میں سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کے حوالے سے کچھ لکھتا کہ ان دونوں کی کتاب میں تعریف بھی ہے اور جانب داری بھی۔ انتظار حسین کا کالم میرے کالم کے بعد چھپا تھا اور وہ اُن دنوں کراچی ہی میں تھے۔ یہ کالم پڑھ کر میں نے اُن سے کہا تھا کہ آپ کو چوں کہ آئندہ لاہور ہی میں رہنا ہے اس لیے آپ نے ''بے ضرر'' کالم لکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کشور ناہید سے ڈرتے ہیں۔ کشور کے مرحوم عاشق ناصر کاظمی کی ڈائری لاہور سے چھپی ہے۔ اس میں کشور کا ذکر ہے، اس کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحے پڑھ چکا ہوں، ایسا کوئی نکتہ ہاتھ نہیں آیا جس سے کشور کے بقول ناصر کاظمی کا یکے از عشاق ہونا ثابت ہو۔ آپ نے یہ ڈائری دیکھی؟

''تاریخِ یوسفی'' کے مطلوبہ صفحات کے لیے میں نے کلکتہ کے مظفر حنفی کو خط لکھ دیا تھا۔ ابھی تک جواب نہیں آیا۔ کچھ دن انتظار کروں گا، پھر کسی دوسرے دروازے پر دستک دوں گا۔ کلکتہ میں مولانا ملیح آبادی کے بیٹے ہیں۔ وہ مجھ سے خلوص کا رشتہ رکھتے ہیں۔ کراچی آتے ہیں تو مجھ سے ضرور ملتے ہیں۔ اُنھیں لکھوں گا۔

طاہر مسعود اور آصف فرخی خیریت سے ہیں، ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ طاہر تو بالکل بدل گئے ہیں۔ انگریزی لباس پہننا ترک کر دیا ہے۔ داڑھی رکھ لی ہے۔ داڑھی میں چند بال سفید بھی ہیں۔ میں نے پوچھا، انھیں سفید کرنے کے لیے آپ نے کیا چیز استعمال کی ہے، جواب میں وہ صرف مسکرا دیے۔

حمید نسیم صاحب کی کتاب کے بارے میں آپ کی جو رائے بھی ہو، لیکن شکریے کا خط تو آپ کو لکھنا چاہیے تھا۔☆۱۱۱ اُنھیں اس کا افسوس ہے کہ میری تجویز پر جن لوگوں کو اُنھوں نے کتاب بھیجی، اُن میں سے کسی نے رسید نہیں دی۔

راشد نمبر واپس نہیں ملا۔

خدا کرے آپ، بھابی اور بچے خیریت سے ہوں۔ آمنہ، بھابی کو بہت یاد کرتی ہیں اور سلام لکھواتی ہیں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۴-۵-۹۵ء

☆۱۱۱۔ حمید نسیم کی کتاب ''اقبال ایک عظیم شاعر'' پر بالآخر میں نے اپنی بے لاگ رائے حمید نسیم صاحب کو لکھ بھیجی تھی۔ جواب میں چھ سات صفحے کا ایک عتاب نامہ میرے حصے میں آیا۔ حمید نسیم کے اس عتاب نامے پر ان دنوں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ''قابض'' ہیں اور اسے واگزار کرنے پر تیار نہیں!

☆

(۶۳)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

بے حد شرمندہ ہوں کہ خاصی تاخیر کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ ہوا یہ کہ ایک جگہ سے بہت سے پرانے رسالے مل گئے۔ انھیں جلد از جلد واپس کرنا تھا۔ ان میں میرے کام کی بہت چیزیں تھیں۔ رسالوں کی ورق گردانی اور مطلوبہ مضامین کے عکس بنوانے میں خاصا وقت صرف ہوا۔ اس دوران کوئی دوسرا کام نہ کر سکا۔

بے حد شکریہ کہ آپ نے ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب سے میرے لیے کتابیں حاصل کیں اور اس سے زیادہ شکریہ اس بات کا کہ یہ کتابیں ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمت میں پیش کر دیں۔ جو ہوا، اچھا ہوا، نہ ہوتا تو اور بھی اچھا ہوتا۔ کم از کم کتابوں کے نام تو بتا دیجیے تاکہ ان میں سے جو میرے پاس نہ ہوں وہ کسی اور ذریعے سے منگوا لوں۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے میں نے گزارش کی تھی کہ کتابوں کے نام بتا دیجیے۔ کئی دن ہو گئے مگر انھوں نے توجہ نہیں کی۔ مگر یہ سب باتیں صرف آپ کے لیے ہیں۔ قریشی صاحب سے ہرگز کچھ نہ کہیے گا۔ عبادت صاحب کی صرف چند کتابیں میرے پاس ہیں۔

شیخ عبدالماجد کی کتاب مل گئی۔ بے حد شکر گزار ہوں۔ نہایت ہی واہیات کتاب ہے۔☆۱۱۲ اس کتاب کو لاہور سے لانے کا یہ اثر ہوا کہ لطیف اللہ صاحب بیمار پڑ گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں محفوظ ہوں۔ میں نے کتاب وصول کرتے ہی اس پر جراثیم کش دوا چھڑک دی تھی۔ لطیف اللہ صاحب آپ کے حسنِ اخلاق اور حسنِ صورت کے بے حد مداح ہیں۔ میں مزاج پرسی کے لیے گیا تو بیماری کی حالت میں بھی آپ کی تعریف کرتے رہے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ اس مردِ نحیف پر تصوف اور بیماری کے اثرات کس قدر مثبت ہیں۔ میں نے اپنے ہاں ہر جمعہ کو درسِ بیدل شروع کیا تھا۔ بیدل کی صرف تین غزلیں اب تک لطیف اللہ صاحب نے پڑھائی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے موصوف کی بیماری میں بیدل کو بھی کچھ دخل ہے۔

یوسف بخاری کے کاغذات کی تلاش جاری ہے۔☆۱۱۳ میرے پاس اُن کے غیر مطبوعہ خطوط خاصی تعداد میں ہیں۔ یہ جلد ہی بھیجوں گا اور اس کے ساتھ ''دلّی کا روڑا'' بھی۔ یہ کتابچہ پہلے ''اردو ادب'' علی گڑھ میں مقالے کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ ''اقوال و امثال'' آپ کو انجمن سے براہِ راست ملے گی۔ اُن سے کہہ دیا ہے کہ رسالہ ''سیارہ'' میں آپ اس پر مضمون لکھ دیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کو انجمن کی کتابوں کے دو دو نسخے بھیج دیے جائیں اور آپ ان پر ''سیارہ'' میں تبصرہ کر دیا کریں۔ ایک

☆۱۱۲۔ لاہور کے ایک قادیانی قلم کار۔ انھوں نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ اقبال قادیانیت سے شدید طور پر متاثر تھے اور ان کی شاعری کا ایک حصہ قادیانی ''اکابر'' کی تحریک کا نتیجہ تھا وغیرہ۔

☆۱۱۳۔ ان دنوں میری ایم اے کی ایک شاگرد یوسف بخاری دہلوی پر مقالہ لکھنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ خواجہ صاحب نے اس مقالے کی تکمیل کے لیے نہایت قیمتی لوازمہ بھیجا۔

ایک نسخہ اُن لوگوں کو دے دیا کیجیے۔

افتخار عارف صاحب کو تراجم کا مشورہ میں نے ہی دیا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے جو مختلف احباب سے قابلِ ترجمہ کتابوں کی فہرستیں بنوائی تھیں، وہ انھیں دے دی تھیں۔ آپ کی تیار کردہ فہرست بھی اُن کو دی تھی۔ ایڈورڈ سعید کی کتاب کا نام اُنھوں نے اسی فہرست میں دیکھا ہے۔ معاوضہ جو تجویز کیا گیا ہے وہ بہت کم ہے۔☆۱۱۴ ترجمے کا نرخ ہزار الفاظ کے لیے ڈیڑھ سو روپے سے دو سو روپے تک کا ہے۔ اس طرح کم از کم =/۷۵ روپے فی صفحہ معاوضہ تو ملنا چاہیے۔

حسبِ معمول ایک زحمت دے رہا ہوں۔ لاہور میوزیم میں دیا نرائن نگم اور مرزا فہیم بیگ کا ایک ایک خط ہے۔ دو خط ذوالفقار علی بخاری کے ہیں۔ ان چاروں کی مجھے ضرورت ہے۔ اگر آپ انجم رحمانی صاحب سے مل کر ان چار خطوں کے عکس بنوا دیں تو بے حد کرم ہوگا۔ ان خطوں کا ذکر لاہور میوزیم کی فہرستِ مخطوطات مرتبہ رشید احمد میں ہے، جلد سوم، ص ۱۳۔ ان چاروں خطوں کے نمبر حوالہ یہ ہیں:
۹/۱۴۱۰۔ ٹی، ۸/۱۴۱۱۔ ٹی، ۹/۱۴۱۲۔ یو، ۱۰/۱۴۱۳۔ یو۔ میں ہمیشہ آپ کو زحمت دیتا ہوں۔ کیا کروں، پیر شصت سالہ ہوں اور میرے عصائے پیری آپ ہی ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

رسالہ ''غالب'' (نیا شمارہ) آپ کو بھیجا گیا ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں آپ کو پسند آئیں گی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر آفتاب احمد کا مضمون (فیض) پڑھیے گا۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۳-۴-۹۶ء

☆

(۶۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

کیا کسی آئین، قانون، دستور، شریعت، طریقت، یہاں تک کہ آپ کی محذورۂ جان و دل جماعتِ اسلامی کے کسی اجلاس کی روداد میں کہیں لکھا ہے کہ اپنے چاہنے والوں کو تنگ کیا جائے۔ تو پھر آپ نے میرے کئی خطوں کے جواب کیوں نہیں دیے۔ رسالہ ''غالب'' کی رسید کیوں نہیں بھجوائی، انجمن کی کتابوں کی وصولی کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ یوسف بخاری سے متعلق کاغذات ملنے پر میرے اطمینان کے لیے تین حرف کیوں نہیں لکھے۔ اتنا پریشان تو کشور ناہید نے یوسف کامران کو بھی نہیں کیا ہوگا، جتنا آپ نے مجھے امتحان میں ڈالا ہے۔ لڑکے لڑکیوں سے امتحان لیتے لیتے آپ پیرانِ فرتوت کے بھی امتحان لینے لگے۔ افسوس کہ جماعتِ اسلامی نے پورے معاشرے کی اصلاح کا ٹھیکا لے رکھا ہے لیکن اپنے متفقین کی

☆۱۱۴۔ مقتدرہ قومی زبان نے مجھے ایڈورڈ سعید کی کتاب **Orientalism** کا اردو ترجمہ کرنے کا کام سونپا تھا مگر افسوس کہ مقتدرہ کی عجلت پسندی اور میری روایتی کاہلی سدِّ راہ بنی رہی اور یہ کام ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اصلاح کا معاملہ خدا پر چھوڑ رکھا ہے۔ آخر یہ جماعت باقی سب کچھ بھی خدا پر کیوں نہیں چھوڑ دیتی!

آپ کو اندازہ نہیں، دار اشکوہ کے قاتل، یہ نام انھیں مت بتایئے گا، نے تو آپ کو جتایا ہوگا کہ میں نے کس محنت اور دقت سے یوسف بخاری کے کاغذات تلاش کیے۔ میں نہایت تنگ جگہ پر ایک ہاتھ سے الماری سے کاغذ نکالتا دوسرے سے اورنگ زیب صاحب کو دیتا، پھر دو گھنٹے صرف کر کے ان کاغذات میں سے آپ کی ''شاگردہ'' کے کام کی چیزیں نکالیں۔ شدید گرمی کے عالم میں میرا جو حال ہوا سو ہوا، اورنگ زیب صاحب بھی پسینے میں اس طرح نہا گئے جیسے پسینہ نہ ہو عرقِ انفعال ہو۔ کاش آپ نے اس محنت کی داد ہی دی ہوتی۔ ہاں علامہ اقبال کی پہلی بیوی کے بارے میں کتاب کا نیا ایڈیشن بھی آپ نے وصول کرلیا اور یہ نہ بتایا کہ اُن کی دوسری بیوی پر آپ کتاب کب تک لکھیں گے؟ تیسری بیوی پر لکھنے کا حق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو ہے مگر وہ اس حق کو شاید ہی استعمال کر سکیں کہ دوسروں کی بیویوں کے معاملات میں دخل دینا شرعاً جائز نہیں۔ علامہ کی محبوباؤں پر کتاب جعفر بلوچ صاحب کو لکھنی چاہیے کہ گڑھے مردے اکھاڑنے یا اکھیڑنے میں انھیں یدِطولیٰ حاصل ہے۔

ہاں اس کا شکریہ بھی آپ پر واجب ہے کہ آپ کے لاہور کے قیام کے دوران میں آپ کے لیے باعث زحمت نہیں ہوا۔ آپ کی کار اتنی بھی استعمال نہیں کی جتنی ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنے چہرے پر مسکراہٹ استعمال کر لیتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگلی بار بھی آپ اس زحمت سے بچے رہیں گے۔ اقبال ایوارڈ کے سلسلے میں آرہا ہوں۔ اب کے کچھ لوگوں کو جرمانے کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ ان لوگوں میں آپ بھی شامل ہوں گے۔

اچھا اب ایک نہایت ضروری کام کی طرف توجہ کیجیے۔ پنجاب لائبریری میں ''اودھ پنچ'' کی فائلیں ہیں۔ ان میں ۱۹۱۸ء کے کچھ شمارے بھی ہیں۔ ۱۲/ اپریل ۱۹۱۸ء کے شمارے میں ''سیف زبان لکھنوی'' کا ایک مضمون ''ادبی دنیا کا انقلاب'' شائع ہوا ہے۔ یہ یاسؔ (جو اُس وقت یگانہ نہیں بنے تھے) کے بارے میں ہے۔ اس کا عکس بنوا کر بھجوا دیجیے۔ ۱۹۱۸ء اور اس کے بعد کے شماروں پر بھی نظر ڈال لیجیے، اگر یاسؔ کی یا اُس کے بارے میں کوئی تحریر ہو تو اُس کا بھی عکس بنوا لیجیے۔ یہ کام بہت عجلت کا ہے، امید ہے آپ اپنے وقت کا کچھ حصہ میری خاطر بھی ضائع کر کے، یہ کام کر دیں گے۔ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ میری بے تابی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ابھی سے دروازے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ہے کہ ڈاکیا آپ کا ارسال کردہ لفافہ لے کر آتا ہوگا جس میں میرے مطلوبہ فوٹو اسٹیٹ ہوں گے۔

میری سادگی دیکھیے کہ پچھلے خط میں لاہور میوزیم سے متعلق ایک کام لکھا تھا۔ وہی کام نہیں ہوا تو دوسرا کام بتا دیا۔ خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۹-۵-۹۶ء

☆

(۶۵)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا خط مورخہ ۱۲ر جون ابھی کچھ دیر پہلے ملا۔ بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ اپنی روایات کے خلاف جواب دینے میں خاصے مستعد ہو گئے ہیں۔ خدا کرے آپ کے اس تازہ وصف کو دوام حاصل ہو۔

"اودھ پنچ" کے سلسلے میں میری معلومات کا ماخذ ایک خط ہے جو جمیل احمد رضوی صاحب نے ۵ر جنوری ۱۹۸۸ء کو رؤف پاریکھ صاحب کے نام لکھا تھا۔ اس کا عکس میں نے پاریکھ صاحب سے حاصل کر لیا ہے جو اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔☆۱۱۵ امید ہے اس کی بنیاد پر آپ کو مطلوبہ شمارہ تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔ اگر اس کام میں آپ ممکنہ حد تک عجلت سے کام لے سکیں تو کرم ہوگا۔ میرا مطلوبہ مضمون "ادبی دنیا کا انقلاب" ہے جسے سیف زبان لکھنوی نے لکھا ہے اور جو ۱۲ر اپریل ۱۹۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد کے شمارے بھی دیکھ لیجیے، ممکن ہے اُن میں یاس نے یا کسی دوسرے شخص نے کچھ لکھا ہو۔ میرے پاس "اودھ پنچ" کے دو ڈھائی سو شمارے ہیں مگر وہ ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کے ہیں۔

صہبا لکھنوی کے نام آپ کا خط پڑھا۔ دراصل محمد علی صدیقی سے اُن کے تعلقات بہت گہرے ہیں، اس وجہ سے اُنھوں نے خط کی اشاعت مناسب نہ سمجھی۔ جولائی کا مہینہ اور دیکھ لیجیے۔ اگر یہ خط اُس میں بھی نہ چھپا تو پھر میں کالم میں اسے چھاپ دوں گا اور محمد علی صدیقی کا دفاع بھی کروں گا اور کہوں گا جس طرح بڑے شاعروں کی غلطیاں سند بن جاتی ہیں اُسی طرح "بڑے" نقاد کے ارشادات پتھر پر لکیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔☆۱۱۶

حمید نسیم صاحب نے سعید شیخ کو کیا لکھا ہے، مجھے معلوم نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ آپ نے اقبال والی کتاب کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، اُس سے وہ خوش نہیں ہیں اور جب وہ کسی سے ایک بار ناخوش ہو جائیں تو مشکل ہی سے اُسے معاف کرتے ہیں۔ وہ عمر کی جس منزل میں ہیں، وہاں اُنھیں "حرفِ دل خوش کن" کی ضرورت ہے، جب کوئی امر اس کے برعکس ہو تو وہ دلگیر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا سعید شیخ صاحب

☆۱۱۵۔ جمیل احمد رضوی صاحب کا یہ خط بطور ضمیمہ شاملِ اشاعت ہے۔

☆۱۱۶۔ محمد علی صدیقی صاحب نے غالب کے حوالے سے "افکار" میں کچھ اوٹ پٹانگ، مضحکہ خیز باتیں لکھ دی تھیں۔ میں نے اس ضمن میں صہبا صاحب کو خط لکھا تھا۔ یہ خط شائع نہ کیا گیا، بعد ازاں مشفق خواجہ صاحب نے "تکبیر" میں اس خط کو بنیاد بنا کر ایک عمدہ کالم لکھا۔ افسوس یہ کالم ان کے کالموں کے تینوں منتخبات میں کسی جگہ بار نہ پاسکا۔

کے نام کا خط پڑھ کر آپ افسردہ نہ ہوں۔ اُن کی نئی کتاب ''چند اور اہم شاعر'' بھی چھپ گئی ہے۔ افسوس کہ میں یہ بھجوا نہیں سکتا۔ آپ کے خط نے معاملہ بگاڑ دیا ہے ورنہ اُن کی اگلی پچھلی ساری کتابیں آپ کو مل جاتیں۔

لاہور سے ایک مراسلہ (گشتی) موصول ہوا ہے جو ڈاکٹر سید معین الرحمن کے سخت خلاف ہے۔ یہ اور لوگوں کو بھی ملا ہے اور اس کے آخر میں ایک طویل فہرست اُن لوگوں کی ہے جن کے نام یہ بھیجا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انھی کے کالج کے کسی استاد کا کارنامہ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، یہ مراسلہ کس نے لکھا ہے؟

''اردو کی مختصر آپ بیتیاں'' بھی خوب آپ نے ڈھونڈ نکالی۔ میں نے ایم اے میں ''خود نوشت سوانح عمری کا فن اور اردو میں اس کی روایت'' پر مقالہ لکھا تھا۔ اسی سلسلے میں مختصر آپ بیتیاں یک جا کی تھیں۔ ''الزبیر'' کے ایڈیٹر کراچی آئے اور اُنھوں نے بتایا کہ وہ ''آپ بیتی نمبر'' نکال رہے ہیں تو میں نے یہ پلندہ اُن کو دے دیا۔ اُنھوں نے اسے اپنے رسالے میں چھاپا اور پانچ آف پرنٹ مجھے دیے۔ ان میں سے ایک میں نے ممتاز حسن مرحوم کو دے دیا۔ یہی رفعت کلیکشن میں ہے۔ یہ آف پرنٹ تو اب نہیں مل سکتا، اگر ''الزبیر'' کا آپ بیتی نمبر آپ کے پاس نہ ہو تو وہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔

لاہور میوزیم میں یگانہ کے نام کے خطوط مل گئے تھے۔ بے حد ممنون ہوں۔ لاہور میں ایک صاحب تھے حفظ الرحمن منہاس، مولوی محبوب عالم پیسہ اخبار کے پوتے یا نواسے تھے۔ یگانہ کے اُن سے گہرے تعلقات تھے۔ میرا خیال ہے یہ خطوط منہاس صاحب نے ہی میوزیم میں دیے ہوں گے۔ اگر زحمت نہ ہو تو رحمانی صاحب سے فون پر اس کی تصدیق کرا لیجیے۔ میرا خیال ہے کہ یگانہ جب لاہور میں منہاس کے ہاں رہتے تھے تو وہاں یہ خط بھول گئے ہوں گے۔

احمد جاوید صاحب نے ابھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔

شدید گرمی اُس پر بجلی کا غائب ہونا۔ زندگی میں پہلے ہی کون سا سکون تھا کہ ان دونوں عذابوں نے جینا مشکل کر دیا ہے۔ پرسوں پورا دن بجلی غائب رہی۔ میں نے پورے آٹھ گھنٹے صحن میں کھڑے ہو کر ایک اسٹول سامنے رکھ کر کام کیا کہ وہاں ہوا کا گزر تھا۔

میں نے جعفر بلوچ صاحب کے لیے بھی رسالہ ''غالب'' بھیجا تھا۔ شاید اُنھیں نہیں ملا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۸۔۶۔۹۶ء

مکتوب (خفیہ) ۹۳

فون نمبر 87962

ایل/11
5 - 1 - 88

محترمی ، السلام علیکم !

آپ کا مکتوب مورخہ 24 دسمبر 1987ء وصول ہوا ۔

اودھ پنچ لکھنؤ کے جو شمارے لائبریری میں موجود ہیں ، اُن کی تفصیل درج ذیل ہے ۔

جنوری 1917ء ، فروری ، اپریل ، مئی ، اگست ، ستمبر ، اکتوبر 1918ء ، 1919ء اور 1920ء کی جلد مکمل ، مئی ، دسمبر 1925ء ؛ جنوری ، فروری ، اپریل 1926ء ، جون ، جولائی 1931ء ۔

امید ہے آپ کے مزاج بخیر ہوں گے ۔

والسلام

مخلص

(جمیل احمد رضوی)
ڈپٹی چیف لائبریرین ۔

بخدمت
جناب رؤف پاریکھ ،
حرفت پاریکھ کمپنی ، دریا لال اسٹریٹ ،
جوڑیا بازار ، کراچی ۔

مکرم خواجہ صاحب
سلام علیکم۔ معذرت خواہ ہوں کہ اس خط کا عکس پہلے نہ بھیج سکا۔ کراچی سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔
مخلص
رؤف پاریکھ
۱۲/۱/۹۴

☆

(۶۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا اور ''اودھ پنچ'' کے فوٹو اسٹیٹ بھی۔ بے حد شکر گزار ہوں۔ افسوس کہ مطلوبہ مضمون نہیں مل سکا۔ اب اسے ہندوستان میں تلاش کروں گا۔ ''اودھ پنچ'' میں اقبال کے خلاف بہت کچھ چھپتا رہا ہے۔ ''زبان فطرت دربار'' کے علاوہ اور فرضی ناموں سے بھی مثلاً ایک فرضی نام ''منطق آرا بیگم'' تھا۔ ''اودھ پنچ'' میں بے شمار کام کی چیزیں ملتی ہیں مثلاً مشاہیر کے خطوط، لاہور کی اردو مجلس (حفیظ ہوشیار پوری) کی رودادیں، جامع اللغات اور نور اللغات پر درجنوں قسطوں پر مشتمل تبصرے۔ ایک خزانہ ہے، اس پر کام ہونا چاہیے۔ یہ ساری تحریریں حکیم ممتاز حسین لکھتے تھے جو اس کے ایڈیٹر تھے۔ میرے پاس ''اودھ پنچ'' کے تقریباً ڈیڑھ سو شمارے ہیں۔ ان میں سے بعض میں اقبال سے متعلق تحریریں بھی ہیں۔ اقبال اور ''اودھ پنچ'' کے حوالے سے ضرور لکھنا چاہیے مگر بہتر یہ ہے کہ پہلے سب چیزوں کا سراغ لگا لیا جائے۔ لاہور میں جو شمارے ہیں وہ تو آپ باآسانی دیکھ لیں گے مگر کراچی کے ذخیروں سے تو یہاں آئے بغیر کام نہیں بنے گا۔ یہاں غالب لائبریری، لیاقت نیشنل لائبریری، ہمدرد لائبریری، بیدل لائبریری اور کراچی یونی ورسٹی لائبریری میں ''اودھ پنچ'' کے پرچے ہیں۔ اپنی حد تک اور غالب لائبریری کی حد تک تو مسئلہ میں حل کر سکتا ہوں۔

ڈاکٹر گیان چند کی ادبی تاریخوں سے متعلق کتاب ابھی کمپوز ہو رہی ہے۔☆۱۱۷ چھپتے ہی بھجوا دوں گا۔ ''مشر'' کے لیے میں نے ایک کتب فروش سے کہہ دیا ہے، ان شاء اللہ اگلے چند روز میں مل جائے گی۔ جس ادارے نے یہ کتاب چھاپی ہے اس کا دفتر یونی ورسٹی میں ہے اور دفتر میں سوائے ڈاکٹر ریاض الاسلام کے کوئی اور نہیں۔ کتاب کو گودام سے نکالنا ڈاکٹر صاحب کے بس کی بات نہیں۔ ایک کتب فروش جو اس ادارے کا سول ایجنٹ ہے، کبھی کبھار وہاں جا کر ضرورت کی کتابیں نے آتا ہے۔ وہی ''مشر'' بھی منگوا دے گا۔ اگر بہت جلدی ہو تو میں اپنا نسخہ بھیج سکتا ہوں۔

ایسوسی ایٹ پروفیسر ہونے پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ حق بحقدار رسید۔

''شہاب نامے'' میری نظر سے نہیں گزری☆۱۱۸ تسلیم احمد تصور نے شہاب صاحب کے خطوں کے لیے لکھا تھا مگر میرے لیے ان خطوں کو تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ''الزبیر'' کے آپ بیتی نمبر کا مکرر نسخہ میرے پاس ہے۔ یہ آپ کی امانت ہے۔ ستمبر میں رفاقت علی شاہد کراچی آئیں گے تو پھر اس مکرر نسخے کو تلاش کیا جائے گا۔

☆۱۱۷۔ یہ کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' کے عنوان سے ۲۰۰۰ء میں انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کی۔

☆۱۱۸۔ شہاب کے خطوط میں کم از کم ایک خط ضرور ہے جو خواجہ صاحب نے میری گزارش پر ارسال کیا تھا اور جس کی نقل میں نے تسلیم احمد تصور کو دی تھی۔

میں نے ''افکار'' کے دفتر میں فون کیا تھا۔ اس مہینے بھی یہ خط نہیں چھپا۔ نکہت بریلوی نے بتایا کہ آپ کا خط، محمد علی صدیقی لے گئے تھے۔ نکہت صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اسے چھاپیں گے۔ ایک مہینہ اور انتظار کر لیتے ہیں، اس کے بعد میں کالم لکھ دوں گا۔ دراصل یہ خط ''ناقابلِ اشاعت'' ہے کیوں کہ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اتنا بڑا نقاد معمولی معمولی باتوں سے بھی ناواقف ہے۔

سید معین الرحمٰن کے بارے میں جتنے ''محبت نامے'' شائع ہوئے ہیں، مجھے ان کی ضرورت ہے۔ ان کے پاس تو ہوں گے، نہ ہوں تو کہیں سے حاصل کر کے بھجوائیے۔ چند روز ہوئے فرمان فتح پوری صاحب سے بات ہوئی تھی۔ وہ معین صاحب کے خاص الخاص سرپرستوں میں سے ہیں۔ اُنھیں بھی اس کا ملال ہے کہ معین صاحب کو وہ کچھ نہیں کرنا چاہیے جو وہ کرتے رہتے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۔۷۔۹۶

☆

(۶۷)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا خط مل گیا تھا۔ جواب دینے کو سوچ ہی رہا تھا کہ ایک الم ناک سانحہ رونما ہوا۔ میرے ایک عزیز ترین دوست جو بھائیوں کی طرح تھے، اچانک انتقال کر گئے۔ سید سعید احمد۔ اُنھیں آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ بہاول پور میں یہ ہمارے ساتھ تھے۔ وہاں ایک کالج میں فارسی کے استاد تھے۔ ہر سال گرمیوں کی تعطیلات میرے ساتھ گزارتے تھے۔ اب کے بھی حسبِ معمول آئے۔ گزشتہ بدھ کو شام پانچ بجے تک میرے ساتھ رہے۔ پھر کل آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ بیوی بچے ساتھ تھے۔ اس لیے قیام بھائی کے گھر تھا۔ اُسی رات بچوں سے باتیں کرتے ہوئے اچانک حملۂ قلب ہوا اور اس سے پہلے کہ کوئی طبی مدد ملتی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ یقین نہیں آتا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ میرے ان کے ۲۵۔۲۶ برسوں کے تعلقات تھے اور ایسے گہرے اور مخلصانہ کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر اپنا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے لیے مغفرت کی دعا کیجیے۔☆۱۱۹ پروفیسر محمد اسلم صاحب سے بھی سعید صاحب کے گہرے مراسم تھے۔ پچھلے جمعہ کو اسلم صاحب کراچی میں تھے اور میرے ہاں کئی گھنٹے رہے۔ اُس وقت سعید صاحب بھی موجود تھے۔

''مثمر''☆۱۲۰ میں نے یونی ورسٹی سے منگوالی تھی۔ علمی اداروں کی کتابیں کوئی نہیں خریدتا اور اگر

☆۱۱۹۔ مرحوم نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ مجھ سے بھی یاد اللہ تھی۔ خدا انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

☆۱۲۰۔ سراج الدین خان آرزو کی عالمانہ تصنیف۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی صاحب زادی نے مرتب کر کے کراچی سے شائع کی تھی۔ خواجہ صاحب کی عنایت سے یہ کتاب مجھے ملی۔

کوئی قسمت کا مارا خریدنا چاہے تو پریشانی ہوتی ہے۔ ادارے کے سول ایجنٹ کے پاس یہ کتاب نہیں تھی۔ اس لیے یونی ورسٹی سے منگوانی پڑی اور وہ بھی اس طرح کہ آدمی کو دو مرتبہ وہاں جانا پڑا۔ جوش پر خورشید علی خاں کی کتاب پر میں نے دو کالم لکھے تھے۔[☆۱۲۱] اس کتاب کے چند نسخے مصنف سے دستخط کرا کے حاصل کیے تھے۔ ان میں سے ایک آپ کی نذر ہے۔ کچھ اور کتابیں بھی آپ کے لیے رکھی ہیں، وہ آئندہ بھیجوں گا۔ یہاں ڈاک خانے والے بک پوسٹ دو کلو سے زیادہ کا وصول نہیں کرتے، معلوم نہیں کیوں۔

سید معین الرحمٰن کے بارے میں دونوں مضمون دیکھے، افسوس ہوا۔ سید صاحب بے حد پریشان ہیں۔ اُن کا خط آیا ہے جس میں اُنھوں نے اپنی پریشانی کا حال لکھا ہے اور یہ سوال کیا ہے "میں کیا کروں؟" ظاہر ہے سوائے صبر کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ مجھے تسلیم احمد تصور کے غالب نمبر کی تو ضرورت نہیں ہے، لیکن اس میں لطیف الزماں کی جو دو تحریریں ہیں اور تصور نے جو دیباچہ یا اداریہ لکھا ہے اس کا عکس مل جائے تو کرم ہوگا۔ "ایجوکیشن لائن" میں شائع شدہ تحریر بھی مل جائے تو اچھا ہے۔

عبادت بریلوی نے جو کتابیں میرے لیے دی تھیں، اُن میں سے کم از کم سات کتابیں میرے پاس نہیں ہیں۔ اب میں لاہور آؤں گا تو یہ اُن سے خود حاصل کرلوں گا۔ لاہور ۱۵ ر ستمبر کے بعد آؤں گا، اقبال ایوارڈ کی میٹنگ میں۔

"تاریخ یوسفی" کے لیے لکھ رکھا ہے۔ اب پھر لکھتا ہوں۔ ان شاء اللہ یہ کام جلد ہو جائے گا۔

حمید نسیم صاحب کے بارے میں آپ کی سب باتیں درست مگر اُن کی ضعیف العمری اور بیماری کی وجہ سے خاموشی ہی بہتر ہے۔ وہ اپنی رایوں میں بہت سخت بلکہ متشدد ہیں۔ اس لیے میں تو اُن سے کبھی کوئی اختلافی بات نہیں کرتا کہ اس سے اُنھیں تکلیف ہوتی ہے۔

دونوں کتابوں کی وصولی کی اطلاع ضرور دیجیے گا۔

خدا کرے آپ مع اہلِ خانہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۴۔۸۔۹۴ء

پیکٹ بند کیا جا چکا تھا کہ ایک ضروری بات لکھنے سے رہ گئی۔ چند روز ہوئے نکہت بریلوی آئے تھے۔ اُن کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ آپ کا خط "افکار" میں نہیں چھپے گا لہٰذا اب میں اس پر لکھوں گا۔ لیکن آپ کا خط بنام مدیر "افکار" کاغذات میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ بہت تلاش کیا نہیں ملا۔ اب آپ بہ واپسی ڈاک اس خط کا عکس بھیج دیجیے ساتھ میں میرے نام کے خط میں اس کا پس منظر بھی کہ کس طرح آپ کے خط کو اُنھوں نے گم کیا، آپ نے دوبارہ بھیجا مگر اُنھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔

☆۱۲۱۔ خورشید علی خاں کی کتاب "ہمارے جوش صاحب" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب نے اس پر جو کالم باندھا اس کا عنوان تھا: "جوش اور ان کے مصرع بردار"، دیکھیے "سخن در سخن" ص ۱۶۵۔۱۷۵۔

☆

(۶۸)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا خط مع منسلکات مل گیا، بے حد ممنون ہوں۔ یہ جان کر اطمینان ہوا کہ دونوں کتابیں آپ کو مل گئیں۔ ''مثمر'' اس لائق ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ کیا جائے مگر یہ کام کون کرے۔ ہمارے دوست پروفیسر لطیف اللہ یہ کام کر سکتے ہیں مگر انھوں نے تو اس بھاری پتھر کو چومنے سے بھی انکار کر دیا۔

''سورج'' کے غالب نمبر کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ یہ سارے مضامین مطبوعہ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ انھیں صحیح طور پر بھی نقل نہیں کیا گیا ہوگا۔ میرے پاس وہ تمام اصل کتابیں اور رسالے موجود ہیں جن سے یہ نقل کیے گئے ہیں تو میں اسے کیا کروں گا۔ مدیر کی اہلیت کا اندازہ تو اسی سے ہو جاتا ہے کہ انھوں نے مضامین کو جن عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے، اُن مضامین کے مندرجات سے وہ آگاہ نہیں ہیں۔ ''غالب کے ادبی معرکے'' نقدِ غالب کے تحت ہے اور مرزا عباس بیگ کو غالب کے تحقیقی آئینے میں عکس فگن کر رکھا ہے جب کہ اس مضمون کا غالب سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ عباس بیگ خواہر زادہ ہے تو ہوا کرے، غالب کی زندگی سے اس کا کیا تعلق اور پھر غالب سے متعلق بہترین تحقیقی و تنقیدی مضامین اس سے یکسر غائب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب کو جو چیز مل گئی اُسے شامل کر لیا اور یہ بھی نہ دیکھا کہ اس موضوع پر اس سے بہتر مواد بھی موجود ہے۔

ایک لطیفہ سنیے۔ آپ کے لفافے کے ساتھ ساتھ ایک اور لفافہ موصول ہوا۔ اس میں ''سورج'' کے اداریے کا ایک اقتباس جو میرے بارے میں ہے، وہ ٹائپ کر کے، نیچے یہ بھی لکھا تھا کہ کراچی میں رسالہ کہاں دستیاب ہے اور کتنے میں۔ ظاہر ہے کہ یہ اقتباس خود ایڈیٹر ہی نے بھیجا ہوگا۔ اس میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ میں نے اُن کی کوئی مدد نہیں کی اور اُن کے فرستادہ سے نہایت درشت لہجے میں ملنے سے انکار کر دیا۔ بالکل غلط۔ یہ صاحب لاہور میں ڈاکٹر وحید قریشی کے دفتر میں ملے اور کہا میں غالب نمبر نکال رہا ہوں، کراچی آؤں گا اور آپ سے کچھ نادر چیزیں حاصل کروں گا۔ میں نے کہا ضرور۔ یہ صاحب خود تو نہ آئے کسی اور صاحب کو جو یہاں آرہے تھے میرا فون نمبر دیا اور اُنھوں نے فرمایا ''آپ جو نادر چیزیں دینا چاہتے ہیں، دے دیجیے۔'' میں نے کہا، ''اس کا فیصلہ تو آپ کریں گے کہ آپ کو کیا چاہیے۔ میرے پاس غالب کے بارے میں بہت کچھ ہے۔ مجھے کیا معلوم آپ کو کن نوادرات کی ضرورت ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ خود انتخاب کر لیں اور اگر انتخاب ہی کرنا ہے تو آپ غالب لائبریری چلے جائیں وہاں غالبیات کا ذخیرہ میرے ذخیرے سے کہیں بڑا ہے۔ میں غالب لائبریری والوں کو فون کر دوں گا، آپ کو ہر ممکن سہولت دی جائے گی۔'' بس اتنی بات تھی جس کو اُنھوں نے غلط طور پر بیان کیا۔ دراصل ان صاحب کی اصل شکایت یہ ہے کہ میں نے قدرت اللہ شہاب کے خط انھیں نہیں

دیے۔ میرے پاس خطوط اور دیگر کاغذات بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ یہ مرتب ہو رہے ہیں موضوع وار۔ اب تک جو حصہ مرتب ہوا ہے اُس میں شہاب صاحب کے خط نہیں ہیں۔ اگر دستیاب ہوجاتے تو میں بھیج دیتا۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ میں اپنے سب کام چھوڑ کر سارے کاغذات دیکھوں اور ان میں سے شہاب صاحب کے خط ڈھونڈ کر موصوف کی خدمت میں پیش کروں۔ اس میں کم از کم دو مہینے صرف ہوں گے۔ میں اتنا وقت ضائع کروں تو کیوں۔ ان صاحب نے مجھ پر ''درشت لہجے'' کا الزام بھی لگایا ہے، میں تو کسی کو قتل کرتے وقت بھی درشت لہجہ اختیار نہیں کرتا۔ نہایت محبت اور شائستگی سے یہ کام انجام دیتا ہوں۔

ڈاکٹر معین الرحمن صاحب کی حالت پر رحم آتا ہے۔ میرا دل اُن کے ساتھ ہے لیکن دماغ کچھ اور سوچتا ہے۔ کچھ دن ہوئے عالی صاحب کے گھر پر ایک دعوت میں فرمان صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی دل و دماغ کی اسی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ میں نے ہمیشہ معین صاحب کی اس امید پر حوصلہ افزائی کی کہ وہ آگے چل کر کوئی بہتر کام کریں گے مگر ابھی تک تو وہ ''تحقیق'' کی ''ت'' سے بھی واقف نہیں ہوئے ہیں مگر اُن کے خلاف جس طرح لکھا جا رہا ہے اُس سے بغض کا اظہار ہوتا ہے۔ محاسبہ ضرور ہونا چاہیے مگر شائستہ انداز سے۔ ویسے میرا یہ ایمان ہے کہ جو لوگ نام و نمود کی خاطر لکھتے ہیں وہ بہت جلد گم نامی کے گڑھے میں دفن ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف لکھنے کی ضرورت نہیں، خود اُن کا کام اُن کے خلاف رسوائی کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

محمد علی صدیقی کے بارے میں عموماً میں کچھ نہیں لکھتا۔ وہ بڑے حساس ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے چھیڑ چھاڑ کی (جب انھوں نے رومن میں لکھے ہوئے لفظ ''محبد'' کو ''متحد'' پڑھا) تو انھوں نے مجھے فون کیا اور کہا، ''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی جنازہ میرے گھر سے اُٹھا ہو۔'' جو شخص کسی تحریر کا ایسا خوف ناک اثر لے اُس پر کیا لکھا جائے۔ بہ ہر حال آپ کے خط پر تو کالم لکھنا ہی ہے۔ میں نے دو ہفتے سے کالم نہیں لکھا۔ ایک تو سعید صاحب کی وفات کا اثر ہے، دوسرے طبیعت خراب ہے۔ کھانسی، نزلہ، زکام جیسے امراضِ خفیفہ مگر خبیثہ نے پریشان کر رکھا ہے۔ اب طبیعت قدرے بہتر ہے۔

''مدار الافاضل''[☆☆۱۲۲] کی کچھ جلدیں میرے پاس ہیں۔ میں پہلے انھیں دیکھ لوں۔ جو جلد کم ہوگی، اُس کے لیے آپ کو زحمت دوں گا۔ ''ہمارے جوش صاحب'' کے لیے انھوں نے تصویر مانگی تھی میں نے انکار کیا تو انھوں نے کہیں سے کسی تقریب (شادی یا کوئی اور دعوت) کی کوئی اجتماعی تصویر حاصل کی۔ نقطے برابر میری تصویر کو بڑا کرایا تو میری صورت اتنی ہول ناک ہوگئی کہ اُسے دیکھ کر مجھے خوف آیا۔ جب میرا یہ حال ہوا تو دوسروں پر جو گزرے گی آپ اُس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میرے ہاتھ سے جو نسخے

☆☆۱۲۲۔ عہد جلال الدین اکبر میں لکھی جانے والی قابلِ قدر فرہنگ۔ یہ لغت اللہ داد فیضی سرہندی کے قلم سے نکلی۔ پنجاب یونی ورسٹی نے بہت عرصہ پہلے اسے شائع کیا۔

گزرے، اُن میں، میں نے اپنی بگڑی ہوئی صورت کو مزید بگاڑ دیا۔

بہت عرصہ ہوا کراچی سے ممتاز حسن مرحوم کے ایما پر انگریزی میں ایک کتاب Aspects of Ghalib شائع ہوئی تھی۔ اس میں پانچ مقالے ہیں۔ ادارۂ یادگار غالب کے لیے اس کا ترجمہ محی الحق فاروقی صاحب سے کرایا گیا ہے۔ یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے جسٹس کیانی کی کتاب "ایک جج بنس بھی سکتا ہے" کا ترجمہ کیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس ترجمے کو اصل سے ملا کر دیکھ لیں اور جہاں اصلاح کی ضرورت ہو، اصلاح کر دیں۔ آپ کی اس محنت کا کتاب کے دیباچے میں اعتراف بھی ہوگا اور کچھ "نذرانہ" بھی پیش کیا جائے گا۔ ترجموں کے معاملے میں کسی ایک شخص پر اعتبار کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ آپ کی نظر سے یہ ترجمہ گزر جائے تو اطمینان رہے گا کہ کام ٹھیک ہوا ہے۔ آپ کا جواب آنے پر ترجمہ اور اصل کتاب بھجوا دوں گا۔☆۱۲۳

لاہور اقبال ایوارڈ کے سلسلے میں آؤں گا۔ ۱۵ر ستمبر کے بعد اور ۳۰ر ستمبر سے پہلے۔ آنے سے پہلے میں اطلاع دے دوں گا۔ اب کے میں اقبال اکیڈمی کا مہمان ہوگا لیکن عملاً آپ کو زحمت دینے آ رہا ہوں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۴-۸-۹۶ء

☆

(۶۹)

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

یہ خط مجھے پریس کلب کے پتے پر لکھنا چاہیے جہاں آپ تقریر کرنے یا مضمون پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے ہیں، چوں کہ دیر سویر، آپ کو لوٹ کر دولت خانے ہی پر واپس آنا ہے، اس لیے گھر کے پتے پر خط روانہ کر رہا ہوں۔

میں ۲۸ر کی شام کو بخیریت کراچی پہنچ گیا۔ آتے ہی "تقریباتی" مصروفیات کا آغاز ہوگیا۔ شادیوں میں شرکت تقریباً ہر روز کر رہا ہوں۔ اپنی شادی سے اتنی تکلیف نہیں اٹھائی جتنی دوسروں کی شادیوں سے اٹھا رہا ہوں۔ تین روز ڈاکٹر داؤد رہبر کے ساتھ گزرے۔ اُن کی کتابیں تو پڑھی تھیں، اب کے گانا بھی سن لیا۔ پرانے استادوں کی طرح جم کر گاتے ہیں۔ فن سے خوب واقف ہیں۔ گانے کی محفل ڈاکٹر جمیل جالبی کے گھر تھی۔ طبلہ اور ہارمونیم بجانے والے ۱۵، ۱۵ر سو روپے مانگ رہے تھے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ طبلہ میں سیکھ لوں اور ہارمونیم آپ۔ تین ہزار روپے بچ جائیں گے۔ مگر ڈاکٹر

☆۱۲۳۔ معلوم نہیں کیا سبب رہا کہ نہ اصل کتاب پہنچی نہ ترجمہ لہٰذا نظرثانی کا کوئی سوال ہی نہ رہا۔

صاحب کو یہ تجویز پسند نہ آئی اور انھوں نے تین ہزار روپے صرف کر دیے۔

لاہور میں حسبِ معمول میرے حال پر آپ کی جو عنایات رہیں، اُن کا شکریہ ادا نہیں کروں گا ورنہ آپ آئندہ کے لیے محتاط ہو جائیں گے۔ میرا لاہور آنے کا اصل مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ آپ سے ملاقات ہو جائے۔ سو یہ مقصد 'الحمد للہ' بہ خوبی پورا ہوا۔ ایک دن اقبال اکیڈمی میں آپ کو موجود نہ پا کر ایک صاحب نے کہا، ''حیرت ہے تحسین صاحب موجود نہیں ہیں۔'' میں نے کہا، ''وہ ایڈورڈ سعید کا ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں۔'' اس پر ایک دوسرے صاحب نے گل افشانی کی، ''ایڈورڈ سعید کیا چیز ہے، تحسین فراقی تو اچھے اچھوں کا ترجمہ کر ڈالتے ہیں۔'' بہ ہر حال آپ ایڈورڈ سعید کا ترجمہ کریں نہ کریں، ''ارمغانِ وحید'' کی طباعت میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کی مدد ضرور کریں۔ مضامین کے پروفوں پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہ غلطیاں جن کی نشان دہی کتاب کی طباعت کے بعد آپ ڈاکٹر ہاشمی کے نام کے خط میں کریں گے، اُن کی نشان دہی کتاب کی طباعت سے پہلے کر دیجیے۔

ریسرچ سوسائٹی جرنل کا چندہ جمع کرا دیجیے۔ مجھے شبہ ہے کہ آپ کے ایما پر میں نے آپ کو کم رقم دی۔ اس جرنل کا سالانہ چندہ سو روپے سے زیادہ ہے۔ اب زائد رقم آپ کو ادا کرنی ہوگی۔ حشر کے دن اس رقم کا دس گنا ادا کروں گا مگر وہاں آپ کو رقم وصول کرنے کی ضرورت کہاں ہوگی۔ خدا جانے کس کس کا ہاتھ آپ کے دامن پر ہوگا۔

آپ کے دوست لطیف الزماں خان نے ''نامہ ہای فارسی غالب'' کا ترجمہ کیا ہے۔ ایسا غلط کام اردو میں آج تک نہیں ہوا تھا۔ اب کے میں نے اسی پر کالم لکھا ہے مگر افسوس کہ حق ادا نہیں ہو سکا۔ دامانِ کالم تنگ اور غلطیاں بسیار۔☆۱۴۳

اور ہاں آپ کے کلاس فیلو نے غالب پر مزاحیہ مضامین کی جو کتاب شائع کی ہے اُس کا ایک نسخہ مجھے بھجوایئے اور اپنے طور پر پوچھیے کہ انھیں یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ خامہ بگوش کا کالم میرے نام سے چھاپیں۔ کبھی تقریروں اور جلسوں وغیرہ سے فرصت مل جائے تو خط لکھ دیجیے۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۹۔۱۲۔۹۶ء

☆

(۷۰)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کا نامہ عنبر شمامہ مل گیا تھا، جواب میں تاخیر کا سبب سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ آپ

☆۱۴۳۔ خواجہ صاحب نے یہ کالم ''مرزا غالب پر قاتلانہ حملہ'' کے دلچسپ عنوان سے لکھا۔ اب ان کے مجموعے ''سخن ہائے ناگفتنی'' میں شامل ہے۔

کی مصروفیات کا خیال تھا۔ امید ہے پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ملک کے نظامِ تعلیم کو مزید خراب کرنے کی مصروفیت ختم ہو چکی ہوگی۔

بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے جرنل ریسرچ سوسائٹی کا زرِ سالانہ جمع کرا دیا۔ سولہ روپے آپ کو اپنی گرہ سے دینے پڑے۔ خدا کا شکر ہے کہ اتنی کم رقم پر فیصلہ ہوگیا۔ بہ ہر حال یہ سولہ روپے رائگاں نہیں جائیں گے، آپ کے علمی ذوق کی یاد دلاتے رہیں گے۔ دوسرا اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ رقم ایک جائز کام پر صرف ہوئی، ورنہ آپ یہ روپے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو خوش کرنے کے لیے جماعتِ اسلامی کے دھرنا فنڈ میں دے دیتے۔

آپ کی بیماری کا سن کر افسوس ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب آپ صحت پا چکے ہیں۔ میں بھی پچھلے دنوں بیمار رہا اور آپ کی بھابی بھی۔ ایک روز تو آمنہ کی طبیعت اتنی خراب ہوگئی کہ رات ایک بجے میں اور رفاقت گلدستوی انھیں لے کر اسپتال گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ بہتر ہیں۔

رفاقت گلدستوی پورے ۴۶ دن میرے کلبۂ احزاں میں مسرت کی لہر دوڑاتے رہے۔ انھوں نے دس ہزار کے قریب صفحات فوٹو کرائے۔ گلدستوں سے ان کی اس دلچسپی کی بنا پر میں نے اُن کا نام رفاقت گلدستوی رکھ دیا۔ ان شاء اللہ صادق سردھنوی کی طرح یہ نام بھی مشہور ہوگا۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ آپ کا یہ شاگردِ عزیز نہایت عمدہ آدمی ہے۔ لکھنے پڑھنے کے کاموں میں اس کا ذوق و شوق دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ آگے چل کر ترقی کرے گا۔ اپنے کام کے ساتھ ساتھ اس نے میرا بھی یہ کام کر دیا کہ کتب خانے کے غیر مرتب حصے کو مرتب کر دیا۔ میں نے اسے سیکڑوں رسالے اور کتابیں جو اس کے کام کی تھیں، بہ طور انعام پیش کر دیں۔ اب اس کے پاس کئی تحقیقی رسالوں کے مکمل فائل ہیں۔ کچھ کتابیں اور رسالے آپ کے لیے بھی بھیجے ہیں۔ امید ہے مل گئے ہوں گے۔

سید صاحب پر اجمل کمال کا مضمون تو چھپنے سے پہلے ہی ایک ذریعے سے دیکھ لیا تھا۔ اجمل کمال نے پرانا قرض نہیں چکایا، یہ بالکل نیا قرض ہے۔ فہمیدہ ریاض کے دیباچے والا۔ یہ مضمون اسی دیباچے کی وجہ سے لکھا گیا ہے۔☆[۱۲۵] اس دیباچے سے متعلق آپ کے مضمون کا انتظار ہے۔ سید صاحب کہہ رہے تھے کہ انھوں نے تمام لوازمہ آپ کو فراہم کر دیا ہے۔ سستی کے معاملے میں آپ اور سید صاحب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اصل صورتِ حال کیا ہے۔ آپ سید صاحب سے فوراً رابطہ کیجیے۔ مضمون لکھیے اور اس کے ساتھ اصل دیباچہ، فہمیدہ ریاض کے خطوط اور انتظار حسین کے اور

☆۱۲۵۔ اجمل کمال نے یہ مضمون ''سید کام کرتا ہے'' کے زیرِ عنوان لکھا تھا۔ مضمون میں جا بجا سید صاحب کے چٹکیاں لی تھیں اور بعض جگہ استہزائیہ انداز اختیار کیا تھا۔ اصل میں سید صاحب نے فہمیدہ ریاض کے سفرنامہ بنگلہ دیش ''زندہ بہاریں'' کا دیباچہ لکھا تھا جو محترمہ کو پسند نہ آیا اور انھوں نے اسے اپنی کتاب میں شامل نہ کیا۔ سید صاحب کے خلاف مضمون کا محرک یہی دیباچہ تھا۔ خواجہ صاحب نے اس ضمن میں دو نہایت مزے کے کالم ''دستِ بجنگل میں قلم'' کے عنوان سے لکھے تھے۔ ملاحظہ کیجیے ''سخن در سخن''، ص ۱۵۴۔۱۶۴

میرے کالم بطور ضمائم شامل کردیجیے۔

''ارمغان'' کے کام میں خاصی تاخیر ہو رہی ہے۔ اِدھر گوہر نوشاہی اپنا مضمون نہیں دے رہے۔ اب ڈاکٹر صاحب مقتدرہ کے چیئرمین تو ہیں نہیں جو گوہر نوشاہی کو اُن کی پروا ہو۔ ویسے میں نے گوہر صاحب کو دھمکی دے دی ہے کہ ڈاکٹر صاحب دوبارہ مقتدرہ میں آنے والے ہیں۔ ملکی حالات ایسے ڈانواں ڈول ہیں کہ میری دھمکی حقیقت کا روپ بھی دھار سکتی ہے۔ اس لیے گوہر نوشاہی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک ہفتے میں مضمون دے دیں گے۔

غالب پر مزاحیہ مضامین والی کتاب اب تک نہیں ملی۔ لطیف الزماں نے نہایت لجاجت آمیز لہجے میں خط لکھا ہے اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ پوری کتاب کی غلطیوں کی نشان دہی کردیجیے۔ میں اگلا ایڈیشن آپ کے شکریے کے ساتھ شائع کروں گا۔ اب بتائیے اگر مجھ کو ہی کام کرنا ہے تو میں خود ہی کیوں نہ پورا ترجمہ کردوں۔ ویسے یہ کام بھی ہوگیا ہے۔ ایک نہایت لائق آدمی نے ان خطوں کا ترجمہ کردیا ہے جو اسی سال شائع ہوگا، حواشی کے ساتھ۔ محمد عالم مختار حق صاحب کے ساتھ ملاقات میں کیا طے ہوا؟ گاہے گاہے خط لکھتے رہا کیجیے۔ اس طرح لکھنے کی مشق بھی جاری رہے گی اور میرا بھلا بھی ہوگا۔ تقریر کی مشق تو ہوتی رہتی ہے۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۶-۲-۹۷ء

☆

(۷۱)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون۔

مجھے آپ کی واپسی کا اتنا انتظار نہیں تھا جتنا واپسی کے بعد آپ کے خط کا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ آپ کم از کم ڈیڑھ دو مہینہ وہاں رہتے۔ علی گڑھ اور لکھنؤ کی بھی سیر کرکے آتے۔ ایسے مواقع روز روز کہاں ملتے ہیں۔ آپ دہلی میں پندرہ دن رہے۔ آٹھ گھنٹے سوتے ہوں گے۔ بارہ گھنٹے ڈاکٹر ہاشمی کی معیت میں جماعتیوں سے ملتے ہوں گے۔ باقی چار گھنٹوں میں دہلی دیکھی جاسکتی ہے نہ شرفائے دہلی سے ملاقات کی جاسکتی ہے۔ بہ ہر حال وہاں سے آپ کے بارے میں جو رپورٹیں آتی ہیں، وہ خاصی اطمینان بخش ہیں۔ بس ایک شکایت موصول ہوئی ہے کہ آپ وہاں گفتگو کے دوران فارسی شعر بہت پڑھتے تھے۔ مجھے اس کی بھی بے حد خوشی ہے کہ وہاں آپ دونوں کا بڑے پیمانے پر استقبال ہوا۔ آپ کے اعزاز میں ادبی محفلیں ہوئیں۔ اس سے زیادہ خوشی اس کی ہے کہ لاہور واپسی کے بعد بھی استقبالیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ لاہور میں کوئی ادارۂ علم و ادب ہے۔ ۲؍ جولائی کو اس نے آپ کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا تھا۔

اس کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ اگر دعوت نامے کے ساتھ ہوائی جہاز کا واپسی کا ٹکٹ بھی ہوتا تو میں اس میں ضرور شرکت کرتا۔

میں نے وہ تصویر دیکھ لی ہے جس میں ڈاکٹر ہاشمی، میرا اشنکر☆۱۲۶ کے ساتھ کھڑے ہیں۔ تصویر میں یہ عورت اتنی اچھی آئی ہے تو اصل میں خدا جانے کیا چیز ہوگی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد پیش کردی ہے کہ تصویر میں تحسین فراقی نہیں ہیں، ورنہ وہ حجاب حائل بن کر آپ کو لطفِ نظارہ سے محروم کردیتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہاشمی صاحب اپنے سفرنامے میں اس خاتون کا ذکر کس طرح کرتے ہیں۔ اُن کے اسپین کے سفرنامے میں صنفِ نازک کا ذکر تو بس سہیل عمر کی حد تک ہے۔ ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ جو لوگ گناہ نہیں کرتے وہ دراصل خداوند تعالیٰ کے غفور الرحیم ہونے میں یقین نہیں رکھتے۔ انسان کو ہمیشہ گرامی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے جو اس میں یقین رکھتا ہے:

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما
آں را نہایتے ست نہ ایں را نہایتے

مگر اس معاملے میں یگانہ سب سے بڑھ گیا ہے۔ وہ خدا کے عدل سے پناہ مانگتا ہے:

حق میں اوروں کے تری ذات سراپا احسان
وائے قسمت کہ مری ضد سے تو عادل ہوجائے

تو جناب، ہاشمی صاحب کو یہ ساری باتیں سمجھائیے اور اپنے ڈھب پر لے آئیے کہ آدمی سب کچھ کرتا بھی رہے اور کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ گناہ گاروں پر خدا احسان کرتا ہے اور بے گناہوں سے عدل۔ اسی لیے تو صوفیہ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے خدا ہمیں تو اپنے عدل سے محفوظ رکھ اور رحمت سے نواز۔

ڈاکٹر محمد حسن☆۱۲۷ اور اُن کی اہلیہ کے بارے میں آپ نے جو کچھ سنا ہے، وہ ایک حد تک درست ہے مگر اس کے ذمہ دار خود ڈاکٹر محمد حسن ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں جب میں ہندوستان گیا تھا تو میری اور آمنہ کی موجودگی میں دونوں میں زبردست جنگ ہوئی تھی۔ بیگم نے رو رو کر ڈاکٹر صاحب کی شکایتیں کیں۔ بیگم کی ایک شکایت یہ تھی کہ میں نے اپنے کمرے میں خانہ کعبہ کی تصویر لگائی تو انھوں نے اتار دی۔ میں نماز پڑھتی ہوں تو یہ منع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کا جواب یہ دیا، "صاحب یہ میرا گھر ہے مسجد نہیں ہے۔" پھر بیگم نے الزام لگایا کہ یہ غیر عورتوں سے راہ و رسم بڑھاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس الزام کی تردید نہیں کی۔ غرض کہ اچھا خاصا تماشا ہوا۔ ظاہر ہے ان حالات سے بیگم کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ وہ بھی تشدد پر اتر آئیں۔ بیگم نے ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں بتایا کہ یہ فہمیدہ ریاض سے ملتے ہیں (اُن دنوں

☆۱۲۶۔ ان دنوں دلی کے مشہور سرکاری ادارے I.C.C.R کی ڈائرکٹر جنرل تھیں۔ دلی یونی ورسٹی اور ICCR کے اشتراک سے منعقد ہونے والے بین الاقوامی اقبال سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لیے آئی تھیں۔

☆۱۲۷۔ مشہور ترقی پسند نقاد۔ سابق استاد و صدر شعبۂ اردو جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی۔

فہمیدہ ریاض دہلی میں تھیں) مجھے ایک روز معلوم ہوگیا کہ یہ دونوں ریڈیو اسٹیشن پر ملیں گے۔ میں وہاں پہنچ گئی اور پھر مجھ سے جو کچھ ہوسکا، میں نے کیا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے یہ کہا، محض غلط فہمی کی بنا پر انھوں نے بہت سے لوگوں کے سامنے ہم دونوں کو ذلیل کیا۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ دونوں میں کسی ایک کو غلط کہنا مناسب نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے حق میں نہلے پر دہلا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ''علمی'' کاموں کے بارے میں آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ جتنی سرسری اور متعصبانہ تنقید انھوں نے لکھی ہے شاید ہی کسی نے لکھی ہو، اُن کی مستقل موضوعات پر کتابیں ثانوی ماخذ کی مدد سے لکھی گئی ہیں۔ براہِ راست مطالعہ اُن کے ہاں کم ہی ملے گا۔

آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے سعیدہ بانو احمد کی کتاب میرے لیے حاصل کی۔ مگر جناب، جو کتاب میں نے قیمتاً لانے کے لیے کہا تھا، اُسے تحفتاً بھیجنا بڑی زیادتی ہے۔ آپ نے غضب کیا کہ رقم لوٹا دی۔ میری مطلوبہ کتابیں نہیں ملی تھیں تو آپ حال ہی کی شائع شدہ دو چار علمی و تحقیقی نوعیت کی کتابیں خرید لیتے۔ یہ بھی نہ ہوسکتا تو بچوں کے لیے میری طرف سے مٹھائی ہی خرید لیتے۔ آپ کا پیسے واپس کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس سے بوئے غیریت آتی ہے۔

سعیدہ بانو کی آپ بیتی[☆۱۴۸] عنایت کرکے آپ نے احسان کیا۔ مجھے اس کا شدید انتظار تھا۔ میں نے سب کام چھوڑ کر اس کتاب کو پڑھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اردو میں پہلی مرتبہ ایسی کتاب شائع ہوئی ہے جسے آپ بیتی کہا جاسکتا ہے ورنہ اب تک تو جتنوں نے اس قسم کی کتابیں لکھی ہیں، انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ بیتی کہتے کسے ہیں۔ کسی کو آپ بیتی اور memoirs کا فرق بھی معلوم نہیں۔ اس کتاب میں سعیدہ بیگم نے نہایت بے خوفی کے ساتھ تمام واقعات سچ سچ لکھ دیے ہیں۔ اتنی جرأت عورتوں میں تو کیا، مردوں میں بھی نہیں ہوتی۔ کیا کوئی عورت ایسی ہوگی جو ۲۷ برس تک کسی کی داشتہ رہے اور اس کا اعتراف بھی کرے۔ سعیدہ بیگم نے صرف وہی واقعات لکھے ہیں جو اُس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں، یہ نہیں کیا کہ دوسروں کے بارے میں فضول قسم کی باتیں لکھ کر کتاب کا پیٹ بھرا ہو اور پھر کمال کی بات یہ ہے کہ وہ کوئی ادیبہ نہیں ہیں لیکن اندازِ بیان ایسا ہے کہ پیشہ ور ادیب بھی ایسا نہیں لکھ سکتے۔ میری رائے میں یہ ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔ کشور ناہید کو ضرور یہ کتاب پڑھنی چاہیے تا کہ اُسے معلوم ہو کہ آپ بیتی کیسے لکھی جاتی ہے اور نثر کیسے لکھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے متعلق واقعہ آپ نے خوب لکھا۔ حیرت ہے کہ اُنھوں نے بھری محفل میں یہ کہہ دیا کہ جناح کے نام اقبال کے خطوط جعلی ہیں[☆۱۴۹] اور اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ بعد

☆۱۴۸۔ پوست کندہ صداقتوں کی حامل آپ بیتی ''ڈگر سے ہٹ کر''۔

☆۱۴۹۔ یہ بات انھوں نے غالب اکادمی دہلی کے ہال میں تقریر کرتے ہوئے کہی جہاں ڈاکٹر ہاشمی صاحب اور دیگر پاکستانی مندوبین کے اعزاز میں اقبال اکادمی دہلی نے ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اس بے بنیاد دعوے کا جواب انھیں اسی جلسے میں دے دیا گیا تھا۔

میں وہ مکر گئے۔ خلیق انجم صاحب نے "دیوانِ بیانؔ" کی نقل مجھ سے طلب کی تھی جو میں نے ۹؍ جون کو ڈاک سے بھیج دی تھی۔ اب تک اُن کی طرف سے وصولی کی اطلاع نہیں آئی۔ کیا آپ کی موجودگی میں اس کا ذکر آیا تھا کیوں کہ یہ نقل لازماً ۱۷؍ جون تک انھیں مل گئی ہوگی۔

میں نے کالم نگاری بالکل ترک کردی ہے اور یہ طے کرلیا ہے کہ اب یہ کام کسی قیمت پر نہ کروں گا۔ اس کی وجہ سے ایک تو ذہنی دباؤ بہت تھا۔ مقررہ وقت پر کالم لکھ کر دینا ایک عذاب سے کم نہ تھا اور پھر اس مقصد کے لیے بہت سی فضول چیزیں پڑھنی پڑتی تھیں۔ اس فیصلے سے مالی نقصان تو خاصا ہوا ہے لیکن جو ذہنی سکون ملا ہے، اس کے فوائد بے شمار ہیں۔ اب میں پوری یک سوئی سے اپنے نامکمل کاموں کو مکمل کرنے میں مصروف ہوں۔ "تکبیر" والوں نے بہت اصرار کیا مگر میں راضی نہیں ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کالم کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور اس کا اندازہ اُن بے شمار خطوں سے بھی ہوتا ہے جو مجھے موصول ہوئے ہیں لیکن کالم کے ذریعے شہرت حاصل کرنا، میرا مقصد نہیں رہا بلکہ شہرت سے مجھے کوئی خاص دل چسپی ہی نہیں ہے۔ پورے برصغیر میں اگر دس بارہ آدمی بھی میری تحقیقی نوعیت کی تحریریں پڑھ لیں تو یہ میرے لیے کافی ہے۔ اب "تکبیر" میں طاہر مسعود کالم لکھا کریں گے۔ ایک لطیفہ سنیے۔ شہر بھر میں یہ افواہ گرم ہے کہ "تکبیر" والوں سے اختلاف کی بنا پر میں نے کالم لکھنا ترک کیا ہے۔ "جسارت" سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا، "اب آپ ہمارے ہاں کالم لکھیں۔ میں نے کہا ضرور لکھوں گا مگر مجھے "تکبیر" سے جو معاوضہ ملتا تھا وہ آپ کے ایڈیٹر کی تنخواہ کے برابر ہے۔ اس کے بعد وہ صاحب دوبارہ تشریف نہیں لائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے یا نہیں؟ اُن کے خلاف ہمارے دوست نے جو افسوس ناک کاغذی مہم چلائی تھی وہ آپ نے دیکھی ہوگی۔ اُس میں ڈاکٹر صاحب پر یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ مشفق خواجہ لاہور آئے تو اکیڈیمی کی ایک گاڑی اُن کے تصرف میں اور دوسری اُن کی بیوی کے تصرف میں رہتی تھی۔ سہیل عمر اکثر فون کرتے رہتے ہیں، میں نے اُن سے کہا، "اب کے میں آؤں گا تو اکیڈیمی کی دونوں گاڑیاں پھر میرے تصرف میں رہیں گی۔" وہ ہنس دیے اور کہنے لگے، "آپ بالکل بے فکر رہیں یہ گاڑیاں آپ ہی کے لیے ہیں۔"

میرزا ادیب صاحب کی بیماری اور پھر آپریشن کی خبر تو آپ کو معلوم ہوگی۔ کبھی کبھار اُن سے ملنے چلے جایا کیجیے۔ اب ایسے لوگ اس دنیا میں نہیں آئیں گے۔ انھیں شکایت ہے کہ کوئی اُن سے ملنے کے لیے نہیں آتا۔ خدا انھیں تادیر سلامت رکھے کہ اُن کا دم غنیمت ہے۔

آپ ہندوستان سے جو کتابیں لوٹ کر لائے ہیں، اُن میں کام کی اور ڈھنگ کی دو چار کتابوں کے نام لکھ بھیجیے:

پچھلے سال ڈاکٹر عبدالحق☆[۱۳۰] نے مجھے نظام خطبہ پڑھنے کی دعوت دی تھی۔ میں نے انھیں لکھا کہ آپ نے غلط دروازے پر دستک دی ہے۔ خطبہ پڑھنا تو کیا، میں نے تو آج تک کوئی خطبہ سنا بھی نہیں۔ ہم نے انجمن کی طرف سے ڈاکٹر گیان چند کو اکتوبر میں مدعو کیا ہے۔ چند روز وہ لاہور میں بھی قیام کریں گے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے ہاں اُن کے قیام کا انتظام کیا ہے۔ آپ اُن سے ضرور ملیے گا۔

دیکھیے میں نے کتنا طویل خط لکھ دیا اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ کوئی کام نہیں لکھا۔ ورنہ عموماً میں آپ کو زحمت دینے ہی کے لیے خط لکھتا ہوں۔

خدا کرے آپ سب خوش و خرم ہوں۔ ہمشیرہ صاحبہ کا اب کیا حال ہے؟☆[۱۳۱] ہم دونوں اُن کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتے ہیں۔

نومبر میں لاہور آنے کا پروگرام ہے۔ ایک دن کے لیے گجرانوالہ بھی جاؤں گا۔ ضیاء اللہ کھوکھر صاحب کا کتب خانہ دیکھنے کے لیے۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۸۔۷۔۹۷ء

☆

(۷۲)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

منسلکہ خط لکھ چکا تھا کہ یاد آیا ایک ضروری بات لکھنے سے رہ گئی۔

لاہور میں آپ سے طے ہوا تھا کہ آپ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر اورنگزیب عالمگیر میرے ساتھ جھنڈیر کی لائبریری دیکھیں گے۔ یہ کام بہت ضروری ہے کہ پاکستان میں ایسی شان دار ذاتی لائبریری شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ جہاں یہ لائبریری ہے، وہ مقام نہایت پُرفضا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم کچھ وقت ایک ساتھ گزاریں۔ ایک دن ملتان میں ایک دن بہاول پور میں بھی گزارا جاسکتا ہے۔ آپ لوگ آپس میں طے کرکے بتائیے کہ اس اجتماعِ ضدین☆[۱۳۲] کے لیے کون سا وقت موزوں ہوگا؟ آپ کا خط آنے پر میں جھنڈیر والوں کو لکھوں گا☆[۱۳۳] اگر ممکن ہو تو رفاقت گلدستوی☆[۱۳۴] کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔ ممکن ہونے کی بات اس لیے لکھ رہا ہوں، آپ کے علم میں ہوگا کہ اس مہینے سے وہ فضلی سنز میں

☆۱۳۰۔ دلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر اور استادِ ممتاز، میرے دوست اور کرم فرما۔

☆۱۳۱۔ میری بڑی بہن شمیم اختر، جو کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ مارچ ۱۹۹۹ء میں انتقال کرگئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

☆۱۳۲۔ "اجتماعِ اضداد" کا محل تھا۔

☆۱۳۳۔ خدا خدا کرکے تین برس بعد ۲۰۰۰ء کے اوائل میں ملتان اور وہاں سے جھنڈیر جانے کا موقع مل پایا۔ وہاں جو چند دن حضرت مشفق خواجہ کی معیت میں گزرے وہ میری زندگی کا حاصل تھے۔

☆۱۳۴۔ مراد ہیں رفاقت علی شاہد۔ ان دنوں وہ انیسویں صدی کے اردو گلدستوں پر پی ایچ ڈی کرنے کے لیے پرتول رہے تھے۔ یہ مقالہ میری نگرانی میں مکمل ہوا۔

ملازم ہو گئے ہیں، نئی ملازمت کی وجہ سے شاید انھیں رخصت نہ مل سکے۔ ویسے بہاول پور لائبریری میں اور جھنڈیر میں بھی ان کے کام کی چیزیں مل جائیں گی۔

اصمعی صاحب کو کئی مرتبہ فون کر چکا ہوں۔ مگر وہ دفتر میں ملتے ہی نہیں۔ جب سے ان لوگوں نے ''امت'' نکالا ہے، یہ امت خرافات میں کھو گئی ہے۔ میں ان سے آپ کے خط اور غزل کا ذکر کروں گا۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۶-۲-۹۷ء

☆

(۷۳)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مل گیا تھا، بے حد ممنون ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ میں اب بالکل تندرست ہوں۔ چند روز سے معمول کے مطابق کام بھی شروع کر دیا ہے مگر اوقاتِ کار میں کمی اور لمحاتِ آرام میں اضافہ کر دیا ہے۔ ۱۱ر ستمبر سے ۱۸ر تک اسپتال میں رہا اور پھر آرام کے لیے اور اندمالِ زخم کے انتظار میں، اپنے چھوٹے بھائی کے ہاں سمندر کے کنارے چلا گیا۔ ۴ر اکتوبر تک وہاں رہا۔ دراصل میرا شوگر کا علاج غلط ہو رہا تھا، اس سے پیچیدگی پیدا ہوئی اور مرے پہ سو دُرّے، ران میں ایک مہلک پھوڑا نکل آیا۔ اسی کا آپریشن ہوا۔ اس بیماری سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ یہ معلوم ہو گیا کہ بے نتیجہ کاموں میں ہر وقت مصروف رہنے سے بہتر ہے کچھ وقت آرام بھی کیا جائے کہ اس سے بہتر نتائج سامنے آتے ہیں۔ بھائی کا مکان آپ دیکھ چکے ہیں۔ مکان اور سمندر کے درمیان صرف ایک سڑک ہے۔ میں سارا دن سمندر کو دیکھتا رہتا تھا۔ صبح، دوپہر، شام، تینوں وقت سمندر کا نظارہ مختلف ہوتا ہے۔ خوب صورت پرندے، موجوں کا شور، ڈوبتا ہوا سورج، صبح سویرے اور شام کے وقت ملاحوں کی ٹولیاں، نماز کے وقت قبلہ رو ہو کر اُن کا عبادت گزار ہونا اور پھر رات کو دور کھڑے ہوئے جہازوں کی روشنیاں، غرض کہ سمندر سے بہت کچھ ملا۔ آپ جب کراچی تشریف لائیں گے تو چند روز اس مکان میں آپ کے ساتھ گزاروں گا۔ پھر آپ کو صحیح اندازہ ہو گا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، الفاظ اُن کیفیات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر گیان چند ۱۷ر اکتوبر کی شام کو کراچی آئے تھے۔ کل رات انھیں رخصت کیا ہے۔ امید ہے اب تک اُن سے آپ کی ملاقات ہو چکی ہوگی۔[☆۱۳۵] اُن سے تقریباً چالیس برسوں سے خط کتابت

☆۱۳۵۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے دو ہی ملاقاتیں رہیں۔ پہلی ۱۹۸۹ء میں حیدر آباد دکن میں جہاں میں عالمی رابطۂ ادب اسلامی ہند کی دعوت پر ایک سیمینار میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ دوسری ملاقات ان کے کراچی سے لاہور آنے پر ۱۹۹۷ء میں ہوئی۔

تھی۔ ملاقات پہلی بار ہوئی۔ میں نے اُنھیں نہایت عمدہ انسان پایا۔ سادگی اور انکسار نے اُن کی شخصیت کو نکھار دیا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے سفر در سفر کے مراحل ہیں۔ خوشی ہوئی۔ یہ بھی حصول علم کا ذریعہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو اس کے پے در پے مواقع مل رہے ہیں۔☆۱۳۶ میں ۱۷ر نومبر کو لاہور پہنچوں گا اور ۳۰ر تک وہاں رہوں گا۔ اگر آپ ۳۰ر سے پہلے واپس آگئے تو ملاقات ہو جائے گی، ورنہ حسرتِ دید لیے واپس آ جاؤں گا۔ آپ کے بغیر لاہور کا تصور کرنا ایسا ہی ہے جیسے مجنوں کے بغیر صحرا کا۔ سنا ہے کہ آپ واپسی پر لندن بھی جائیں گے اور وہاں اکرام چغتائی آپ لوگوں کے رہ نما ہوں گے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر اندیشہ آپ لوگوں کے گمراہ ہونے کا ہے۔ آپ کی تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تو یہ شکن نظاروں کی تاب کیسے لائیں گے۔ خدا اُنھیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ خصوصاً چغتائی کی رہ نمائی سے۔

یہ رفاقت علی شاہد کو کیا ہو گیا کہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کی کتاب پر آپ سے ''حرفِ چند'' لکھوا لیا۔ اس کا عنوان ''حرفِ چند'' کی بجائے ''تین حرف'' ہوتا تو بہتر تھا کیوں کہ جو اسے پڑھتا ہے، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم پر تین حرف بھیجتا ہے۔ بے چارے کی ساری محنت پر آپ نے پانی پھیر دیا۔☆۱۳۷

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۴۔۱۰۔۹۷ء

☆

(۷۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

کل شام ڈاکٹر اصغر عباس صاحب☆۱۳۸ الوداعی ملاقات کے لیے آئے تو وہ دیر تک آپ کے

☆۱۳۶۔ ۱۹۹۷ء کے اوائل میں مجھے اور میرے بعض احباب کو اقبال فاؤنڈیشن یورپ کی جانب سے علامہ اقبال کی فکریات پر ہونے والے ایک بین الاقوامی سمپوزیم میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ یہ سمپوزیم بیلجیم کے تاریخی شہر گینٹ میں منعقد ہوا۔ گینٹ یونی ورسٹی میں برپا ہونے والے اس یادگار سیمینار میں این میری شمل، وتو سالیر نو، یورگل، ژان مارِیک، روحی غالب شاس، ڈاکٹر سعید اختر درانی، خالد احمد، محمد اکرام چغتائی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، سہیل عمر اور متعدد دیگر اقبال شناسوں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور میں یکم دسمبر ۱۹۹۷ء کو پاکستان لوٹے۔ خواجہ صاحب تب تک واپس کراچی جا چکے تھے۔

☆۱۳۷۔ رفاقت صاحب نے دلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ارتضیٰ کریم کے پی ایچ ڈی کے مقالے کو جو کتابی صورت میں پہلے ہندوستان میں شائع ہو چکا تھا، لاہور سے دوبارہ شائع کرنے کا ارادہ کیا، مجھ سے کہا کہ میں اس پر اپنے تاثرات رقم کروں۔ میں نے جو لکھا اسے اُنھوں نے من و عن میرے ہی سوادِ تحریر میں شائع کر دیا۔ اس مختصر تاثر میں جہاں ارتضیٰ کریم کے اس تحقیقی کام کی تعریف کی تھی وہیں چند کھلے تضادات کی نشان دہی بھی بلا تامل کر دی تھی۔ خواجہ صاحب کا اشارہ اُنھی کی جانب ہے۔

☆۱۳۸۔ میرے دوست اور کرم فرما۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر اور سابق صدر شعبہ، حال ڈائرکٹر سرسید اکادمی علی گڑھ۔

اخلاق، مہمان نوازی، خوش مزاجی یہاں تک کہ علم و فضل کی بھی تعریف کرتے رہے۔ اُنھوں نے یہاں تک کہا کہ اگر میں لاہور میں کسی سے نہ ملتا، صرف تحسین فراقی صاحب سے ملتا تو بھی میرا سفرِ لاہور کامیاب رہتا۔ یہ سب باتیں سن کر جی خوش ہوا۔ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ایک مسافر کی دل نوازی کی۔

۱۴ اپریل کو اسلام آباد جانے کا ارادہ ہے۔ وہاں دو تین دن قیام رہے گا۔ لاہور سے اس (قدر) قریب آکر سوچتا ہوں کہ کیوں نہ آپ کے دیدار سے بھی آنکھیں سینک لوں۔ نومبر میں آپ سے ملاقات نہ ہونے کا جو قلق ہے وہ اسی صورت میں دور ہوسکتا ہے۔[☆۱۳۹] لاہور میں تین چار روز سے زیادہ قیام نہیں ہوگا۔ کیا یونی ورسٹی ہوسٹل میں رہائش کا انتظام ہوسکتا ہے؟ اس کا ایک فائدہ ہوگا کہ رات بھی آپ کے قریب ہی کہیں گزرے گی۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پھر یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا ہوسٹل ہوسکتا ہے۔ بکنگ اقبال اکیڈمی کی نام پر اور کرایہ میں خود ادا کردوں گا۔ یہ بھی نہیں تو کوئی ایسا ہوٹل جس کا کرایہ پانچ چھ سو روپے یومیہ سے زیادہ نہ ہو۔ کسی دوست یا رشتہ دار کے گھر ہرگز نہیں ٹھہروں گا کہ اس سے طرفین کی آزادی پر اثر پڑتا ہے۔ رشتہ داروں کے ہاں قیام کا جو تلخ تجربہ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ بیوی کا سارا زیور چوری ہوگیا۔[☆۱۴۰] میرے پاس تو زیورِ علم بھی نہیں ہے جو چوری کے لیے پیش کرسکوں۔

مگر یہ لاہور آنا اسی سے مشروط ہے کہ اُن دنوں میں آپ کی کوئی ایسی مصروفیت نہ ہو جو میرے اور آپ کے درمیان مفارقت پیدا کرے۔ ایسی صورت میں، میں نہیں آؤں گا۔ اصلی مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کے ساتھ کچھ وقت گزار سکوں اور اگر ہوسکے تو آپ کے ساتھ گجرانوالہ میں ضیاء اللہ کھوکھر صاحب کی لائبریری دیکھ سکوں۔[☆۱۴۱]

یہاں سے کسی کتاب کی ضرورت ہو تو بلاتکلف لکھیے۔ ایک زمانے میں آپ کو اسد علی انوری کی ''قتیل و غالب'' کی ضرورت تھی۔ یہ کتاب یہاں چھپ گئی ہے، ڈاکٹر اسلم فرخی کے دیباچے کے ساتھ۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا ہے کہ وہ آپ کو اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجیں۔ کتاب ملے تو شکریے کا خط لکھ دیجیے گا لیکن خدا کے لیے دیباچۂ مرتب کی غلطیوں کی فہرست مرتب کرکے نہ اُنھیں بھیجیے گا۔

یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا ہوسٹل سب سے عمدہ رہے گا۔ اس سلسلے میں سہیل عمر صاحب سے بات کیجیے۔ وہ انتظام کرادیں گے۔ ظاہر ہے کہ کرایہ میں خود ادا کروں گا۔

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱-۳-۹۸ء

☆۱۳۹۔ نومبر میں، میں مع دیگر احباب کے پندرہ دن کے لیے یورپ گیا ہوا تھا۔

☆۱۴۰۔ یہ سانحہ اُن دنوں ہوا جب خواجہ صاحب اپنی بیگم کے ساتھ محترمہ فضہ طوری (خواجہ صاحب کی تایا زاد) کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ زیورات محترمہ طوری کا گھریلو ملازم لے اڑا۔

☆۱۴۱۔ رسائل و جرائد کا بے مثل ذخیرہ اس لائبریری کا امتیاز ہے۔ افسوس خواجہ صاحب کے ہمراہ وہاں جانا نہ ہوسکا۔

☆

(۷۵)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

بالآخر آپ نے خط لکھ ہی دیا۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ کا خط آنے سے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ظلمت کدے میں شمع جل گئی ہو۔ مجھے آپ کی مصروفیات کا احساس ہے۔ آپ اگر مہینے میں ایک خط بھی لکھ دیا کریں تو دل بہلا رہے۔ اب اس عمر میں دل بہلنے کی یہی باتیں رہ گئی ہیں۔

میں نے اپنے سلسلے میں انکسار سے ہرگز کام نہیں لیا۔ مجھ میں سو خوبیوں کی ایک خوبی یہی تو ہے کہ اپنی ذات کو محدب شیشے سے نہیں دیکھتا۔ میرا ایک شعر ہے:

مثالِ عکس گنجِ ذات سے باہر رہا ہوں میں
کہ آپ اپنے مقابل آئنہ بن کر رہا ہوں میں

سو آئینے میں جو کچھ نظر آتا ہے، لائقِ شکر تو ہے، قابلِ فخر نہیں۔

شوکت میرٹھی کی شرح ایک ہی مرتبہ چھپی تھی، ''پروانہ'' میں قسط وار اور پھر انھیں اجزا کی شیرازہ بندی کر کے کتابی صورت دے دی گئی تھی۔ میرے پیشِ نظر نسخے کے شروع کے آخری صفحات پر بٹر پیپر چپکایا گیا ہے۔ لئی کا رنگ کچھ عرصے بعد سیاہ پڑنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے یہ صفحات بڑی حد تک ناخوانا ہو گئے ہیں۔ افسوس کہ سرورق آپ کے نسخے میں ہے نہ میرے نسخے میں۔ آپ نے صحیح لکھا کہ میں نے غلطی سے س ۱۳۴ کو س ۱۳۳ لکھ دیا۔

جعفر بلوچ کو بلوچستان واپس چلے جانا چاہیے۔ وہاں اُنھیں بلوچستان یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری بھی مل جائے گی اور جھوٹے وعدے کرنے کے بعد منہ چھپانے کے لیے جگہ بھی۔ میں نے زندگی میں پہلا کام اُن سے کہا تھا، اُن سے کہیے کہ اسے میرا آخری کام سمجھ کے کر دیں۔ اس کے بعد کبھی کوئی زحمت نہیں دوں گا۔ ویسے اس خط کے ساتھ ہی اُنھیں بھی خط لکھ رہا ہوں اور عمر شیخ کو بھی کہ اب وہ اپنا ایوارڈ مع نقد رقم کے واپس لے لیں۔ جو شخص ایک چھوٹا سا کام نہ کر سکتا ہو اُسے ایوارڈ دینے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔☆۱۳۳

علامہ کے خطبات سے متعلق کتاب آپ کو جلد ہی مل جائے گی۔☆۱۳۴

سہ ماہی ''اردو'' کے لیے دفتر کو ہدایت کر دی ہے۔ پچھلے چند شمارے آپ کو بذریعہ رجسٹری بھیجے جا رہے ہیں۔

☆۱۳۳۔ جناب جعفر بلوچ کو ۱۹۷ء کے اواخر میں ۹۸ء کے اوائل میں عمر شیخ ایوارڈ ملا تھا۔ نقد رقم پچاس ہزار روپے تھی۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ایوارڈ لندن کے ایک علم دوست شخص عمر شیخ نے اپنے نام سے جاری کر رکھا ہے۔

☆۱۳۴۔ ڈاکٹر حسین محمد جعفری کی مرتبہ کتاب۔

طاہر مسعود سے آپ کا سلام کہہ دیا ہے۔ وہ جواب میں وعلیکم السلام کہہ رہے ہیں۔ ویسے جب سے اُنھوں نے خرقۂ درویشی پہنا ہے ہر اچھی چیز کو وعلیکم السلام کہہ دیا ہے۔ خدا اُن کی اسی دنیا میں مغفرت کرے۔

میں نے دفترِ انجمن کو ہدایت کی تھی کہ رسالہ ''اردو'' کے پچھلے پانچ شمارے آپ کو بھیج دیے جائیں اُن عقل مندوں نے تازہ شمارے کے پانچ نسخے بھیج دیجیے۔ یہ آپ اُن دوستوں میں تقسیم کردیجیے جو اس کے مستحق ہوں۔ ایک پرچہ زاہد منیر عامر صاحب کو ضرور دے دیجیے گا۔ آپ کو مزید شمارے بھیجے جارہے ہیں۔

لندن سے عبدالرحمن بزمی صاحب کبھی کبھی فون کرتے رہتے ہیں۔ چند روز ہوئے ان کا فون آیا تھا۔ آپ کا ذکر بڑی محبت سے کررہے تھے۔ بزمی صاحب بڑے مخلص آدمی ہیں۔ کئی سال سے اُن سے ٹیلی فونی روابط (اور وہ بھی یک طرفہ) قائم ہیں۔ ملاقات چند منٹ کی ہے جو اُن کی گزشتہ آمد پر ہوئی تھی۔☆۱۴۴ خدا کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۱-۶-۹۸ء

☆

(۷۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا گرامی نامہ مل گیا تھا۔ میں آپ کی مطلوبہ کتاب کی تلاش میں رہا۔ شہر کی دکانوں پر دستیاب نہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ کراچی یونی ورسٹی کی مطبوعات عام دکان دار نہیں رکھتے۔ ایک دوست کے ذریعے کتاب یونی ورسٹی سے منگوائی۔ آج ہی آئی ہے اور بھیج رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ''یادگارِ غالب'' کی اولین طباعت کا عکس بھی ہے۔ ادارۂ یادگارِ غالب نے دوبارہ کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ غالب پر کئی کتابیں زیرِ طبع ہیں۔ ان شاء اللہ وہ بھی آپ تک پہنچتی رہیں گی۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے اب کے خلافِ معمول بہت دنوں سے خط نہیں لکھا۔ سنا ہے کہ اُن کا سفرنامہ چھپ گیا ہے۔☆۱۴۵ یقیناً یہ سفرنامہ اس لائق ہوگا کہ دینی مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ شاید اسی وجہ سے اُنھوں نے ''دنیا داروں'' کو اس سے محروم رکھا ہے۔

ہمارے ہاں تو غالب کے دو صد سالہ یومِ پیدائش پر ڈھنگ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں دو ایک کام اچھے ہوگئے ہیں۔ خصوصاً ''جامعہ'' کا غالب نمبر۔ یہ اچھا نمبر ہے اور اس میں شامل بعض مضامین لائقِ مطالعہ ہیں۔

☆۱۴۴۔ خوش فکر شاعر، نہایت وجیہ علم دوست اور معارف پرور شخصیت۔
☆۱۴۵۔ ان کے سفرنامہ اندلس ''پوشیدہ تری خاک میں'' کی طرف اشارہ ہے۔

ادارۂ یادگارِ غالب سے غالب کی دو اوّلین شرحیں (والہ و شوکت میرٹھی) یک جا شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ شوکت میرٹھی اپنے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے۔ انھوں نے غالب پر مضامین بھی خاصی تعداد میں لکھے ہیں مگر آج ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے، یہ جو اخباروں کے ادبی صفحات پر اپنے نام چمکاتے پھرتے ہیں، اپنے انجام سے بے خبر ہیں۔ ان کے لیے تو کوئی دعائے خیر کرنے والا بھی نہیں ملے گا۔

جعفر بلوچ صاحب نے ابھی تک میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ جی چاہتا ہے کہ ان کی ایک ایسی ہی ہجو لکھوں جیسی انشا نے عظیم کی لکھی تھی☆[۱۴۶] افسوس کہ انشا جیسی قادر الکلامی مجھ میں نہیں، جعفر بلوچ میں ہے، لہٰذا انھی سے درخواست کروں گا کہ اپنی ہجو لکھ کر بھیج دیں جسے میں اپنے نام سے شائع کراؤں۔ اب تک میں یہ سمجھتا تھا کہ اُن کے پی ایچ ڈی نہ کرنے کا سبب آپ ہیں مگر اب میرا خیال ہے کہ ہر خرابی کی بنیاد پر وہ خود موجود ہیں۔ بتایئے ذرا سا کام کہا تھا، وہ بھی نہ کر پائے۔ ایسا آدمی پی ایچ ڈی کیا کرے گا؟ بلکہ اب تو شبہ ہونے لگا ہے کہ ایم اے کی ڈگری بھی انھیں کہیں راستے میں پڑی مل گئی تھی۔

دارالشکوہ کے قاتل نے لندن میں میرے نام جو خط لکھا تھا، وہ بالآخر انھوں نے لاہور سے پوسٹ کردیا۔ اس مستعدی کی داد دینی چاہیے ورنہ اگلے سال بوقتِ ملاقات بھی وہ یہ خط مجھے دے سکتے تھے۔

عبدالرحمٰن بزمی صاحب گاہے گاہے فون کرتے رہتے ہیں۔ آپ کا اور دیگر احباب کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں۔ بہت ہی مخلص اور مہربان ہیں۔ خدا کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۹۔۶۔۹۸

☆

(۷۷)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون۔

آپ کو خط لکھنے کی نہیں تو پڑھنے کی کہاں فرصت ہوگی، لہٰذا مختصراً عرض کرتا ہوں کہ آپ یاد آتے ہیں اور بہت یاد آتے ہیں۔ آخر اتنا یاد آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بھائی صاحب! مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں، صرف آپ کو یاد کرنے سے تو عاقبت نہیں سنورے گی بلکہ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی خراب ہی ہوگی۔

آپ اندلس جارہے ہیں،☆[۱۴۷] مبارک۔ میرے جاننے والوں میں آپ دوسرے ہیں جو وہاں جارہے ہیں۔ پہلے عبدالرحمٰن الداخل تھے۔ وہ اور اُن کے وارث صدیوں تک اس ملک پر قابض

☆۱۴۶۔ مرزا عظیم بیگ شاگردِ سودا کی ہجو بصورت مخمس: گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے۔ بحر رجز میں ڈال کر بحرِ رمل چلے۔

☆۱۴۷۔ مرکزی وزارتِ تعلیم نے اپنے یونی ورسٹی اسپین کی اقبال چیئر پر میرا انتخاب کیا تھا۔ توقع تھی کہ میں دسمبر ۱۹۹۹ء کی کسی تاریخ کو اپنی نئی ذمہ داری سنبھال لوں گا مگر سرخ فیتے اور دیگر بے تدبیریوں کا شکار ہو کر میں وہاں نہ جاسکا۔

رہے۔ آپ کا قبضہ کتنے دنوں کے لیے ہے، مطلع فرمایئے تاکہ اُسی نسبت سے انتظار کیا جائے۔

ستمبر کے آخر یا اکتوبر کے شروع میں اسلام آباد اور لاہور کے سفر کا ارادہ ہے۔ خدا کرے تب تک آپ وہیں ہوں، ورنہ میرا سفر ضائع ہو جائے گا۔

''آج کل'' دہلی میں آپ کا ذکر آیا ہے۔ فوٹو اسٹیٹ منسلک ہے۔☆۱۴۸

خدا کرے آپ مع اہلِ خانہ خیریت سے ہوں اور بیرونِ خانہ بھی خیریت ہو، یعنی جعفر بلوچ ٹھیک ٹھاک ہوں اور مٹھائی سے ذیابیطس کا علاج کر رہے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۵۔۸۔۹۹

☆

(۷۸)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ سے جدا ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں کراچی پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا۔ دس بارہ دن طبیعت ایسی خراب رہی کہ شکنِ بستر بنا رہا۔ اس بیماری کو دو چیزوں کے تصور سے آسان کیا۔ آپ کے قہقہے کانوں میں رس گھولتے رہے اور بوقتِ رخصت آپ کے ہاتھ میں پھلوں کے تھیلے آنکھوں کو سکون بخشتے رہے، افسوس کہ یہ دونوں چیزیں لاہور ہی میں رہ گئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میں بہت بہتر ہوں اور کل سے کام شروع کر دیا ہے۔

آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود، میرے ساتھ جتنا وقت بھی گزارا اس کا شکریہ اس لیے ادا نہیں کروں گا کہ میں اسی کام کے لیے لاہور آیا تھا کہ آپ کا وقت ضائع کروں۔ الحمد اللہ کہ اس میں کسی قدر کامیابی ہوئی۔ دراصل میں لاہور کا تصور آپ کے بغیر نہیں کر سکتا۔ آپ کے اسپین جانے کا مطلب یہ ہے کہ نصف لاہور ویران ہو جائے گا۔ باقی نصف کو خدا آباد رکھے کہ اُس میں ہمارے بہت سے دوست اور کرم فرما موجود ہیں۔

آپ کے اسپین جانے کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟ مشکور حسین یاد کی واپسی سے مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں وہاں بھی اپنا تقرر نہ کرا لیں☆۱۴۹ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا کہ اُن کا تقرر کرنے والے اب وہاں

☆۱۴۸۔ میرے مرتبہ کمبل پوش کے سفرنامے ''عجائباتِ فرنگ'' (تاریخ یوسفی) پر مجھی محمود ہاشمی کا تبصرہ جو اب تک آل انڈیا ریڈیو سے متعدد بار نشر ہو چکا ہے۔ یہ تبصرہ ماہنامہ ''آج کل'' دہلی کے ستمبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

☆۱۴۹۔ ۱۹۹۹ء کے وسط میں تہران یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو پاکستان شناسی میں اس وقت کے پیر ہفتاد و دو سالہ جناب مشکور حسین یاد کا تقرر کیا گیا۔ ایک ایسا شخص جو مرکزی وزارتِ تعلیم کے کسی انٹرویو میں شریک نہ ہوا، جو پی ایچ ڈی نہ تھا جس کی عمر ستر سے متجاوز تھی۔ مراد یہ ہے کہ اس طرح کی مسندوں کے لیے جو لازمی شرائط ہیں ان سب کو بالائے طاق رکھ کر انھیں وہاں بھیج دیا گیا، حالاں کہ اس مسند پر بھی میں پہلے نمبر پر منتخب ہوا تھا۔ یاد صاحب دو ماہ سے زیادہ تہران کی علمی فضا کی تاب نہ لا کر لاہور سدھارے اور پھر کہیں پانچ چھ برس بعد اس مسند پر میرا تقرر ہوا۔

ہیں جہاں سے اُن کو کچھ اپنی خبر نہیں آتی۔

بیگم صاحبہ کا اب کیا حال ہے؟ ہم دونوں کی طرف سے اُن کی مزاج پرسی کیجیے گا۔
خدا کرے، آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۳۔۱۱۔۹۹

☆

(۷۹)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

فون پر آپ کی آواز فردوسِ گوش بنی اور پھر سوادِ تحریر سے جنتِ نگاہ کے مزے لوٹے۔ اس "بیمار پرسی" کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اکتوبر سے فروری تک چار مہینے بڑی بے مزگی میں گزرے۔[☆۱۵۰] خدا کا شکر ہے کہ اب کوئی شکایت نہیں۔ بس ایک پریشانی ہے کہ کام کا سلسلہ رک جانے کی وجہ سے دوبارہ کام شروع کرنے میں دقتیں پیش آرہی ہیں۔ بہ ہر حال یہ مرحلہ بھی گزر جائے گا۔

مظفر علی سید کی دائمی مفارقت، میرے لیے دائمی غم ہے۔[☆۱۵۱] وہ شخص دوست ہی نہیں، محسن بھی تھا۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا، حاصل کیا۔ خصوصاً ۱۹۸۹ء کا پورا سال وہ جب کراچی میں رہے تو تقریباً ہر دوسرے دن اُن سے ملاقات ہوتی تھی۔ ایسا صاحبِ علم اور باغ و بہار انسان کم ہی دیکھا ہے۔ قدیم و جدید اردو ادب کے ساتھ ساتھ فارسی ادب اور عالمی ادب پر جیسی نظر اُن کی تھی اُس میں اگر کوئی اُن کا شریک و سہیم ہوسکتا ہے تو وہ شمس الرحمٰن فاروقی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ سید صاحب "علومِ مردہ" یعنی عروض، علمِ قافیہ، رمل، جعفر سے بھی واقف تھے۔ علمِ معنی و بیان کا بڑا حصہ بھی علمِ مردہ میں شمار ہوتا ہے، اس پر بھی نظر تھی۔ سیکڑوں متروکات مع امثال ازبر تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس انسانی پیکر میں علم و فضل کی کیسی وسیع دنیا آباد تھی۔ حافظہ بھی بے پناہ تھا۔ بس ایک وہم تھا کہ اپنی تمام پرانی تحریروں کو ازکار رفتہ سمجھتے تھے، اسی لیے مضامین کے مجموعے چھپوانے سے گریزاں تھے۔ یہ اُن کی تکمیلیت پسندی کا وہم تھا، ورنہ اُن کے مضامین کے تین چار نہایت عمدہ مجموعے تیار ہوسکتے تھے۔ اور ان شاء اللہ ہوں گے۔ میں لاہور آؤں گا تو اُن کے صاحب زادے سے بات کروں گا۔

اقبال اکیڈمی سے اکرام چغتائی کی کتاب تو مل گئی تھی لیکن "مطالعۂ بیدل" کا فارسی ترجمہ

☆۱۵۰۔ خواجہ صاحب کی شدید علالت۔ ذیابیطس کے جادوئی اثرات جسم پر مرتب ہوئے۔ گردے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ ران پر پھوڑا نکل آیا جس کا آپریشن کرانا پڑا۔

☆۱۵۱۔ فاضلِ یگانہ جناب مظفر علی سید کا ۲۸؍ جنوری ۲۰۰۰ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ علم سے ایسا غیر معمولی شغف تھا کہ وفات سے صرف ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے ڈاکٹر خورشید رضوی سے عربی کے بعض لسانی نکات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ افسوس تنقیدی مضامین کا فقط ایک مجموعہ (مرتبہ: قمر ادہم) "تنقید کی آزادی" شائع ہوا۔

نہیں ملا۔☆۱۵۲ غالب والی کتاب بھی نہیں ملی☆۱۵۳ ڈاکٹر قریشی صاحب ۱۱ مارچ کو واپس آئیں گے تو بھیجیں گے۔ سنا ہے کہ یہ کتاب بہت خراب چھپی ہے۔ بالکل اُسی طرح کی ہے جس طرح اردو بازار والے گائیڈ چھاپتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لندن میں بہت خوش ہیں☆۱۵۴ افسوس کہ وہ ایسی عمر میں لندن گئے کہ وہاں کی ''نعمتوں'' سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ خیر ''اُس'' عمر میں بھی انھوں نے کون سا تیر مارا تھا، بلکہ کوئی تیر کھایا بھی نہیں تھا۔

آپ کے جانے کی کوئی تاریخ مقرر ہوئی یا نہیں؟

مضمون کی ایک نقل ''کتاب نما'' دہلی اور ''غالب نامہ'' دہلی کو بھی بھیجیے۔ اچھا ہے کہ یہ وہاں بھی چھپ جائے۔

خدا کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۹۔۳۔۲۰۰۰ء

☆

(۸۰)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

کیسے اچھے دن تھے جو آپ کے ساتھ گزر گئے۔ آپ کے علم سے فائدہ تو معین الرحمن نے اٹھایا مگر آپ کی غیر علمی گفتگو کا جادو مجھ پر ایسا چلا کہ آپ سے جدا ہونے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ ۲۱ر کی شام جدائی ملتان میں آئی۔ میں بہانے بہانے سے آپ کو روکتا رہا مگر تاجدارِ سلطنتِ غیر مغلیہ نے میری ایک نہ چلنے دی۔ اُن کا جلال اُن کے چہرے سے ہویدا تھا مگر عمر میں سب سے کم ہونے کی وجہ سے یعنی عالمِ شہزادگی میں ہونے کی وجہ سے وہ شمشیر زنی کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ مجھے یقین ہے وہ راستے بھر آپ سے لڑتے رہے ہوں گے مگر سچی بات یہ ہے کہ اُن کی وجہ سے بھی بڑی رونق رہی اور جعفر بلوچ کا کیا کہنا، یہ حضرت تو ہر اعتبار سے رونق بنارہی ہیں۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے جعفر بلوچ جیسی نادر روزگار ہستی سے ملوایا۔ ایسا خندہ گر ساری دنیا میں تو کیا، سرشار کے ناولوں میں بھی نہ ملے گا۔ بہ ہر حال ان کی شکر خوری باعثِ تشویش ہے۔ اس سلسلے میں آپ لوگوں کو کچھ کرنا چاہیے ورنہ یہ قیمتی شخص ہاتھوں سے نکل جائے گا۔

چند روز ہوئے افتخار عارف کا فون آیا تھا کہ آپ اُن کے پاس بیٹھے تھے، انھوں نے مجھے فون کیا مگر میں گھر پر موجود نہ تھا۔ افسوس ہوا کہ آپ سے بات نہ ہو سکی۔

☆۱۵۲۔ مطالعہ بیدل در پرتو اندیشہ ہای برگسون (ترجمہ از علی بیات تہرانی)۔
☆۱۵۳۔ ''غالب فکر و فرہنگ''۔ میری یہ کتاب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے شائع ہوئی۔
☆۱۵۴۔ ڈاکٹر صاحب اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو میں نے شکایت نامہ بھیجا ہے، اور لکھا ہے کہ آپ بھی قاضی محمد حسین☆۱۵۵ سے کم نہیں۔ "قاضی آوے ای آوے" کا نعرہ لگا کر نہیں آئے۔☆۱۵۶ غضب تو یہ ہے کہ میری تالیفِ قلب کے لیے انھوں نے کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ انھیں کتابوں کی تالیف سے فرصت ہو تو نیاز مندوں کی تالیفِ قلب کا خیال کریں۔

آپ کے کتابچے کا کوئی ردِعمل سامنے آیا یا نہیں؟ تفصیل سے لکھیے☆۱۵۷

میں نے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے کہا تھا کہ آپ کی کتاب اور اکادمی کی دوسری کتابوں کے سات سات نسخے یہاں کے اخبارات و رسائل میں تبصرے کے لیے بھیج دیں۔ وہ شاید بھول گئے۔ انھیں یاد دلا دیجیے۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۷-۴-۲۰۰۰

☆

(۸۱)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا ۳ر اگست کا خط ملا۔ صورتِ حال سے آگاہی ہوئی۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے پروفیسر کی جگہ کے لیے درخواست گزار دی۔ ان شاء اللہ آپ اس منصب پر ضرور فائز ہوں گے کہ اورینٹل کالج کی قدیم اور شان دار علمی روایات کے امین اب صرف اور صرف آپ ہی ہیں۔ خدا آپ کو طویل عمر دے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی کے بعد اورینٹل کالج میں جو علمی زوال آیا ہے اس کی تلافی آپ ہی کر سکتے ہیں۔ کیا رشید حسن خاں صاحب کے ۲۸ر جون کے خط کا عکس میں نے آپ کو بھیج دیا تھا؟ اب ڈاکٹر گیان چند کے خط مورخہ ۲۹ر جون کا عکس بھیج رہا ہوں۔ انھوں نے فون پر بھی "شخص مذکور"☆۱۵۸ کے بارے میں دلچسپ باتیں کیں۔ وہ اس پر حیران تھے کہ کوئی شخص علمی معاملات میں اتنا بددیانت بھی ہو سکتا ہے۔

جعفر بلوچ صاحب کی نظم (مادۂ تاریخ والی) مل گئی ہے۔ اس شخص کا جواب نہیں۔ ہجوگوئی سے جیسی طبعی مناسبت اسے ہے، سودا و انشا کو کیا ہوگی۔ اللہ نے ہمارے اس دوست کو بہترین تخریبی ذہن

☆۱۵۵۔ یعنی قاضی حسین احمد

☆۱۵۶۔ اپریل ۲۰۰۰ء میں جھنڈیر میں چند دن خواجہ صاحب اور دیگر دوستوں کی معیت میں گزرے۔ کیا یادگار لمحے تھے۔ ہاشمی صاحب کو بھی اس علمی سفر میں ہمارے ساتھ روانہ ہونا تھا مگر اپنی علالت کے باعث وہ اس لیے سفر کے متحمل نہ ہو سکے۔

☆۱۵۷۔ "دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — اصل حقائق"۔ اس کتابچے کی نہ صرف برِعظیم پاک و ہند میں بلکہ باہر کی اردو دنیا میں بھی پذیرائی ہوئی۔

☆۱۵۸۔ مراد ہیں ڈاکٹر معین الرحمن۔

عطا کیا ہے۔ یہ نظم پڑھ کر جی خوش ہوگیا، مگر اُس شخص کے لیے دل آزردہ ہوا جس کی شان میں یہ نظم ہے۔☆☆[159]

ناصر زیدی کا کالم میں نے نہیں دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے نقوی صاحب کو فون کیا تھا۔ جی ہاں، نقوی صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ نسخہ وہی ہے جو مہاراجا جے پور کے لیے تیار کیا گیا تھا☆☆[160] اس دوران میں "املائے غالب" بھی شائع ہو جائے گی۔ مبین مرزا سے ابھی بات نہیں ہوئی۔ آج فون کر کے معلوم کروں گا۔ کل وہ آئے تھے تو بہت لوگ بیٹھے تھے، اس لیے میں نے بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

خط کا دو سطری جواب ضرور دیجیے تاکہ یہ اطمینان ہو کہ خط آپ کو مل گیا۔ یہ آخری جملہ لکھا تھا آپ کا فون آگیا۔ اسے کہتے ہیں دل سے دل کو —

آپ کا
مشفق خواجہ ۷۔۸۔۲۰۰۰

☆

(۸۲)

عزیز مکرم، سلام مسنون

آپ بغیر اطلاع کے ہندوستان چلے گئے☆☆[161] اور میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا کہ اتنی مشکلوں سے کتاب کا ایک نسخہ حاصل کر کے بھیجا تھا اور آپ نے وصول ہونے کی اطلاع تک نہ دی۔ میری حیرت غصے میں اور پھر انتقام کے جذبے میں منتقل ہوگئی اور میں نے عاق نامے کا مسودہ تیار کر لیا۔ وہ تو یہ کہیے کہ رات آپ کا فون آگیا ورنہ یہ عاق نامہ آپ کے نام روانہ کر چکا ہوتا۔ بہرحال میں اس دستاویز کو ضائع نہیں کروں گا۔ آئندہ کبھی کام میں لاؤں گا۔ اورینٹل کالج میں آپ کے علاوہ بھی تو کئی عزیز ہیں۔

آپ کے ہندوستان جانے پر رشک آیا۔ مجھے لوگوں سے ملنے کا تو کوئی خاص شوق نہیں ہے، وہاں کے آثارِ قدیمہ خصوصاً مسلم آثارِ قدیمہ سے بے حد دل چسپی ہے۔ کاش آپ کے ساتھ کبھی وہاں جانے کا موقع ملے۔ آپ کے جانے سے کئی فائدے ہوں گے کہ آپ میری طرح اس قسم کی چیزوں سے دل چسپی لیتے ہیں اور پھر مجھے بھی آثارِ قدیمہ قسم کی چیز سمجھ کر میرے لیے عصائے پیری کا کام کریں گے۔

ڈاکٹر گیان چند کا مضمون ارسال ہے۔ اس کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھیے اور فون پر

☆☆۱۵۹۔ معین الرحمن صاحب کے لیے لکھی گئی اس نظم کا آغاز اس مصرعے سے ہوتا ہے: عصرِ نو، یہ رنگ تیرا قابلِ افسوس ہے۔ اسی میں ایک شعر یہ تھا۔ نسخہ مملوکہ پنجاب یونی ورسٹی، نسخہ مسروقہ گنجینۂ مانوس ہے۔ دوسرے مصرعے کے ٹکڑے "نسخہ مسروقہ گنجینۂ مانوس" سے ۱۴۲۱ھ برآمد ہوتا ہے۔

☆☆۱۶۰۔ سب سے پہلے اس قیاس کا اظہار ڈاکٹر محمد حنیف نقوی (بنارس) نے کیا تھا۔ قدرت نقوی نے اس سلسلے میں اپنے کتابچے میں دلائل فراہم کر کے اس کی توثیق کر دی۔

☆☆۱۶۱۔ میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی دعوت پر نومبر ۲۰۰۰ء میں ہندوستان گیا۔ اس یادگار سفر میں پروفیسر نظیر صدیقی کی معیت نصیب رہی۔

جو گفتگو ہوئی تھی اُس پر عمل کیجیے۔ جس رسالے میں یہ مضمون چھپے، اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب کو بذریعہ ایئر میل بھجوا دیجیے۔

ہندوستان کا سفر نامہ مفصل لکھیے۔ کوئی خاص کتاب لائے ہوں تو اُس کا نام بھی۔

باقی باقی۔ ڈاک خانے کا وقت ختم ہونے والا ہے۔ اس لیے جلدی میں ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۔۱۲۔۲۰۰۰ء

☆

(۸۳)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا خط کئی دن تک نہ آئے تو تشویش ہوتی ہے۔ پھر پریشانی ہوتی ہے۔ جوں جوں پریشانی کا دورانیہ بڑھتا جاتا ہے، افسوس کہ ایک زیریں لہر بھی کارفرما ہو جاتی ہے۔ بالآخر افسوس ہی باقی رہ جاتا ہے۔ پرسوں میں اسی مرحلے میں تھا کہ اکرام چغتائی صاحب کا فون آیا۔ میں نے کہا، میرا ایک کام کر دیجیے۔ وہ پریشان ہو گئے کہ خدا جانے کیا کام اُن کے ذمے کر دوں۔ اُن کے درجات کی بلندی دیکھتے ہوئے کہیں قرض ہی نہ مانگ لوں۔ اُنھوں نے نہایت نحیف آواز میں کہا، کیا کام ہے؟ میں نے کہا، بس ذرا تحسین فراقی کو فون کر دیجیے اور ایک سہ حرفی پیغام اُن تک پہنچا دیجیے۔ کہنے لگے، وہ کیا؟ میں نے کہا بس فون پر اتنا کہہ دیجیے کہ کراچی والے نے کہا ہے، "بہت افسوس ہے۔" کہنے لگے، بس اتنا سا کام؟ میں نے کہا، "یہ بھی بہت ہے، آپ کے احسانات کی فہرست ایسے ہی کاموں سے خاصی طویل ہو چکی ہے۔" امید ہے اُنھوں نے میرا پیغام دیا ہوگا۔ یہ عجیب اتفاق ہے پرسوں آپ کو پیغام دیا، کل آپ کا خط آ گیا۔ پڑھ کر اطمینان ہوا کہ آپ نے خط کا جواب حسبِ معمول تساہل کی وجہ سے تاخیر سے دیا ہے، باقی سب خیریت ہے!

آپ کی اور آپ کے دوستوں کی یہ تجویز بہت عمدہ ہے کہ نسخۂ مسروقہ سے متعلق تمام تحریروں کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ میرے خیال میں کوئی بھی پبلشر اس پر آمادہ ہو جائے گا، لیکن اس مجموعے میں صرف سنجیدہ تحریریں ہی شامل ہوں۔ کالم وغیرہ نہ شامل کیے جائیں تو اچھا ہے۔ ان مضامین پر اگر جناب خلیل الرحمٰن داؤدی سے محاکمہ لکھوا لیا جائے تو یہ سونے پر سہاگہ ہوگا۔☆۱۶۲

آپ نے س۔ ا (سارق اعظم) کی نئی کتاب "بر تجلیٔ غالب" دیکھی؟☆۱۶۳ یہ اسی قسم کی کتابیں لکھ سکتا ہے کہ اس کی ذہنی سطح عورتوں کے کوسنوں والی ہے۔ اس میں بھی وہ بضد ہے کہ اُس کا نسخۂ مسروقہ ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور عرشی صاحب کے نسخوں سے الگ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ

☆۱۶۲۔ یہ کتاب "محاکمہ" (جلد اول) کے نام سے شائع ہوئی۔ جعفر بلوچ اور رفاقت علی شاہد اس کے مرتب تھے۔

☆۱۶۳۔ مراد ڈاکٹر معین الرحمٰن۔

وہ اس سے بھی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے کہ عرشی صاحب کے سامنے اس نسخے کا فوٹو اسٹیٹ تھا۔[۱۹۴] ایسا شخص "دیوانِ غالب" تو کیا، دیوان ناصر زیدی بھی مرتب کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا (ناصر زیدی نے ایک مرتبہ اپنا ایک مجموعہ مجھے تبصرے کے لیے بھیجا تھا، میں نے لکھا تھا کہ ناصر زیدی، غالب کی سطح کا شاعر ہے۔ اُس کے ہاں وہ تمام الفاظ ملتے ہیں جو غالب کے کلام میں پائے جاتے۔ بس یہ فرق ہے کہ غالب کے ہاں ان لفظوں کی ترتیب ذرا مختلف ہوتی ہے)۔

اس نئی کتاب میں س۔ا نے یہ موٴقف اختیار کیا ہے کہ اگر اُس کا نسخہ وہی ہے جو پنجاب یونی ورسٹی میں تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اُسے تدوین کی داد تو ملنی چاہیے۔ یہ موٴقف ایک سارق ہی کا ہوسکتا ہے۔ اُس نے نہ صرف مخطوطے کے بعض مقامات پر تحریف کی ہے بلکہ عرشی وغیرہ کی محنت کو بھی اپنے کھاتے میں ڈال لیا ہے، یہ کہہ کر کہ اُس کا نسخہ اور عرشی کا نسخہ تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلے اُس کو اس مخطوطے کے اسی ہزار مل رہے تھے اب اس کی مارکیٹ ویلیو ۲۰، ۲۲ لاکھ روپے ہے۔ اس سے گیان چند جیسے سادہ لوح متاثر ہوجاتے ہیں اور س۔ا کے ایثار کی تعریف کرتے ہیں حالاں کہ اصل وجہ یہ ہے کہ س۔ا نے آئندہ کی پریشانیوں سے جان چھڑانے کے لیے یہ نسخہ یونی ورسٹی کے حوالے کیا ہے۔ کوئی بھی شخص F.I.R کٹوا کر س۔ا کے لیے مشکلات پیدا کرسکتا تھا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کا یہی طریقہ تھا کہ مالِ مسروقہ کو اصل مالک کے حوالے کردیا جائے۔ آپ اپنے مضمون میں ان مسائل پر ضرور لکھیے گا۔

میں نے ڈاکٹر نذیر احمد کے جملے پر طنز کا غلاف اس لیے چڑھایا تھا کہ وہ بہت بڑے محقق ہیں، اُن کی غلطی معاف کردینی چاہیے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے سنہ ستاون والی کتاب غور سے دیکھی ہی نہیں۔ اُنھوں نے ازخود یہ باور کرلیا کہ "دستنبو" کا ترجمہ معین الرحمٰن نے کیا ہے اور اس سے نتیجہ نکال لیا کہ جو آدمی "دستنبو" کا ترجمہ کرسکتا ہے وہ دساتیر کے ذخیرۂ الفاظ سے بھی واقف ہوگا کیوں کہ غالب نے "دستنبو" میں دساتیر کے الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں۔ بے چارے نذیر احمد کو کیا معلوم کہ س۔ا تو دساتیر کی دال سے بھی واقف نہیں، صرف اُس دال سے واقف ہے جو جوتیوں میں بٹتی ہے۔

جھنڈیر اور بہاول پور کے سفر کے لیے میں نے اپریل کا مہینہ اس لیے رکھا تھا کہ اس مہینے میں آپ لوگوں کی تعطیلات ہوتی ہیں۔ مارچ میں تو سردی ہوگی۔ میری رائے میں سردی کے موسم میں سفر کرنا، خاصا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اب آپ حضرات مل کر کوئی فیصلہ کیجیے۔ میں اُس پر عمل کروں گا۔ مئی کیسا رہے گا؟ گرمی تو شدید ہوگی مگر اس علاقے کی سردی کی طرح ناقابلِ برداشت نہیں ہوگی۔

آپ کا ہندوستان کا مختصر سفرنامہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کا اور قدرت نقوی کا مقالہ وہاں کے اہلِ علم تک پہنچا کہ نہیں؟ پہنچا تو اُن کی رائے کیا ہے؟ آپ کو یہ جان کر

---

[۱۹۴]۔ خواجہ صاحب کی مراد اصلاً رَوٹوگراف سے ہے۔

افسوس ہوگا کہ قدرت نقوی صاحب ۱۵، ۲۰ روز سے شدید بیمار ہیں اور اسپتال میں ہیں۔ اُن کے گردوں نے کام بند کردیا ہے۔ ہر دوسرے چوتھے روز خون تبدیل ہوتا ہے۔☆۱۶۵

من موہن تلخ میرا بہت پرانا دوست ہے۔ اُس سے ۱۹۵۶ء سے یاد اللہ ہے۔ اب بھی کبھی کبھی خط لکھتا رہتا ہے اور اپنا کلام بھجواتا رہتا ہے۔ ۱۵ر سال پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اب تو وہ بھی میری طرح پیرِ فرتوت بن چکا ہوگا۔☆۱۶۶

آپ نے دیکھا س۔ا نے نئی کتاب میں لطیف الزماں کا جعلی خط بھی شامل کرلیا ہے۔ شاید اسی لیے کتاب مجھے نہیں بھیجی۔ مجھے ڈاکٹر صدیق جاوید صاحب نے بھیجی ہے۔ آپ کی مصروفیات کا مجھے اندازہ ہے کہ آپ ماشاء اللہ عروسِ ہزار داماد ہیں لیکن میرے خط کی رسید تو بھجوا دیا کیجیے۔ اس سے اطمینان رہتا ہے کہ خط آپ تک پہنچ گیا۔

یہ خط میں نے کل لکھا تھا۔ آج جب پوسٹ کرنے کے لیے بھیجنے لگا تو یہ اطلاع ملی کہ صبح چار بجے سید قدرت نقوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ حق مغفرت کرے بہت اچھے انسان تھے۔

اچھا اب اجازت دیجیے۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۱۵۔۱۲۔۲۰۰۰ء

☆

(۸۴)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

بالآخر لاہور کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ ۱۹ر کو اسلام آباد پہنچوں گا۔ چند روز وہاں کے ''اہلِ علم'' کے خوانِ بے مزہ سے لطف اندوز ہوں گا اور پھر لاہور آؤں گا۔ چند روز آپ کے ساتھ گزریں گے۔ اس دوران میں اگر اورنگ زیب صاحب سے آپ کی سرد جنگ جاری ہوگی تو اس میں کچھ گرما گرمی پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ لاہور میں مجھے کوئی کام نہیں، سوائے آپ لوگوں سے ملنے کے۔ آپ لوگ حفاظتی تدابیر اختیار کرلیں۔

''عبرت الغافلین'' کا عکس لندن سے آنے ہی والا ہے☆۱۶۷ (کراچی یونی ورسٹی کے مخطوطے میں یہ رسالہ نہیں ہے)۔ اگر میرے لاہور پہنچنے سے پہلے آگیا تو ساتھ لیتا آؤں گا۔ ورنہ دوستوں کی اصلاح کے لیے وہیں آپ کی موجودگی میں تصنیف کر ڈالوں گا۔ سودا نے اس رسالے کا کیا

☆۱۶۵۔ اس مکتوب میں قدرت نقوی کی رحلت کی اطلاع ہے۔ مرحوم کے قلم سے جو آخری تحریر نکلی وہ یہی ان کا کتابچہ تھا جس میں دیوانِ غالب ''نسخۂ مسروق'' پر انھوں نے جان دار محاکمہ کیا تھا۔

☆۱۶۶۔ من موہن تلخ سے دلی میں متعدد ملاقاتیں رہیں۔ خواجہ صاحب کی رحلت سے قبل ہی تلخ بھی رخصت ہوگئے۔

☆۱۶۷۔ خواجہ صاحب کی عنایت سے برٹش لائبریری میں محفوظ ''عبرۃ الغافلین'' کے مخطوطے کا عکس بالآخر مل گیا تھا۔ افسوس کہ خواجہ صاحب کی زندگی میں، میں اس کی تدوین و ترجمہ مکمل نہ کرسکا۔ اب یہ قریب الاختتام ہے۔

عمدہ نام رکھا ہے۔ کسی شاگرد کو آمادہ کیجیے کہ اس نام سے "محققِ بے تحقیق" کی سوانح عمری لکھ ڈالے۔

مجلّہ "تحقیق" کے جن شماروں کی فہرست بھیجی تھی، انھیں حاصل کر رکھیے ... اگر یہ فہرست گم ہوگئی ہو تو مطلع فرمایے، دوبارہ بھیج دوں گا۔ باقی باتیں زبانی ہوں گی۔

منسلکہ خطوط متعلقہ حضرات تک پہنچا دیجیے۔ شکریہ۔ پہلے ارادہ تھا کہ یہ زحمت ڈاکٹر ہاشمی صاحب کو دوں گا مگر اُنھوں نے جاپان جانے کا مژدہ سنا رکھا ہے۔ ایسے کٹھن حالات میں ملک سے باہر چلے جانا ہی بہتر ہے۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۶۔۱۔۲۰۰۱ء

☆

(۸۵)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

ایک خط ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے ذریعے بھیجا تھا، امید ہے ملا ہوگا۔ دو روز ہوئے "سورج" کے تازہ شمارے کے پانچ نسخے ملے۔ اب کے اُنھوں نے پھر معین نمبر نکال دیا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب کا محاکمہ نہایت منصفانہ ہے۔ حیرت ہے کہ اُنھوں نے اس سلسلے میں چھپنے والی ایک ایک تحریر پڑھی۔ میرا خیال ہے کہ اب اس موضوع پر کوئی کچھ بھی لکھے، داؤدی صاحب کے لکھے پر اضافہ نہیں ہوسکتا۔ چوں کہ یہ اس بحث کا نقطۂ عروج ہے، اس لیے اب میری رائے میں اسے ختم ہوجانا چاہیے۔ مجھ تک یہ تشویش ناک اطلاعات پہنچی ہیں کہ معین صاحب شدید بیمار ہیں۔ میرے خیال میں اب انھیں معاف کردینا چاہیے۔ معین صاحب نے اس جھگڑے میں جس طرح مجھے اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بلاوجہ گھسیٹا ہے، اس کے بعد میرے دل میں اُن کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے مگر مجھ سے کسی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی، اس لیے اُن کی سفارش کرنے پر مجبور ہوں۔

آپ سے ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ۷ر کو مجلس کی میٹنگ میں، میں ضرور آتا مگر دعوت نامہ میٹنگ سے صرف تین دن پہلے ملا۔ اتنے کم عرصے میں تو میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کا پروگرام بھی نہیں بنا سکتا تو لاہور کیا آتا۔ آٹھ دس روز پہلے اطلاع ملتی تو میں ضرور آتا۔ اب شاید ستمبر/اکتوبر میں اسلام آباد جانا ہو تب لاہور کا چکر بھی لگاؤں گا۔ آپ سے اور دوسرے دوستوں سے پچھلے سال اپریل میں ملاقات ہوئی تھی۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ سال میں ایک مرتبہ ضرور ملاقات ہوجائے۔ کراچی میں، میں باوجود بے شمار ملاقاتیوں کے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ لاہور میں آپ لوگوں سے مل کر تازہ دم ہوجاتا ہوں۔ لاہور میں جتنے دن رہتا ہوں، خوش رہتا ہوں کہ اس شہر سے مجھے اپنے آباؤ اجداد کی خوش بو آتی ہے۔

امید ہے گیان چند صاحب کی کتاب آپ کو اب تک مل گئی ہوگی۔ اس میں رام لعل اور فراق کے خاکے ضرور پڑھیے گا۔ کمال کے خاکے ہیں۔ ایسے خوب صورت خاکے اردو میں کم لکھے گئے ہیں☆۱۶۸ گیان چند صاحب آج کل خوب لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی نئی کتاب ''قاضی عبدالودود بہ حیثیت محقق'' کا مسودہ بھیجا ہے۔ فل اسکیپ سائز کے پورے آٹھ سو صفحات ہیں۔ ابھی اس کتاب کا ایک ہی باب پڑھا ہے۔ آنکھیں ہی نہیں دل بھی روشن ہوگیا۔ انھوں نے موضوع کا حق ادا کردیا ہے۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۵۔۵۔۲۰۰۱ء

☆

(۸۶)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

کتاب نامبارک موصول ہوئی☆۱۶۹ اس تحفۂ غیر مسروقہ کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ جمع و ترتیب کے کاموں میں پہلے بھی جعفر بلوچ کا جواب نہ تھا اور اب تو انھوں نے ثابت کردیا کہ دوسروں کے خوان سے ریزہ ریزہ چن کر اعلیٰ قسم کی بریانی تیار کی جاسکتی ہے۔ واجد علی شاہ کے دستر خوان پر ایسی ہی بریانی ہوتی تھی جسے کھا کھا کر اکرام چغتائی اب تک واجد علی شاہ کی ممنوعات پر تحقیق کر رہے ہیں۔ جعفر صاحب کو میری مبارک باد پہنچا دیجیے۔

ویسے اس کتاب کو دیکھ کر مجھے وہ پرانے فاتح یاد آگئے جو کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو وہاں کے بادشاہ کو تہ تیغ کرنے کے بعد اُس کے آباؤ اجداد کی لاشوں کو مقبروں سے نکال کر پھانسی کے تختے پر لٹکاتے تھے۔ آپ لوگوں نے بھی لاش کو پھانسی دینے کی روایت زندہ کی ہے۔ بہرحال اس سے لاش کو فائدہ ہو نہ ہو، دوسروں کو عبرت حاصل ہوگی اور وہ اس قسم کے کاموں سے اجتناب کریں گے۔

جعفر بلوچ نظم کے ساتھ نثر بھی بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ اُن کا ذخیرۂ الفاظ انھی سے مخصوص ہے۔ خدا اُنھیں تادیر سلامت رکھے اور وہ اپنی اس صلاحیت سے کوئی زبردست کام لیں۔

ہمارے مولانا ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے بھی ساری عمر جمع و ترتیب کا کام کیا۔ پچھلے دنوں میں انھوں نے اپنی تازہ مرتبہ کتاب دی جو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے بارے میں ہے۔ یہ اُن کی پچاسویں کتاب ہے۔ میں نے انھیں اس ریکارڈ پر مبارک باد دی اور کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ اب آپ ایسی

☆۱۶۸۔ گیان چند صاحب کی یہ کتاب خواجہ صاحب ہی کی عنایت سے ملی۔ ویسے تو یہ پوری کتاب ہی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے مگر رام لعل اور فراق گورکھ پوری کے خاکوں سے ان کی شخصیات کے بعض ایسے پہلوؤں سے آگاہی ہوتی ہے جس سے کم لوگ واقف ہیں۔ گیان چند کی بے باک نگاری لائق داد ہے۔ کتاب کا نام ہے ''شخصیات و مشاہدات''، ناشر فضلی سنز کراچی۔

☆۱۶۹۔ یعنی ''محاکمہ'' (جلد اول) حصہ اول۔

بھی کوئی کتاب لائیں جو شروع سے آخر تک آپ کی اپنی لکھی ہوئی ہو۔ اُنھوں نے جواب میں فرمایا، جسے شروع سے آخر تک کسی کتاب کو پڑھنے کا تجربہ نہ ہو وہ کسی کتاب کو شروع سے آخر تک کیا لکھے گا۔ یہ سن کر میں شرمندہ ہوا کہ اُن کے ارشاد کے بعد میں یہی کچھ کرسکتا تھا۔

''عبرت الغافلین'' کے لیے میں نے لندن کے ایک دوست سے رابطہ کیا۔ انڈیا آفس لائبریری برٹش لائبریری کا حصہ بن چکی ہے، وہ وہاں گئے۔ وہاں سلیم قریشی کام کرتے ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ ''کلیاتِ سودا'' کے متعلقہ نسخے کی مائیکروفلم کراچی یونی ورسٹی کو دی گئی ہے۔ میں نے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ بات درست ہے۔ اب یونی ورسٹی کے ایک اہلکار کو متعین کیا گیا ہے کہ مخطوطے کو مائیکروفلم ریڈر پر دیکھا جائے اور ''عبرت الغافلین'' والے حصے کے پرنٹ بنائے جائیں۔ ان شاء اللہ یہ کام جلد ہی ہوجائے گا۔ اس کام کی نگرانی کے لیے میں نے طاہر مسعود صاحب سے درخواست کی ہے۔ اگرچہ وہ مولانا احمد جاوید سے بیعت کے بعد کسی کام کے نہیں رہے لیکن میں اُن سے مایوس نہیں ہوں۔ کبھی نہ کبھی وہ ضرور راہِ راست پر آئیں گے۔ کوئی ایک مہینہ ہوا کہ وہ متین الرحمٰن مرتضیٰ صاحب کے ساتھ تشریف لائے تھے مگر کسی قسم کے مالِ مسروقہ پر گفتگو نہیں ہوئی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۳۔۸۔۲۰۰۱

☆

(۸۷)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

جائے عبرت سرائے فانی ہے تو جائے عبرت الغافلین آپ کا شعبۂ اردو ہے جس کی وجہ سے آپ اپنے اصل کام سے غافل ہیں۔ یہ تو شعبے کی صدارت ہے، اگر ملک کی بدقسمتی سے آپ کو صدرِ مملکت کا عہدہ مل گیا تو پھر مصروفیت کی وجہ سے آپ اس لائق بھی نہ رہیں گے کہ اپنے ریفرنڈم میں اپنا ہی جعلی ووٹ ڈال سکیں۔ یہ ہر حال میرا کام یاد دہانی کرانا ہے۔ ''عبرت الغافلین'' کا ترجمہ جہاں دو سو سال تک شائع نہیں ہوا تو مزید دو سو سال تک شائع نہ ہو، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

شاید مئی میں لاہور آؤں۔ اُس وقت تک مسودہ تیار کرلیجیے گا۔ یہ ہمارے جون تک کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہے۔

پچھلے پورے مہینے میں میری صحت، بعض سیاسی، مذہبی جماعتوں کی نیت کی طرح ڈانواں ڈول رہی۔ بلامبالغہ درجنوں ٹیسٹ ہوئے اور الٹرا ساؤنڈ۔ خون میں یوریا کی مقدار نارمل سے زیادہ تھی۔ اس لیے ہر وقت غنودگی کا عالم رہتا تھا۔ یہ ہر حال اب اس گردابِ بلا سے باہر نکل آیا ہوں تاکہ آپ کی

وعدہ خلافیوں سے مزید محفوظ ہو سکوں۔

عبدالوہاب سلیم صاحب سے آپ واقف ہوں گے۔ بہت علم دوست ہیں، اور صاحب ثروت بھی۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ان کے پاس علم زیادہ ہے یا دولت دنیا۔ بہر حال لوگوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ جعل سازِ اعظم نے ان کے سامنے بھی دستِ طلب دراز کیا اور خاصی معقول رقم، دیوان غالب نسخہ جعلی چھاپنے کے لیے اینٹھ لی۔ سلیم صاحب مجھے فون کرتے رہتے ہیں۔ انھیں میں نے اصل حالات بتائے تو بہت حیران ہوئے۔ جعفر بلوچ نے جو کتاب اس مسئلے سے متعلق شائع کی ہے وہ سلیم صاحب کی نظر سے ضرور گزرنی چاہیے، لہٰذا اس کا ایک نسخہ فوراً بھجوا دیجیے تاکہ میں سلیم صاحب کو بھیج سکوں۔ میں جعفر بلوچ کو کئی خط لکھ چکا ہوں مگر اس مردِ سخن گو پر کلام نرم و نازک کا اثر نہیں ہوتا۔ بلوچ صاحب کے اس ناروا رویے کی وجہ سے انھیں عاق کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ وکیلوں سے مشورے کر رہا ہوں۔

اور سنیے۔ اسلام آباد سے گوہر نوشاہی صاحب کا فون آیا ہے کہ اب رسالہ ''نوادر'' کو وہ مرتب کریں گے۔☆۱۰۷ میں نے انھیں رفاقت علی شاہد کی جانشینی یعنی ترقیِ معکوس پر مبارک باد دی۔ اس کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ گوہر صاحب نے ''نوادر'' کی مجلسِ ادارت میں میرا نام دینے کی اجازت چاہی۔ میں نے معذرت چاہی۔ انھوں نے سبب پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ میں رسوائی اور بدنامی کے حصول میں آبرومندانہ ذرائع استعمال کرتا ہوں۔

آپ نے خط پڑھ لیا۔ اپنی مصروفیات میں سے چند لمحے ضائع کیے، بے حد شکریہ۔ چند لمحے اور ضائع کیجیے اور اس خط کا جواب لکھ دیجیے۔ اگر لکھنے کی فرصت نہ ہو تو آس پاس بیٹھنے والوں میں سے کسی کو املا کرا دیجیے۔ املا کی غلطیاں میں خود درست کر لوں گا۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۵۔۴۔۲۰۰۲

☆

(۸۸)

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

۳۴ روز کا بن باس کاٹ کر اپنے کلبۂ احزاں میں چراغِ افسردہ کی صورت واپس آ گیا ہوں۔ اصل بیماری سے تو نجات مل گئی ہے مگر کمزوری ابھی باقی ہے۔ اس کا تعلق عمر یا اعمال سے نہیں، اُن دواؤں سے ہے جو میں استعمال کرتا رہا۔ کیا زمانہ تھا کہ ہمارے اطبا ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر والوں کو کشتے یعنی مقوی دوائیں کھلایا کرتے تھے اور طبِ مغرب نے مزید کمزور کرنے کی دوائیں کھلانی شروع کر دی ہیں۔

بیماری کے دوران آپ نے ''عبرت الغافلین'' پر کام کرنے کا مژدہ سنایا۔ اس سے میرے

☆۱۰۷ قبلاً اس تحقیقی پرچے کو رفاقت علی شاہد مرتب کرتے تھے۔ پرچے کے مالک مسعود زیدی خلف نظیر حسنین زیدی ہیں۔

صحت یاب ہونے کی راہ آسان ہوگئی۔ اب آپ یہ کام کر ہی ڈالیے ورنہ معین الرحمن سے کہوں گا کہ آپ کے خلاف ایک آدھ اور مضمون لکھ دے، بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود ہی اپنے خلاف مضمون لکھ کر موصوف کو دے دیں۔ آپ کا لکھا ہوا مضمون مدلل اور بامعنی ہوگا۔ موصوف حسب عادت ادھر اُدھر کی ہانکیں گے۔ موصوف کا میری بیماری کے دوران ایک دلچسپ خط موصول ہوا ہے۔ اس کا عکس میں نے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو بھیجا ہے اُن سے لے کر پڑھیے گا۔

سہیل عمر صاحب نے اقبال اکیڈمی کی پول میں مجھے دھانسنے کا پروگرام بنایا ہے۔ کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ۔ میں نے ہر چند انکار کیا لیکن اُن کا اصرار اس لیے غالب آ گیا کہ اُنھوں نے انتخاب کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ ظاہر ہے کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا، یہاں تک کہ آپ سے بھی یہی کہوں گا کہ اپنی مرضی کے مطابق ووٹ دیجیے۔

اگست کے آخر یا ستمبر کے شروع میں لاہور آنے کا پروگرام ہے۔ اگر اقبال ایوارڈ کی میٹنگ ہوئی تو اُن کا مہمان بنوں گا بہ صورتِ دیگر یونی ورسٹی کے دیمک خوردہ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہروں گا۔ گیسٹ ہاؤس کیا کانجی ہاؤس کہیے جہاں آوارہ جانوروں کو بند کیا جاتا ہے۔

ارادہ تھا کہ جون میں آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو کراچی آنے کی دعوت دوں گا لیکن افسوس کہ یہ مہینہ بیماری کی نذر ہوگیا۔ بھابی صاحبہ سے میری طرف سے معذرت کرلیجیے گا۔ آپ سب سے خصوصاً ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے، اس لیے لاہور آنے کا پروگرام بنایا ہے۔

دوسرا خط برادر عزیز جعفر بلوچ صاحب کے لیے ہے۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۲۔۷۔۲۰۰۲ء

☆

(۸۹)

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

اگرچہ فون پر آپ سے بات ہو چکی ہے مگر شکریے کا خط لکھنا بھی واجب ہے۔ لاہور میں آپ کی وجہ سے میرا قیام اتنا خوش گوار تھا کہ کراچی واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اب یہاں آیا ہوں تو دل نہیں لگ رہا۔ کاش میں آپ سے پوچھ لیتا کہ دل لگانے کا طریقہ کیا ہے۔ بہ ہر حال اب تو جیسی گزر رہی ہے ویسی ہی گزارنی ہوگی۔

یاد آرہا ہے کہ آپ نے ''ارمغان سید عبداللہ'' کے مضامین کی فہرست مجھے سنائی تھی تو اس میں لطیف اللہ صاحب کے مقالے کا ذکر نہیں تھا۔ یہ مقالہ مشہور صوفی شاعر اور نثر نگار عراقی پر ہے۔ کیا یہ آپ کو نہیں ملا؟ اگر نہیں تو فوراً لکھیے بھیج دوں گا۔ یہ بہت عمدہ مقالہ ہے اور آپ کے ارمغان میں شامل ہونے کے

لائق۔ کیا میں نے ان کا کوئی اور مقالہ تو نہیں بھیجا تھا؟ یہ یاد ہے کہ ایک مقالہ بھیجا ضرور تھا۔☆۱۷۱

ادارۂ یادگارِ غالب کی فہرستِ مطبوعات میں نے آپ کو دی تھی اور کہا تھا جو کتابیں آپ کے پاس نہ ہوں اُن سے مطلع کیجیے، بھجوا دی جائیں گی اور یہ بھی کہا تھا کہ اپنے شعبے کے لیے بھی یہ کتابیں حاصل کیجیے۔ پشاور سے پروفیسر طاہر فاروقی پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ کیا یہ آپ کے پاس ہے؟ میرے پاس اس کے کچھ زائد نسخے ہیں، یہ میں پیش کر سکتا ہوں۔

طاہر مسعود صاحب آج کل اسپتال میں ہیں۔ ان کے پتے کا آپریشن کر کے دو بڑی بڑی پتھریاں نکالی گئی ہیں۔ یہ میں نے دیکھیں تو حیران رہ گیا اور میں نے کہا، یہ پتھر تو اتنے بڑے ہیں، خدا جانے عقل پر پڑنے والے پتھر نکالے جائیں تو وہ کتنے بڑے ہوں گے۔ اگر مناسب سمجھیں تو انھیں مزاج پرسی کا خط لکھ دیجیے گا۔

افسوس ہے کہ میں اب کے درِ دولت پر دستک نہ دے سکا۔ اس کے باوجود آپ نے اتنے تکلف سے کام لیا۔ بیگم آپ کا اور اور آپ کی بیگم صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔

آج کل ہندوستان سے بہت عمدہ کتابیں آ رہی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی دو کتابیں آئی ہیں۔ ایک ''دامانِ باغباں'' اور ایک ''نوائے سروش''۔ پہلی کتاب میں قرۃ العین کے نام ادیبوں کے خطوط ہیں۔ بیش تر خطوط تو بکواس ہیں مگر بعض نہایت دلچسپ خصوصاً جمیلہ ہاشمی کے جن میں بے شمار لوگوں کی برائیاں کی گئی ہیں۔ بعض نام ور ادیبوں نے قرۃ العین کو شرم ناک خط لکھے ہیں جن میں اُن پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی گئی ہے۔ موصوفہ نے ان ''نام ور'' لوگوں کو یہ خطوط شائع کر کے رسوا کر دیا۔ دوسری کتاب (نوائے سروش) قرۃ العین کے انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ یہ مطبوعہ ہیں لیکن محترمہ نے ان پر نظرِ ثانی کر کے خاصی قطع و برید کی ہے۔ پہلا طویل انٹرویو غیر مطبوعہ ہے جو کتاب کے مرتب (جمیل اختر) نے کیا ہے۔ اس انٹرویو کے ہر تیسرے سوال کے جواب میں قرۃ العین نے کہا ہے، یہ احمقانہ سوال ہے، حماقت کی باتیں مجھے پسند نہیں، دلچسپ انٹرویو ہے۔ خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۔۱۱۔۲۰۰۲ء

☆

(۹۰)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ نصیبِ دشمناں آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ خدا کرے کہ میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی آپ پوری طرح صحت یاب ہو چکے ہوں۔

☆۱۷۱۔ پروفیسر لطیف اللہ کا یہ عمدہ مقالہ ''ارمغانِ سید عبداللہ'' میں شامل ہے۔ کتاب اسی برس شائع ہونے کی توقع ہے۔

علامہ علاء الدین صدیقی سے متعلق کتاب مل گئی تھی۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔
میری صحت، خدا کا شکر ہے کہ بہت بہتر ہے۔ صحت کی بہتری کا اس سے اندازہ کیجیے کہ ۲راگست کو میں چند روز کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔

آپ کالجوں کے معائنے کے لیے زمین کا گز بنے رہتے ہیں۔ کیا اسلام آباد کے کالجوں کی زبوں حالی کا علم نہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ان کالجوں کے معائنے کے لیے اسلام آباد آجائیں اور اس بہانے آپ سے ملاقات ہو جائے۔☆۱۷۲

آخر کار حضرت اکرام چغتائی نے اپنی ٹوپی سے کمبل پوش کو نکال ہی ڈالا۔ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ میرے پاس نہیں ہے بلکہ اب تو میرا خیال ہے کہ کمبل پوش کا کمبل بلکہ ''چھوٹے کپڑے'' بھی چغتائی صاحب ہی کے پاس سے برآمد ہوں گے۔ ویسے انھوں نے دیباچے میں آپ کا احترام ملحوظ رکھا ہے۔☆۱۷۳ اب تو آپ خدا کے لیے نہ سہی، اکرام چغتائی کے لیے فارسی متن کا اردو متن سے مقابلہ کر ڈالیے۔ لیجیے اس سے مجھے ''عبرت الغافلین'' یاد آگئی۔ کسی نے بتایا تھا کہ آپ اس کا فارسی متن تیار کر رہے ہیں، اس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی ہوگا اور یہ کام آپ کو دو سال پہلے مکمل کر لینا چاہیے تھا مگر آپ اس انتظار میں ہیں کہ اس کام کو کوئی دوسرا شائع کرنے کا ارادہ کرے تو پھر آپ جلدی جلدی اپنا کام کریں گے۔ کاش کوئی اہلِ بصیرت اس کام میں آپ کا ہاتھ بٹا سکے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

جلدی سے اپنی صحت یابی کا مژدہ سنایئے کہ آپ کی صحت ہی دراصل میری صحت ہے۔

آج کل یہاں دو ہندوستانی ادیب وارد ہیں۔ ڈاکٹر نبی ہادی (بیدل اور مغلوں کے ملک الشعرا والے) اور مظفر حنفی، دونوں تشریف لائے تھے۔ مفصل ملاقاتیں رہیں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۶۔۴۔۲۰۰۴ء

☆

(۹۱)

۷۸۶

بھائی صاحب، سلام مسنون

آپ کہاں ہیں، خط لکھتے ہیں نہ خط کا جواب دیتے ہیں۔ آخر ایسی بھی کیا بے اعتنائی! اس ماہ ۱۹ر کو میں نے زندگی کے ۶۹ر سال پورے کر لیے۔ یقین نہیں آتا کہ میں اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں۔ آدمی

☆۱۷۲۔ اگست میں خواجہ صاحب جب کمال فن ایوارڈ کی میٹنگ میں جو مقتدرہ کے زیر اہتمام ہوئی تھی، آئے تو میں اسلام آباد ایئر پورٹ پر ان کی پذیرائی کے لیے موجود تھا۔ یہ چند دن ان کے ساتھ بڑے یادگار تھے۔ کیا خبر تھی کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔

☆۱۷۳۔ اکرام چغتائی صاحب نے ''تاریخ یوسفی'' (سفرنامہ کمبل پوش معروف بہ ''عجائبات فرنگ'') جون ۲۰۰۴ء میں شائع کردی۔ یہ نسخہ دہلی کالج کے مطبع العلوم سے طبع شدہ ۱۸۴۷ء کے نسخے پر مبنی ہے۔

بڑھاپا تو اُس وقت ہوتا ہے جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھے تو یہ کہے — شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم۔ اور یہاں حال ہے کہ سوائے عمر کے رائگاں جانے کے احساس کے، کچھ حاصلِ عمر نہیں ہے۔ بس چند دوستوں کی محبتیں ہیں جو پوری زندگی کا حاصل ہیں۔ اب انھی محبتوں کے سہارے بسر ہو رہی ہے۔

آج کل کراچی میں بڑی رونق ہے، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر انور معظم اور جیلانی بانو یہاں موجود ہیں۔ کل ''نگار'' کا جلسہ ہے۔ اُس میں شرکت کے لیے ڈاکٹر سلیم اختر بھی آ رہے ہیں۔ آپ بھی آ جاتے تو اچھا ہوتا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اب اصل غرض بیان کرتا ہوں۔ آپ نے محمد امین زبیری کے خطوں کی نقلیں ارسال کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو وعدہ وفا کیجیے۔

''بازیافت'' کے جو زائد شمارے آپ نے بھیجے تھے اُن میں سے دو میں نے امریکا بھجوا دیے۔ ایک ڈاکٹر داؤد رہبر، کے لیے اور دوسرا عبدالوہاب خان سلیم صاحب کے لیے — داؤد رہبر پر یاد آیا، ان کی دو کتابیں (۱) ''تسلیمات'' اور (۲) ''سلام و پیام''، جلد دوم، حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ آپ کی نظر سے گزریں؟ ظالم کیا عمدہ نثر لکھتا ہے۔

وسط جنوری میں مقتدرہ کی مجلسِ نظما میں شرکت کا دعوت نامہ آیا ہے۔ مگر اتنی سردی میں اسلام آباد جانے کی ہمت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ موسم بہار میں لاہور آؤں گا۔☆۱۷۴

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۶ر دسمبر ۲۰۰۳ء☆۱۷۵

☆☆☆

☆۱۷۴۔ افسوس صد افسوس کہ موسم بہار کی آمد سے پہلے ہی خواجہ صاحب رخصت ہو گئے اور اپنے دوستوں اور نیاز مندوں کو ہمیشہ کے لیے سوگوار چھوڑ گئے۔ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔

☆۱۷۵۔ شاید خواجہ صاحب کا میرے نام یہ دوسرا خط ہے جس میں تاریخ تحریر نہیں۔ میں نے قیاساً ۲۶ر دسمبر ۲۰۰۳ء لکھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی تاریخ ولادت ۱۹ر دسمبر ہے جس کا زیرِ نظر خط میں ذکر ہے۔ خط پر کراچی کے ڈاک خانے کی مہر ۲۷ر کی ہے۔ اس لیے گمان یہی ہے کہ یہ خط کم سے کم ایک دن پہلے لکھا گیا ہوگا۔

بنام محمد حمزہ فاروقی

تمہید

برسوں بعد میں جب مشفق خواجہ صاحب کے خطوط مرتب کرنے لگا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی ماہر نفسیات کے عمل تنویم نے مجھے ماضی میں سفر کرنے پر مجبور کردیا ہو۔ اس دور کی تلخ و شیریں یادوں کا کارواں نظر کے سامنے گزرنے لگا اور یہ باور کرنا محال ہوگیا کہ خواجہ صاحب جیسا مخلص، شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان اس دنیا میں نہیں رہا۔

خواجہ صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، ان میں رند مشرب بھی تھے اور متقی و صالح امیدوار بھی۔ وہ اپنے ان ساتھیوں، جن میں علم و ادب کے "جراثیم" تھے، میں علمی خدمت کی جوت جگاتے اور انھیں کام کرنے کی راہیں سُجھاتے۔ وہ خود بھی جاہ و منصب اور نمود و نمائش سے بے نیاز رہے اور دوستوں سے بھی ادب کی بے لوث خدمت کے خواہاں رہے۔

زیرِ نظر خطوط سے خواجہ صاحب کی شخصیت کے بہت سے دل آویز پہلو نمایاں ہیں، مثلاً وضع داری، دوست داری، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور شگفتگی ہر ہر سطر سے نمایاں تھی۔ ان کے خیالات میں کہیں ابہام نہ تھا۔ اندازِ تحریر مکالماتی تھا۔ ان خطوط سے ان کی علمی پیاس نمایاں تھی۔ علمی و ادبی منصوبے اور اشاعتی پروگرام کا احوال بھی ان میں ملتا ہے۔ اپنے موضوع سے متعلق مخطوط یا کتاب کے حصول کے لیے مضطرب رہتے اور یہ اضطراب اس وقت تک برقرار رہتا جب تک وہ شے مختلف مراحل سے گزر کر ان تک نہ پہنچتی۔

جن شخصیات مثلاً ممتاز حسن، بشیر احمد ڈار اور خواجہ عبدالوحید (والد) سے انھیں تعلق خاطر تھا، ان کی بابت پُرخلوص جذبات کا اظہار ان خطوں سے ہوتا ہے۔ ان کے علمی ارتقا کے آئینہ دار بھی ایک حد تک یہ مکاتیب ہیں۔

آپ خط کا جواب فوراً دیتے تھے لیکن پاکستان کے ڈاک کے ناقص نظام کی بدولت ان کے بہت سے خط ضائع ہوگئے۔ آخر اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ ناظم آباد سے صدر آتے اور اپنے سامنے

ان خطوں کو "مہر زدہ" کروانے کے بعد گھر لوٹتے۔

زیرِ نظر خطوط اس دور میں لکھے گئے جب راقم اسکول برائے علومِ شرقی و افریقی (SOAS) میں ایم اے اسٹڈیز جنوبی ایشیا کا طالب علم تھا۔ خطوط کا دورانیہ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے مارچ ۱۹۸۰ء تک پھیلا ہوا تھا۔ میں بعض نجی معاملات میں ان کے مشوروں اور علمی مسائل میں معاونت کا طالب رہا۔ خواجہ صاحب کے پرخلوص مشورے اور علمی تعاون میرے بہت کام آیا۔

☆

(۱)

برادرِ مکرم و محترم حمزہ صاحب، سلامِ مسنون

یکے بعد دیگرے آپ کے دو خط ملے، اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اتنی دور رہ کر بھی آپ نے مجھے یاد رکھا، یہ میری خوش بختی اور آپ کی خوش صفاتی ہے۔ جب سے آپ گئے ہیں، میں اپنے گھر کی سیڑھیوں سے نیچے نہیں اُترا۔ باہر کی دنیا سے میرا تعلق آپ کے ذریعے تھا۔ یہ تعلق گو عارضی طور پر ختم ہوگیا ہے لیکن میں گزرے ہوئے اچھے دنوں کی یاد میں آنے والے اچھے دنوں کا انتظار کروں گا، جب آپ دوبارہ یہاں تشریف لائیں گے۔ آپ نے جس عظیم مقصد کے لیے یہ بن باس گوارا کیا ہے، اس کے پیشِ نظر میری دعا ہے کہ خدا آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔

مکان کے سلسلے میں آپ کی پریشانیوں کی تفصیل پڑھ کر تشویش ہوئی۔ میری دعا ہے کہ اب تک آپ کو مکان مل چکا ہو۔ میں اس قسم کی مشکلات کے پیشِ نظر آپ کو مشورہ دیتا تھا کہ وقتِ مقررہ سے کم از کم ایک مہینہ پہلے آپ کو لندن پہنچ جانا چاہیے۔

اب آپ پچھلی باتوں کو ذہن سے نکال دیجیے۔ آپ کے ساتھ جس نے بھی بُرا سلوک کیا ہے، اسے معاف کر دیجیے۔ ماضی کی تلخ یادوں کو اپنے ذہن و قلب سے دور رکھیے۔ آئندہ کی فکر کیجیے۔ علمی ترقی ہر قسم کی ذہنی پریشانی سے چھٹکارا حاصل کیے بغیر نہیں ہوسکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لندن میں اپنا وقت بالکل ضائع نہیں کریں گے۔ یاد رکھیے ہر گزرا ہوا لمحہ ہی انسان کا اصل نامۂ اعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ لمحہ بے کار گزرا ہے تو نامۂ اعمال پر ایک سیاہ نقطے کا اضافہ ہو جائے گا۔

میں ایک اور معاملے میں بھی آپ کو مشورہ دوں گا۔ دوست بنانے کے سلسلے میں آپ قدرے غیر محتاط رہیں۔ دوستی کی بنیاد ہمیشہ فکری و ذہنی ہونی چاہیے۔ محض وقت گزاری کے لیے دوستی کے دامن کو وسیع کرنا زندگی کے دامن کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ اب تک آپ ہر اس شخص کی طرف

دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہے ہیں جو آپ کے ساتھ چند لمحے گزار سکے، اسی لیے آپ کو ایسے لوگ ملتے رہے جو مخلص نہیں تھے۔ لندن میں آپ اس روش کو ترک کر دیجیے گا۔ کسی کو دوست بنانے یا سمجھنے سے پہلے یہ دیکھ لیجیے گا کہ وہ ذہنی سطح پر دوستی نبھا سکتا ہے یا نہیں۔ معاف کیجیے گا کہ میں اکثر ناصح مشفق بن جاتا ہوں لیکن کیا کروں، میں آپ کا بہی خواہ ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ آپ زندگی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیں اور اس طرح زندگی نہ گزاریں جس طرح عام لوگ گزارتے ہیں۔

کالم نویسی کا شغل جاری ہے لیکن اب میں اس سے گھبرا گیا ہوں، کیوں کہ اس میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ اب تک کے کالم آپ کو بھجوانے کی کوشش کروں گا۔☆☆۱

سفرنامے کی کاپیاں جوڑی جارہی ہیں۔ یہ کام ان شاء اللہ اس مہینے کے آخر تک مکمل ہوجائے گا۔ پھر طباعت و جلد سازی کا مرحلہ ہے جو بہت جلد طے ہوگا۔ اس سلسلے میں جو تاخیر ہوئی، مجھے اس کا افسوس ہے لیکن موجودہ حالات میں یہ تاخیر ناگزیر تھی۔☆☆۲

مولانا مہر کے سلسلے میں کام جاری رکھیے۔ جس قدر جلد ممکن ہو مسودہ بھیج دیجیے تاکہ میں اس کام کو آگے بڑھا سکوں۔

انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں جانے کا اتفاق ہوا یا نہیں؟ آپ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہر ہفتے پابندی سے خط لکھتے رہیے۔ اپنے تجربات و مشاہدات کو تفصیل سے قلم بند کیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۸/اکتوبر ۱۹۷۷ء

☆☆

(۲)

برادرِ مکرم و محترم، سلامِ مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۶/نومبر ابھی ابھی ملا ہے۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ میں نے ۳۰/اکتوبر کو ایک عریضہ ارسال کیا تھا، امید ہے وہ اب تک مل چکا ہوگا۔☆☆۳

آپ نے اپنے گرامی نامے میں شکایت کی ہے کہ میں خط کا جواب نہیں دیتا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کو خط لکھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں ان خوش گوار لمحوں کو یاد کرتا ہوں، بلکہ ان میں پھر کھو جاتا ہوں جو آپ کے ساتھ گزرے تھے۔ اس صورتِ حال کی ساری ذمہ داری ڈاک پر ہے۔ ادھر سے میں خط لکھتا ہوں، وہ ابھی آپ تک پہنچتا نہیں ہے کہ آپ مجھے خط لکھ دیتے ہیں۔ اس خرابی کا حل

☆☆۱۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب روزنامہ "جسارت" میں سیاسی اور ادبی کالم لکھتے تھے۔
☆☆۲۔ "زمان و مکاں اور بھی ہیں" مارچ ۱۹۷۸ء میں عصری مطبوعات کراچی سے شائع ہوئی تھی۔
☆☆۳۔ یہ خط ڈاک میں ضائع ہوگیا۔

میں نے یہ تلاش کیا ہے کہ آئندہ میں آپ کو ہر مہینے کی ۵، ۱۵ اور ۲۵ر کو خط لکھا کروں گا۔ یہ سوچے بغیر کہ آپ کے خط کا جواب واجب ہے یا نہیں، ان تین تاریخوں میں لازماً خط لکھوں گا لیکن آپ پابند نہیں ہوں گے۔ آپ زیادہ سے زیادہ اور طویل سے طویل خط لکھتے رہیے۔ اب تک جو خط آپ نے لکھے ہیں، وہ نہایت مختصر ہیں۔ نیز ان میں دل چسپ باتیں نہیں ہیں جو میں سننے کا متمنی ہوں۔

پچھلے تین دن آپ کی کتابوں کی صفائی میں صرف ہوئے☆۴ ایک آدمی بھی بلا لیا تھا۔ افسوس کہ بیش تر کتابوں کو کیڑا لگا ہوا ہے اور بعض کو تو بے حد نقصان پہنچا ہے۔ ان کی وجہ سے میری کتابیں بھی متاثر ہوئی ہیں۔ آپ کی متعدد کتابوں کی جلدیں الگ کرنی پڑی ہیں۔ ان کتابوں کا یہ حال ہے تو اُن کی حالت کیا ہوگی جو آپ کے گھر پر ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنے گھر والوں کو ہدایت کر دیں کہ وہ کتابوں کی صفائی باقاعدگی سے کرتے رہیں۔ کراچی کی ہوا کتابوں کے لیے بہت ناسازگار ہے۔ اگر کتابیں بغیر استعمال کے یا بغیر صفائی کے پڑی رہیں تو کیڑوں کی غذا بن جاتی ہیں۔ بہر حال مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر رہا ہوں۔

آپ کی کتاب کی کاپیاں جوڑی جا چکی ہیں۔ اب چند روز ان کی چیکنگ میں صرف ہوں گے۔ اس کے بعد یہ پریس بھیج دی جائیں گی۔ میں اس سلسلے میں حتی الامکان عجلت سے کام لے رہا ہوں لیکن کام اتنا زیادہ ہے کہ وقت صرف ہو رہا ہے۔ بہ ہر حال آپ مطمئن رہیں، دیر آید درست آید والا معاملہ ہے۔

میں آپ کے ارشاد کے مطابق "سفرنامہ اقبال"☆۵ کے چند نسخے بحری ڈاک سے بھیج چکا ہوں۔ یہ آپ کو ملیں تو اطلاع دیجیے گا۔ میرے پچھلے خط میں بہت سی باتیں جواب طلب تھیں۔ توجہ فرمایئے۔

کالم ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، مگر اب اس میں دل نہیں لگ رہا کیوں کہ میرے دوسرے کام متاثر ہوتے ہیں۔ سوچا ہے کہ دسمبر کے آخر تک لکھوں گا، پھر معذرت کر لوں گا۔

یہ خط رجسٹری سے بھیج رہا ہوں، تاکہ آپ کو لازماً مل جائے۔ باقی باتیں پھر کروں گا، ورنہ ڈاک کا وقت نکل جائے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۰ر نومبر ۱۹۷۷ء

☆

(۳)

یارِ مہرباں، تسلیمات

ڈاک کا نظام اتنا خراب ہے کہ میرے خط آپ کو دیر سے ملتے ہیں یا ملتے ہی نہیں اور آپ

☆۴۔ انگلستان آنے سے پیش تر میں نے اپنی اہم کتابیں خواجہ صاحب کے ہاں رکھوا دی تھیں۔

☆۵۔ "سفرنامہ اقبال" اشاعت اوّل ۱۹۷۳ء، مکتبہ معیار، کراچی

یہ سمجھتے ہیں کہ میں خط نہیں بھیجتا۔ حالاں کہ سب کام چھوڑ کر آپ کو خط لکھتا ہوں۔ ایک مرتبہ احتیاطاً آپ کو رجسٹری سے خط لکھا، وہ آپ کو ڈیڑھ مہینے بعد ملا۔ ڈاک کے نظام میں جو معشوقانہ خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان کی وضاحت کے لیے ایک دستاویزی ثبوت بھیج رہا ہوں۔ اس خط کے ساتھ آپ ایک تراشا ملاحظہ کریں گے۔ یہ آپ کے ایک لفافے کا ہے۔ آپ نے ۱۶/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو جو خط لکھا تھا، وہ مجھے جنوری کے مہینے میں ملا ہے۔ اس تراشے پر دو مہریں ہیں۔ ایک لندن کی ۱۷/اکتوبر ۱۹۷۷ء کی اور دوسری کراچی ۱۰/جنوری ۱۹۷۸ء کی۔ کراچی کی مہر پر ۱۰/اور ۱۹۷۸ء واضح ہیں بہ جنوری کا لفظ نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ جنوری کے بعد کا مہینہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ثبوت اس لیے پیش کیا ہے تاکہ آپ کو یقین آسکے کہ ڈاک کے نظام میں ہمارے سیاسی نظام سے زیادہ گڑبڑ ہے۔ آپ یہ خیال کبھی دل میں نہ لائیں کہ آپ کے معاملے میں کوتاہیِ قلم سے کام لوں گا۔ جب میں آپ کے ساتھ گھنٹوں باتوں میں مصروف رہ سکتا ہوں تو کیا خط لکھنے کے لیے چند منٹ نہیں نکال سکتا اور پھر یہ میرا اخلاقی فرض بھی ہے۔ ایک دوست جو ہزاروں میل دور خود عائد کردہ قیدِ تنہائی کاٹ رہا ہو، اس کی مزاج پرسی میں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔

سفرنامے کا قصہ یہ ہے کہ خدا خدا کر کے چھپ گیا ہے۔ آج کل نصابی کتابوں کی طباعت کا زور ہے۔ اوّل تو کوئی پریس کتاب لینے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ ایک راضی ہوا اور پندرہ دن کے وعدے پر لیکن اس نے پورا مہینہ لگا دیا۔ کل ہی طباعت مکمل ہوئی ہے اور کتاب جلد ساز کے ہاں پہنچ گئی ہے۔ ٹائٹل کا بلاک بنوالیا ہے۔ جلد ساز چند روز میں ڈمی کاپی دے گا اور اس کے مطابق ٹائٹل چھپ جائے گا۔ اس دوران میں جلد سازی بھی مکمل ہوجائے گی اور اس طرح میں ایک فرض سے سبک دوش ہوجاؤں گا۔ ایک کاپی آپ کو فوراً ہوائی ڈاک سے بھیج دوں گا اور باقی سمندری ڈاک سے۔ ہوائی ڈاک سے زیادہ کاپیاں اس لیے نہ بھیجوں گا کہ ایک کاپی پر ڈاک کا خرچ تقریباً پچیس روپے آتا ہے۔

ان شاء اللہ کتاب چھپتے ہی اس پر تبصرے بھی کروا دوں گا۔ آپ پردیس میں ہوں گے اور آپ کی دھوم یہاں ہوگی۔ اس کام پر جو وقت صرف ہوا ہے، وہ میرے اندازے سے بہت زیادہ ہے۔ بہ ہر حال آپ کی خوشی مقصود تھی اس لیے میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے۔

اب سوچ رہا ہوں کہ مولانا مہر والا کام بھی منظرِ عام پر آجائے تو بہت اچھا ہو۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟ آپ نے کہا تھا کہ آپ لندن میں اس موضوع پر کام کریں گے۔ کیا آپ اب بھی اپنے ارادے پر قائم ہیں یا میں ہی موجودہ مسودے کی نظرِ ثانی کر ڈالوں۔[☆٦]

آپ نے اپنے گرامی نامے مورخہ ۱۶/اکتوبر میں ایک سفرنامے کا ذکر کیا ہے جو لاہور کے ایک شخص نے تبت کی سیاحت کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کتاب کی مجھے شدید ضرورت ہے۔ اگر آپ اپنی پہلی فرصت میں بھجوا سکیں تو کرم ہوگا۔ اگر یہ کتاب دستیاب نہ ہو تو کم از کم اس کے اُردو متن کا فوٹو

☆٦۔ ''نقوشِ مہر'' بعض موانع کے سبب شائع نہ ہوسکی۔

اور سرورق کی نقل بھجوا دیجیے۔ مگر بہت جلد۔

میرا ایک یہ کام بھی کیجیے کہ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم والوں سے معلوم کیجیے کہ اگر کسی مخطوطے کا فوٹو منگوایا جائے تو کیا خرچ ہوگا۔ نیز مائیکروفلم پر کیا لاگت آئے گی؟

ابنِ انشا کا انتقال میرے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ ۲۸ برس کے تعلقات تھے۔ یہ شخص طرح دار یہاں سے ہنستا بولتا گیا تھا اور وہاں سے لکڑی کے صندوق میں بند ''کارگو'' کی صورت میں آیا۔ خدا مغفرت کرے۔ بہت اچھا آدمی تھا۔

ایک اور سانحہ بھی ہوا کہ پروفیسر محمد حسن عسکری کا انتقال ہوگیا۔ بڑے ادیب ہی نہیں بڑے آدمی بھی تھے۔ اسلامیہ کالج میں یہ میرے استاد تھے۔ گو میں نے ان کی کلاس میں کبھی شرکت نہیں کی لیکن ان کی تحریروں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ تین برس تک روزانہ ان سے سلام دعا ہوتی تھی۔

آپ اکثر یاد آتے ہیں۔ جب کبھی شام کے وقت میں اداس ہوتا ہوں تو آپ کا خیال ذہن میں آجاتا ہے۔ آپ کے دل کش قہقہے فضا میں گونجنے لگتے ہیں۔ ۱۹ر دسمبر کو خاص طور پر بہت یاد آئے۔ ۱۹۷۶ء میں یہ پورا دن آپ کے ساتھ گزارا تھا۔ یہ دن اس لیے بھی یاد رہا کہ یہ میرا یومِ پیدائش تھا۔

میرا کالم نویسی کا سلسلہ جاری ہے، البتہ یہ تبدیلی عمل میں آئی ہے کہ اب ہفتے میں صرف ایک بار لکھتا ہوں۔ اس سے زیادہ لکھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔☆[۷]

اقبال کے صد سالہ یومِ پیدائش پر یہاں بہت کچھ ہوا مگر کوئی کام کی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ یار لوگوں نے محض روپیا کمانے کی خاطر پرانی شراب نئی بوتلوں میں پیش کردی ہے۔

آپ کے چچا جان کے انتقال کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ سفرنامے کی طباعت پر اخراجات اندازے سے کہیں زیادہ آئے ہیں۔ کاغذ تو خیر پہلے کا موجود تھا، صرف طباعت، جلد سازی اور ٹائٹل وغیرہ پر سات ہزار اٹھ گئے لیکن مجھے اس کا خیال نہیں۔ آپ کی خوش نودی کی خاطر مجھے سب کچھ منظور ہے۔

میں سوچ رہا ہوں کہ اگر کوئی ناشر مل جائے تو سفرنامۂ اقبال☆[۸] کا دوسرا ایڈیشن چھپوا دیا جائے۔ آپ کو اگر فرصت ملے تو اس پر نظرِ ثانی کرڈالیے۔

آپ اپنے خطوط میں ذرا تفصیل سے کام لیا کیجیے۔ جس جس سے ملاقات ہوا کرے اس کا ذکر کیا کیجیے۔ ذرا یہ بتائیے کن کن نئے دوستوں سے دوستی ہوئی ہے۔ ہر ایک (کا) مفصل تعارف کرائیے۔ کیا کبھی رالف رسل سے ملاقات ہوئی ہے؟ اگر ہو تو میرا سلام کہیے گا اور ان سے یہ بھی کہیے گا کہ مولوی عبدالحق سے اپنی ملاقاتوں کی روداد لکھ دیں، یا پھر آپ ان سے پوچھ کر یہ روداد قلم بند کرلیجیے

☆۷۔ چند سطریں حذف کردیں۔

☆۸۔ ''سفرنامۂ اقبال'' کا دوسرا ایڈیشن ترامیم اور اضافوں کے بعد ۱۹۸۹ء میں ''مکتبۂ اسلوب'' کراچی سے شائع ہوا تھا۔

گا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے اعزازی لائبریرین Simon Digby ہیں۔ بڑے دل چسپ آدمی ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان آئے تھے، ان سے میری ملاقاتیں رہی تھیں۔ ان سے آپ ضرور ملیے۔ میرا سلام کہیے گا۔

پاکستانیوں میں سے کس کس سے ملاقات ہوئی ہے؟ اگر آپ کو فرصت ملے تو ایک مضمون لکھیے ''ابنِ انشا کے آخری ایام'' ۔ اس سلسلے میں پاکستانی سفارت خانے اور بی بی سی والوں سے آپ کو بہت مدد مل سکتی ہے۔

دیکھیے میں نے کتنا طویل خط لکھ ڈالا۔ اس وقت میں یہی تصور کر رہا ہوں کہ آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں اور میں باتیں کر رہا ہوں۔

ابھی کچھ دیر پہلے والد صاحب قبلہ سے مل کر آ رہا ہوں۔ آپ کا سلام انھیں پہنچا دیا ہے۔ وہ دعا کہہ رہے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۸ر جنوری ۱۹۷۸ء

اور ہاں اگر کوئی ''خاص'' آدمی دوست بنا ہو تو اس کا حال لکھیے اور ہو سکے تو اس کی تصویر بھی بھیجیے تاکہ آپ کے ذوقِ نظر کی داد دے سکوں۔

☆

(۴)

برادر مکرم و محترم، سلام مسنون

آپ کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ ان میں سے ایک محبت نامہ تھا اور دوسرا قیامت نامہ۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے پہلے محبت نامہ کھول لیا، ورنہ کہیں دوسرا لفافہ پہلے کھول لیتا تو پھر پہلا لفافہ کھولنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ بندہ پرور! اس بندۂ ناچیز پر ایسا بھی کیا ظلم۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں۔ میں تو سارے کام چھوڑ کر آپ کو خط لکھتا ہوں۔ اگر آپ پردیس میں ہیں تو میری حالت آپ سے زیادہ قابلِ رحم ہے کہ میں وطن میں غریب الوطن ہوں۔ جہاں کوئی ہم سخن اور ہم زبان نہ ہو، وہاں آدمی غریب الوطن ہی ہوتا ہے۔ میری وطنیت آپ کے دم سے تھی۔ آپ میرے ہم سخن تھے، ہم زبان تھے۔ آپ کے سوا کسی سے میل جول نہ تھا۔ اب آپ کو خط لکھتا ہوں تو یہ تصور کر لیتا ہوں کہ آپ سامنے بیٹھے ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر کبھی میرا خط نہ ملے تو سمجھ لیجیے کہ خطا میری نہیں ڈاک والوں کی ہے۔ ہائے اگلے زمانے میں کیا عمدہ ڈاک کا نظام تھا، ہر منزل پر تازہ دم گھوڑے کھڑے رہتے تھے۔ پچھلی منزل کا ہرکارہ اگلی منزل کے ہرکارے کو خطوں کا پشتارہ تھما دیتا اور اس طرح خط ایک منزل سے دوسری منزل تک ہوتا ہوا منزلِ آخر تک پہنچ جاتا تھا۔ نہ ٹکٹ لگانے کا اور نہ ٹکٹ پر مہر لگوانے کا

کھڑاگ، نہ خط گم ہوجانے کا خطرہ۔ اب یہ حال ہے کہ دس روپے رکشے پر آنے جانے کے صرف کرو، تین روپے کا ٹکٹ لگاؤ اور پھر بھی یقین نہیں ہوتا کہ خط مکتوب الیہ تک ضرور پہنچے گا۔

آپ کا قیامت نامہ یعنی خفگی نامہ پڑھ کر دل کانپ اٹھا۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے یہاں خفگی کا کم سے کم اظہار طلاق و عاق سے ہوتا ہے۔ گو آپ مجھے طلاق دے سکتے ہیں نہ عاق کر سکتے ہیں لیکن یہ تو لکھ سکتے ہیں:

میں یہاں پر علمی حلقوں میں آپ کی دوستی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہوں اور ادھر آپ نے خطوں کا جواب نہ دینے کی قسم کھا رکھی ہے۔

میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کے غصے میں بھی محبت کا رنگ ہوتا ہے لیکن حمزہ تو جب تھا کہ آپ مہ وشوں کے حلقے میں بھی میرا ڈھنڈورا پیٹتے۔ بہ ہرحال آپ وعدہ کیجیے کہ میرا خط نہ ملنے کی صورت میں آپ یہ ہرگز تصور نہیں کریں گے کہ میں کوتاہیِ قلم کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

اچھا اب دوسری باتیں سنیے۔

آپ کا سفرنامہ ابھی تک جلد ساز کی تحویل میں ہے۔ اس نے حتمی وعدہ ۲۰ رفروری کا کیا ہے۔ ٹائیٹل بھی چھپ رہا ہے۔ چار رنگوں کا ہے۔ اس کے لیے بہترین قسم کا آرٹ پیپر خرید کر پریس پہنچایا جا چکا ہے۔ کتاب ہر حالت میں آئندہ ہفتے تک مکمل ہوجائے گی۔ میں اس کے چھ نسخے اجمل صاحب کو بھیج دوں گا۔ ایک ان کے لیے اور پانچ آپ کے لیے۔ یہ کہوں گا کہ پانچوں نسخے ہوائی ڈاک سے آپ کو بھیج دیے جائیں۔ مزید نسخوں کی ضرورت ہو تو لکھیے گا۔

معین الدین عقیل صاحب اور کشفی صاحبان کی کتابوں کا ایک ایک نسخہ اجمل صاحب کو پہنچا دیا ہے۔ امید ہے یہ دونوں کتابیں جلد ہی آپ کو مل جائیں گی۔☆۹

اب ذرا فرصت ملے گی تو مولانا مہر سے متعلق آپ کی کتاب کو ''ٹھکانے'' لگانے کی کوشش کروں گا۔

میں نے اس مہینے سے کالم نگاری چھوڑ دی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کام میں ذہنی طور پر اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ دوسرا کوئی کام کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کی خاطر میں اپنے اصل کاموں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اگرچہ اخبار والوں کا بے حد اصرار ہے کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھوں لیکن میرے لیے ممکن نہیں۔

صباح الدین عبدالرحمن صاحب ۷ رفروری کو یہاں سے واپس اپنے وطن چلے گئے۔ ۴ر اور ۶ رفروری کو ان سے دو طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ ان کے گھر پر اور دوسری مرتبہ ☆ راشدی

☆۹۔ ''اردو شاعری کا تہذیبی و سیاسی پس منظر'' از ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ'' از ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ یہ ان حضرات کے ڈاکٹریٹ کے مقالے تھے۔

صاحب کے مکان پر۔ دونوں مرتبہ آپ بہت یاد آئے۔ گفتگو کچھ اتنی زیادہ علمی تھی کہ بار ہا آپ کے اخلاقی و غیر اخلاقی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۱۰ر فروری کو ڈاکٹر معین الدین عقیل کی شادی تھی۔ سہرا باندھ کر وہ ایسے نادم نظر آرہے تھے کہ جیسے دولھا نہ ہوں نادم سیتا پوری ہوں۔ پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ خدا جانے ان پر یا فریقِ ثانی پر یا دونوں پر کیا گزری۔ ڈاکٹر عقیل کی شادی میں نہ جانے پنجابی کی وہ رباعی یاد آتی رہی جس کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے زمانے کے صوفی جب نعرہ مارتے تھے تو سننے والے بے ہوش ہوجاتے تھے، آج کل کے صوفی خود ہی نعرہ مارتے ہیں اور خود ہی بے ہوش ہوجاتے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب سے ایک دن غالب لائبریری میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا ذکرِ خیر رہا، جانے سے پہلے ایک دن آئے تھے اور مجھے عزیز بھٹی پارک لے گئے تھے۔ وہ بھی میری طرح آپ کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ ان کا پتا یہ ہے:

۲/۱۳-A ۳ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸۔

آپ فی الحال اتنا تو کر سکتے ہیں کہ "سفر نامہ اقبال" کی کتابت کی غلطیوں کی نشان دہی کردیں اور ہاں آپ شاید یہ چاہتے تھے کہ فلسطین[۱۰] سے متعلق جو مضمون آپ نے لکھا تھا، وہ بھی اس میں شامل ہوجائے۔ یہ باتیں میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر کبھی جی میں آیا تو اس کتاب کو دوبارہ چھپوانے کی کوشش کروں گا۔

رالف رسل صاحب سے میرا اسلام کہیے گا۔[۱۱] وہ کراچی آئے تھے تو ان سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ ازراہِ کرم انجمن تشریف لائے تھے۔ بابائے اُردو سے متعلق ان کی گفتگو ضرور "نوار بند" کرلیجیے۔ آپ نے "ٹیپ بند" لکھا ہے، ایران میں اس کے لیے "نوار بند" کی اصطلاح رائج ہے۔ نوار وہی لفظ ہے جو پنجابی میں "نواڑ" کہلاتا ہے۔ وہ سفید پٹی جس سے پلنگ کا متن بنا جاتا ہے (دیکھیے لفظ متن کا یہ کتنا عمدہ استعمال ہے)۔

آپ کے موضوع سے متعلق ایک کتاب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے بھی لکھی ہے۔ افسوس کہ یہ یہاں نہیں ملتی ورنہ یہ بھی اجمل صاحب کو بھجوا دیتا۔ اس کا نام ہے "اُردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر"۔ یہ برٹش میوزیم میں ضرور ہوگی۔ آپ وہاں محمود صاحب سے ملیے۔ وہ ضرور آپ کی مدد کریں گے، بہت اچھے آدمی ہیں۔[۱۲]

☆۱۰۔ "اقبال اور مسئلہ فلسطین"۔ "اقبال ریویو"۔ جولائی ۱۹۶۹ء۔

☆۱۱۔ خواجہ صاحب کو رالف رسل کے بارے میں بہت خوش گمانی تھی۔

☆۱۲۔ قاضی محمود الحق اس وقت برٹش میوزیم لائبریری کے شعبۂ ترقی کے نگران تھے۔ حد درجہ بے فیض اور احساس کمتری کے مریض تھے۔

☆۱۳۔ سید معین الدین شاہ۔

ایس ایم شاہ صاحب☆۱۳ سے میرا سلام کہہ دیجیے۔ انھوں نے ایک کتاب کا عکس بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔ دو تین سال سے یہ وعدہ وہ نبھائے چلے جارہے تھے، اب یہ کتاب مجھے مل گئی ہے۔ انھوں نے خود تو وعدہ پورا نہیں کیا لیکن ان کی دعاؤں کے طفیل میرا کام ہوگیا۔ ان کا پی ایچ ڈی کا کام کس مرحلے پر ہے؟

لاہور کے ایک شخص نے تبت کا جو سفرنامہ لکھا تھا، وہ اپنی اوّلین فرصت میں بھجوا دیجیے۔ اگر کتاب دستیاب نہ ہو تو اس کا فوٹو اسٹیٹ بھجوا دیجیے بلکہ یہی صورت بہتر ہوگی کیوں کہ فوٹو اسٹیٹ سستا ہوتا ہے اور لندن میں تو اور بھی سستا پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں یہ سفرنامہ بھیجنے کی کوشش کریں گے۔ ریڈیو کے کام کے لیے اس کی ضرورت ہے۔

آپ کے بھیجے ہوئے چند خوب صورت تصویری کارڈ مل گئے۔ مگر میں آپ کے کیمرے کی کھینچی ہوئی تصویریں دیکھنے کا مشتاق ہوں۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ آپ کا سلام انھیں پہنچا دیا تھا، وہ دعا لکھواتے ہیں۔

جب بھی سوسائٹی جاتے ہوئے شہید ملت روڈ سے گزرتا ہوں اور کل پارک کی طرف جانے والی سڑک پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار آپ یاد آجاتے ہیں۔ ایک روز گلشن اقبال جاتے ہوئے سبزی منڈی کے پاس سے گزرا تو بھی آپ یاد آگئے۔ اس شہر کے کئی راستوں پر آپ کی یادیں بچھی ہوئی ہیں۔ آپ اکثر یاد آتے ہیں اور میں یہ سوچ کر اداس ہو جاتا ہوں کہ آپ مجھ سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ اطمینان بھی رہتا ہے کہ آپ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے وہاں گئے ہیں۔

آپ کا دوسرا سفرنامہ☆۱۴ کس مرحلے میں ہے۔ اس کو بھی لکھ ڈالیے، ورنہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا بہت سی تفصیلات ذہن سے محو ہوتی جائیں گی۔

اچھا اب اجازت دیجیے۔ شام کے چھ بج رہے ہیں۔ اس خط کو پوسٹ کرنے کے لیے میٹرو پول کے ڈاک خانے جاؤں گا۔ دیکھیے اس ڈاک خانے کے نام پر بھی آپ یاد آگئے۔ ڈاک خانے کے ساتھ ہی وہ ہوٹل شالیمار تھا جہاں ہم گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۵ر فروری ۱۹۷۸ء

☆

(۵)

برادر مکرم و محترم، سلام مسنون

کل آپ کا ۱۷ر فروری کا خط ملا تھا اور آج ۲۲ر فروری کا۔ اس سے پہلے میں تین خط لکھ چکا

☆۱۴۔ "سفر آشوب" ۱۹۸۷ء میں مکتبۂ اسلوب کراچی سے شائع ہوئی۔

ہوں جو ۱۰، ۱۵ اور ۲۸ فروری کو لکھے گئے تھے۔ خیال ہے کہ میرے خط اب تک آپ کو مل چکے ہوں گے۔

آپ کا ۲۲ فروری کا خط پڑھ کر مجھے دکھ ہوا☆۱۵ اگر اس خط کو لکھنے کے بعد آپ دوبارہ پڑھتے تو شاید آپ اسے پوسٹ نہ کرتے۔ آپ ہی انصاف کیجیے کہ ایک خط ۱۷ کو پوسٹ کرتے ہیں اور صرف چار دن کے بعد آپ ۲۲ فروری کو دوسرا خط لکھ دیتے ہیں کہ میرے خط کا جواب نہیں آیا۔ چار دن تو آپ کا خط مجھ تک پہنچنے کے لیے بھی ناکافی ہیں۔ پھر بھلا میرا جواب آپ کو کیسے مل سکتا ہے؟

بہ ہر حال آپ کچھ کریں۔ ترک مراسلت کریں یا ترک مراسم، اپنا کام تو محبت کرنا اور کیے جانا ہے۔ میں اس حمزہ فاروقی کو کبھی نہیں بھول سکتا جس کے ساتھ میرا بہت سا وقت گزرا ہے۔

آپ کی کتاب کی طباعت مکمل ہو چکی ہے۔ چھ نسخے اجمل صاحب کو بھجوا دیے ہیں۔ ان میں سے پانچ وہ آپ کو بھیج دیں گے۔ مزید نسخوں کی ضرورت ہو تو وہ بھی بھیج دوں گا۔ میرا خیال تھا کہ اس موقعے پر آپ کی طرف سے جو خط آئے گا اسے پڑھ کر میں خوش ہوں گا لیکن افسوس کہ جو خط آیا ہے، اس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کے تصنیفی و تالیفی کاموں میں "ناخواندہ مہمان" بننے کی کوشش کی۔

ہر حال میری دعا ہے کہ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اگر کسی دوست کی دل آزاری سے آپ کو خوشی ملتی ہے تو خدا اس کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے۔

مجھے معلوم نہیں کہ آپ آئندہ خط لکھیں گے یا نہیں، لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی جو محبت ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ میں حسبِ سابق آپ کی صحت و شادمانی اور ترقی و کامیابی کے لیے دعاگو رہوں گا۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ ۲ مارچ ۱۹۷۸ء

☆

(۶)

برادرِ مکرم و محترم، سلامِ مسنون

گرامی نامہ ملا، اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ اب آپ مجھ سے خوش ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب کسی معاملے میں آپ کا کوئی اعتبار نہیں۔ آپ کا مزاج بھی آسمان کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ کاش آپ کی طبیعت میں زمین کا سا دھیما پن ہوتا جو گردش میں بھی رہتی ہے اور کسی کو اس کی گردش کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ بہ ہر حال

☆۱۵۔ مجھے اپنی کتاب کا شدت سے انتظار تھا۔ عالمِ اضطراب میں، میں نے جو خط لکھا وہ خواجہ صاحب کی دل آزاری کا موجب بنا۔

جو ہوا سو ہوا، آئندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگایئے کہ آپ کم از کم ایک آدمی کو یعنی راقم الحروف کو خوش رکھیں گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آزما کر دیکھ لیجیے۔

خدا کا شکر ہے کتاب آپ کو پسند آئی۔ یہاں بھی اسے پسند کیا گیا ہے۔ دو تین اخباروں میں تبصرے آچکے ہیں اور اس مہینے میں کئی اور تبصرے آجائیں گے۔ یہ سب میں آپ کو بھجوا دوں گا۔ میرا دیباچہ بھی لوگوں نے پسند کیا ہے۔ ''آہنگ'' والوں نے تو اسے چھاپ بھی دیا ہے۔ میں نے آپ کی خواہش پر دیباچہ لکھا تھا، آپ کو پسند آیا تو یہی میری محنت کا صلہ ہے۔

کتاب یہاں کے تمام اہم ادیبوں کو بھیجی گئی ہے۔ ہندوستان کے بھی کئی لوگوں کو روانہ کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں لوگوں کے جو تاثرات ہوں گے ان سے بھی آپ کو مطلع کروں گا۔

میں نے اجمل صاحب کو کتاب کے (۲۱) نسخے بھیجے تھے۔ انھیں فون کر دوں گا کہ وہ آپ کو مزید ۱۵ نسخے بھیج دیں۔ انھیں ضرورت ہوگی تو اور دے دوں گا۔ ہاں غالب کا شعر ''گلزار میں آوے'' اسی طرح درست ہے جس طرح کتاب میں چھپا ہے۔ آپ کے مسودے میں غلط تھا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے کتاب کے سلسلے میں دوستوں کو دعوت دی اور اس میں انگریز لڑکیاں بھی شریک ہوئیں۔ یہ لڑکیاں آپ کی دعوتوں ہی میں شریک ہوتی ہیں یا غموں میں بھی شرکت کرتی ہیں۔

میں بھی یہاں آپ کی طرف سے دوستوں کو دعوت دینے کی سوچ رہا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ لڑکیاں کہاں سے آئیں گی؟ چلیے لڑکیوں اور آپ کے بغیر ہی سہی۔ جب غائبانہ نماز جنازہ ہو سکتی ہے تو غائبانہ دعوت کیوں نہیں ہو سکتی۔

کیا آپ لندن کے کتب فروشوں کی دکانوں پر جاتے ہیں۔ اگر آپ کی عنایت سے کتابوں کی فہرستیں مل جایا کریں تو بہت اچھا ہو۔ کتابیں نہیں تو کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۶/اپریل ۱۹۷۸ء

☆

(۷)

برادر مکرم و محترم، سلام مسنون۔

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۳/اپریل چند روز قبل مل گیا تھا۔ جواب میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ لاہور سے ایک دوست آگئے تھے، وہ میرے ہی مہمان تھے، لہٰذا سارا وقت مہمان نوازی میں گزرا۔ آج صبح

وہ روانہ ہوئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اس تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ محترم اجمل صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی۔ مولانا مہر سے متعلق تمام کاغذات میں انھیں بھیج دوں گا اور وہ ان کے فوٹو اسٹیٹ بنوا کر آپ کو ارسال کر دیں گے۔ انھوں نے کتاب کے مزید دس نسخے طلب فرمائے ہیں، وہ بھی بھیج دوں گا۔ کتاب پر تبصرے اب تک تین آئے ہیں، ''جنگ''، ''جسارت'' اور ''مساوات'' میں۔ مزید تبصرے عنقریب شائع ہوں گے۔ یہ سب ایک ساتھ بھیج دوں گا۔ ویسے یہ کتاب پاکستان اور ہندوستان کے متعدد اہل قلم کو بھیجی گئی ہے تاکہ ادبی حلقوں میں اس کا تعارف ہو جائے۔ وقار احمد رضوی اور منیر فاروقی کو بھی ایک ایک نسخہ دے دیا ہے، محض آپ کی یاد دلانے کے لیے۔ ڈاکٹر ریاض الحسن سے فون پر آپ کے متعلق گفتگو ہوئی تھی۔ آپ کا ذکر بہت محبت اور شفقت سے کر رہے تھے۔ ان کے لیے بھی ایک نسخہ ایک صاحب کو دے دیا ہے کہ پہنچا دیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا دیباچہ آپ کے دوستوں نے پسند کیا۔ اس کا افسوس ہے کہ مکمل دیباچہ شاملِ کتاب نہ ہو سکا۔ ایک صفحے کی خاطر ایک پوری کاپی بڑھانی پڑتی۔ اخراجات خواہ مخواہ بڑھتے۔ کل میں نے ہندوستان کے ایک رسالے میں آپ کی کتاب ''سفرنامۂ اقبال'' کا اشتہار پڑھا، معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب وہاں کے کسی ناشر نے چھاپ لی ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی کتاب اہل ہندوستان کے لیے بھی مفید ہے۔ وہاں کے علمی حلقوں میں آپ کا نام کسی حد تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اب اس کتاب سے مزید تعارف ہو جائے گا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ غالب کا شعر اسی صورت میں درست ہے جس صورت میں آپ کی کتاب کے ص ۱۲۹ پر چھپا ہے۔ ''قدِ دل کش'' غالب نے نہیں لکھا، یہ آپ کی اختراع ہے۔ دیوانِ غالب دیکھ لیجیے اس میں ''قدِ دلجو'' ہی ہے۔

آپ کی کتاب کے سلسلے میں جو تقریب ہوئی تھی اس کی تصویریں ضرور بھیجیے[☆☆۱۹] میں ان تصویروں کو دیکھ کر سمجھوں گا کہ میں بھی وہاں حاضر تھا۔ رالف رسل صاحب کا مشورہ صائب ہے۔ آپ کو مولانا مہر پر کام ضرور کرنا چاہیے وہاں آپ کو ان کی تمام کتابیں مل جائیں گی۔

والد صاحب قبلہ آپ کی خیریت اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔ وہ آپ کو دعا لکھواتے ہیں۔ آپ کا سلام میں باقاعدگی سے ان تک پہنچا دیتا ہوں۔

میں حسبِ معمول اپنے کاموں میں مصروف ہوں۔ کالم نگاری میں نے چھوڑ دی تھی لیکن ان لوگوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ جن دو مہینوں میں کالم نگاری نہیں کی ان کی تنخواہ بھی زبردستی دے گئے۔ آخر مجبور ہو کر ہفتے میں ایک دن لکھنے کی ہامی بھری ہے۔ اب تک تین کالم چھپ چکے ہیں، چوتھا کل چھپے گا۔

آج کل یہاں سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ خدا کرے آپ خوش و خرم اور صحت یاب ہوں۔

☆☆۱۹۔ کتاب ملنے پر میں نے لندن کے [illegible] ریستوران میں اپنے ساتھیوں اور اساتذہ کی دعوت کی تھی۔

ایس ایم شاہ صاحب کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے۔

آپ کی خیریت کا طالب
مشفق خواجہ ۲۸ راپریل ۱۹۷۸ء

☆

(۸)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

ابھی ابھی آپ کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ جی خوش ہوا کہ آپ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں۔ خدا آپ کو یہاں اور وہاں دونوں جگہ خوش رکھے (یہاں سے مراد پاکستان اور وہاں سے انگلستان)۔

آپ یاد آتے ہیں اور اکثر یاد آتے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی طارق نے ''بزی بی ہوٹل'' کے پیچھے فلیٹ لے لیا ہے، اس لیے اب اکثر اس طرف جانا ہوتا ہے تو ہوٹل پر نظر پڑتے ہی آپ یاد آجاتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی یادوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آپ یہاں تھے تو دنیا سے میرا رابطہ قائم تھا اور اب تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ترکِ دنیا کی منزل کے بعد ترکِ ترک کے مرحلے سے گزر رہا ہوں۔

آپ کے بارے میں ''جسارت'' میں جو خبر چھپی تھی، اس کا تراشہ بھیج رہا ہوں۔ انٹرویو ابھی نہیں چھپا۔ جلد ہی چھپ جائے گا اور فوراً بھجوا دوں گا۔

سلیم الدین قریشی صاحب سے آپ کی رشتہ داری کی خبر سن کر کم از کم مجھے تو خوشی ہوئی۔ ان صاحب کے مضامین جو ''کتاب'' میں چھپتے رہتے ہیں، میری نظر سے گزرتے ہیں۔ یہ مفید کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے آپ کو انڈیا آفس کے جو کیٹلاگ دکھائے تھے، ان کے نام اور قیمتیں لکھ بھیجیے پھر فیصلہ کروں گا کہ کون سا خریدنا چاہیے۔

قریشی صاحب سے یہ بھی معلوم کیجیے کہ بلوم ہارٹ کا اُردو مخطوطات کا جو کیٹلاگ ۱۹۲۶ء میں چھپا تھا، اس کے بعد بھی کوئی کیٹلاگ اُردو کا چھپا کہ نہیں۔ اگر نہیں تو کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ جن مخطوطات کا حوالہ مذکورہ کیٹلاگ میں نہیں ہے، ان کے نام کیا ہیں؟ کیا ان کی کوئی hand list موجود ہے؟

حیرت ہے کہ قریشی صاحب نے بوڈلین لائبریری کے ایک مخطوطے کا عکس حاصل کر کے دینے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔ انگلستان کی لائبریریاں تو اس سلسلے میں عام لوگوں سے تعاون کرتی ہیں اور قریشی صاحب تو اس میدان کے خاص الخاص آدمی ہیں۔ یہ بہر حال اس مخطوطے کی وجہ سے میرا کام رُکا ہوا

☆۱۵۱۔ کسی مخطوطے کی عکسی نقل کا حصول اس قدر آسان نہ تھا اس مقصد کے لیے میں نے براہِ راست بوڈلین لائبریری کو خط لکھا تھا۔

ہے۔ اگر ادبی کاموں کے کرنے سے ثواب اور نہ کرنے سے گناہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ آپ میرے کام میں تاخیر کر کے خواہ مخواہ گناہ گار ہو رہے ہیں۔ ہمت کرم آپ قریشی صاحب کے مشورے سے بوڈلین لائبریری والوں کو ایک خط لکھ بھیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ڈاک سے آپ کو فوٹو اسٹیٹ بھیج دیں گے۔[☆۱۷]

اس وقت تک میری کتاب کے ۹۴۴ صفحات چھپ چکے ہیں۔ باقی تین سو بھی چند روز میں چھپ جائیں گے اور پھر میں آپ کی خدمت میں سب سے پہلے یہ کتاب روانہ کروں گا۔

پرسوں مولانا عبدالعزیز میمن کا انتقال ہوگیا، یہ علمی دنیا کا بہت بڑا نقصان ہے، خدا مغفرت کرے۔

کل غالب لائبریری میں ممتاز حسن مرحوم کی برسی پر ایک جلسہ ہوا۔ آپ بہت یاد آئے۔ ساتھ ہی وہ سب ملاقاتیں بھی یاد آئیں جن میں آپ بھی شریک تھے۔ ممتاز حسن صاحب جیسے لوگ ہمارے معاشرے میں کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ واقعی عظیم انسان تھے۔ میں نے ایسا علم دوست اور انسان دوست انسان دوسرا نہیں دیکھا۔ میری مرتبہ کتاب ''اقبال از احمد دین'' انجمن کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ اس کا انتساب میں نے ممتاز حسن صاحب ہی کے نام کیا ہے اور کسی کا یہ شعر لکھا ہے:

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

کل ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے مذکورہ جلسے میں ممتاز حسن مرحوم کے بارے میں ایک مختصر لیکن اچھا مضمون پڑھا تھا۔ جلسے کے بعد آپ کا ذکر کرتے رہے۔ خیریت پوچھتے رہے۔ تبصرے کا وعدہ میں نے یاد دلایا۔ انھوں نے فرمایا کہ جلد ہی لکھ دیں گے۔

سعید صاحب کے نام کا خط انھیں پوسٹ کر دیا ہے۔ باقی سب لوگ خیریت سے ہیں۔ اظہر حقی صاحب آئندہ مہینے میں والد بن جائیں گے۔ کبھی کتابوں کی دکان پر جانا ہو تو دیکھیے گا کہ پیپر بیک میں کسی کی کوئی autobiography شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ مجھے دل چسپی ایسے لوگوں کی خود نوشتوں سے ہے جو ہندوستان سے متعلق رہے ہوں، لیکن یہ فرصت کا کام ہے۔ جب بھی آپ کو فرصت ہو تو۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں۔ شام کو جاؤں گا اور آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ اگر مولانا حسن مثنیٰ صاحب ابھی تک وہاں موجود ہوں تو میرا سلام کہیے۔[☆۱۸]

آپ کا
مشفق خواجہ ۲۹/ اکتوبر ۱۹۷۸ء

☆۱۸۔ مولانا حسن مثنیٰ ندوی معتمر عالم الاسلامی کے نمائندے کی حیثیت سے مفتی ضیاء الدین بابا خانوف کی دعوت پر روس گئے تھے۔ وہاں آپ نے تاشقند، سمرقند، بخارا، مجرپہ خواجہ، لینن گراڈ اور ماسکو کا دورہ کیا تھا اور اکتوبر ۱۹۷۸ء میں لندن تشریف لائے۔ آپ نے ڈاکٹر خالد حسن قادری کے ہاں قیام کیا تھا۔

ضروری

آپ نے جو تصویریں دی تھیں، وہ اچھی نہیں ہیں۔ ایک اچھی تصویر جو چکنے کاغذ پر ہو تو بھیجیے تاکہ تصویر چھپے تو لوگوں پر رعب پڑے۔

☆

(۹)

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اپنے مقالے کی تدوین میں شب و روز مشغول ہیں۔ آپ کو ایسے ہی کاموں میں مشغول رہنا چاہیے اور یہی آپ کی زندگی کا مقصد ہے۔

ایک تشویش ناک خبر یہ ہے کہ جناب بشیر احمد ڈار شدید بیمار ہیں۔ تین روز ہوئے ان کے صاحب زادے کا فون آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ دو مہینے سے ڈار صاحب نے لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑ رکھا ہے اس لیے کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ ایکسرے میں پھیپھڑے پر ایک دھبا سا نظر آیا ہے جس کی بنا پر کینسر یا ٹی بی کا خدشہ ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ ڈار صاحب کا دم غنیمت ہے۔ دعا کیجیے کہ وہ صحت یاب ہو جائیں اور تادیر سلامت رہ کر علم کی خدمت کریں۔ میں نے جب سے ڈار صاحب کی تشویش ناک حالت کی خبر سنی ہے، طبیعت سخت بے چین ہے۔ آپ ڈار صاحب کو مزاج پرسی کا خط ضرور لکھیے۔ ان کا پتا یہ ہے: ۳۳۵، شاد باغ، لاہور۔

آپ کو جس مخطوطے کے عکس کے لیے کہا تھا، اس کی شدید ضرورت ہے۔ اس کے بغیر میرا کام رکا ہوا ہے۔ جس طرح بھی ہو اسے حاصل کیجیے۔ آپ نے لکھا ہے کہ نومبر کے آخر تک آپ کے مقالے کا کام ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ مذکورہ عکس کی فراہمی پر توجہ دیجیے۔ یہ اتنا آسان کام ہے کہ آپ جیسے مستعد اور فعال انسان کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس علمی کام میں تعاون کر کے ثواب حاصل کریں گے اور یہ بھی یاد رہے کہ علمی کاموں میں تاخیر کا سبب بننے کا گناہ ہوتا ہے۔ خدا آپ کو اس گناہ سے محفوظ رکھے۔

آپ کا انٹرویو میں کب کا لکھ کر انھیں دے چکا ہوں مگر اخبار والوں کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ اکثر یاد کراتا رہتا ہوں۔ اب توقع ہے کہ جلد چھپ جائے گا۔

میرا کیمرا خوب کام کر رہا ہے۔ یہ شوق بہت مہنگا ہے اس لیے کم تصویریں اتاری ہیں لیکن بہت اچھی۔

سب لوگ خیریت سے ہیں۔ والد صاحب قبلہ آپ کو سلام لکھواتے ہیں۔ آپ کی بھابی بھی سلام لکھوا رہی ہیں۔

خدا کرے آپ ہر طرح سے خیریت سے ہوں۔

میری کتاب کس کس کو دے دی؟ مولانا حسن مثنیٰ کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۶ر نومبر ۱۹۷۸ء

☆

(۱۰)

برادرِ عزیز مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ یکم دسمبر آج ہی موصول ہوا ہے۔ اتنی تاخیر شاید محرم کی تعطیلات کی وجہ سے ہوئی ہے، میں بھی گزشتہ ماہ کی آخری تاریخوں میں ایک عریضہ لکھ چکا ہوں، جو امید ہے مل چکا ہوگا۔

خوشی کی بات ہے کہ بوڈلین لائبریری کو جو آپ نے خط لکھا تھا، اس کا جواب آ ہی گیا۔ آپ نے حساب لکھا ہے، وہ میرے ناقص خیال میں درست نہیں ہے۔ خط میں لکھا ہے کہ سلور پرنٹ کا نرخ 16P برائے ایک پرنٹ ہے۔ مخطوطے کے جو فولیو مجھے درکار ہیں ان کی تعداد ۴۸ ہے۔ فولیو دو صفحوں کا ہوتا ہے اور عام طور پر ایک پرنٹ میں دو صفحے آتے ہیں۔ اگر ایک پرنٹ میں ایک ہی صفحہ مانا جائے تب بھی اجرت ۹۶×۱۶=۱۵۳۶ پینس ہوتی ہے۔ اب آپ اس کے پونڈ خود ہی بنا لیجیے۔ میرے حساب سے تو کل خرچ کسی طرح بھی سات پونڈ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر ایک پرنٹ میں دو صفحے آ گئے تو اجرت ساڑھے تین پونڈ ہوگی۔ بہر حال آپ اس سلسلے میں مزید تحقیق فرمالیں۔[☆۱۹]

سلور پرنٹ چوں کہ سستا ہے اس لیے مجھے یہی حاصل کرنا ہے۔ آپ اسی کے حاصل کرنے کے لیے لائبریری کو لکھ دیجیے۔

ایک مرتبہ پھر آپ یہ بات جان لیجیے کہ مخطوطے کے جو صفحات نمبر لکھے ہیں، مجھے اس کے مطابق صرف ۴۸ اوراق کی ضرورت ہے۔ شاید آپ نے پورے مخطوطے کا حساب لگا لیا ہے۔ اب ایک چھوٹی سی گزارش ہے۔ آپ کی طرف میرے چھ سو روپے واجب ہیں۔ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ میں یہ رقم یہاں ادا نہیں کر سکتا، لندن سے آپ کو مطلوبہ چیز یا چیزیں اسی رقم کے برابر بھیج دوں گا۔ میں نے عرض کیا تھا، ٹھیک ہے۔ مجھے بعض کتابوں یا فوٹو اسٹیٹ کی ضرورت ہوگی، اس میں رقم منہا ہو جائے گی۔ اب آپ فرما رہے ہیں کہ میں فوٹو اسٹیٹ کی اجرت کا انتظام کر دوں۔ اس سادگی کی داد میں ہی دے سکتا ہوں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

اب کے تو آپ کو جو زحمت دی ہے سو دی ہے، آئندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں، حالاں کہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک بہت ضروری کتاب منگوانی ہے، اس کے لیے آپ کو لکھوں گا لیکن

☆۱۹۔ خواجہ صاحب کے ذہن میں پرانے زمانے کے پونڈ کا تصور تھا، جب ۱۲ پینس کا ایک شلنگ اور ۲۰ شلنگ کا پونڈ ہوتا تھا۔ اعشاری نظام رائج ہونے کے بعد پرانے سکے رفتہ رفتہ متروک ہو گئے اور نئے ۱۰۰ پینس کے پونڈ کا رواج عام ہو گیا تھا۔

اب ہمت نہیں پڑتی۔

بہ ہر حال جس طرح بھی ممکن ہو، مذکورہ مخطوطے کا سلور پرنٹ حاصل کر کے مجھے ایئر میل سے پوسٹ کردیجیے۔ اگر آپ کو اس پر بھی اصرار ہو تو میں جملہ اخراجات یہاں پر آپ کے بہنوئی صاحب کو ادا کردوں گا۔ چوں کہ میری ضرورت شدید ہے اور میرا کام رُکا ہوا ہے اس لیے میں مذکورہ سلور پرنٹ حاصل کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ اگر ان تمام وضاحتوں کے باوجود آپ کی مالی حالت اجازت نہ دیتی ہو تو ازراہِ کرم بہ واپسی ڈاک مطلع فرمایئے، میں کوئی اور انتظام کرنے کی کوشش کروں گا۔[☆۲۰]

اور سنایئے کیا حالات ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یکم جنوری سے قبل آپ مقالہ مکمل کر لیں گے۔ مجھے امید ہے یہ مقالہ ہر اعتبار سے معیاری اور آپ کے شایانِ شان ہوگا۔[☆۲۱]

لندن میں خوب سردی پڑ رہی تھی اور یہاں سردی آئی ہی نہیں۔ دن بھر گرمی رہتی ہے اور رات کو قدرے خنکی ہوجاتی ہے۔

پچھلے خط میں، میں نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ جناب بشیر احمد ڈار صاحب شدید بیمار ہیں۔

والد صاحب قبلہ خیریت سے ہیں اور سلام لکھواتے ہیں۔ باقی باتیں سابقہ خط اور اس خط کا جواب آنے پر لکھوں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۸ء

☆

(11)

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کا تازہ ترین خط مکتوبہ ۲۱ر مارچ کل شام کو ملا تھا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرا ۱۹ر فروری کا خط آپ کو کل ایک مہینے بعد ملا۔ شاید اس کا سبب یہ ہوگا کہ آپ چوں کہ سفر میں تھے، اس لیے یہ خط آپ کے ہوسٹل کے دفتر میں پڑا رہا ہوگا۔

اس سے پہلے آپ کے تین خط ملے تھے۔ دو آپ نے اسپین سے لکھے تھے اور ایک مراکش سے۔ یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ نے سفر میں بھی مجھے یاد رکھا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو دنیا کے

☆۲۰۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۷۸ء کو میں نے ۱۷ پونڈ کا چیک بوڈلین لائبریری کے نام بھیج دیا تھا اور انھوں نے ۸ر فروری ۱۹۷۹ء کو مخطوطے کی عکسی نقل براہِ راست خواجہ صاحب کو ہوائی ڈاک کے ذریعے بھیج دی۔

☆۲۱۔ مقالہ ۳۱ر جنوری ۱۹۷۹ء کو مکمل ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ Socio Political Aspects of Urdu Literature during 1857 and its Aftermaths اور یہ "ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان" کے جرنل کی تین اشاعتوں میں جنوری، اپریل اور اکتوبر کی تین اقساط میں شائع ہوا تھا۔

مختلف خطوں کی سیاحت کا موقع ملتا ہے اور میں خوش قسمت ہوں کہ آپ کے سفر کی روداد سے محظوظ ہوتا ہوں۔ یہ خطوط اگرچہ مختصر تھے لیکن ایک مسافر سے اس سے زیادہ طویل خطوں کا طالب ہونا مناسب نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اپنی ڈائری میں زیادہ تفصیل سے کام لیا ہوگا۔ خدا نے چاہا تو حسب سابق اس ڈائری سے لطف اندوز ہونے کا موقع ضرور ملے گا۔

''دیوانِ قدرت'' کے عکس کے لیے ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس عکس پر جو مصارف ہوئے ہیں ان کا خیال کر کے دل کانپ اٹھتا ہے۔ اتنی رقم اگر مصنفِ دیوان کو اس کی زندگی میں مل جاتی تو اس کا سال دو سال کا خرچ آسانی سے نکل آتا۔ میں نے سنا تھا کہ لندن میں عکس کا خرچ دو چار پینس فی صفحہ ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔''

میری کتاب جو لاہور میں چھپ رہی تھی، اس کی طباعت نومبر ۱۹۷۸ء کے وسط میں مکمل ہوگئی تھی۔ اس وقت سے اب تک جلد سازی کا کام ہو رہا ہے۔ ہمارے اداروں میں اسی طرح سست رفتاری سے کام ہوتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اداروں میں کام کرنے والے اہلیت وصلاحیت کی بجائے سفارش کے ذریعے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ بہرحال جس وقت بھی کتاب ملی، آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے سلیم الدین قریشی صاحب سے کہہ دیا کہ وہ اپنے کیٹلاگ کا ایک نسخہ مجھے بھیج دیں۔ میں اس کے لیے چشم براہ رہوں گا۔

میری دوسری کتاب ''اقبال'' از احمد دین، انجمن ترقیِ اُردو کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ کے شروع میں طباعت مکمل ہو جائے گی تو آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔

آپ کی کتاب ''زمان و مکان'' پر فی الحال تو تبصرے کرا رہا ہوں۔ نفیس اکیڈیمی سے کوئی معاملہ طے نہیں ہوا۔ کتاب چوں کہ ان کے پریس میں چھپی ہے، لہٰذا تبصرے میں انھیں کا نام دے دیا ہے۔ انھوں نے فی الحال دس نسخے فروخت اور واپسی کے اصول پر لیے ہیں۔ کتاب کی فروخت مایوس کن ہے۔ سبب یہ ہے کہ یہاں ڈائجسٹ وغیرہ زیادہ بکتے ہیں۔ میں نے تو اپنی کتاب کی فروخت سے مایوس ہو کر اس کا بڑا حصہ لائبریریوں اور اہلِ علم میں تقسیم کر دیا ہے۔ آپ کی کتاب پر ایک اور تبصرہ شائع ہوا ہے، بھیج رہا ہوں۔

سابقہ فلموں میں سے دو تین تصویریں صحیح نکلی ہیں۔ ان میں ایک آپ کی ہے، بھیج رہا ہوں۔ میرا فوٹو گرافی کا شوق عروج پر ہے۔ آپ کا نتیجہ کب آرہا ہے؟ آج کل کیا شغل ہے؟ مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی خدمت میں سلام پیش کر دیجیے۔ والد صاحب قبلہ لاہور تشریف لے گئے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ احتیاطاً یہ خط رجسٹری سے بھیج رہا ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۳ر اپریل ۱۹۷۹ء

☆

(۱۲)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے دلی دکھ ہو رہا ہے کہ میرے اور آپ کے مہربان جناب بشیر احمد ڈار اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ۲۹ر مارچ کو صبح ساڑھے دس بجے کے قریب انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ افسوس صد افسوس کہ ایک مخلص اور انسان دوست شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ گئی۔ ان جیسا دوسرا صاحبِ علم و قلم کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ڈار صاحب جیسا ممتاز اہلِ علم انتقال کر جائے اور اخباروں میں دو سطری خبر بھی شائع نہ ہو۔ مجھے ان کے انتقال کی اطلاع کل ہی ایس ایم میر صاحب نے فون پر دی ہے۔ ڈار صاحب اکتوبر میں بیمار پڑے تھے۔ چھ مہینے کے اندر اندر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مرض کینسر کا تشخیص ہوا تھا۔ سنا ہے آخری زمانے میں مختلف دوائیوں کا ردِعمل خراب ہوا۔ ذہن بھی متاثر ہوگیا تھا۔ بستر سے اُٹھ کر باہر جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس وجہ سے کئی مرتبہ شدید جسمانی چوٹیں بھی آئیں۔ آپ مرحوم کی بیگم صاحبہ کو تعزیت کا خط لکھ دیجیے۔ پتا وہی ہے جس پر آپ نے ڈار صاحب کو خط لکھا تھا۔

اگر آپ ڈار صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا حال قلم بند فرما دیں تو میں اسے یہاں کے کسی اخبار یا رسالے میں چھپوا دوں گا۔ محمد عبداللہ قریشی صاحب کو بھی میں نے مضمون لکھنے کے لیے کہا ہے۔

مولانا مہر سے متعلق اپنے مضمون کی نقل بھی بھیج دیجیے۔ ان کی برسی پر اسے بھی چھپوا دوں گا۔

اب اس سے زیادہ نہیں لکھا جاتا۔ طبیعت سخت اداس ہے۔ یقین نہیں آتا کہ ڈار صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ آمین

آپ کا
مشفق خواجہ

☆

(۱۳)

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون☆۲۲

آپ کا ۲۹ر جنوری کا گرامی نامہ آج ملا ہے۔

آپ نے والد صاحب کی خیریت پوچھی ہے۔ اس بات نے دل لہولہان کر دیا۔ دسمبر کی ۲۸ر کو وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ہمیں ہمیشہ کے لیے سوگوار چھوڑ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ دسمبر

☆۲۲۔ اس خط پر تاریخ درج نہ تھی۔ ایوگرام پر مہر کی مدد سے تاریخ متعین کی گئی۔

کے شروع میں ان کی طبیعت بہت بہتر ہوگئی تھی اور ہم نے ۳۰ر جنوری کو ان کی سالگرہ بڑے پیمانے پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد سے بہت سے لوگوں کو مدعو کیا۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ ۲۵ر کو ان کی طبیعت بگڑی، ۲۶ر، ۲۷ر کو وہ اسپتال میں رہے اور ۲۷ر، ۲۸ر کی درمیانی شب کو بارہ بج کر آٹھ منٹ پر رحلت فرما گئے۔ میں نے اجمل صاحب سے فون پر عرض کیا تھا کہ آپ کو اطلاع دے دیں۔ اس حادثے نے دل و دماغ کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔

سلیم الدین قریشی صاحب کا کیٹلاگ مجھے نہیں ملا۔ شاید وہاں سے بھیجا ہی نہیں گیا۔ اس کی مجھے جتنی شدید اور فوری ضرورت تھی، اتنی ہی تاخیر ہو رہی ہے۔ اگر آپ اس سلسلے میں فوری توجہ فرما سکیں تو کرم ہوگا۔

مفصل خط میں ان شاء اللہ آپ کا جواب آنے پر لکھوں گا۔ اپنا پتا صاف اور واضح لکھیے۔

خدا کرے آپ مع بھابی صاحبہ کے خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ ۵ر فروری ۱۹۸۰ء

☆

(۱۴)

برادر عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ کا پہلا گرامی نامہ مل گیا تھا جس میں آپ نے والد صاحب مرحوم کی تعزیت کی تھی۔ اس کا جواب میں نے فوراً لکھ دیا تھا۔ غلطی یہی کی کہ پوسٹ کرنے کے لیے ایک چپراسی کو دے دیا۔ اس نے یقیناً ٹکٹ کے پیسے جیب میں رکھے ہوں گے اور خط ضائع کر دیا ہوگا۔ اب یہ خط میں خود پوسٹ کروں گا۔

والد صاحب مرحوم کی دائمی مفارقت نے زندگی کو بے مزہ کر دیا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں کس قدر ان سے وابستہ تھا۔ علمی کاموں میں بھی اسی لیے مزہ آتا تھا کہ ان کی داد ان سے ملتی تھی۔ آپ سے بھی انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ آخری دنوں میں کئی بار آپ کو یاد کیا تھا۔ بیماری کے دوران آپ جب بھی ان سے ملنے کے لیے آئے تھے تو وہ بے حد خوش ہوئے تھے۔ آپ جب لندن سے آنے کے دوسرے ہی دن ان سے ملے تھے تو وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ انھوں نے اکثر لوگوں سے اس کا ذکر کیا تھا کہ حمزہ صاحب کراچی آتے ہی مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ دعا کیجیے کہ خداوند تعالیٰ انھیں درجاتِ عالیہ عطا فرمائے۔

میں ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے فوری طور پر تین کام کر رہا ہوں۔

(۱) ان کے بارے میں ایک مجموعۂ مضامین۔ اس میں ان کے دوستوں اور جاننے والوں کے مضامین ہوں گے۔ آپ بھی اس کے لیے ایک مضمون ضرور لکھیے۔ جو جو باتیں یاد آئیں، قلم بند کر دیجیے۔

(۲) ان کا روزنامچہ مرتب کر رہا ہوں۔ اس میں پچاس سال پہلے کے لاہور کی پوری علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ آ گئی ہے۔

(۳) ان کے نام مشاہیر (ابوالکلام آزاد، اقبال، سید سلیمان ندوی) کے خطوط کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ خط بھی کتابی صورت میں شائع کروں گا۔

آپ سے میں نے عرض کیا تھا کہ میرا ارادہ ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ اس کی صورت نکل آئی ہے۔ آج کل میں اس کام پر خاصا وقت دے رہا ہوں۔ تمام ممتاز اہلِ قلم کا تعاون حاصل ہو گیا ہے۔ اب آپ اس کے پہلے شمارے کے لیے اپنے سفرنامے کا اسپین سے متعلق حصہ جلد از جلد لکھ کر مجھے بھیج دیجیے۔ ضخامت کی آپ پروا نہ کیجیے۔ بس یہ شرط ہے کہ سفرنامہ حسبِ سابق دل چسپ ہونا چاہیے۔[☆۲۳] مجھے امید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں یہ کام انجام دیں گے۔

مولانا مہر سے متعلق کتاب بھی اب آ جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ جتنا کام آپ نے کر لیا ہے، وہی کافی ہے۔ جو کاغذات آپ نے مجھ سے منگوائے تھے، ان پر ایک نظر ڈال کر واپس بھیج دیجیے۔ میں مولانا ابو سلمان صاحب سے اس کی نظرِ ثانی کرا کے شائع کر دوں گا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے کیٹلاگ روانہ کر دیا ہے۔ اصل خوشی اس وقت ہو گی جب یہ ملے گا۔ دو سال سے اس کی آمد آمد کی خبر سن رہا ہوں۔ اتنا انتظار تو میں نے کسی محبوب کا بھی نہیں کیا جتنا اس کا کرنا پڑا۔

اپنی کتابیں میں عنقریب آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ ڈاک سے پہنچنے میں دیر لگے گی۔ میرے ایک جاننے والے لندن جا رہے ہیں، ان کے ہاتھ بھیج دوں گا۔

احباب خیریت سے ہیں۔ جب ملاقات ہوتی ہے آپ کا ذکرِ خیر ضرور آتا ہے۔ آپ نے اپنے حالات تفصیل سے نہیں لکھے۔ آج کل کیا مشاغل ہیں؟ پی ایچ ڈی کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟ امریکا میں کہاں کہاں کی سیر کی اور آئندہ کیا کیا ارادے ہیں؟ ان سب امور سے متعلق تفصیل سے لکھیے۔

آپ اکثر یاد آتے ہیں۔ آپ کا خلوص، آپ کی شفقت، اس زمانے میں ناپید ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس دنیا میں آپ جیسے وسیع القلب انسانوں کا تناسب بڑھ جائے تو یہ دنیا واقعی رہنے کے قابل بن جائے۔

جنوری میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب دوبارہ کراچی آئے تھے، وہ بھی آپ کے خلوص کے

☆۲۳۔ یہ سفرنامہ ۱۹۸۲ء میں "مکتبۂ اسلوب" کراچی نے شائع کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے "آج بھی اس دیس میں" کا مسودہ دیکھنے کے بعد اسے رسالے میں شائع کرنے کی بجائے کتابی شکل میں چھپوانا بہتر سمجھا۔

تہ دل سے قائل ہیں، کل پروفیسر ممتاز حسین آئے تھے، آپ سے ملنے کے شائق تھے۔ اب آپ آئیں گے تو اُن سے ضرور ملیے۔

اچھا اب اجازت دیجیے۔ میری مندرجہ ذیل گزارشات پر عمل کیجیے:

۱۔ اپنے تفصیلی حالات و کوائف لکھیے۔ یعنی یہ کہ کس عالم میں گزر رہی ہے؟

۲۔ والد صاحب قبلہ مرحوم کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند فرما دیجیے۔

۳۔ میرے رسالے کے لیے اسپین کا سفر نامہ تحریر فرما دیجیے، جلد از جلد۔ پہلا شمارہ کتابت ہو رہا ہے۔ یہ تقریباً سات سو صفحات کا ہوگا۔☆۲۴

۴۔ مولانا مہر سے متعلق کام پر توجہ کیجیے۔

خدا کرے آپ اور بیگم صاحبہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۲/ مارچ ۱۹۸۰ء

بھائی جان! اپنا پتا الگ الگ انگریزی حروف میں لکھیے۔ موجودہ صورت میں یہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔

☆☆☆

بنام اصغر عباس

(۱)

محترمی و مکرمی، تسلیمات

جناب مرتضیٰ حسین بلگرامی کے ذریعے گرامی نامہ ملا اور متعدد قیمتی تحفے بھی۔ ان عنایت کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ یہ آپ کی محبت ہے کہ آپ نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ اپنے حسن اخلاص کی بنا پر یاد آتے بھی رہتے ہیں۔ میں نے اس دوران میں ایک آدھ خط آپ کو لکھا تھا، معلوم ہوتا ہے وہ آپ کو نہیں ملا، ورنہ آپ یہ نہ لکھتے کہ خط کتابت ایک عرصے سے موقوف ہے۔ آپ کی کتاب ''سرسید کی تعزیتی تحریریں'' بھی ملی۔ آپ کو خوب موضوع سوجھا اور بڑے سلیقے سے اس کا حق ادا کیا۔ ان منتشر تحریروں کی یک جائی سے سرسید کی انسان دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاصرین سے کس درجہ تعلق خاطر رکھتے تھے اور اُن کی دائمی مفارقت کو کیسی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ شخصیات پر آپ کے حواشی نہایت مفید ہیں۔ بلاشبہ ان کے لکھنے میں آپ نے بڑی محنت کی ہے۔

آپ کی اور احمر لاری صاحب کی کتابیں چھپوانے کی کوشش میں نے کی تھی۔ جس ناشر سے رابطہ قائم کیا تھا، وہ کاروبار بند کر کے امریکا چلا گیا۔ کتابیں نہیں چھپیں مگر ایک نقصان یہ ہو گیا کہ احمر لاری کی کتاب ''حسرت'' کا جو نسخہ میرے پاس تھا، وہ میں نے عکس ہونے کے لیے ناشر کو دیا۔ یہ نسخہ بھی مجھے واپس نہیں ملا۔ اس کتاب کی جب بھی ضرورت پڑتی ہی، غصے میں آ کر ناشر صاحب کے شجرۂ نسب میں دو چار جان داروں کا اضافہ کر دیتا ہوں۔ پچھلے دنوں ایک صاحب دلّی گئے تھے، اُن کے ذریعے مذکورہ کتاب تلاش کروائی تھی مگر کسی کتب فروش کے ہاں نہ ملی۔

ادھر میری بھی ایک کتاب شائع ہوئی ہے ''تحقیق نامہ''۔ یہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ بلگرامی صاحب کے حوالے کر رہا ہوں کہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ ایک کتاب ''سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت'' بھی پیش کر رہا ہوں۔ چوں کہ سرسید آپ کی دل چسپی کا موضوع ہے، اس لیے

یہ کتاب آپ کی نظر سے گزرنی چاہیے۔ شاید آپ اس کتاب کو پسند فرمائیں، یہ میرے ایک دوست ظفر حسن صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔

آپ نے اپنے گرامی نامے میں لکھا ہے کہ سرسیّد کے ابتدائی دس برسوں سے متعلق ایک مضمون آپ بھیج رہے ہیں۔ یہ مضمون مجھے نہیں ملا۔ شاید آپ بھیجنا بھول گئے۔ اب ڈاک سے بھجوا دیجیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی بزمِ اقبال لاہور کے مجلّے سہ ماہی ''اقبال'' کا اردو ادب نمبر شائع کررہے ہیں، یہ مقالہ اُس میں شامل ہوجائے گا۔

ہم دونوں اکثر آپ دونوں کو یاد کرتے ہیں۔ چھ سال پہلے انھی دنوں آپ سے جو ملاقاتیں ہوئی تھیں، اُن کی یادیں ہنوز تازہ ہیں۔ جب بھی ہم اپنے سفرِ ہند کا البم دیکھتے ہیں تو آپ لوگوں سے ''خاموش ملاقات'' بھی ہوجاتی ہے۔ چھ سال پہلے آپ نے یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ آپ کے ایفائے عہد تک زندہ رہنے کا ارادہ ہے۔

ایک چھوٹا سا خوش بو کا تحفہ آمنہ نے بھابی صاحبہ کے لیے دیا ہے، یہ اُنھیں پیش کردیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ۔ ۲۵۔۱۱۔۹۱ء

☆

(۲)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا، چائے کے پیکٹ ملے، آمنہ کے لیے کریم ملی، غالب اور علی گڑھ کے موضوع پر مقالہ ملا۔ اتنی بہت سی عنایات کا لفظوں میں شکریہ اگر ادا ہوسکتا ہو تو آپ ہی میری طرف سے اپنا شکریہ ادا کرلیجیے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرے نامۂ اعمال میں اپنے گناہوں اور آپ کے احسانات کے علاوہ کوئی تیسرا اندراج نہیں ہوگا۔ نامۂ اعمال میں اتنی جگہ ہی نہیں ہوگی کہ کوئی تیسری بات لکھی جاسکے۔ حضرتِ من! میں نے چائے کی تعریف اس لیے نہیں کی تھی کہ آپ اسے حسنِ طلب سمجھ کر لطف و کرم کا دریا بہا دیں۔ جتنی چائے آپ بھیج چکے ہیں، یہ اگلے پانچ برسوں کے لیے کافی ہے۔ اب آپ پانچ برس بعد زحمت فرمایئے گا۔ مضمون بہت اچھا ہے، میں اسے ''غالب'' کے زیرِ ترتیب شمارے میں شامل کررہا ہوں۔ آمنہ، بھابی صاحبہ کا شکریہ ادا کررہی ہیں۔ وہ خود خط لکھتیں مگر گزشتہ چند ماہ سے اُن کی طبیعت خراب ہے۔ بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے۔ ایک مرتبہ تو انھیں اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ اب وہ قدرے بہتر ہیں لیکن کبھی کبھی سر چکرانے لگتا ہے۔ علاج باقاعدگی سے ہورہا ہے مگر آرام وہ اتنا نہیں کرتیں جتنا کہ کرنا چاہیے۔ کریم انھی کو نہیں، مجھے بھی پسند آئی۔ جب وہ استعمال کرتی ہیں تو کمرہ مہکنے لگتا ہے۔ اگرچہ اب ہم دونوں کی عمریں ایسی نہیں ہیں کہ کمرہ مہکے (کریم کی اس تعریف کو بھی آپ حسنِ طلب نہ جانیے)۔

میں "نذرِ حامد" کے لیے ضرور لکھتا مگر یگانہ پر کام آخری مراحل میں ہے۔ اگر کسی اور موضوع پر کام کروں گا تو اس کام کا حرج ہوگا۔ میں کئی برسوں سے یگانہ کا کلام، مضامین اور خطوط مرتب کر رہا ہوں۔ خواہش ہے کہ یہ کام اس سال کے آخر تک مکمل ہو جائے۔ امید ہے آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔

آپ کے پروفیسر ہونے پر مبارک باد کا خط میں نے آپ کے اطلاع دینے سے پہلے آپ کو لکھا تھا۔ افسوس کہ میرا وہ خط آپ کو نہیں ملا۔ جس روز آپ کا تقرر ہوا تھا، اُسی دن ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے مجھے یہ اطلاع دی تھی۔ آپ کا خط بہت بعد میں ملا تھا۔ بہ ہر حال دوبارہ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو وہی جگہ ملی جس پر رشید احمد صدیقی تشریف فرما تھے۔ حق بہ حق دار رسید اسی کو کہتے ہیں۔ میں آپ کی دنیاوی ترقیوں کے ساتھ ساتھ آپ کی علمی و ادبی ترقیوں کے لیے بھی دعا کرتا ہوں۔

حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ علی گڑھ کی سرزمین کے دامن میں کیسے کیسے گہر ہائے آب دار ہیں۔ حکیم صاحب سراپا علم ہیں۔ یہاں ان کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ جو بھی ان سے ملتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ مجھے تو یہ اس لیے اور بھی اچھے لگے کہ آپ کا خط لے کر آئے تھے۔ کل حکیم صاحب میرے ہاں تشریف لا رہے ہیں۔ میں یہ خط اُن کو دوں گا اور گزارش کروں گا کہ وہ جب آپ سے ملیں تو آپ کو میری آنکھوں سے بھی دیکھیں۔

اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں۔ پچھلے تین گھنٹوں سے بجلی غائب ہے۔ مدھم سی ایمرجنسی لائٹ میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خط پر پسینہ ہی نہیں گرا، سگریٹ کی ایک چنگاری بھی گری۔ اوپر ایک جگہ سرخ دائرے میں جو نشان ہے، وہ اسی چنگاری کی یادگار ہے۔ میں آپ کی دل چسپی کی کچھ کتابیں آپ کو ڈاک سے بھیجوں گا۔ حکیم صاحب کے پاس اپنی سیکڑوں کتابیں ہیں، اچھا نہیں لگتا کہ اُن کو زحمت دی جائے۔ خدا کرے آپ اور بھابی صاحبہ خیریت سے ہوں۔ آمنہ سلام لکھوا رہی ہیں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۵۔۷۔۹۷ء

☆

(۳)

برادرِ محترم و مکرم، سلام مسنون

علی گڑھ کی طرح کراچی میں بھی ایک "گلشنِ دوست" ہے۔ دونوں جگہ آپ موجود ہیں، فرق یہ ہے کہ کراچی کے گلشنِ دوست میں آپ کو میں چشمِ تصور سے دیکھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں کہ آپ سے ملاقات کی مسرت حاصل کرنے میں مکانی بُعد حائل نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک زندگی کو خوش گوار بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اچھے لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا جائے۔ اسی لیے میں نے اپنی آنکھوں کو "گلشنِ دوست" کا نام دیا ہے۔

آپ کے دو خط ملے، رسالہ "طور" کے مطلوبہ مضمون کا عکس ملا۔ محترمہ جمال آرا نظامی کے ذریعے تحفے ملے - آپ کی کس کس عنایت کا ذکر کروں! ان سب کے جواب میں آپ کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں کہ اس کے سوا کچھ اور کر نہیں سکتا۔

مجھے افسوس ہے کہ ایک مدت کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آمنہ تو بیمار تھیں ہی، میں بھی ان کے نقشِ قدم پر چل پڑا۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں طبیعت خراب ہوئی۔ ٹانگ پر ایک موذی پھوڑا نمودار ہوا۔ اس کا علاج آپریشن قرار پایا۔ نو دن اسپتال میں رہا اور پھر بحالیِ صحت کے لیے اپنے چھوٹے بھائی کے ہاں منتقل ہوگیا۔ اس کا مکان ایک پُرفضا ساحلی علاقے میں ہے۔ سمندر اور مکان کے درمیان صرف ایک سڑک ہے۔ سمندر سے اتنی قربت پہلے کبھی نہیں رہی تھی۔ صبح سے شام تک میں سمندر سے ہم کلام رہتا اور یوں بحالیِ صحت کی منزل جلد قریب آ گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میں اپنے گھر واپس آ گیا ہوں۔ میری بیماری میں آمنہ اپنی بیماری کو بھول گئیں، نتیجہ یہ کہ وہ بھی اب پوری طرح صحت یاب ہیں۔

آپ انواع و اقسام کے تحائف ارسال فرما کر مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ مجھے آپ کی محبت اور خلوص حاصل ہیں اور ان سے بڑا تحفہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا ہوں کہ مجھ سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا ایک شخص میرے لیے سراپا محبت ہے۔ اب میرے پاس آپ کے اتنے تحفے ہوگئے ہیں کہ یہ زندگی بھر کے لیے کافی ہیں اور اگر اب بھی آپ کوئی تحفہ بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ ایک ہی تحفہ ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ کچھ دنوں کے لیے آپ خود یہاں تشریف لائیے۔ بارہ برسوں سے آپ آنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ اب تو یہ وعدہ پورا کیجیے۔

رسالہ "زمانہ" میں یگانہ کی جو تحریریں شائع ہوئی ہیں، وہ سب میرے پاس ہیں۔ خدا بخش لائبریری کا انتخاب بھی میرے پاس ہے۔ اس لیے آپ زحمت نہ فرمائیں۔ میں نے پچھلے تین برسوں میں کئی ہزار شمارے رسالوں کے دیکھے ہیں اور ان میں سے یگانہ کے بارے میں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ بس ایک چیز میں حاصل نہیں کرسکا اور وہ ہے رسالہ "کار امروز"۔ یہ رسالہ خود یگانہ (یاس) نے جاری کیا تھا، لکھنؤ سے۔ پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے کل پانچ شمارے شائع ہوئے تھے، ان میں صرف ایک (فروری مارچ ۱۹۲۱ء کا مشترکہ) شمارہ میرے پاس ہے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر گیان چند، انجمن ترقیِ اردو کی دعوت پر کراچی تشریف لائے تھے۔ اُن کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ اُن سے چالیس برسوں سے خط کتابت تھی۔ ملاقات اب ہوئی۔

بھائی صاحب کی خدمت میں ہم دونوں کا سلام۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ آپ نے شمس الرحمٰن فاروقی کے بارے میں جو مضمون بھیجا تھا، وہ "قومی زبان" کے اکتوبر ۱۹۹۷ء کے شمارے میں شائع ہوگیا ہے۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۳۱-۱۱-۹۷ء

☆

(۴)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

آپ کی پیہم عنایات کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں! میں بڑا گناہ گار انسان ہوں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ضرور کچھ نیکیاں کی ہوں گی جن کا صلہ آپ کے لطف و کرم کی صورت میں ملا ہے۔ مجھے اپنی پوری زندگی میں جو دو چار محبت کرنے والے ملے ہیں، اُن میں آپ بھی شامل ہیں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آپ کی محبت حاصل ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اتنا کرم فرمائیں اور میں خط کا جواب بھی نہ لکھوں۔ میں نے جولائی کے پہلے ہفتے میں آپ کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا تھا، اس میں چار دیگر حضرات کے نام خطوط بھی تھے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے نام۔ معلوم ہوتا ہے میرا یہ لفافہ ڈاک میں ضائع ہوگیا۔ غلطی یہ ہوئی کہ اسے رجسٹری سے نہیں بھیجا۔ میں عموماً ضروری خطوط رجسٹری سے بھیجتا ہوں مگر اُس روز لفافہ ڈاک خانے بھیجا تو رجسٹری کا وقت ختم ہوگیا تھا، اس لیے عام ڈاک سے بھیج دیا۔ مذکورہ حضرات کو نہایت اہم امور کے بارے میں خطوط لکھے تھے۔ وہ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔ سرور صاحب کو دیباچے کی رسید بھیجی تھی اور ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اپنی کتاب ''تصحیحِ متن'' عنایت کی تھی، اُس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ یہ کتاب یہاں شائع ہورہی ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین صاحب کو اُن کے نئے تقرر کی مبارک باد دی تھی۔ اب ان سب حضرات کو جلد ہی دوبارہ خط لکھوں گا اور رجسٹری سے آپ ہی کو بھیج دوں گا۔ ان حضرات سے ملاقات ہو تو صورتِ حال واضح کردیجیے گا اور سرور صاحب قبلہ کو یہ ضرور بتا دیجیے گا کہ اُن کی کتاب ''خطوطِ عبدالحق'' پریس میں ہے۔ ۱۶ر اگست کو بابائے اردو کی ۳۷ ویں برسی ہے۔ اس روز ایک جلسۂ عام ہوگا جس میں اس کتاب کی رونمائی ہوگی۔ پریس سے یہ کتاب آنے ہی والی ہے۔ اس کے بیس نسخے پروفیسر صاحب کو فوراً بھجوا دیے جائیں گے۔

اصلاحی صاحب کا نام ''غیر اصلاحی'' تجویز کرتا ہوں۔ اُنھوں نے آپ کو یہ غلط اطلاع دی کہ میں نے خط کتابت بند کردی ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ آمنہ کی ناسازیِ طبع کی وجہ سے میں خطوں کے جواب نہیں دے سکا۔ اصلاحی صاحب سے میں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ آپ کے لیے کچھ کتابیں لے جائیں مگر اُنھوں نے معذرت کردی اور یہ کہا، میرے پاس اپنی کتابیں بہت زیادہ ہیں۔ آپ نے ان کے ہاتھ جو تحائف بھیجے تھے، وہ بھی اُنھوں نے خود پہنچانے کی زحمت نہیں کی بلکہ مجھ سے کہا، آدمی بھیج کر منگوا لیجیے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ وہ اصلاحی ہیں یا غیر اصلاحی۔

آپ کی میرے حال پر اتنی عنایتیں ہیں کہ اگر میں گنواؤں تو گنوا نہیں سکتا۔ بہ ہر حال تحائف کا اور رحم علی الہاشمی کی ''یادیں'' کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ''اودھ پنچ'' کے مضامین کی نقول حاصل

کرنے میں آپ نے جو زحمت اٹھائی اُس کے لیے شکریہ نہیں دعائے خیر کرتا ہوں۔ احمد صغیر زیدی صاحب کو تلاش کرنا آپ ہی کا کام تھا، خودنوشت اور کچکول یگانہ کا عکس مل جائے تو کسی محفوظ طریقے سے یہاں بھیج دیجیے گا۔ یہ تو بڑی خوش خبری ہے کہ وہ یگانہ سے متعلق چیزیں فروخت کرنا چاہتے ہیں، یہ آپ اُن سے حاصل کرلیجیے، مناسب قیمت پر۔ جو رقم بھی ہوگی، میں پیش کردوں گا۔ رقم پیش کرنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ نکال لوں گا۔ مکتبہ جامعہ دہلی میں میری دو کتابوں کی رائلٹی جمع ہے۔ میں اُن سے کہہ دوں گا کہ میری ساری واجب رقم آپ کو ادا کردی جائے۔ اس سلسلے میں آپ عجلت سے کام لیں تو بہتر ہوگا تاکہ یہ تمام چیزیں مل جائیں اور میرا رکا ہوا کام چل نکلے۔ لکھنؤ کے ڈاکٹر سلیمان حسین صاحب نے بھی لکھا ہے کہ ایک صاحب کے پاس یگانہ کا رسالہ ''کار امروز'' ہے۔ میں نے انھیں جواب دیا ہے کہ وہ حاصل کرلیں اور قیمت سے مجھے مطلع کردیں۔ اُن کو یہ بھی لکھا ہے کہ وہ یہ رسالے حاصل کرکے آپ کو بھجوادیں۔ یگانہ کے سلسلے میں جو کچھ بھی مل جائے میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

یہ خط لکھ چکا تھا کہ شان الحق صاحب کا خط ملا۔ اُس پر ان کا یہ پتا لکھا ہے:

341, Frontenac Drive

D.D.O, QC, H9g 1R4, Canada.

کیا آپ نے اسی پتے پر خط لکھا تھا؟

افسوس کہ کراچی میں آپ کے پاس وقت کم تھا، ورنہ سرسیّد سے متعلق کاغذات آپ خود دیکھ کر فیصلہ کرسکتے کہ آپ کو کن کاغذات کی ضرورت ہے۔ دراصل یہ کاغذات، دوسرے بہت سے کاغذات میں ملے ہوئے ہیں اور انھیں الگ کرنا، خاصا لمبا کام ہے۔ بہ ہرحال میں نے کاغذات کی ترتیب کا کام شروع کردیا ہے، جو اہم کاغذات نظر آئیں گے، اُن کے عکس بنوا کر بھجوا دوں گا۔ سیّد حامد سے متعلق کاغذات جو میں نے آپ کو دیے تھے، نوادر کا درجہ رکھتے ہیں۔ سیّد محمود کے بارے میں تو معلومات عام ہیں لیکن سیّد حامد کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ آپ کو ان کی اشاعت میں تامل کیوں ہے؟ یہ تو تاریخی حقائق ہیں، اُن کو کہاں تک چھپایا جاسکتا ہے۔ ان کاغذات کی اشاعت سے سرسیّد کی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ان کاغذات کو آپ مرتب کرکے شائع کردیجیے۔

میرے پاس سرسیّد کی ایک نادر تصنیف ہے جو ۱۸۷۲ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی اور جو خاص خاص لوگوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ یہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہے اور اس کا ذکر عام طور پر کہیں نہیں ملتا۔ اس کے دو سرورق ہیں۔ پہلا انگریزی میں اور دوسرا اردو میں۔ ان دونوں کا اور پہلے اور آخری صفحے کا عکس بھیجتا ہوں۔ دیکھیے یہ کتاب علی گڑھ میں ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو میں پوری کتاب کا عکس بھیج دوں گا۔ آپ اسے مرتب کرکے شائع کردیجیے، اس کتاب کے ۱۱۵ صفحات ہیں۔

راس مسعود کے کچھ کاغذات بھی میرے پاس ہیں۔ اگر آپ فرمائیں گے تو ان میں سے بعض

کے عکس بھیج دوں گا۔ میرے پاس جو کچھ ہے، وہ آپ ہی کا ہے۔ راس مسعود اور مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی باہمی مراسلت میرے پاس ہے۔ یہ خطوط خاصی تعداد میں ہیں۔ یہ بھی بھیج سکتا ہوں۔

کاش آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں آجائیں تو میں سارے کاغذات آپ کے سامنے رکھ دوں تا کہ آپ اپنی پسند کی چیزیں انتخاب کرلیں۔

آمنہ کی طبیعت خاصی خراب ہے۔ بلڈ پریشر کے ساتھ جوڑوں کے درد نے پریشان کر رکھا ہے۔ فزیوتھراپی کے لیے اکثر اسپتال جانا پڑتا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ذیابیطس کا سرکش گھوڑا پوری طرح میرے قابو میں ہے مگر آمنہ کی ناسازیِ طبیعت کی وجہ سے طبیعت بے کیف رہتی ہے۔

میں اگلے چند روز میں دوبارہ خط لکھوں گا اور علی گڑھ کے دوسرے مہربانوں کو بھی لکھوں گا۔ یہ سب خط آپ ہی کے پتے پر بھیج دوں گا۔ آپ کی کتابیں بھی الگ رکھی ہیں۔ وہ بھی جلد بھجوا دوں گا۔ یہاں کی اور کتابوں کی ضرورت ہو تو بلاتکلف تحریر فرمائیے۔

شیخ منظور الٰہی صاحب کی کتاب ''نیرنگِ اندلس'' ضرور پڑھیے اور ممکن ہو تو اس پر تبصرہ بھی لکھ دیجیے۔ آمنہ آپ کو اور بھابی صاحبہ کو سلام لکھوا رہی ہیں۔

شہاب الدین ثاقب کہاں ہیں؟ ان حضرت نے وعدہ کیا تھا کہ علی گڑھ پہنچ کر خط لکھیں گے۔ مجھے تو یہ بھی ''غیر اصلاحی'' نظر آتے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ۔ ۷۔۸۔۹۸ء

☆

(۵)

محترمی و مکرمی، سلامِ مسنون

آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آکسفورڈ سے آپ کا خط پا کر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جہاں بھی ہوتے ہیں، مجھے یاد رکھتے ہیں۔ آپ ہی جیسے دو چار محبت کرنے والوں کا فیضان ہے کہ زندگی خوب صورت معلوم ہوتی ہے، اتنی خوب صورت کہ دیر تک زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ آکسفورڈ میں خوش ہیں، مکان کشادہ ملا ہے، جگہ پُرفضا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بھابی آپ کے ساتھ ہیں۔ پردیس میں بھی گھر کا سا مزہ آرہا ہے، لیکن آپ کہتے ہیں کہ گھر یاد آرہا ہے۔ آپ کا گھر تو آپ کے ساتھ ہے، لہٰذا اس موقعے کو غنیمت سمجھیے اور خوب جی بھر کے خدا کی قدرت کے نظاروں سے دل بہلایئے۔ علمی کام تو آپ کریں گے

ہی، لیکن اصل کام سیر و سیاحت ہونا چاہیے۔ روزنامچہ بھی لکھتے جایئے تا کہ آپ واپسی پر سفرنامہ لکھ سکیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مجھ جیسے گوشہ نشین، سفرنامے کے توسط سے، آپ کے ہم سفر بن جائیں گے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کے اس سفر کا اصل مقصد کیا ہے؟ کسی خاص موضوع پر تحقیق، یا تعلیم و تدریس۔ تحقیقی موضوع سرسید ہی ہوگا۔

''ادب لطیف'' کے پہلے شمارے کا عکس مل گیا تھا۔ اس کی رسید میں نے اس لیے نہیں بھیجی کہ عکس کے ساتھ خط میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ آپ ۳۱ر جنوری کو بیرونی سفر کے لیے روانہ ہو جائیں گی۔ اس کا شکریہ کیا ادا کروں کہ ایسے درجنوں کام آپ کی توجہ سے پورے ہوئے۔ آپ کے لیے جو کتابیں حاصل کر رکھی تھیں، وہ بھی اسی لیے نہیں بھیجیں۔ اب آپ کی واپسی پر ارسال کروں گا۔ ان کتابوں میں ٹرول کی سرسید پر انگریزی کتاب کا ترجمہ بھی ہے جو اکرام چغتائی نے کیا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے ڈاکٹر احمر لاری کی کتاب ''حسرت موہانی'' مجھے بھیجی تھی اور فرمایا تھا کہ اسے پاکستان میں چھپوا دوں۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے ادارے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے۔ آپ کی کتاب بھی جلد ہی چھپنے والی ہے۔ تاخیر کا سبب یہ ہے کہ اکیڈمی کے مالی حالات دگرگوں تھے۔ احمر لاری کی کتاب خاصی جاذب توجہ چھپی ہے۔

انجمن ترقی اردو نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کو بابائے اردو لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اُن کا خط آیا ہے کہ وہ ستمبر میں اس مقصد کے لیے کراچی آئیں گے۔ ایک دل چسپ بات لکھتا ہوں، یہ صرف آپ کے لیے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسلوب صاحب اپنے رسالے میں پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے خلاف ایک عرصے سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ موقع بے موقع ایسی باتیں لکھتے رہتے ہیں جنھیں پڑھ کر اُن سب لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے جو مذکورہ دونوں بزرگوں ہی کے بارے میں نہیں، خود اسلوب صاحب کے بارے میں بھی اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں اسلوب صاحب کو ایک خط لکھا کہ آپ ان دونوں کے خلاف لکھ کر ان دونوں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے، لیکن خود آپ کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوئی۔ اس لیے گزارش ہے کہ آپ اس سلسلے کو ختم کر دیں۔ آپ کو خوشی ہوگی کہ اسلوب صاحب نے میری بات مان لی ہے۔ اُن کا خط آیا ہے کہ وہ آئندہ ان دونوں کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھیں گے۔ خدا کرے وہ اس وعدے پر قائم رہیں۔

یگانہ پر کام اتنا پھیل گیا ہے کہ اب اسے سمیٹنا مشکل ہو رہا ہے۔ بہ ہر حال اس کوشش میں ہوں کہ کم از کم کلیات نظم اس سال لازماً شائع ہو جائے۔ خطوط اور مقالات کی تدوین کا کام بعد میں کروں گا اور آخر میں یگانہ کی سوانح عمری بھی لکھوں گا۔

آمنہ آج کل پریشان ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن شدید بیمار ہیں۔ ۲۴ر مارچ سے وہ اسپتال میں ہیں، آمنہ بھی اُن کے ساتھ وہیں ہیں، میں تقریباً روزانہ اسپتال جاتا ہوں۔ وہ آپ کو سلام لکھوا رہی

ہیں۔ ہم دونوں کی طرف سے بھابی صاحبہ کی خدمت میں سلام پیش کر دیجیے۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۲۷۔۴۔۹۹ء

☆

(۶)

مخترمی و مکرمی، سلام مسنون۔

گرامی نامہ مورخہ ۲۷ر نومبر موصول ہوا۔ اسے پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ آپ نے محض میری خیریت معلوم کرنے کے لیے یہ خط لکھا، اور یہ بھی لکھا کہ میں چند ہفتوں سے آپ کو یاد آ رہا ہوں۔ آپ ہی جیسے دو چار کرم فرماؤں کی وجہ سے زندگی خوب صورت نظر آتی ہے اور زندہ رہنے کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے۔ میں جب یہ تصور کرتا ہوں کہ مجھ سے سیکڑوں میل دور بیٹھے آپ کے دل میں میرے لیے اتنی محبت ہے تو مجھے اپنے آپ پر رشک آتا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے چند روز سے آپ ہی کے ایک معاملے میں، میں پریشان رہا۔ ہوا یہ کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا فون آیا کہ آپ کی کتاب ''سرسیّد کی صحافت'' پریس بھیجی جا رہی تھی کہ آخری چیکنگ میں معلوم ہوا کہ صرف ص ۲۷۳ تک کے صفحات موجود ہیں۔ باقی صفحات کی اصل ہے نہ کمپوزنگ۔ انھوں نے کہا کہ صفحات انھیں بھجوا دوں تاکہ کتاب مکمل ہو جائے۔ میں نے اس کتاب کو اپنے ہاں تلاش کیا تو یاد آیا کہ اپنا نسخہ ہی تو میں نے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو کمپوزنگ کے لیے بھیجا تھا۔ سوچا طاہر مسعود صاحب سے یہ کتاب منگوا لوں۔ انھوں نے بتایا کہ اُن کا نسخہ کوئی پڑھنے کے لیے لے گیا ہے اور یہ یاد نہیں، وہ کون تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ آپ کو لکھوں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ آپ کا خط آ گیا۔ اسے کہتے ہیں دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تو جناب آپ پہلا کام یہ کیجیے کہ اپنی مذکورہ کتاب کے ص ۲۷۴ سے آخر تک کے صفحات کا عکس بھجوا دیجیے۔ بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو براہِ راست بھیج دیجیے تاکہ کام جلد شروع ہو جائے۔ اُن کا پتا یہ ہے:

269-N

Samanabad, Lahore-54500

اس خط کے ساتھ آپ کی دل چسپی کی چھ کتابیں بھیج رہا ہوں۔ ان میں سب سے اہم مولانا حسرت موہانی کا تذکرۃ الشعرا ہے جو پہلی بار مکمل صورت میں شائع ہوا ہے۔ اخبار ''مخبر عالم'' مراد آباد پر مولانا امداد صابری کی کتاب بھی پہلی بار یہاں سے چھپی ہے۔ یہ مولانا کی زندگی میں بہ وجوہ شائع نہیں ہوئی تھی۔ گیان چند صاحب کی کتاب ''رموز غالب'' کا پاکستانی ایڈیشن اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

رائے بریلی کے صغیر احمد زیدی صاحب کو مراثی سے متعلق چند کتابیں میں نے بھیجی تھیں۔ اُن

کی طرف سے ان کی رسید نہیں آئی۔ میں نے اُنھیں یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کے توسط سے اُنھوں نے ''کچکول'' کا جو عکس عنایت کیا تھا اس میں چار صفحات (۸۵۔۸۸) نہیں ہیں۔ میں نے گزارش کی تھی کہ وہ ان صفحات کا عکس بھجوا دیں۔ اب آپ یاد دہانی کرائیے۔

ڈاکٹر احمر لاری کو اُن کی کتاب ''حسرت موہانی'' کے چند نسخے ڈاکٹر وحید قریشی نے بھجوا دیے تھی۔ ''تذکرۃ الشعرا'' میں اُنھیں بھی بھجوا رہا ہوں۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔

میں خیریت سے ہوں اور آمنہ بھی۔ البتہ آمنہ کی بہن کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس لیے اُن کا زیادہ وقت بہن کی تیمارداری میں گزرتا ہے۔ دعا کیجیے کہ خدا مریضہ کو شفا دے۔ میں اکتوبر میں لاہور اور اسلام آباد گیا تھا۔ وہاں کئی دوستوں سے آپ کا ذکرِ خیر رہا خصوصاً ڈاکٹر گوہر نوشاہی اور ڈاکٹر تحسین فراقی سے۔ فراقی صاحب کا اسپین کی کسی یونی ورسٹی میں تقرر ہوگیا ہے۔ عید کے بعد وہ اسپین چلے جائیں گے۔ ایک زحمت! ''قومی زبان'' علی گڑھ کے کئی احباب کو بھیجا جاتا ہے۔ آئندہ ان پرچوں کا پیکٹ آپ کے نام بھیجوں گا۔ آپ اپنے چپراسی کے ذریعے تقسیم کرا دیجیے گا۔ شکریہ۔

اس خط کے ساتھ کچھ خط دوسروں کے لیے بھی ہیں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی، از راہِ کرم یہ اُن تک پہنچا دیجیے۔

عزیزی شہاب الدین ثاقب کہاں ہیں؟ بہت دنوں سے اُن کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ ملاقات ہو تو میری طرف سے مزاج پرسی کیجیے گا۔ محترم آلِ احمد سرور صاحب سے ملاقات ہو تو اُن تک بھی میرا نیاز مندانہ آداب پہنچا دیجیے۔ آمنہ سلام لکھوا رہی ہیں۔ محترمہ بھابی صاحبہ کی خدمت میں ہم دونوں کا سلام۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۲۔۹۔۹۹ء

☆

(۷)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

گرامی نامہ یکم مارچ موصول ہوا، ممنون ہوں۔ اس سے پہلے ڈاکٹر جمال آرا نظامی کے ذریعے مکتوبِ گرامی مع تحائف گراں قدر موصول ہوا تھا۔ معذرت خواہ ہوں کہ فوراً رسید نہ بھیج سکا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ذرا مہلت ملے تو علی گڑھ کے متعدد کرم فرماؤں کے خطوط کے جوابات واجب ہیں، وہ سب آپ ہی کے ذریعے بھیج دوں۔ مگر ابھی تک وہ مہلت نہیں ملی۔ آج ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب کو خط لکھا تو انھیں یہ خط بھیج رہا ہوں کہ از راہِ کرم آپ کی خدمت میں روانہ فرما دیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب سے میری بات ہوگئی ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ وہ اپنی بیٹی سے کہہ دیں گے کہ وہ اپنے مقالے کا وہ حصہ آپ کو بھیج دے جو علی گڑھ کی خواتین سے متعلق ہے۔ وہ آپ کو خط بھی لکھیں گے۔

سلمیٰ شان الحق حقی نے صفیہ اختر پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جو میں نے رسالہ ''غالب'' میں شائع کیا تھا۔ یہ رسالہ ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے پاس ہوگا (ویسے یہ میں نے آپ کو بھی بھیجا تھا) شاید یہ مضمون آپ کے کام کا ہو۔ زرِ خش پر ایک مضمون شان الحق حقی صاحب نے لکھا تھا۔ یہ اُن کے کسی مجموعے میں ہے۔ آپ فرمائیں گے تو میں بھیج دوں گا۔

میری خیریت کی آپ کیا پوچھتے ہیں، اکتوبر سے صحت کی کشتی ڈانواں ڈول ہے۔ ذیابیطس کے ساتھ بلڈ پریشر نے بھی گھر دیکھ لیا ہے۔ دونوں امراض کی دواؤں کا آپس میں ٹکراؤ ہوا جس نے بہت پریشان کیا۔ نتیجہ یہ کہ سوائے مطالعے کے کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ اس بیماری سے یہ فائدہ ہوا کہ کئی کتابیں جن کے مطالعے کے لیے وقت نہیں مل رہا تھا، انھیں پڑھ ڈالا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میں بہتر ہوں۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب ایک سے می نار کے سلسلے میں لندن گئے تھے، کل ہی واپس آئے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا ہے کہ وہ آپ کی کتاب جلد از جلد شائع کردیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سب سے پہلے اسی کو شائع کریں گے۔

یہاں ایک ادارہ ''خطبات احمدیہ'' کے انگریزی اور اردو متون کو شائع کرنا چاہتا ہے۔ انگریزی ایڈیشن تو شاید ایک ہی بار چھپا تھا، اردو کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے ۱۸۸۷ء میں چھپا تھا اور یہی مکمل ایڈیشن ہے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں کئی نقشے اور شجرے شامل نہیں کیے گئے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ پچھلے دنوں آپ لندن گئے تھے تو کیا یہ دونوں متن وہاں کی کسی لائبریری میں آپ کی نظر سے گزرے تھے؟ یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ لندن سے ان کے عکس منگوانے میں سہولت ہوگی۔ آپ صرف لائبریری کی نشان دہی کردیجیے۔

آمنہ خیریت سے ہیں اور حسبِ معمول اپنی بہن کی تیمارداری میں مصروف۔ گزشتہ سال وہ پورے چھ مہینے اپنی بہن کے ساتھ اسپتال میں رہی ہیں۔ مریضہ کی حالت جیسی تھی، ویسی ہی ہے، کوئی فرق نہیں پڑا۔ آمنہ آپ کو اور بھابی صاحبہ کو سلام لکھوا رہی ہیں۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں میرا سلام بھی پیش کردیجیے۔ آپ کے تحائف کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہاں بریلی کے زیدی صاحب کو آپ نے خط لکھا کہ نہیں۔ مطلوبہ چار صفحات مل جائیں تو کرم ہوگا۔ پچھلے خط میں، میں نے تفصیل لکھی تھی۔ ازراہِ کرم ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کو فون کر کے بتا دیجیے کہ میں انھیں جلد ہی خط لکھوں گا۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ ۱۰-۳-۲۰۰۰ء

☆

(۸)

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

کتنا عجیب اتفاق ہے، اُدھر آپ نے مجھے خط لکھا اور ادھر میں نے۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے، ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ یہ جان کر اطمینان ہوا کہ آپ کو میرا خط بھی مل گیا اور رسالہ "غالب" بھی۔ آپ کے لیے کچھ کتابیں بھی رکھی ہیں، ان شاء اللہ جلد ہی بھجواؤں گا۔ امید ہے آپ ازبکستان کی سیر کر کے آ چکے ہوں گے۔ کہیے وہاں وقت کیسا گزرا۔ سمرقند و بخارا اور تاشقند وغیرہ کو آپ نے کیسا پایا۔ یہ تو وہ علاقے ہیں جن کے نام ہم ہوش سنبھالتے ہی سنتے ہیں۔ ان تاریخی شہروں کو دیکھنا ایک بڑا خوش گوار تجربہ ہوگا۔

آپ کی کتاب کی اشاعت میں بہت تاخیر ہو رہی ہے۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی کی سرگرمیاں ڈیڑھ سال سے بند ہیں۔ دفتر کے عین سامنے سڑک کھدی پڑی ہے اور دفتر کا راستہ مسدود ہے۔ اب کچھ صورتِ حال بہتر ہوئی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے بتایا ہے کہ بہت جلد کتاب شائع ہو جائے گی۔

آپ کے ہاں کے تین سے می ناروں کی اطلاع مل گئی تھی۔ خطباتِ صدارت جو آپ نے بھیجے ہیں، یہ "قومی زبان" میں شائع کروں گا۔ پہلے آلِ احمد سرور سے می نار کی روداد شائع ہو رہی ہے۔ شہاب الدین ثاقب صاحب کی نوشتہ روداد جو "سیاست" حیدر آباد میں شائع ہوئی تھی، اسے نقل کیا ہے۔ اگر شمس الرحمٰن فاروقی کا کلیدی خطبہ مل جائے تو وہ بھی چھاپ دوں گا کہ یہاں کے لوگوں کو معلوم ہو کہ آپ کے ہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ آلِ احمد سرور سے می نار کا انعقاد آپ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ہم نے جن لوگوں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، اُن کی خدمات کا اعتراف بہت بڑی سعادت ہے۔ یہ کام آپ ہی کر سکتے تھے اور بہت عمدگی سے کیا۔ مگر یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بعض بدنصیب سرور صاحب کے خلاف زبان درازی کرتے ہیں۔ دہلی کا رسالہ "استعارہ" آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس میں جو یاوہ گوئی کی گئی ہے، وہ لکھنے والے کی بد طینتی اور چھاپنے والے کی بدگہری کا آئینہ ہے۔

آپ لوگوں سے ملنے اور ہندوستان کے تاریخی آثار دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ خصوصاً حیدر آباد، اجنتا، ایلورا، شادی آباد مانڈو، زندگی رہی تو اگلے سال آؤں گا۔

چند روز ہوئے محترم آلِ احمد سرور صاحب کا خط آیا تھا۔ ملاقات ہو تو میرا سلام عرض کیجیے گا۔ اُن کے پاس مشاہیر کے خطوط کا جو ذخیرہ ہے، اُس کا بڑا حصہ لائق اشاعت ہے۔ کاش اُنھیں ایسے معاون مل جائیں جو اُن سے خطوط پر حواشی لکھوالیں۔ بابائے اردو کے خطوط پر تو میں نے کام کرالیا تھا، اگر میں وہاں ہوتا تو اب تک سارے خطوط مرتب کرالیتا۔ خود سرور صاحب کے خطوط بھی اس لائق ہیں

کہ اُنھیں مرتب کیا جائے۔ یہ کام آپ کیوں نہیں کرتے۔ سرور صاحب کی موجودگی میں ان پر حواشی لکھنے میں آسانی ہوگی۔ سرور صاحب کے خطوط جمع کرنے میں، میں بھی کچھ مدد کرسکتا ہوں۔

آمنہ کی اور میری طرف سے محترمہ بھابی صاحبہ کی خدمت میں سلام پیش کردیجیے۔

عزیزی شہاب الدین ثاقب کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔

آپ کا
مشفق خواجہ ۱۸۔۵۔۲۰۰۱ء

☆

(۹)

محترمی و مکرمی، سلامِ مسنون

حکیم سیّد ظل الرحمٰن صاحب آج کل یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ ایک دو روز میں واپس جانے والے ہیں۔ آج وہ کسی وقت تشریف لائیں گے۔ اس موقعے کو غنیمت جان کر یہ خط لکھ رہا ہوں تاکہ حکیم صاحب اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور آپ کی خدمت میں پیش کردیں۔

خدا کا شکر ہے کہ میں اب خیریت سے ہوں اور اپنے کاموں میں مصروف۔ علاج اور پرہیز دونوں پر عمل ہو رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ سگریٹ بھی ترک کردی ہے۔ پچاس برسوں تک سگریٹ نے میرا ساتھ دیا، آخر میں نے ہی بے وفائی کی! اپنی اس حرکت پر افسوس تو ہوتا ہے، مگر کیا کروں مجبور ہوں۔

اگست کے شروع میں، میں اسلام آباد گیا تھا۔ ازراہِ کرم ڈاکٹر صدیق جاوید صاحب بھی وہاں آگئے۔ اُن سے آپ کا ذکرِ خیر رہا۔

شہاب الدین ثاقب صاحب بھی اگست ہی کے مہینے میں تشریف لائے تھے۔ اُن سے بھی آپ کی باتیں ہوتی رہیں۔

آمنہ خیریت سے ہیں۔ ہم دونوں آپ دونوں کو اکثر یاد کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بہت کم وقت گزرا مگر اس کی خوش گوار یادوں نے زندگی کو کتنا خوب صورت بنا دیا ہے۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں ہم دونوں کا سلام پیش کردیجیے۔ آپ کی صحت و عافیت کی دعاؤں کے ساتھ۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ ۱۔۱۱۔۲۰۰۲ء

☆

(۱۰)

محترمی و مکرمی، سلامِ مسنون

گرامی نامہ ملا اور کتابوں کا پیکٹ بھی۔ ان عنایات کے دل سے ممنون ہوں۔ سرسیّد اکیڈمی

آپ کی سربراہی میں بہت مفید کام کر رہی ہے۔ صرف ایک ''تبیین الکلام'' ہی کو لے لیجیے، میرے نزدیک اس کی اشاعت تو ایک کارنامے سے کم نہیں۔ اس کتاب کا صرف نام ہی سنا تھا یا اس کے چند اقتباسات ہی نظر سے گزرے تھے، آپ کی عنایت اس کتاب کو دیکھ لیا اور اگر اللہ نے توفیق دی تو مطالعہ بھی کروں گا۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ دونوں ملکوں میں یکساں طور پر سرسیّد کا چرچا ہے۔ پاکستان میں شاید ہی کوئی شہر ہوگا جہاں سرسیّد کے نام پر کوئی ادارہ قائم نہ ہو۔ محلّوں اور سڑکوں کے نام بھی کثرت سے رکھے گئے ہیں۔ کتابیں بھی اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ دل چسپ بات یہ ہے کہ سرسیّد کی مخالفت میں بھی بعض حلقے بہت سرگرم ہیں۔ ایک صاحب نے تو سرسیّد کے خلاف لکھنا اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے۔ یہ سب سرسیّد کی عظمت کی دلیلیں ہیں۔ آپ اکیڈمی کے ذریعے سرسیّد کے خیالات کی جو اشاعت کر رہے ہیں، اُس کے لیے وہ سب لوگ آپ کے ممنون ہیں جو سرسیّد سے عقیدت کا رشتہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صدیق جاوید صاحب خیریت سے ہیں۔ اُن سے ہفتے میں ایک دو بار فون پر بات چیت ہو جاتی ہے۔ انھوں نے تحقیقی نوعیت کی ایک اور کتاب لکھی ہے جو عنقریب شائع ہو رہی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ میری صحت اب قدرے اطمینان بخش ہے۔

آج کل آپ کے ملک سے مہمان اکثر آتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر خلیق انجم، جیلانی بانو اور ڈاکٹر انور معظم صاحب آئے تھے۔ ڈاکٹر انور معظم صاحب اب دوبارہ آئے ہیں۔ وہ پرسوں واپس جا رہے ہیں۔ یہ خط وہی پوسٹ کریں گے۔

آمنہ آپ کو اور بیگم صاحب کو سلام لکھوا رہی ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ ۱۶۔۱۔۲۰۰۵ء

☆☆☆

بنام رؤف پاریکھ

مکرمی۔ سلام مسنون!

بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی کتاب "ہوائیاں" عنایت فرمائی اور معذرت خواہ ہوں کہ کتاب کی وصولی کی اطلاع تاخیر سے دے رہا ہوں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ میں کراچی سے باہر گیا تھا۔ میری عدم موجودگی میں کتاب موصول ہوئی اور ۱۵۔۲۰ روز تک لفافے میں بند رہی۔ واپس آیا تو سوچا کتاب پڑھ کر خط لکھوں۔ سو اسے میں نے کل ہی ختم کیا ہے۔ آپ نے دل چسپ مضامین لکھے ہیں۔ پڑھ کر جی خوش ہوا اور اس سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ آپ نے کسی دوسرے سے فلیپ یا دیباچہ نہیں لکھوایا۔ اس قسم کی تحریروں سے نقصان ہی پہنچتا ہے، فائدہ نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ پھر آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۲۔۵۔۹۳ء

☆☆☆

بنام اشفاق احمد ورک

(۱)

عزیز مکرم، سلام مسنون

آپ نے فروری کے وسط میں میرے لیے جو کتاب بھیجی تھی، وہ ابھی ایک ہفتہ قبل مجھ تک پہنچی ہے۔ میری طبیعت ناساز تھی، اس لیے اپنے گھر سے دور ایک دوسری جگہ منتقل ہوگیا تھا جہاں طبّی سہولتیں آسانی سے دستیاب ہوجاتی ہیں۔ آپ کی کتاب نامہ بر کے پاس پڑی رہی۔ اب اپنے گھر واپس آیا ہوں تو یہ مجھے ملی ہے۔ اگر وہیں مل جاتی تو صحت کی بحالی کا مسئلہ جلد حل ہوجاتا۔

میں نے اس کتاب کو ابھی جستہ جستہ دیکھا ہے، اس کے باوجود نصف سے زیادہ کتاب پڑھ ڈالی ہے۔ جی خوش ہوا۔ آپ نے بڑی محنت کی ہے، حالاں کہ پی ایچ ڈی کے مقالوں کے لیے محنت اُن کے پڑھنے والے کرتے ہیں۔

موضوع کی بے انتہا وسعت کے باوجود آپ نے مطالعہ و تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔ اس کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے ایسے ایسوں کو بھی پڑھ ڈالا جنھیں پڑھنا مشکل میں پڑنے کے مترادف ہے۔ یہی نہیں آپ نے بعض فراموش شدہ مگر اہم مزاح نگاروں کو تلاش کرکے بھی تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں آپ کے کام کی داد دی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے کام نہیں کیا، کام کرنے والوں کے لیے ایک مثال قائم کی ہے۔

اس کتاب میں اپنا ذکر پڑھ کر بے حد شرمندگی ہوئی (اب میں عمر کی اُس منزل میں ہوں جہاں دوسروں کے اعمال ہی پر شرمندگی ہوسکتی ہے)۔ کاش میں اُن الفاظ کا واقعی مستحق ہوتا جو آپ نے میرے لیے استعمال کیے ہیں۔ ان سے اور کچھ ثابت ہو نہ ہو، یہ ضرور ثابت ہوجاتا ہے کہ آپ لفظوں کے معاملے میں بڑی سخی ہیں۔

مظہر امام میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اُن کی برہمی بجا ہے۔ وہ دوستی کی بنا پر نہیں چاہتے

تھے کہ میں سچ بولوں جب کہ میں نے اسی بنا پر سچ بولنا ضروری سمجھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ناراض ہو گئے۔ میں نے اُن کے بارے میں دو کالم لکھے تھے۔ ایک سے وہ خوش ہوئے اور دوسرے سے ناخوش۔ اب یہ دونوں کالم زیرِ طبع انتخابات میں شامل ہیں۔ یہ انتخابات اگلے مہینے شائع ہو جائیں گے۔ مبین مرزا صاحب سے میں نے کہا ہے کہ وہ آپ کو ضرور بھیجیں۔

آپ کی کتاب میں بعض اچھے لکھنے والوں کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ ایک اہم نام نظرانداز ہونے پر مجھے حیرت ہے، اور وہ نام ہے طفیل احمد جمالی کا۔ ایک زمانے میں وہ بہت مقبول تھے۔ اُن کا کالم ''گر تو بُرا نہ مانے''، ''امروز'' میں چھپتا تھا اور بہت پڑھا جاتا تھا۔ مجید لاہوری کے بعد وہ ایک عرصے تک ''نمکدان'' شائع کرتے رہے ہیں۔ ابنِ انشا انھیں اپنا گرو کہا کرتے تھے۔ اسی طرح مختار زمن کا نام تو آپ نے ایک جگہ لیا ہے لیکن اُن کی کتاب ''گفتنی ناگفتنی'' کا ذکر نہیں کیا۔

کاش آپ دورانِ تحقیق کراچی تشریف لے آتے تو آپ کو یہاں بہت سی چیزیں مل جاتیں جو لاہور اور مضافاتِ لاہور میں نہیں ہیں۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب نے بہت اعلیٰ معیار کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا ہے۔ اُن کے ادارے کی ایک اور کتاب ''جہانِ حیرت'' بھی دیکھی۔ وہ بھی طباعت کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ ۲۳۔۳۔۲۰۰۴ء

☆

(۲)

عزیزِ مکرم، سلامِ مسنون

بہت دن ہوئے، میرے خط کے جواب میں، آپ کا خط آیا تھا۔ اس میں ایک آدھ جواب طلب بات تھی، معلوم نہیں کیوں، یہ خط کاغذات میں دبا رہ گیا، اب نظر پڑا ہے تو افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کیا سوچتے ہوں گے کہ یہ شخص...... خیر یہ جملہ آپ خود ہی مکمل کر لیجیے۔

طفیل احمد جمالی پر کام نہیں ہوا۔ یہ اس لائق ہیں کہ ان کی تحریریں جمع کی جائیں۔ یہ ایک عرصے تک رسالہ ''نمکدان'' مرتب کرتے رہے ہیں۔ اس میں ان کی خاصی تحریریں ہیں۔ ''امروز'' میں ہر اتوار کو کالم ''گر تو بُرا نہ مانے'' سال ہا سال لکھتے رہے ہیں۔ روز کے مزاحیہ کالم میں بھی ان کا حصہ تھا۔ اس طرح کہ مزاحیہ کالم باری باری ابراہیم جلیس، ابنِ انشا اور جمالی لکھا کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی ''پہلا درویش'' تھا، کوئی ''دوسرا درویش'' اور کوئی ''تیسرا درویش'' ۔ چھان بین کی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ کون کیا تھا۔ ہفت روزہ ''نگار'' میں بھی اُنھوں نے بہت کچھ لکھا۔ نظم اور نثر دونوں۔ ان کا ایک قلمی

نام بھی تھا۔ دنیائے فلم سے متعلق منظومات اسی نام سے نگار میں چھپتی تھیں۔ لاہور کا ''لیل و نہار'' بند ہوگیا تو کراچی سے سبط حسن نے یہ رسالہ جاری کیا۔ فیض صاحب کا نام بھی مجلسِ ادارت میں شامل تھا۔ اس میں بھی جمالی نے ''گر تو بُرا نہ مانے'' شروع کیا تھا۔ غرض کہ جمالی کی تحریریں رسالوں اور اخباروں میں دفن ہیں۔ انھیں تلاش کرنا ہوگا۔

جمالؔی شاعر بھی بہت اچھے تھے۔ ترنم نہایت عمدہ تھا، اس لیے مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ غزل بہت اچھی کہتے تھے۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے:

کم نہ تھے نازک مزاجی میں کسی سے ہم مگر
رنج دینے والے کو پہچان کر چپ ہو گئے

جمالؔی کے جاننے والے ابھی بہت سے لوگ موجود ہیں، اس لیے اُن کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔ بیگم اور دو بیٹیاں بھی کراچی میں ہیں۔

آپ نے اپنی کتاب ہندوستان بھیجی؟ خدا بخش لائبریری پٹنہ، انجمن ترقیِ اُردو، دہلی، رضا لائبریری رامپور، آزاد لائبریری علی گڑھ میں ضرور جانی چاہیے۔ طنز و مزاح پر ناؔمی انصاری لکھتے رہتے ہیں، انھیں بھی ضرور بھیجیے۔ ان کا پتا حاشیے پر لکھ رہا ہوں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش
مشفق خواجہ ۳۰-۸-۲۰۰۴ء

☆

(۳)

عزیز مکرم، سلامِ مسنون

مجھے یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی کہ مبین مرزا صاحب نے کتابیں آپ کو نہیں بھیجیں۔ حیرت اس پر ہے کہ اُنھوں نے چند نسخے مجھے کس طرح عنایت کردیے۔ بہ ہر حال یہ دونوں کتابیں میں ارسال کر رہا ہوں۔ کتابوں پر مصنف کے دستخط حاصل نہ کرسکا کیوں کہ شہر میں کوئی ایسا شخص دستیاب نہیں ہوا جو ان فضولیاتِ ادب سے نسبتِ تصنیف رکھتا ہوں۔ جس شہر میں ردیاتِ ادب کا کاروبار چمک رہا ہو، وہاں ایسی چیزوں کی کیا قدر ہوگی۔

لاہور میں جمالی کے جاننے والوں میں سرِ فہرست حمید اختر صاحب ہیں۔ محترم قاسمی صاحب بھی اُنھیں ضرور جانتے ہوں گے۔ مسعود اشعر صاحب بھی لازماً واقف ہوں گے۔ ''امروز'' کے پرانے اراکینِ ادارہ کو مذکورہ تینوں بزرگوں کی مدد سے تلاش کیجیے اور پھر ''امروز'' کی فائلوں سے اُن کے کالم نکالیے، اس کے بعد کراچی آجائیے۔ یہاں اُن کے بعض رشتہ دار بھی مل جائیں گے، بیگم بھی یہیں ہیں۔

اُن سے ایک طویل انٹرویو لے لیجیے گا۔ نگار (فلمی اخبار) کے دفتر میں اس کا فائل بھی مل جائے گا۔ آپ پہلا قدم اٹھایئے، راستہ خود ہموار ہوتا چلا جائے گا۔ بیگم صاحب اس لائق نہیں ہیں کہ خطوں کے جواب دے سکیں، اُن سے گفتگو ہی نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔ دو بیٹیاں بھی ہیں مگر وہ بہت کم عمر تھیں جب جمالی صاحب کا انتقال ہوا۔ مالک رام نے تذکرۂ معاصرین میں جمالی کے جو حالات لکھے ہیں، وہ منسلک ہیں۔ اس سے آپ کو حدود کار متعین کرنے میں مدد ملے گی۔

آپ ہندوستان میں اپنی کتاب نامی انصاری کو ضرور بھیجیے۔ انھوں نے بھی طنز و مزاح پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کا پتا یہ ہے:

99/295, Nala Road. Chaman Ganj. Kanpur-208001 (INDIA)

پتا انگریزی ہی میں لکھیے گا کہ وہاں کے ڈاکیے یہاں کے ادیبوں کی طرح اُردو نہیں پڑھ سکتے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش

مشفق خواجہ ۱۷۔۹۔۲۰۰۲ء

☆☆☆

شاعری

کلیاتِ یگانہ مشفق خواجہ قیمت: ۵۰۰/روپے	موسم موسم (کلیات) ادا جعفری قیمت: ۴۵۰/روپے	عالی کلام (جمیل الدین عالی کی شاعری کا انتخاب) جمال پانی پتی قیمت: ۲۰۰/روپے
موجِ صد رنگ عبداللہ جاوید قیمت: ۲۰۰/روپے	حصارِ امکاں عبداللہ جاوید قیمت: ۲۰۰/روپے	خواب سماں عبداللہ جاوید قیمت: ۲۰۰/روپے
آبشار رضی مجتبیٰ قیمت: ۲۵۰/روپے	اُجالوں کی اوٹ رضی مجتبیٰ قیمت: ۲۵۰/روپے	لفظوں کے پیرہن سحاب قزلباش قیمت: ۱۵۰/روپے
دامن (کلیات) باقر نقوی قیمت: ۴۰۰/روپے	کہیں کچھ کھو گیا ہے میر ظفر حسن قیمت: ۱۵۰/روپے	سنہری دھوپ کا آنچل میر ظفر حسن قیمت: ۱۵۰/روپے
غزل بے شرط (کلیاتِ غزل) ساقی فاروقی قیمت: ۳۵۰/روپے	چاکِ قفس رضیہ فصیح احمد قیمت: ۱۵۰/روپے	ہونے کا تماشا احمد زاہد قیمت: ۱۵۰/روپے

تنقید

اختلاف کے پہلو
جمال پانی پتی
قیمت: ۱۸۰/روپے

نفی سے اثبات تک
جمال پانی پتی
قیمت: ۲۰۰/روپے

جدیدیت اور جدیدیت کی اہلیت
جمال پانی پتی
قیمت: ۲۵۰/روپے

تعبیر کی شرح
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت: ۲۰۰/روپے

جدید سندھی ادب
(انعام یافتہ کتاب)
سیّد مظہر جمیل
قیمت: ۷۰۰/روپے

انگارے سے پگھلا نیلم تک
سیّد مظہر جمیل
قیمت: ۲۵۰/روپے

شاگردانِ انیس
ڈاکٹر مقام حسین جعفری
قیمت: ۲۵۰/روپے

عصری ادب اور سماجی رجحانات
ڈاکٹر رؤف پاریکھ
قیمت: ۱۵۰/روپے

افسانے / ناول

جو کہانیاں لکھیں
(۲۰۰۵ء تک لکھی گئی تمام کہانیاں یکجا)
اسد محمد خاں
زیرِ طبع

تیسرے پہر کی کہانیاں
(افسانوں کا نیا مجموعہ)
اسد محمد خاں
قیمت: ۱۵۰/روپے

آبلہ پا
(انعام یافتہ ناول)
رضیہ فصیح احمد
قیمت: ۲۵۰/روپے

دو ناول
(● صدیوں کی زنجیر ● یہ خواب سارے)
رضیہ فصیح احمد
قیمت: ۷۰۰/روپے

چار ناول
● انتظار موسم گل ● متاعِ درد
● اک جہاں اور بھی ہے ● آبلۂ عشق
رضیہ فصیح احمد
قیمت: ۵۰۰/روپے

مجموعہ رضیہ فصیح احمد
(افسانوں کا کلیات)
رضیہ فصیح احمد
قیمت: ۶۰۰/روپے

ورثہ
رضیہ فصیح احمد
قیمت: ۲۰۰/روپے

پلوں کے نیچے بہتا پانی
مقصود الٰہی شیخ
قیمت: ۲۸۰/روپے

مرگ زار
محمد حمید شاہد
قیمت: ۱۵۰/روپے

بکھرے ہوئے لوگ
محسنہ جیلانی
قیمت: ۱۵۰/روپے

مژگاں تو کھول
حمرا خلیق
قیمت: ۱۲۰/روپے

خوف کے آسمان تلے
مبین مرزا
قیمت: ۲۰۰/روپے

Kitab Market, Office# 17, St.# 3, Urdu Bazar, Karachi, Pakistan Ph: (92-21) 2751428
e-mail:a.bazyaft@yahoo.com

تراجم

سلاسل
(ایلکس ہیلے کے ناول Roots کا ترجمہ)
مترجم: انوار فاطمہ جعفری
قیمت: ۴۰۰/روپے

سرخاب کے پر
(عالمی مزاح پاروں کا ترجمہ)
مترجم: ڈاکٹر رؤف پاریکھ
قیمت: ۱۰۰/روپے

عالمی ادب: ایک انتخاب
(عالمی ادب کی نمائندہ نگارشات)
مرتبہ: شگفتہ افتخار
قیمت: ۲۵۰/روپے

مشرق و مغرب کے افسانے
(منتخب عالمی افسانے)
مترجم: حمرا خلیق
قیمت: ۱۵۰/روپے

شاہکار سندھی کہانیاں
(سندھ کے افسانوی ادب سے انتخاب)
مترجم: شاہد حنائی
قیمت: ۲۰۰/روپے

فکریات
(عالمی ادب سے منتخب مقالات)
مترجم: ڈاکٹر تحسین فراقی
قیمت: ۲۵۰/روپے

"مکالمہ"

کی آئندہ اشاعت

ہم عصر اردو افسانہ

ایک دستاویز

بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں